معیاری ادبی مضامین کا مجموعہ

نگارشات



از
آغا محمد باقر
ایم۔ اے، ایم۔ او۔ ایل، بی۔ ٹی
نبیرۂ شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد مرحوم

حسبِ فرمائش
شیخ مبارک علی تاجر کتب اندرون لوہاری دروازہ لاہور
عالمگیر الیکٹرک پرنٹنگ پریس بازار سید مٹھا، لاہور میں باہتمام حافظ محمد عالم چھپا
قیمت ایک روپیہ آٹھ آنہ
پہلا ایڈیشن ایک ہزار

مضامین

"اِنشاپردازی"

دُنیا میں ہر شخص کوئی نہ کوئی وصف لے کر آیا ہے۔ اور وہ اپنے مخصوص اوصاف سے دوسروں کو کچھ نہ کچھ فائدہ بھی ضرور پہنچاتا ہے۔ ہمارے جن مضمون نگاروں کو انشاپردازی کا وصف عطا ہُوا ہے۔ وہ اپنے زورِ قلم سے زندگی کے رُوحانی اور جمالی شعبوں کو چمکاتے ہیں یا انسان کی دماغی۔ رُوحانی اور وجدانی گرسنگی کو دُور کرنے کے لئے غذا مہیا کرتے ہیں۔ انشاپرداز کسی موضوع کے متعلّق اپنے تاثرات کو دوسروں کے سامنے پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ گویا انشا پرداز کی حیثیت ایک مصوّر کی سی ہے۔ لیکن مصوّر اور انشا پرداز میں فرق یہ ہے کہ انشا پرداز کسی چیز کے انہی پہلوؤں پر روشنی ڈالتا ہے جو اس کے دل و دماغ کو زیادہ متاثر کرتے ہیں۔ اور ان چیزوں کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ جو اس کے زورِ بیان سے خود بخود تصوّرات میں آ سکتی ہیں۔ اس کے مقابلے میں مصوّر مجبور ہو جاتا ہے کہ اپنے موڈل کو پورا کرنے کے لئے ضروری چیزوں کے ساتھ غیر ضروری چیزوں کو بھی پس منظر

میں پیش کرے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ انشا پردازی محض الفاظ کا گورکھ دھندا یا خیالات کا زرّین جال ہے اس سے عملی دُنیا میں نہ تو کچھ فائدہ پہنچتا ہے اور نہ اس میں صداقت ہوتی ہے اس لئے اس پر وقت ضائع کرنا فضول ہے۔ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ فنِ لطیف میں عام طور پر ظاہری صداقت کو مدِنظر نہیں رکھا جاتا لیکن اس کے باوجود انشا پردازی کے کمالات جس قسم کی صداقت کو بے نقاب کرتے ہیں عملی دُنیا میں اس سے لُطف اندوز ہونا اور واقفیّت حاصل کرنا ازبس ضروری ہے۔ مثلاً بعض اوقات انسان اپنے کام کاج اور روزانہ کی پریشانیوں سے تھک ٹوٹ کر بالکل پژمُردہ ہو جاتا ہے۔ اگر ایسے اوقات میں اس کے سامنے کوئی ادبی تصنیف آجائے تو وہ اس میں مستغرق ہوکر اپنے تمام رنج والم اور کسل کو بھول جاتا ہے۔ کبھی روتا ہے کبھی کھلکھلا کر ہنستا ہے۔ کبھی مُسکراتا ہے۔ غرض انشاپردازی کی بدولت وہ اپنے دل کی بھڑاس نکال کر ہلکا ہوجاتا ہے۔

فنِ انشاپردازی ایک قسم کی دماغی ورزش ہے جو شخص یہ ریاضت کرتا ہے۔ وہ ضرور انشا پرداز بن سکتا ہے۔ لیکن ہم لوگوں میں یہ غلط خیال مستحکم ہوگیا ہے کہ انشاپردازی

قدرتی عطیہ ہے۔ اور وہ ان لوگوں کے لئے مخصوص ہے جو
اہل زبان کہلانے کے مستحق ہیں۔ اس خیال کی بدولت ہمارے
ملک میں روز بروز اچھے انشاپردازوں کی تعداد میں کمی
واقعہ ہورہی ہے۔ جو انشاپرداز اپنی جگہ خالی کرتا ہے دوسرا
کوئی شخص اس کی جگہ کو پُر نہیں کر سکتا بعض انشاپرداز
پیدائشی اور فطری انشاپرداز ہوتے ہیں لیکن یہ فیصلہ کرلینا
سراسر غلطی ہے کہ اس قُدرتی صلاحیت کے لئے مشق کی
ضرورت نہیں اس کے ساتھ ہی یہ خیال بھی درست نہیں کہ
انشاپردازی اہل زبان کا ورثہ ہے۔ انشاپردازی ایک
فنِ لطیف ہے۔ اور یہ ان لوگوں کا جائز ورثہ ہے جو اپنے
خیالات اور تاثرات کو نہایت اچھے اور موزوں الفاظ میں
ادا کرنے کی کوشش مسلسل جاری رکھتے ہیں۔ اگر آپ کو کسی
باکمال مصنّف کا قلمی مسودہ دیکھنے کا اتفاق ہو تو آسانی سے اندازہ
ہوسکیگا کہ وہ ہر لفظ کی نشست۔ آواز، اثر اور موزونیت
پر کس قدر عرق ریزی کرتا ہے۔ کسی لفظ کو آگے پیچھے کرکے
فقرے کا زور بڑھاتا ہے۔ کہیں کاٹ چھانٹ کرکے فقرے
پر فقرہ اور لفظ پر لفظ چڑھاتا ہے اور اپنے طرز بیان کی موزونیت
اور دل نشینی میں اضافہ کرتا ہے۔ غرض ایک ایک لفظ پر
پسینہ بہاتا اور آنکھوں کا تیل ٹپکاتا ہے پھر کہیں جاکر ایسا مضمون

تیار ہوتا ہے جو قبول کی سند پاتا ہے۔ ہمارے دور کے عام مصنفین اور انشا پرداز اس قسم کی جانکاہی اور عرق ریزی سے پرہیز کرتے ہیں، وہ جو کچھ اپنے قلم سے لکھ دیں اسے پتھر کی لکیر سمجھتے ہیں۔ اور اہل زبان کا تو کہنا ہی کیا ہے وہ تو یہ سمجھے بیٹھے ہیں ؎

سند ہے جو بھی ہم کہہ دیویں عارفؔ
زبان ریختہ اپنی زبان ہے

یہی وجہ ہے کہ اب نہ تو پہلے جیسے باکمال انشا پرداز پیدا ہوتے ہیں اور نہ آجکل کے انشا پردازوں کی تحریروں میں پُرانے انشا پردازوں کی تحریروں کا سا ادبی لُطف آتا ہے ؞

ناقص ابتدائی تعلیم انشا پردازوں کے فقدان کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ آجکل ابتدائی تعلیم ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں ہے جو خود صحیح معنوں میں تعلیم یافتہ کہلانے کے مستحق نہیں۔ جو شخص چند ابتدائی کتابیں پڑھا سکتا ہے وہ معلّم بن جاتا ہے۔ معلّمین کی ناقص تعلیم کا اثر طالب علموں کے لئے زہر قاتل کا حکم رکھتا ہے۔ اوّل تو وہ طلباء میں علم حاصل کرنے کا شوق ہی پیدا نہیں کر سکتے بلکہ اگر کسی طالب علم میں ایسا قُدرتی شوق ہوتا ہے تو وہ اس کو بھی فنا کر دیتے ہیں ان کے اثرات بد سے ذہین اور ہوشیار طالب علم کور ذوق بن جاتے ہیں اور

ان کی توجہ تحصیل علوم کی طرف سے ہٹ کر غیر ضروری اور نقصان دہ مسائل کی طرف منعطف ہونے لگتی ہے ؁

اس قومی نقصان کا ذمّہ دار موجودہ طرز تعلیم ہے۔ ورنہ پہلے زمانے میں بھی یہی لڑکے تھے بلکہ آجکل تعلیم حاصلِ کرنے میں پہلے سے بہت زیادہ آسانیاں پیدا ہوگئی ہیں۔ پھر بھی کوئی ایک مدرسہ ایسے طالب علم پیدا نہیں کرسکتا جن کا پہلے زمانے کے باکمال لوگوں سے مقابلہ کیا جاسکے۔ اگر ہماری ابتدائی تعلیم نہایت قابل اور ہوشیار معلّمین کے سپرد کی جائے تو یقیناً ع "جمعہ بمکتب آورد طفل گریزپائے را" کا سماں پیدا ہوجائے، بہت سے کور ذوق طلباءُ لوہے کے چنے" بڑے شوق سے چبایا کریں اور اُستاد کی علمی قابلیّت اور عالمانہ ذہنیت ان پر وہ اثر کرے جو پارس لوہے پر کرتا ہے ؁

اس بحث سے ہمارا مدعا یہ ہے کہ ہمارے اساتذہ ہی مضمون نویسی اور انشاپردازی سے کوئی خاص دلچسپی نہیں لیتے گویا ان کی اپنی ناقص تعلیم انشاپردازی کے صحیح مذاق سے ناآشنا ہوتی ہے اِس لئے وہ اپنے شاگردوں میں انشاپردازی کا شوق کیونکر پیدا کرسکتے ہیں غالباً یہی وجہ ہے کہ ہماری زبان میں انشاپردازی کو فن کے بجائے محض

قدرتی عطیہ کہا جاتا ہے ۔ اور یہ غلط بھی نہیں کیونکہ جو لوگ اس فن کو حاصل کرتے ہیں اس میں اُستادوں کی قابلیت اور تربیت کو ذرہ برابر دخل نہیں ہوتا۔ بلکہ ان کا دلی شوق اور ذاتی مشق ان کو انشاپرداز بناتی ہے ۔

شمس العلما مولانا آزاد مرحوم اُردو کے بہترین انشاپرداز تھے، وہ انشاپردازی کے متعلق اپنے ایک شاگرد کو لکھتے ہیں "یہ ایک ایسی چیز ہے کہ اگر باپ چاہے بیٹے کو سکھاؤں اور اس میں مادہ نہ ہو تو کچھ بتا نہیں سکتا۔ اور اگر اس میں مادۂ قابل موجود ہے تو کتابیں بھی اُستاد کافی ہیں میرے اوپر جو کچھ تمہیں خیال ہے یہ فقط بھرم ہی بھرم ہے۔ میں نے اس کام کی کبھی اصلاح نہیں لی، نہ عربی میں نہ فارسی میں نہ اُردو میں۔ ہاں اچھے اچھے صاحب کمالوں کے کلام دیکھتا رہا۔ ان کے دیکھتے دیکھتے ایک رنگ ایسا بے رنگ پیدا ہو گیا کہ سب سے الگ ہے اب چاہے کوئی اسے بے رنگ کہے چاہے خوش رنگ ۔ بس یہی طریقہ اُستادی شاگردی کا ہے۔ اگر چند روز پہلے تم یہاں آؤ پھر اپنے سامنے چند کاغذ میں تم سے لکھواؤں اور تمہارے سامنے خود بناؤں۔ شائد اس کا اثر کچھ بہتر ہو"۔

انشاپردازی کی ابتدائی مشق	ابتدائی اور ثانوی تعلیم کے زمانے

میں ہر طالب علم کو امتحان میں کامیاب ہونے کی غرض سے
اُردو میں مضمون لکھنے کی کچھ نہ کچھ مشق ضرور کرنی پڑتی ہے۔
طلبا کو عام طور پر مضمون لکھتے وقت بڑی دقتوں کا سامنا ہوتا
ہے۔ اکثر طالب علم دوسروں کے لکھے ہوئے مضامین سے
استفادہ کرتے ہیں۔ کبھی ماسٹر صاحب اپنی قابلیت کے
مطابق خود ہی انٹ شنٹ لکھوا کر خانہ پُری کر دیتے ہیں۔
بعض ذہین طالب علم اکثر ضروری مضمون کتابوں میں سے
زبانی یاد کر لیتے ہیں۔ ممکن ہے ان طریقوں سے امتحان میں
کامیاب ہونے میں کچھ مدد مل جائے۔ لیکن اس طرح سے
انشا پردازی کا اصل مطلب فوت ہو جاتا ہے۔ ایسا کرنے
سے اوّل تو قوت متخیلہ نشو و نما نہیں پاتی" دوسرے اپنے خیالات
کی پرواز بھی بلند نہیں ہو سکتی۔ میرے نزدیک
مضمون نویسی سکھانے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اُستاد جس
موضوع پر مضمون لکھوانا چاہے۔ پہلے خود اس کا اچھی طرح
مطالعہ کرے۔ ضروری نکات ترتیب وار اپنے ذہن میں
یا کسی کاغذ کے پُرزے پر محفوظ رکھے۔ پھر اپنے طلبائے کے
سامنے نہایت دلچسپ انداز میں ہر نکتہ پر بحث کرے اس
طریق سے چھوٹی چھوٹی جماعتوں کے طالب علم بھی ہر مضمون
کو اچھی طرح سمجھ کر اپنے خیالات کا اظہار کامیابی کے ساتھ

کر سکتے ہیں ؛

اس کے علاوہ انشاپردازی سیکھنے اور اس کے شوق کو ترقی دینے کے لئے ضروری ہے کہ وسیع مطالعہ کیا جائے۔ بلند پایہ مصنّفین کے عمدہ مضامین، ان کا دلنشین اندازبیان، برجستہ محاورات اور دلپذیر طرز تحریر کو اپنے دماغ میں محفوظ رکھنے سے بھی خاطرخواہ فائدہ ہوسکتا ہے۔ اس فن کو حاصل کرنیکا ایک طریقہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اگر کسی انشاپرداز کا کوئی مضمون پسند آئے تو پہلے اس کو اچھی طرح ذہن نشین کیا جائے پھر اس کو دل ہی دل میں دہرایا جائے۔ اس کے بعد اس کو یا اس قسم کے دوسرے مضمون کو اپنے الفاظ میں لکھا جائے۔ اس کے ساتھ یہ بھی کوشش کی جائے کہ خیالات کی ترتیب اور عبارت کا زور نمونے کے مضمون سے بہتر رہے اور وہ نکات جو کسی وجہ سے پہلے مضمون میں نظرانداز ہوگئے ہیں اپنے مضمون میں آجائیں۔ اگر اس قسم کی مشق کچھ عرصے تک جاری رہے تو انشاپردازی بہت آسانی سے آسکتی ہے۔ اس پر اگر کوئی اچھا رہنما بھی مل جائے تو سبحان اللہ ؛

ابتدائی مشکلات عام طور پر بتدی انشاپردازی اور مضمون نویسی کا نام سُن کر گھبراتے ہیں اور بہت جلد فیصلہ کرلیتے ہیں کہ یہ بات ہمارے بس کی نہیں۔ اس فرض سے تو زبان دان

اور اہل زبان یا نہایت قابل آدمی ہی عہدہ برآ ہو سکتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انشا پردازی بہت مشکل فن ہے لیکن اتنا مشکل نہیں جتنا عام طور پر خیال کیا جاتا ہے۔ اس غلط احساس کے پیدا ہونے کی اصلی وجہ یہ ہے کہ ابتداء میں طلبا کی قوّت متخیّلہ کو کام میں نہیں لایا جاتا۔ عام طور پر اساتذہ ان کو مضامین بھی خود ہی تیار کر کے لکھوا دیتے ہیں۔ اس طرح سے طلبا کی قوّت متخیّلہ کو آزادانہ کام کرنے کا موقعہ نہیں ملتا۔ اور نتیجہ کے طور پر وہ بیکار ہو جاتی ہے۔ مضمون نویسی کے لئے سب سے ضروری یہ بات ہے کہ انسان سوچ سکتا ہو۔ اور جس زبان میں وہ مضمون لکھنا چاہے۔ اس کو اسی زبان میں سوچنے کی عادت ہو۔ نیز اس کی قوت متخیّلہ اس قدر تربیت یافتہ ہو کہ جس موضوع پر غور کیا جائے اس میں تسلسل اور تسلسل میں باقاعدگی قائم رہے اگر کوئی شخص اپنے خیالات کو قلمبند کرنے کی کوشش کرے لیکن خیالات میں تسلسل اور باقاعدگی نہ ہو تو اس کی تحریر دیوانے کی بڑ سے زیادہ وقعت نہیں رکھے گی۔ برخلاف اس کے اگر کوئی تحریر مسلسل، اس کے نتائج صحیح، اور طریق استدلال درست ہونگے تو کوئی وجہ نہیں کہ اس تحریر کو معقول تحریر نہ کہا جائے اور نا ممکن ہے کہ پڑھنے والا اسے کچھ نہ کچھ اہمیت نہ دے۔ یاد رہے جن مضامین میں تسلسل

اور استدلال کا خیال رکھا جاتا ہے وہ ضرور کچھ نہ کچھ قعت رکھتے ہیں۔ اس منزل سے آگے بڑھ کر زبان اور زور بیان کا درجہ ہے۔ اگر کوئی انشا پرداز تسلسل۔ استدلال زبان اور زور بیان وغیرہ کا باقاعدہ خیال رکھتا ہے تو اس کے مضامین کی شان اور بھی دو بالا ہو جاتی ہے ؞

وسیع مطالعہ دماغ میں نئے خیالات اور ان میں تسلسل پیدا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ مطالعہ کو زیادہ سے زیادہ وسعت دی جائے۔ لیکن ہمارے نام نہاد انشا پرداز عام طور پر مطالعہ سے جی چراتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کے مضامین نہ تو واقفیت عامہ میں اضافہ کرتے ہیں اور نہ خیالات کی گتھیاں سلجھا کر روحانی لذتیں حاصل کرنے کا سامان بہم پہنچاتے ہیں۔ کم مطالعہ کی وجہ سے ان کے خیالات پست اور تاثرات عامیانہ صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ انشا پرداز کے لئے بالغ نظر اور نکتہ رس ہونا نہایت ضروری ہے اور یہ خصوصیات محض وسیع مطالعہ ہی سے پیدا ہوتی ہیں۔ اس لئے مطالعہ کا شوق انشا پردازی کی جان ہے ؞

روحانی اور استفادی نقطۂ نظر آجکل "اتنی سی بات تھی جسے افسانہ کر دیا" کو بہت بڑا کمال سمجھتے ہیں۔ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ فنّ انشا پردازی کا یہ بھی ایک دلچسپ شعبہ ہے۔

اور اس کے مطالعہ سے ایک قسم کی رُوحانی مسرّت ضرور حاصل ہوتی ہے۔ لیکن ایسا لٹریچر محض دفع الوقتی اور اوقات گزاری کا کام دیتا ہے اور کوئی شخص اس سے حقیقی فائدہ نہیں اُٹھا سکتا۔ اگرچہ آجکل اس قسم کے لٹریچر کو بہت اہمیت حاصل ہے لیکن نہ تو اس سے ہمارے لٹریچر میں کوئی معقول اضافہ ہوتا ہے اور نہ کسی کو کوئی علمی یا عملی فائدہ پہنچتا ہے۔ بعض انشا پردازوں کا خیال ہے کہ صحیح معنوں میں "ادب" اسی تحریر کو کہا جا سکتا ہے جس سے محض رُوحانی لطف حاصل ہوتا ہے۔ میرے نزدیک ایسی انشا پردازی قطعی لاحاصل ہے۔ جس میں لفاظی ہی لفاظی ہو یا جو کچھ بیان کیا جائے اسکا ہماری عملی دُنیا سے کوئی تعلق نہ ہو۔ مضامین وہی اچھے کہلائے جا سکتے ہیں جن کو پڑھ کر کوئی مفید مطلب اور نئی بات حاصل ہو اور اس کے ساتھ ساتھ ادبیت کا رنگ اور لطف بھی دست و گریبان رہے۔ ہمارے مُلک میں اسوقت ایسے انشا پرداز کافی سے زیادہ موجود ہیں جو محض دلچسپ ادبی مضامین لکھنے میں کمال رکھتے ہیں۔ یقیناً وہ اپنی مخصوص انشا پردازی کی بدولت قدر کی نگاہوں سے دیکھے جاتے ہیں مگر افسوس یہ ہے کہ ان کی تحریریں ادب کی کوئی حقیقی خدمت انجام نہیں دیتیں۔ اس صنف ادب میں سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ

کسی مضمون کو ایک مرتبہ پڑھنے کے بعد دوبارہ پڑھنے میں کوئی خاص لطف نہیں آتا۔ لیکن وہ مضامین جو وسیع مطالعہ اور گہری تحقیقات کا نتیجہ ہوتے ہیں ان کی دلچسپی ہمیشہ ہمیشہ قائم رہتی ہے۔ بلکہ ان کو ہر بار پڑھنے سے پہلے سے بھی زیادہ رُوحانی مسرت اور دلچسپی حاصل ہوتی ہے۔

ضروری نکات جب کوئی انشا پرداز مضمون لکھنے کے لئے بیٹھتا ہے تو وہ یقیناً خالی الذہن نہیں ہوتا۔ مضمون شروع کرنے سے پہلے کچھ نہ کچھ خیالات اس کے دل و دماغ پر ضرور محیط ہوتے ہیں۔ جن کو وہ احاطۂ تحریر میں لانے کی کوشش کرتا ہے۔ شروع شروع میں مضمون لکھنے سے پہلے ان خیالات کے متعلق کچھ مختصر حوالہ جات لکھ کر سامنے رکھ لئے جاتے ہیں۔ بعض محتاط انشا پرداز اکثر اوقات ان نکات کو ایک خاص ترتیب بھی دے لیتے ہیں۔ اس مشکل مرحلے کو طے کرنے کے بعد وہ ہر نکتہ کو اپنی مخصوص زبان اور خاص انداز بیان میں قلم کی وساطت سے کاغذ کے سپرد کرتے چلے جاتے ہیں۔ انشا پردازی کے نوآموز اگر اس طریق کار کو کام میں لائیں تو ان کو مضمون نگاری میں بہت آسانیاں حاصل ہو سکتی ہیں۔

ابتدائے مشق میں اس قسم کی تدابیر پر عمل پیرا ہونا نہایت ضروری ہے لیکن مشق پختہ ہونے کے بعد یہ مشکلیں خود بخود

آسان ہو جاتی ہیں۔ ذرا سا دماغ پر دباؤ ڈالنے کی دیر ہوتی ہے کہ خیالات دست بستہ سامنے حاضر ہو جاتے ہیں اور بغیر کسی خاص کوشش کے خود بخود مسلسل قلمبند ہوتے چلے جاتے ہیں لیکن پھر بھی انشا پرداز کو لازم ہے کہ اپنے خیالات کے لشکر کو منظم اور با ترتیب جنبش دینے کے لئے بدنظمی اور انحراف کا موقعہ نہ دے۔ جس طرف بڑھے اس طرف کا نقشہ پہلے سے نظروں کے سامنے ہوتا کہ عین وقت پر کسی پہلو پر غور کرنے میں وقت ضائع نہ ہونے پائے۔ اور یہ خرابی بھی واقع نہ ہو کہ جس ارادے سے خیالات کا لشکر ترتیب دیا گیا تھا۔ وہ تجاویز اور تدابیر کی افترا تفری میں منتشر ہو جائے اور غیر منظم لشکر کی ریل پیل میں خود کہیں کا کہیں جا پڑے، ظاہر ہے یہ کامیابی اسی صورت میں ہو سکتی ہے جب ایک باکمال سپہ سالار کی طرح میدان اور فوج کا پورا نقشہ اس کے ذہن میں پہلے سے محفوظ ہو۔ اور وہ سکون قلب کے ساتھ دائیں بائیں سے خبردار باقاعدہ پیش قدمی کرتا چلا جائے۔

تمہید و اختتام اس ضروری بات سے تقریباً ہر مضمون نگار واقف ہے کہ کسی مضمون کے آغاز اور اختتام میں بہت فرق ہوتا ہے یعنی جو پیراگراف کسی مضمون کے شروع میں تمہید کا کام دے سکتا ہے وہ آخری اور اختتامی پیراگراف کا

کام کبھی نہیں دے سکتا۔ اسی طرح اختتامی پیراگراف بھی تمہیدی پیراگراف کا بدل نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔

عام طور پر تمہید میں مضمون کی عمومی کیفیت سے بحث کی جاتی ہے۔ بیچ کے حصّوں میں اس کے مختلف پہلوؤں پر سیر حاصل بحث کرتے ہیں۔ اور اسی طرح بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ اختتام پر کبھی مضمون کو کسی خاص انجام کی طرف ڈھال کر نصیحت آمیز پُرزور فقروں پر ختم کر دیتے ہیں۔ بعض اوقات آخری پیراگراف میں نہایت مختصر جامع اور زور دار الفاظ میں مضمون کے تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے مضمون کا خاتمہ کرتے ہیں آجکل یہی طریقہ زیادہ مطبوع اور مرغوب ہے۔ کیونکہ اس طرح مضمون ختم کرنے سے مضمون کا سارا خاکہ دوبارہ ذہن میں پھر جاتا ہے۔ جس سے خاطر خواہ اثر باقی رہتا ہے۔

تجربہ بتاتا ہے کہ مضمون کو ختم کرنے میں اتنی دقتیں پیدا نہیں ہوتیں جتنی کسی مضمون کی تمہید میں پیش آتی ہیں۔ بعض اوقات کئی کئی گھنٹے اس فکر میں ضائع ہو جاتے ہیں کہ مضمون کو کس طریقے سے شروع کیا جائے۔ یہ مشکل عام طور پر ایسے انشا پردازوں کو زیادہ پریشان کرتی ہے جن کے پاس خیالات اور ضروری مواد کا ذخیرہ کم ہوتا ہے۔ اس دِقّت کا بہترین حل یہ ہے کہ زیر بحث موضوع کے متعلق کچھ نوٹ لکھ لئے جائیں۔ پھر ان کو

ایک خاص ترتیب سے پھیلا کر اپنے الفاظ میں ان پر بے تکلّف بحث شروع کی جائے۔ اور آخر میں ان سب کو سمیٹتے ہوئے مضمون ختم کر دیا جائے ⁂

بعض نو آموز مضمون نگار اپنے موضوع کی تمہید اس قدر لمبی چوڑی لکھ جاتے ہیں کہ اصل مضمون کا اس سے کوئی معقول تعلّق باقی نہیں رہتا۔ پختہ مشق انشا پرداز نہایت شاندار انداز سے اپنے مضمون کو اُٹھاتے ہیں اور تمہید پر اپنی طبیعت اور قابلیّت کا پورا زور صرف کرتے ہیں۔ لیکن آجکل انشا پردازی میں یہ طریقہ بھی رائج ہے کہ مضمون کو بلا تکلف شروع کر دیتے ہیں۔ اور تمہید پر زیادہ وقت ضائع نہیں کرتے۔ اس طریقے پر عمل کرنے سے وقت ضرور بچتا ہے۔ لیکن مضمون میں وہ لُطف اور زور پیدا نہیں ہوتا جو عمدہ اور زور دار تمہید سے مخصوص ہے۔ میرا خیال یہ ہے کہ مضمون نگاری میں تمہید کو بہت کچھ اہمیت دینی چاہیئے۔ اور اگر اس اہم فرض پر تھوڑا سا وقت بھی ضائع ہو جائے تو اس کی پروا نہیں کرنی چاہیئے کیونکہ عام طور پر اچھی تمہید مضمون کی اہمیت میں چار چاند لگا دیتی ہے۔ اور اس کے اثر سے پڑھنے والا کسی نہ کسی حد تک ضرور مرعوب ہو جاتا ہے۔ جو لوگ انسانی جذبات اور دماغی کیفیات سے واقف ہیں وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ پہلا اور

آخری اثر زندگی کے ہر شعبے میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔
بعینہٖ یہی کیفیت مضامین کی ہے۔ اگر ان کی ابتدا اور انتہا
اچھی ہو تو پڑھنے والے کا دل ان سے ضرور متاثر ہوتا ہے۔

طویل مضامین

اکثر انشا پردازوں کو طویل مضمون لکھنے کا بہت
شوق ہوتا ہے۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ طویل مضمون لکھنا قابلیت
کی دلیل ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ لمبے چوڑے مضامین
لکھنا واقعی قابلیت کا کام ہے۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ انشاپرداز
طویل مضامین میں عموماً دلچسپی اور اپنے زور بیان کو بھی قائم
رکھ سکتا ہے یا نہیں۔ اگر وہ ان خصوصیات پر قادر نہیں
تو مضمون کی بیجا طوالت اس کی دلچسپی کو بدمزگی میں تبدیل
کر دیتی ہے مضمون کی خوبی یہ ہے کہ طرز بیان اور انداز بحث
غیر دلچسپ موضوع کو بھی دلچسپ بنا دے۔ اور اس کے
ساتھ صداقت اور حقیقت نمائی کا دامن بھی ہاتھ سے چھوٹنے
پائے۔

طویل مضامین لکھنے کے شوق میں ہمارے نوآموز انشا پرداز
بے معنی اور غیر متعلق مسائل کو بھی معرض بحث میں لے آتے
ہیں۔ جس سے مضمون کی اہمیت ہی کو نقصان نہیں پہنچتا بلکہ
ان کے فن انشا پردازی پر بھی حرف آتا ہے۔ ہمیشہ یاد
رکھنا چاہیئے کہ ایک اچھا اور مطلب خیز مضمون چاہے وہ

کتنا ہی چھوٹا کیوں نہ ہو ایک طویل مگر بے معنی مضمون سے یقیناً بہتر ہوتا ہے۔ اِس لئے جہاں تک ممکن ہو سکے انشا پرداز کو غیر ضروری طوالت سے گریز کرنا چاہئیے۔ کیونکہ غیر ضروری طوالت اس کے فن کو مزید امتحان میں ڈال دیتی ہے۔

امتحانات میں طلباء سے مضمون لکھوا کر اس بات کا اندازہ کیا جاتا ہے کہ امیدوار معینہ وقت میں صحیح طریقے اور فصیح زبان میں اپنے خیالات کا اظہار کر سکتا ہے یا نہیں۔ نیز اس کی وسعت مطالعہ، بلندئ خیالات، قُدرت بیان ذخیرۂ الفاظ اور معلومات عامہ وغیرہ کس پائے کی ہیں۔ اگر کسی امیدوار کا مضمون اس معیار پر پُورا نہیں اُترتا تو سمجھ لیا جاتا ہے کہ وہ فن انشاپردازی سے نابلد ہے۔ امتحانات میں ہمارے اکثر طلبا اپنی خامیوں کو طوالت کے پردے سے ڈھانکنا چاہتے ہیں لیکن ان کا مضمون جس قدر زیادہ پھیلتا جاتا ہے۔ اسی قدر نقصانات کے امکانات بڑھتے جاتے ہیں۔ ایسے مواقع پر طوالت کی نسبت اختصار کا پہلو اختیار کرنے سے زیادہ فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ انسب یہ ہے کہ جو کچھ لکھا جائے وہ نہایت وثوق اور اطمینان قلب سے لکھا جائے کیونکہ اس طرز عمل سے نقصان اور صحیح راستے سے انحراف کی صورتیں بہت کم پیدا ہوتی ہیں۔

پیراگراف اور عنوان

تسلسل اور ترتیب کی اہمیت سمجھ لینے کے بعد لازم آتا ہے کہ ہر مبحث اور خیال کو الگ الگ پیراگراف میں لکھا جائے۔ تاکہ زیر بحث موضوع کے مختلف پہلو ایک دوسرے سے علیحدہ علیحدہ رہیں۔ اگر یہ احتیاط نہ برتی جائے تو پُورا مضمون ایک مسلسل تحریر بن جاتی ہے۔ جس کو دیکھتے ہی پڑھنے والا اُکتا جاتا ہے۔ پیراگراف مرتب کرنے کا سب سے بڑا فائدہ یہی ہے کہ ایک طرف مضمون کے مختلف پہلو نمایاں رہتے ہیں اور دوسری جانب ظاہری جاذبیت بڑھ جاتی ہے۔ اس لئے نہایت ضروری ہے کہ ہر بحث کے لئے ایک الگ پیراگراف قائم کر دیا جائے تاکہ مختلف پہلو ایک دوسرے سے خلط ملط نہ ہونے پائیں۔ اور پڑھنے والے کو مضمون کا ہر پہلو نمایاں نظر آئے۔ نیز ان تمام پیراگرافوں کا تسلسل خیالات کو ریلتا اور دھکیلتا ہوا انشا پرداز کے مقصد اصلی کی طرف لے جائے۔ اس ترکیب سے نہ صرف موضوع کی خشکی اور بدمزگی دُور ہوتی ہے۔ بلکہ پڑھنے والا خیالات کی رو میں بغیر اُکتائے بہتا چلا جاتا ہے اور آخرکار اس منزل پر پہنچ کر دم لیتا ہے جہاں انشا پرداز اسے پہنچانا چاہتا ہے۔

اگر ہر پیراگراف کا کوئی دلچسپ اور جاذب عنوان

بھی قائم کر دیا جائے تو مضمون کی دلچسپی میں اور بھی زیادہ اضافہ ہو سکتا ہے۔ عنوانات قائم کرنے کا طریقہ خشک اور طویل مضامین میں بہت کافی دلچسپی پیدا کر سکتا ہے۔ لیکن عنوان قائم کرنا بڑا مشکل کام ہے۔ اس کے لئے خاص تجربے اور ذہانت کی ضرورت ہے۔ ویسے عنوان تو ہر شخص قائم کر سکتا ہے لیکن ان کی خوبی یہ ہونی چاہئے کہ عنوان پر نظر پڑتے ہی ان کی بحث کو پڑھنے کا شوق دل میں گُدگُدیاں لینے لگے۔ اور انسان ان سطور کو پڑھنے پر مجبور ہو جائے۔ ظاہر ہے یہ کام ہر کس و ناکس کا نہیں۔ کیونکہ چند لفظوں میں یہ خوبیاں پیدا کرنا بطور خود ایک فن کی حیثیت رکھتا ہے۔ جس پر ہر انشا پرداز دسترس نہیں رکھتا۔ لیکن اگر انسان کوشش کرے تو کیا حاصل نہیں ہو سکتا۔

امتحانی مضامین میں عنوان قائم کرنے سے بہت فائدے پہنچ سکتے ہیں مثلاً ممتحن کو ایک ہی نظر میں عنوان دیکھ کر اندازہ ہو جاتا ہے کہ ان کے تحت میں کس قسم کے خیالات کا اظہار کیا گیا ہے اور یہ کہ ہونہار انشا پرداز کے خیالات کس قدر وسیع اور وقیع ہیں۔ اس کے علاوہ جاذب اور دلچسپ عنوانات مضمون کے متعلق عمدہ رائے قائم کر دیتے ہیں جو زیادہ مارکس دینے کی پُر زور سفارش کرتے ہیں۔

زبان کی شان جس طرح مختلف قابلیّت کے لوگوں سے بات چیت کرتے وقت ان کی قابلیت اور علمیّت کو مدنظر رکھ کر گفتگو کی جاتی ہے۔ اسی طرح انشا پردازی کا کمال بھی یہی ہے کہ ہر موضوع کی اہمیّت کے مطابق زبان استعمال کی جائے۔ اور اس کے ساتھ یہ بھی خیال رہے کہ ہمارا مضمون کس قابلیّت کے لوگوں سے تعلق رکھتا ہے۔ بعض اوقات عبارت کو شاندار اور زور دار بنانے کے لئے خاص قسم کے الفاظ کی ضرورت پڑتی ہے اور کبھی نہایت نرم اور نازک الفاظ استعمال کر کے مقصد حاصل کیا جاتا ہے۔ برخلاف اس کے اگر ہر موضوع اور مبحث کے لئے ایک جیسی زبان سے کام لیا جائے تو خاطرخواہ اثر پیدا نہیں ہوتا۔ اِس لئے انشا پرداز کو لازم ہے کہ وہ اپنے موضوع کی اہمیّت کے مطابق الفاظ صرف کرے۔ اس سے نہ صرف مضمون کی دلچسپی اور شان بڑھتی ہے بلکہ انشا پرداز کے زورِ قلم کا بھی اندازہ ہوتا ہے ؂

نُکتہ چینی میں احتیاط ہر انشا پرداز کا اخلاقی فرض ہے کہ وہ کسی حال میں بھی بازاری اور سوقیانہ الفاظ اور محاورات کو ہرگز استعمال نہ کرے تاکہ اس کے مضمون میں ابتذال پیدا نہ ہونے پائے۔ عام طور پر نُکتہ چینی کرتے ہوئے بعض انشا پرداز بڑی غیر ذمہ داری کا ثبوت دیتے ہیں۔ اس قسم کی عادات ادب کے

سراسر خلاف ہیں۔ان سے محض اخلاقی معیار ہی پست نہیں ہوتا بلکہ مضمون کی تنقیدی حیثیت بھی متعصبانہ ہو جاتی ہے تنقیدی مضامین لکھتے وقت انشا پرداز کو اپنی طبیعت اور قلم پر قادر ہونا چاہیئے تاکہ پڑھنے والے کے دل میں یہ خیال نہ آئے کہ یہ مضمون کسی خاص جذبے کے ماتحت لکھا گیا ہے۔ ایسے مضامین میں زبان نہایت نرم اور ملائم ہونی چاہیئے۔ نیز اچھے اور بُرے دونو پہلوؤں پر روشنی ڈالنی چاہیئے تاکہ نقاد پر جانبداری کا الزام عائد نہ ہو۔

قابلیّت کا اظہار | اکثر انشا پردازوں کو عادت پڑ جاتی ہے کہ وہ ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر عربی فارسی کے مشکل الفاظ اپنی تحریروں میں صرف کرتے ہیں۔ اور سمجھتے ہیں کہ اس طرز تحریر سے ان کی قابلیت ٹپکتی ہے۔ یاد رہے غیر مانوس الفاظ چاہے وہ سنسکرت یا ہندی کے ہوں یا عربی فارسی کے ہر مضمون کی ادبی حیثیت کو گھٹا دیتے ہیں۔ پڑھنے والوں کو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی سخت یا ناگوار چیز بار بار ان کے کام و دہن میں اٹکتی ہے اور ادبی لطف کو بدمزہ کر دیتی ہے۔ انشا پرداز کی تعریف اور قابلیّت یہ ہے کہ وہ ادق سے ادق مضمون کو بھی ایسی سلیس اور صاف زبان میں لکھے جس سے پڑھنے والا یہ سمجھے کہ جو کچھ وہ پڑھ رہا ہے وہ اس کے اپنے دل کی آواز ہے۔ گویا روانی کا

یہ عالم ہو کہ کہیں بھی کسی قسم کی رُکاوٹ پیش نہ آئے۔ کہ اس سے طبیعت بدمزہ ہو کر دلچسپی کا سلسلہ منقطع ہو جاتا ہے۔ اسکے علاوہ انشا پرداز کو صحیح اور سلیس مفرد و مرکب فقرے بنانے میں بھی کافی دستگاہ ہونی ضروری ہے۔ پیچیدہ اور غیر مانوس فقرے عام طور پر طبیعت پر بار گزرتے ہیں اور عبارت کے لُطف اور روانی کو خراب کر دیتے ہیں۔ اس کمال کو حاصل کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ انشا پرداز اپنے مطالعہ کو وسعت دے اور الفاظ و محاورات کے ذخیرے میں اضافہ کرنے کی کوشش ہمیشہ جاری رکھے۔ بس یہی امور انشا پرداز کے کمالات اور قابلیت کی اصلی نشانیاں ہیں "

ضرب الامثال اور اشعار بعض انشا پردازوں کو عادت ہوتی ہے کہ ہر موقعہ پر کوئی نہ کوئی ضرب المثل۔ شعر یا مصرعہ ضرور چسپاں کر دیتے ہیں۔ اور اس کو اپنی قابلیت اور حاضر دماغی کی نشانی سمجھتے ہیں۔ اس طرز انشا پردازی کے رواج کی وجہ یہ ہے کہ یہ طریقہ قدیم زمانے میں بہت مطبوع و مرغوب تھا اور یہ وہی قدیمی اثر ہے جو اب تک چلا آتا ہے۔ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ اچھے شعر واقعی اچھے ہیں اور موقعہ کی ضرب المثلیں یقیناً بھلی معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن ہر دو چار سطروں کے بعد ایک شعر یا کسی ضرب المثل کو چسپان کرنا نہ تحریر میں اچھا لگتا

ہے اور نہ تقریر میں۔ ہم عرض کر چکے ہیں کہ یہ طریقہ تحریر و تقریر بہت دقیانوسی ہوگیا ہے۔ اور اب اس کو کوئی بھی پسند نہیں کرتا۔ اس لئے اشعار اور ضرب الامثال کو بہت کم مواقع پر صرف کرنا چاہئیے ۔ وہ زمانہ گیا جب ہر بات کی سند کسی محاورے یا مشہور شعر سے طلب کی جاتی تھی، ہاں اختلافی امور میں یہ طریقہ اب بھی مستحسن خیال کیا جاتا ہے۔ ہر بات پر شعر پڑھنے یا محاورہ بولنے سے یہ تو ضرور معلوم ہوتا ہے کہ ماشا اللہ پڑھنے والے کو بہت سے برمحل اشعار اور ضرب الامثال وغیرہ یاد ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ کسی قدر اوچھے پن کا بھی اظہار ہوتا ہے جو موجودہ تہذیب میں اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا ہاں کبھی کبھی اور کہیں کہیں کسی عمدہ شعر کو برمحل دہرانا گفتگو اور تحریر کے لطف کو ضرور دوبالا کر دیتا ہے۔ لیکن اسکی عمومیت سے بے لطفی اور بدمزگی پیدا ہوتی ہے ۔

تاریخی واقعات اور کہانیاں

بعض نو آموز انشا پرداز اپنے مضامین میں تاریخی واقعات کو کثرت سے نقل کرنے کے عادی ہوتے ہیں یا اکثر مواقع پر کوئی اچھی سی کہانی بیان کر دیتے ہیں۔ میرے نزدیک انشا پردازی میں یہ طریقہ بھی محمود نہیں، اس طرح سے مضمون غیر معمولی طور پر ڈھیل تو ضرور ہو جاتا ہے اور بعض اوقات دلچسپ بھی بن جاتا ہے۔ لیکن یہ اسلوب

بیان بہ اعتبار فن نامرغوب ہے ۔ انشاپرداز کا فرض اصلی تو یہ ہے کہ وہ اپنے موضوع کے حقیقی مطالب سے بحث کرے ، اور جا و بیجا تاریخی واقعات اور حوالہ جات کو بیچ میں نہ آنے دے۔ انشاپرداز کے لئے تاریخ دانی واقعی بڑی مفید ہے ۔ لیکن اسکے فن کا کمال اسبات کا متقاضی ہے کہ وہ اس کی روشنی سے اپنے مطالب کو چار چاند لگائے ہاں اگر کوئی خاص واقعہ مضمون کی غیر معمولی دلچسپی کا باعث ہو سکتا ہے تو اس کے بیان کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ۔ لیکن علمی اور ادبی مضامین کو تاریخی یا اخلاقی کہانیوں سے آراستہ کرنا کسی طرح قابل تحسین نہیں ہو سکتا ،،

اگر امتحانات میں کوئی امیدوار کسی موضوع پر آسانی سے سیر حاصل بحث نہ کر سکے ۔ نیز غور و فکر وغیرہ کے لئے اس کے پاس بہت کم وقت ہو تو پھر مجبوراً ایسی صورت میں وہ صفحات کو کالا کرنے کے لئے تاریخی واقعات اور دلچسپ قصے کہانیوں سے مناسب امداد لے کر اپنی کمزوریوں اور خامیوں کی کسی نہ کسی حد تک پردہ پوشی ضرور کر سکتا ہے ،،

یہاں اس بات کو بیان کر دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مضامین میں جب کبھی حوالجات اور واقعات بیان کرنے کی نوبت آئے تو انشاپرداز کو اپنے ملک کی مثالیں پیش کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے ۔ اس سے کئی ایک فائدے متصور

ہیں۔ اوّل یہ کہ ہر شخص اپنے مُلکی معاملات میں زیادہ دلچسپی لیتا ہے۔ دوسرے غیر مُلکی عظمت کے کارنامے ہمارے مُلک کے وقار کو ٹھیس نہیں لگاتے تیسرے اپنے مُلک کی خُوبیوں کی شُہرت بڑھتی اور کمزوریوں کی اصلاح ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ یہ بات کچھ دل کو بھی نہیں لگتی کہ اپنی اچھی یا بُری باتوں کو تو نظر انداز کر دیا جائے اور پرائے مُلکوں کی خُوبیوں اور بُرائیوں سے بحث کی جائے۔ ممکن ہے اس تجویز سے بعض لوگوں کو یہ شکایت پیدا ہو کہ ہمارا لٹریچر بہت محدود ہے۔ بے شک ہمارا لٹریچر محدود سہی۔ لیکن جس قدر بھی ہے اگر اسی پر عبور حاصل کر لیا جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ بہترین اقوال و اسناد مہیّا نہ ہو سکیں۔ مگر کیا کیا جائے ہم لوگوں پر مغربی لٹریچر کا اس قدر غلبہ ہو گیا ہے کہ ہمارا اپنا لٹریچر مغربی لٹریچر کا چربہ بن رہا ہے۔ بہرحال ہمارے انشا پردازوں کو اس طرف ضرور متوجّہ ہونا چاہیئے تاکہ مشرقی لٹریچر کی خصوصیات مغربی لٹریچر کے سامنے ماند نہ پڑ جائیں۔

ناصحانہ طرزِ تحریر

فطرت انسانی بھی کچھ عجیب واقعہ ہوئی ہے کہ عام طور پر نصیحت کو قبول نہیں کرتی۔ اکثر اوقات پند و نصیحت کا بعض طبیعتوں پر اُلٹا اثر پڑتا ہے۔ انسان کی طبیعت کا اچھی طرح مطالعہ کرنے کے بعد ماہرینِ ادب نے فیصلہ کیا ہے کہ انشا پرداز

کو کبھی ناصحانہ انداز اختیار نہیں کرنا چاہیئے اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ادب رُوحانی تسکین بخشتا ہے اور نصیحتیں انسان کی طبیعت کو منغّض کر دیتی ہیں بعض یہ کہتے ہیں کہ دُنیا میں ایک سے ایک زیادہ عقلمند اور تجربہ کار موجود ہے ۔لہٰذا ہر کس وناکس کا نصیحتیں کرنا مناسب نہیں ۔ واقعہ یہ ہے کہ ناصح بننا بہت ہی سن رسیدہ تجربہ کار اور عقلمند آدمی کو زیب دیتا ہے ۔اس لئے انشا پرداز کو اس سے احتراز کرنا چاہیئے ۔ ہمارے ادب میں ناصحانہ طرز تحریر بہت ہی کثرت سے رائج ہے ۔ اور اسکی وجہ یہ ہے کہ بچپن میں جو انشا پردازی کے نمونے یا مضامین ہمارے سامنے پیش کئے جاتے ہیں ان کا انداز عموماً ناصحانہ ہوتا ہے ۔جس وقت انشا پردازی کے جوہر چمکانے کا وقت آتا ہے اس وقت ہمارے معلّمین بھی اس معاملے میں اپنی ہدایات سے کوئی فائدہ نہیں پہنچاتے ۔حقیقتاً وہ اپنی ناصحانہ اُفتادِ طبع سے مجبور ہوتے ہیں ۔ اِس لئے یہ اثر آخر عمر تک ہمارے ہونہار انشا پردازوں کا ساتھ نہیں چھوڑتا ۔ اور ان کی انشا پردازی کے نتائج میں ہمیشہ اپنی جھلکیاں دکھاتا رہتا ہے ۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ پند و نصیحت کی تلخیوں سے اپنے قلم کو آلودہ اور قارئین کی طبیعت کو مکدر نہ کیا جائے ۔ ادب کا حقیقی منشا تو یہ ہے کہ وہ زندگی کی تلخیوں کو بھلا کر ہمیں ایسے خوشگوار

ماحول میں پہنچا دے جہاں ہم رُوحانی لذّتوں اور جمالیاتی کیفیتوں سے سرمست ہو جائیں ۔

صفائی | انشا پردازی میں صفائی کو بھی بہت اہمیت حاصل ہے۔ گویا انشا پرداز کے لئے صفائی کی اسی قدر ضرورت ہے۔ جس قدر عشق صادق میں صفائی باطن کی۔ عمدہ اور صاف کاغذ اچھا قلم اور دوات، سُتھرا ماحول، پاک زبان۔ پاکیزہ خیالات۔ خوشنما خط، اور صفائی قلب انشا پرداز کی عام اور ناگزیر ضرورتیں ہیں۔ جن کی نگہداری اور فراہمی ہر معقول انشا پرداز کا اوّلین فرض ہے ۔

"سب جانتے ہیں مُلک الشعرا مرزا رفیع سوداشاہ عالم بادشاہ کے اُستاد تھے۔ ایک دن بادشاہ نے کسی غزل کیلئے تقاضا کیا کہ ابھی تک اصلاح نہیں ہوئی۔ مرزا صاحب نے عُذر کیا۔ بادشاہ نے فرمایا۔ ارے بھئی مرزا تم کتنی غزلیں روز کہہ لیتے ہو؟ مرزا صاحب نے کہا پیرو مرشد جب طبیعت حاضر ہوتی ہے تو یہی دو چار شعر کہہ لیتا ہوں۔ بادشاہ نے فرمایا۔ بھئی ہم تو پاخانہ میں بیٹھے بیٹھے چار چار غزلیں کہہ ڈالتے ہیں۔ اس پر مرزا صاحب نے ہاتھ باندھ کر عرض کیا حضور ان میں سے بُو بھی ویسی ہی آتی ہے" ۔

ممکن ہے بعض انشا پردازوں کے لئے انشا پردازی کے

یہ سامان غیر ضروری ہوں۔ لیکن تجربہ سے ثابت ہے کہ اچھے ماحول اور عمدہ سامان کا طبیعت پر کچھ اچھا ہی اثر پڑتا ہے میرا خیال ہے کہ یہ سامان انشا پرداز کے لئے یکسوئی خیال اور اطمینان قلب مہیا کرنے میں اندازے سے زیادہ مددگار ثابت ہوتا ہے۔

آخری مگر ضروری بات

مضمون لکھنے کے بعد اس کو دوبارہ دیکھنا بیحد ضروری ہے۔ میرے نزدیک نظر ثانی انشا پردازی کی جان ہے۔ نظر ثانی کے عام فائدے یہ ہیں۔ کہ اگر مضمون میں کوئی غلطی یا سُقم باقی رہ جائے تو وہ نظر ثانی میں درست ہو جاتا ہے۔ اکثر دیکھنے میں آیا ہے خیالات کی رو میں بعض غیر ضروری باتیں بیچ میں آجاتی ہیں یا کوئی ضروری نکتہ چھوٹ جاتا ہے بعض اوقات کوئی خاص لفظ یا فقرہ یا زبان پر چڑھا ہوا مخصوص محاورہ یا جُملہ بار بار استعمال ہو جاتا ہے۔ اسی طرح بعض مطالب مکرّر آجاتے ہیں۔ نظر ثانی اس قسم کی تمام غلطیوں کی تلافی کرنے کا موقعہ بہم پہنچاتی ہے۔ ایسے مضامین جو نظر ثانی سے محروم رہ جاتے ہیں اکثر ان میں اس قسم کی بہت سی خرابیاں باقی رہ جاتی ہیں۔ جو پڑھنے والے کے خیالات کو مضمون نگار کی طرف سے بدظن کر دیتی ہیں۔ ظاہر ہے اس معمولی احتیاط کو نظر انداز کرنے سے مضمون اور مضمون نگار کی قدر اور اہمیت کو کس قدر نقصان پہنچتا ہے۔ نظر ثانی سے محض مضمون کی تصحیح نہیں ہوتی بلکہ موضوع کے

متعلق بہت سی نئی نئی باتیں اور اچھوتے پہلو بھی سامنے آجاتے ہیں۔ اگر انشاپرداز دوبارہ لکھنے کی زحمت گوارا کرے تو مضمون میں اور بھی چار چاند لگ جاتے ہیں۔ اگر نومشقی کے زمانے میں کوئی اچھا اُستاد نہ ملے تو اپنے مضمون کی اصلاح کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اسے لکھ کر رکھ دیا جائے۔ جب وہ مضمون دماغ سے بالکل اُتر جائے تو پھر اس پر نظرِ ثانی کی جائے۔ ایسا کرنے سے اپنے مضمون کے محاسن اور کمزوریاں خود بخود نظر آنے لگتی ہیں۔ اور بہت سی خامیوں کی اصلاح انسان خود ہی کر لیتا ہے۔ یہ طریقہ اصلاح اگرچہ ذرا دیر طلب ہے لیکن نہایت مفید ہے اچھے اچھے مصنفین ہمیشہ یہی کرتے آئے ہیں۔ اگر آپ کو گزشتہ صدی کے کسی ادیب کا قلمی مسودہ دیکھنے کا اتفاق ہو تو اندازہ ہو جائیگا کہ وہ کس طرح اپنی تحریروں میں بار بار کانٹ چھانٹ کرتے رہے ہیں ؞

انشاپردازی میں ترقی کرنے کے لئے ضروری ہے کہ نظرِ ثانی اور تصحیح کے کام پر کافی سے زیادہ وقت صرف کیا جائے۔ تاکہ تصنیف میں سے زیادہ سے زیادہ سُقم دُور ہو جائیں۔ اور انشاپرداز کی جانکاہی۔ عرقریزی۔ قابلیت اور فنِ انشاپردازی کا سکہ پڑھنے والوں کے دلوں پر مستقل طور پر ثبت ہو جائے ؞

"قومی زبان"

قومی زبان کی ضرورت اور اہمیت

جب سے ہندوستان میں سیاسی بیداری اور قومی احساس پیدا ہوا ہے عوام میں اس بات کا بہت چرچا ہے کہ ہمارے ملک میں کسی ایسی ویسی زبان کو اس قدر ترقی دینی چاہئے کہ وہ ہر صوبے میں بولی اور سمجھی جا سکے، موجودہ طرز تعلیم اور حکومت نے یہ فخر انگریزی زبان کو دیا ہے جو غیر ملکی زبان ہے۔ قوم پرست طبقہ انگریزی زبان کا ملکی زبان بن جانا ہندوستانیوں کے ملکی وقار کے منافی سمجھتا ہے اور اس کو اپنی بے پرواہی اور غیر ملک پرستی سے تعبیر کرتا ہے"

سیاست دانوں اور ملک و ملت کے بہی خواہوں کا خیال ہے کہ ہندوستان کے بہت سے داخلی اور سیاسی مسائل قومی زبان کا سکہ چلنے سے خود بخود حل ہو جائینگے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ قومی یگانگت میں تہذیب و تمدن کی ترقی کا راز مضمر ہے۔ پھر جس ملک میں ان گنت قوموں کے لوگ آباد ہوں وہاں قومی اتحاد و اتفاق اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک کہ مختلف اقوام میں ایک زبان تبادلۂ خیالات کا

ذریعہ نہ بنے۔ تجربے سے ثابت ہو چکا ہے کہ وہ ہندوستانی اقوام جو ہم مذہبی کے لحاظ سے ایک دوسرے کی ہمدرد اور ہم خیال ہونی چاہئیں تھیں زبان کے اختلاف کی بدولت عام طور پر ایک دوسرے کی مخالف ہیں۔ نیز صُوبائی تعصب اور زبانی اختلاف نے ان کے درمیان نااتّفاقی اور اختلاف کی خلیج اور بھی زیادہ وسیع کر دی ہے ٭

ہندوستان کے ہر صُوبے میں مختلف زبانیں رائج ہونے سے جو نقصان ہماری تہذیب اور تمدّن کو پہنچا وہی صنعت حرفت اور تجارت کی ترقّی میں بھی سنگ گراں ثابت ہوا ہے۔ زبان کے اختلاف سے مُلکی تجارت نے ہمیشہ نقصان اُٹھایا۔ یاد رہے جب تک ہندوستان میں ایک قومی زبان رائج نہ ہو گی بحیثیت مجموعی تجارت کو کبھی فروغ حاصل نہیں ہو سکتا۔ تجارتی ایجنٹ اور صنعت و حرفت کی بڑی بڑی کمپنیاں ہر صُوبے کی زبان سے واقف نہ ہونے کی وجہ سے اپنے کاروبار کو فروغ دینے کی کوشش میں اکثر ناکامیاب ہوتی ہیں۔ اگر کسی صُوبے میں علمی ادبی یا سائنٹفک تحقیقات کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے تو مشترکہ زبان نہ ہونے سے جن دقّتوں کا سامنا ہوتا ہے۔ اس سے ہر تعلیم یافتہ شخص کسی نہ کسی حد تک ضرور واقف ہے نیز مُلکی زبان کا فقدان حکومت کے لئے گوناگوں دقّتوں کا موجب

ہے۔ ہم لوگوں کی بے پروائی سے ان مشکلات کو حل کرنے کے لئے حاکم قوم کی زبان نے ملکی زبان کی صورت اختیار کر لی ورنہ اگر کوئی ایک دیسی زبان ہندوستان میں رائج ہوتی تو انگریزی اس کی جگہ ہرگز نہ لے سکتی۔ اب حُبِ وطنی کے جوش اور وطن پرستی کے خروش نے اس مفید اور اہم مسئلے کی طرف ہم عوام کو متوجہ کیا ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اس کے ساتھ ہندوستان کی بہت سی توقعات وابستہ ہیں ؎

قومی زبان کا انتخاب عوام کی جمہوریت پسندی اور جمہوری طرزِ حکومت نے ہم لوگوں کو انتخاب لڑنا سکھا دیا ہے۔ جب کسی چیز کے انتخاب کا مسئلہ درپیش ہوتا ہے تو عجب لُطف آتا ہے۔ سرزمین انتخاب میدانِ حشر کا نمونہ بن جاتی ہے۔ جب قومی زبان کے انتخاب کا مسئلہ سامنے آیا، تو انتخاب کی جنگ میں بے شمار زبانیں کمر بستہ اُتر آئیں۔ قومی زبان پر مدتوں تحریری اور تقریری جنگیں ہوتی رہیں بلکہ بعض مقامات پر تحریر و تقریر سے گزر کر ہاتھا پائی کی بھی نوبت آئی اور قومی زبان کے انتخاب نے اہم ترین صورت اختیار کر لی ؎

ہندوستان ایک طویل و عریض مُلک ہے۔ اس میں مختلف قومیں اور متعدد نسلیں آباد ہیں۔ خطّے خطّے کی آب و ہوا جدا ہے، آب و ہوا، قومیت، نسل اور مذہب کی تفریق سے یہاں

زبانیں بھی مختلف بولی جاتی ہیں۔ گزشتہ صدیوں کے اعداد
وشمار کے مطابق کسی زمانے میں یہاں دوسو سے اوپر زبانیں
موجود تھیں اور اب بھی درجن بھر سے کم نہیں۔ ان حالات میں یہ
کوشش کرنا کہ سارے ملک میں ایک زبان بولی جائے بڑے
معرکے کا کام ہے۔ لیکن کیا کیا جائے جب ملک کی ترقی اور عروج
کا سوال قومی زبان پر مرتکز ہو جائے۔ لیکن خوش قسمتی سے
یہ مسئلہ جس قدر پیچیدہ اور اُلجھا ہُوا معلوم ہوتا ہے۔ اس کا حل
اس قدر دشوار نہیں، اگر یورپ کے لوگ اپنے علیحدہ علیحدہ
حکومتوں والے ملک میں ایک بالکل نئی اور مشترکہ زبان ایسپرانٹو
کے نام سے پیدا کرنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں تو اس کے مقابلے
میں ہندوستان کے لئے یقیناً یہ کوئی مشکل بات نہیں کہ وہ اپنی
دیسی رائج الوقت زبانوں میں سے کوئی ایک ایسی زبان
انتخاب کرلے جو تمام ملک میں بولی اور سمجھی جائے اور قومی
زبان کہلائے۔

ظاہر ہے موجودہ زبانوں میں سے انتخاب کا فخر اسی زبان
کو حاصل ہو سکتا ہے۔ جو اس وقت زیادہ سے زیادہ رقبے
میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ لیکن اس انتخاب کی جنگ میں
ہر شخص اپنی زبان کی خوبیاں گنوانے اور اس کو کامیاب بنانے
کے لئے نیل کانٹے سے لیس ہو کر آن کودا اور بہانگ بلند

دعویٰ کیا کہ محض ہماری ہی زبان میں سارے ہندوستان کی زبان بننے کی صلاحیت موجود ہے۔ بنگالی بولے ہماری زبان کو عمومیت کی سند ملنی چاہیئے کہ ادبی جواہر ریزوں سے مالا مال ہے۔ اوراس کی شیرینی مالا کلام ہے۔ مرہٹی بولنے والوں نے اپنی زبان کے دلکش گیت گاکر دوسروں کو قائل کرنا چاہا۔ غرض ہر دعویدار نے اپنی زبان کی وسعت اور مقبولیت کا سہارا لے کر قومی زبان ہونے کی سند مانگی، لیکن قرعہ فال دو زبانوں کے نام نکلا، جن کو عوام اُردو اور ہندی کہتے ہیں۔ ۱۹۳۱ء کے اعداد وشمار کا جائزہ لینے سے اندازہ ہوا کہ اُردو[۵] اور ہندی ہندوستان میں بہت مقبول اور محبوب ہیں اور سب زبانوں سے زیادہ اہل ہند ان کے رطب اللسان ہیں۔ ہندوستان کے کونے کونے میں ان کے قدردان اور واقفکار موجود ہیں، اس کے علاوہ ماہرین زبان کا یہ فتویٰ کہ ان دونو کا تعلق انڈوایرین زبانوں کے

---

[۵] ۱۔ مولانا آزاد ...... ہماری اُردو زبان برج بھاشا سے نکلی ہے اور برج بھاشا خاص ہندوستانی زبان ہے۔

۲۔ رام بابو سکسینہ ...... اُردو کا اصلی ماخذ وہ زبان ہے جو دلّی کے اطراف میں بولی جاتی تھی جس کو مغربی ہندی کی شاخ سمجھنا چاہیئے۔

۳۔ پروفیسر شیرانی ...... اُردو کا اصلی گہوارہ پنجاب ہے اور اس کا اصلی ماخذ پنجابی زبان ہے۔

خاندان سے ہے۔ ان کا حق تسلیم کرانے ہیں آسمانی حکم ثابت ہئوا۔ انصاف پسند طبقے نے باقرار صالح شہادت دی کہ ان زبانوں کے صحیح النسب ہونے میں کلام نہیں، ان میں ابھی تک قدیمی زبانوں کے الفاظ شامل ہیں یہی وجہ ہے کہ بنگالی اور گجراتی بولنے والا بھی ان کو آسانی سے سمجھتا ہے۔ اور اور اگر ذراسی ہمت کرے تو بغیر دقت کے ان سے پوری طرح واقف ہوسکتا ہے۔ بعض نے کہا کہ یہ سراسر دھوکا ہے۔ ہندی اور اردو دونو ہندوستان کی چشم و چراغ سہی لیکن یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ وہ بہت سی زبانوں کا مجموعہ ہیں۔ ہم تسلیم کرتے ہیں اردو اور ہندی دو علیحدہ علیحدہ زبانیں ہیں۔ لیکن اس حقیقت سے کون انکار کرسکتا ہے کہ یہ دونو آپس میں شیر و شکر نہیں، فرق صرف اتنا ہے کہ ہندی اپنی قدامت پرستی کی بدولت سنسکرت کے زیر اثر رہی۔ اور اردو نے اپنی فراخ دلی سے ہر زبان سے میل کھایا، اگر تھوڑی دیر کے لئے یہ تسلیم کرلیا جائے کہ اردو اور ہندی بہت سی زبانوں کے ملاپ سے نہیں بنی تو ہر شخص ان کو کیونکر سمجھ لیتا ہے۔ نیز ان میں ہر زبان کے الفاظ اور محاورات آپ ہی آپ کہاں سے آکر پیوست ہوگئے،

اس دوران میں ایک اور جماعت نے قومی زبان کے

مسئلے کو یہ کہہ کر زک پہنچانے کی کوشش کی کہ قومی زبان کا ہونا واقعی ضروری ہے لیکن کسی ایک زبان کو آل انڈیا زبان بنانے سے صوبائی زبانوں کو سخت نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ اس بیجا خطرے سے دُبلے ہونے والے قاضیوں کو تاریخ دانوں نے یہ جواب دے کر ٹھنڈا کیا کہ انگلستان ایک چھوٹا سا مُلک ہے اس میں مختلف حکومتیں راج کرتی ہیں، انگلستان میں عام طور پر ویلش اور سکاٹش دو زبانیں بولی جاتی ہیں۔ لیکن پھر بھی انگریزی کو قومی زبان کہلانے کا فخر حاصل ہے۔ یہ دونو زبانیں ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ لیکن باوجود اس بُنیادی اختلاف کے کسی ایک کی ترقی سے تینوں زبانوں میں سے کسی زبان کو بھی نقصان نہیں پہنچا، اس لئے اگر ہندوستان میں مُلکی زبان کے ساتھ ساتھ صُوبائی زبانیں بھی بولی جائیں تو کچھ مضائقہ نہیں، اس سے نہ تو قومی زبان پر کوئی اثر پڑ سکتا ہے اور نہ صُوبائی زبانوں کو کسی قسم کا خطرہ ہے۔

اُردو کا مقدّمہ

جب زبانوں کے انتخاب کا مسئلہ چھڑا تو اس وقت اہل نظر کی نظر انتخاب اُردو پر پڑ رہی تھی، اور حقیقت یہ ہے کہ یہی وہ زبان تھی جو ہندو مسلمانوں میں یکساں محبوبیت حاصل کر چکی ہے، ہندی اور اُردو میں بڑا فرق یہ ہے کہ کثیر التعداد ہندو اُردو بولتے اور لکھتے ہیں بر خلاف اس کے ہندی مسلمانوں

ہیں بہت کم مقبول ہے ۔ اُردو کی ہمہ گیری اور دلپذیری کے یورپین محقق بھی ہمیشہ سے قائل تھے چنانچہ انڈین فلالوجی کے مشہور مصنف نے آج سے نصف صدی پہلے اُردو کے متعلق اپنی رائے کا اظہار ان الفاظ میں کیا تھا کہ "اُردو ایک وسیع اور فصیح، معنی خیز اور جامع زبان ہے ۔ نہایت ترقی کرنے والی معلوم ہوتی ہے ۔ اور یہ شائستہ صورت اس زبان کی ہے جو سارے ہندوستان میں رائج ہے"۔

مشہور مستشرق گارسن دی تاسی نے لکھا ہے کہ اُردو ہندوستان میں اسی طرح بکثرت مستعمل ہے ۔ جس طرح یورپ میں فرنچ" جارج کیمبل کا خیال تھا کہ اُردو تمام ہندوستان کی زبان بنانے کے قابل ہے اس کی خاص خوبی یہ ہے کہ دوسری زبانوں کے الفاظ اپنی زبان میں اس طرح جذب کر لیتی ہے کہ اس کی اپنی زبان کے لفظ معلوم ہوتے ہیں"

ہسٹری آف انڈیا کے مصنف ونسنٹ سمتھ لکھتے ہیں کہ ہندوستان کی زبانوں میں اُردو ہی اِس قابل ہے کہ اس میں تمام مطالب آسانی سے ادا ہو سکتے ہیں،

یہ الفاظ ان مشہور و معروف مصنفوں کی زبان سے اس وقت نکلے ہیں جب ہندوستان نے قومی زبان کا خواب بھی نہ دیکھا تھا، اِس لئے ان لوگوں کی با صواب رائے پر کسی قسم کی نکتہ چینی

نہیں ہو سکتی، غرض اُردو ہی وہ زبان ہے جو ہندوستان اور غیر ممالک میں تقریباً ہر جگہ بولی اور سمجھی جاتی ہے - ہر صوبائی زبان کے محاورات اور الفاظ اس میں ایسی خوبصورتی سے پیوست ہیں کہ اس کا بولنا اور سمجھنا اور بھی زیادہ آسان ہو گیا ہے- حقیقت یہ ہے کہ شروع سے اس زبان کے ساتھ بڑی بڑی امیدیں وابستہ تھیں اور قوی امید تھی کہ جب ہندوستانی اقوام اتحاد و اتفاق کی اہمیت کو محسوس کرینگی تو اس زبان کو کُل ہندوستان کی زبان تسلیم کیا جائیگا- لیکن اُردو کی بدقسمتی سے اس کی جادو بیانی اور دلپذیری کچھ بھی کام نہ آئی- باہمی نفاق اور مذہبی تعصب نے اس کی مقبولیت کو داغدار کر کے اس سے وہ حق بھی چھین لیا جس کی وہ شروع سے بلا شرکت غیرے دعویدار چلی آتی تھی، خیر اب بھی مایوس نہیں ہونا چاہیئے - اگر اُردو کے حامی موجود ہیں اور ان کو اُردو سے سچی محبت ہے تو اس کو کسی قسم کا خطرہ نہیں، ہاں اس کی تقدیر سے شکوہ ضرور ہے۔

قومی زبان کے انتخاب میں اُردو اور ہندی کو برابر کا مرتبہ دیا گیا ہے - اگر تعصب کی عینک اُتار دی جائے اور انصاف سے دونوں زبانوں کا جائزہ لیا جائے تو اُردو اور ہندی میں زمین آسمان کا فرق نکلیگا - جو مقبولیت اور ہمہ گیری اُردو کو حاصل ہے ہندی کو اس کا عشر عشیر بھی نہیں - اس کے علاوہ دونوں کے

ادبی اور علمی تحصیلات اور ذخیرے ما بہ الامتیاز ہیں، بہر حال اس وقت فیصلہ کیا گیا ہے کہ اُردو اور ہندی دونو ایک ہی ہیں، ان میں تدریجی فرق ہے۔ اصل دونو کی ایک ہے ہندو مُسلم نااتفاقیوں اور مناقشوں کی بدولت یہ زبانیں ایک دوسرے سے علیحدہ ہوگئی ہیں۔ ہندو ہندی کو اپنی زبان کہتے ہیں مسلمان اُردو پر اپنی ملکیت ثابت کرتے ہیں، اصل حقیقت یہ ہے کہ اُردو زبان ہندوستانی اور غیر ملکی زبانوں مثلاً عربی فارسی اور تُرکی وغیرہ کے اختلاط سے پیدا ہوئی ہے اور ہندو مسلمانوں کی یگانگت اور محبت کا زندہ ثبوت ہے غرض یہی وہ زبان ہے جس کو زمانۂ قدیم میں ہندی کہا جاتا تھا۔ لیکن جب انگریزوں نے دہلی کے اُردوئے معلّےٰ کو اُجاڑا اور فورٹ ولیم کالج قائم کیا تو توان کی دُور بین عقل نے ہندی اُردو کے جھگڑوں کا سنگ بُنیاد رکھا۔ اُردو اور ہندی کے نام سے دو شعبے جاری کئے گئے۔ جس کا ظاہرا مقصد اُردو اور ہندی کی قدر دانی تھا لیکن حقیقت میں اس نااتفاقی کا پیش خیمہ تھا جو آج اُردو اور ہندی کے نام سے جاری ہے۔ اس بس بھرے بیج کے پھیلاؤ سے اس متحدہ قومیت کا خاتمہ ہوا جو کئی صدیوں میں اُردو زبان نے پیدا کی تھی۔ اصل میں اس وقت سے اُردو اور ہندی دو الگ زبانیں بنیں۔ اس وقت ان میں محض رسم الخط کا فرق رکھا گیا تھا لیکن دونو

فرقوں کی تنگ نظری اور تعصب پرستی نے ان دونو کو بالکل علیحدہ علیحدہ کر دیا، مسلمانوں نے اُردو کو فارسی اور عربی کے الفاظ سے بار دار کر کے عام فہم ہونے کے رُتبہ سے گرایا اور ادھر ہندوؤں نے ہندی کو سنسکرت اور ٹھیٹھ ہندی کے مشکل الفاظ کی بھرمار سے اُردو سے علیحدہ کیا لیکن لُطف یہ ہے کہ دونو فرقوں میں جو زبان عام طور پر بولی جاتی تھی وہ بدستور عام فہم رہی اور ابھی تک ہے اور اُردو ہندی کے تنازع کی ناسخ ہے

قومی زبان کا نام

ان حالات میں ایک ایسے ثالث بالخیر کی ضرورت تھی، جس کا اثر اُردو اور ہندی کے دعویداروں پر یکساں ہو۔ تاکہ اس کا فیصلہ دونو جماعتیں تسلیم کر لیں، ایسی جماعت ہمارے مُلک میں انڈین نیشنل کانگریس ہے۔ اس کے صدر مُلک کے بے تاج بادشاہ کہلاتے ہیں اور ان کی ہر بات کو عوام قدر کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں، کانگریس نے دونو جماعتوں کی اشاعت شوئی کی اور متفقہ طور پر قرار دیا کہ وہ زبان جو ہندوستان میں قومی زبان ہونے کا فخر حاصل کر سکتی ہے ہندی اور اُردو کے بین بین ہونی چاہئے۔ وہ اُردو جو فارسی اور عربی کے الفاظ کی کثرت سے عام ہندوستانیوں کے لئے ناقابل فہم بن گئی ہے مُلک کی زبان نہیں بن سکتی اور نہ وہ ہندی جو ٹھیٹھ ہندی اور سنسکرت کے الفاظ کی آمیزش سے بھرپور ہے قومی زبان

بننے کی صلاحیت رکھتی ہے اِس لئے باہمی سمجھوتے اور قرارداد سے ان دونوں زبانوں کو ملا کر ایک ایسی زبان ترتیب دی جائے[1] جو ہندوستانی کہلائے اور ہندو مسلمانوں کی سمجھ میں بہ آسانی آئے۔ ظاہر ہے کانگریس کا یہ فیصلہ نہایت منصفانہ اور خوش آئند ہے لیکن سیاسی اختلاف اور باہمی نفاق کی وجہ سے ارباب غرض اس پر طرح طرح کی نکتہ چینی کر رہے ہیں، اور جا و بیجا نقصان کے پہلو چمکا کر عوام کو اس فیصلے سے ہٹانا چاہتے ہیں،

بعض ہندو کہتے ہیں کہ اس قومی زبان کا نام ہندوستانی نہیں ہونا چاہیئے بلکہ اس کو ہندی کہنا چاہیئے۔ ادھر مسلمانوں کا یہ دعویٰ بھی بدستور قائم ہے کہ یہ زبان اُردو ہی کہلانی چاہیئے۔ اعتدال پسند کہتے ہیں کہ اُردو اور ہندی کو ہندوستانی کہدینے سے اصل زبانوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔ یہ تو محض نام کا جھگڑا ہے۔ ہندوستانی جو کچھ ہوگی وہ ظاہر ہے،

تحقیقات سے معلوم ہوتا ہے کہ اُردو کے لئے ہندوستانی نام کچھ نئی چیز نہیں، ۱۶۱۶ء تک کی کتابوں میں ہندوستان کی زبان کو مصنفین نے ہندوستانی کے نام سے یاد کیا ہے انگریز

[1] اس سلسلہ میں یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ اُردو اور ہندی کے اختلاط سے کوئی نئی زبان پیدا نہیں ہوگی۔ ہندوستانی سے مراد وہ زبان ہے جو شمالی ہندوستان میں ہندو مسلمان ہر وقت بولتے ہیں ؞

اب تک اُردو کو ہندوستانی کہتے ہیں، لیکن اُردو پرست طبقہ اس کو اپنی زبان کے وقار کے خلاف سمجھتا ہے۔ قدیم یورپین مورخوں نے اُردو کو لفظ اندوستان سے تعبیر کیا۔ اٹھارھویں صدی کے مصنّفوں نے لاطینی زبان میں لنگوا اندوستانیکا لکھا۔ جان گلکرسٹ نے ۱۷۸۷ء میں اس کو محض ہندوستانی کہا اور اس کے بعد سے "ہندوستانی" نام غیر ملکی اقوام میں عام طور پر مقبول ہوگیا، لیکن اُردو پرست طبقہ ہمیشہ اس نام سے بیزاری کا اظہار کرتا رہا۔ شاہجہاں بادشاہ نے سب سے پہلے اس زبان کو زبان اُردوئے معلیٰ کا لقب دیا اور یہ نام عوام میں مقبول ہُوا، اختصار ہوتے ہوتے زبان اور معلیٰ دونو حذف ہوگئے اور محض اُردو باقی رہ گیا۔ اُس وقت یہ زبان ادبی خدمات بجالانے کے قابل ہو چکی تھی، بعد کے مصنّفین نے اس کو ریختہ کہنا شروع کیا کہ ادبی زبان اور عام زبان میں امتیاز ہوسکے، نظم کے لئے ریختہ کا نام مخصوص ہوگیا، لیکن میر تقی اور مصحفی مرحوم نے اُردو کو ہندی ہی کہنا پسند کیا، غرض تواریخ سے ثابت ہے کہ ہندی اور اُردو دو الگ الگ زبانیں نہیں تھیں، محض سرپرستی اور نام کے فرق سے ایک دوسرے سے دُور جا پڑیں۔ مختلف اثرات اور ماحول نے ان کو ایسا لباس پہنایا کہ پہچانی تک نہیں جاتیں، حالانکہ صرف و نحو کے بہت سے

اصول اور محاورات دونو ں میں ایک طرح پر نہیں ؛

بعض اعتراضات اور ان کے جوابات

بعض لوگوں کی رائے ہے کہ وہ زبان جس کو ہندوستانی کہا جائیگا۔ ہندوستان کی مشترکہ اور قومی زبان نہیں ہو سکتی، کیونکہ اس نئی زبان کا کوئی وجود ہی نہیں اور نہ اس کا کوئی خاص لٹریچر ہے، زبان بننے کا قاعدہ یہ ہے کہ وہ قدرتی طور پر پیدا ہوتی ہے۔ اور انسانوں کے بنانے سے مصنوعی طریقوں سے نہیں بنتی اس لئے مجوزہ ہندوستانی زبان کے خواب دیکھنے کی تعبیر کچھ بھی نہ ہوگی، ان دلائل کی صحت میں واقعی شبہ کرنے کی گنجائش نہیں، لیکن اگر کوئی زبان پہلے سے موجود ہو اور باہمی نفاق انگیزیوں اور افتراق پردازیوں سے اس کی دو شاخیں ہو گئی ہوں۔ تو اس کی تجدید کرنا ناممکن نہیں ہو سکتا۔ اس وقت جس زبان کو ہم قومی زبان بنا رہے ہیں ملک میں اس کے دو سٹائل یا طرز تحریر مروّج ہیں، ایک طرز میں فارسی اور عربی کے الفاظ کی کثرت ہے دوسرے میں سنسکرت اور ہندی الفاظ کی بھرمار ہے۔ اور یہ صورت ان لوگوں کی بدولت پیدا ہوتی ہے جو تعصّب اور تنگ نظری کے شکار رہے ہیں۔ اگر تعصب کی رنگدار عینک اتار دی جائے تو یہ دونو زبانیں ایک ہی نظر آئینگی۔ گویا ہندی اور اُردو ایک ہی ماں کی دو بیٹیاں ہیں۔ ایک

کی سسرال ہندو گھرانوں میں ہے۔ دوسری مسلمانوں میں بیاہی گئی ہے۔ ایک پر مسلمانوں کے تمدن اور مذہب کا اثر پڑا، دوسری خالص ہندو تہذیب کا نمونہ بنی۔ اگر مذہبی تعصب کو بالائے طاق رکھ کر ان دونو بہنوں کو پھر ملنے جلنے کی اجازت دی جائے تو ایک دفعہ پھر وہی محبت اور یگانگت کا زمانہ آسکتا ہے جب اِن دونو پر کوئی جماعتی اور مذہبی رنگ نہیں چڑھا تھا؛

اس کے علاوہ ہمارے مُلک میں بہت سے ایسے مصنف بھی ہیں۔ جن کی تحریریں ہندی اور اُردو دونو زبانوں میں موجود ہیں اور ہندو مسلمان ان کو برابر کی دلچسپی سے پڑھتے ہیں۔ قومی زبان کے حامیوں کا خیال ہے کہ جب مصنفین میں یہ خیال پیدا ہوگا کہ ہماری تحریریں اور خیالات تمام ہندوستان کے لئے ہیں اور ان کا کسی خاص فرقے اور جماعت سے کوئی مخصوص تعلق نہیں تو وہ خود بخود ایسی عام فہم زبان استعمال کرنے لگے جو ہر ہندوستانی سمجھ سکے گا۔ ظاہر ہے یہ کام مولویوں اور پنڈتوں کا نہیں ان کا اثر و رسوخ تو ایک خاص حلقہ میں محدود ہے۔ اس مفید مقصد کی تبلیغ اور اشاعت ان لوگوں پر فرض ہے جن کا واسطہ براہ راست تمام ہندوستان سے ہو سکتا ہے؛

وہ زبان جس کو ہر ایک ہندوستانی سمجھ اور بول نہیں سکتا تمام ہندوستان کی زبان ہرگز نہیں ہوسکتی۔ چاہے کوئی جماعت ایسی زبان کی مقبولیت کے لئے کتنی ہی کوشش کیوں نہ کرے، ایسی تحریریں اور تقریریں جن میں قومی زبان استعمال نہ کی جائیگی خود بخود مقبولیت کے درجے سے گر جائینگی۔ امید ہے کہ اس طرح سے آپ ہی آپ انہیوں اور مصنفوں کا رُجحان ایسی عام فہم اور آسان زبان کی طرف ہوجائیگا جس کو عوام آسانی سے سمجھ سکیں گے۔ وہ زبان جو کسی خاص طبقے کی زبان ہوگی وہ اسی مخصوص حلقے میں محدود رہ جائیگی۔ آخر کار زمانہ اُس کی اصلاح کریگا۔ ہوا کے رُخ کے ساتھ ایسے مصنفین کو اپنا رُخ مجبوراً بدلنا پڑے گا۔ ورنہ ان کی تقریریں اور تحریریں گمنامی کے کونوں میں روپوش ہوجائینگی"۔

صُوبائی زبانوں کا مسئلہ

بعض نکتہ چینوں کا خیال ہے کہ ہندوستانی کی ترویج و ترقی سے صُوبائی زبانوں کو سخت نقصان پہنچیگا، اور ہندوستانی کی مقبولیت بڑھتے بڑھتے ایک وقت ایسا آئیگا کہ صوبائی زبانوں کا بالکل خاتمہ ہوجائیگا۔ یاد رہے یہ خطرہ بھی بالکل خیالی اور بے سروپا ہے۔ ہندوستانی سے کسی ایک زبان کو بھی نقصان پہنچنے کا اندیشہ نہیں، اس زبان کی ترویج کا

مقصد تو صرف اتنا ہے کہ ہندوستان میں رہنے والے ایک
دوسرے سے قریب تر ہو جائیں۔ اور مُلکی مسائل کو وہ اچھی
طرح سے سمجھ سکیں اگر کسی صُوبے میں کوئی خاص زبان عام طور پر
بولی جاتی ہے تو بڑے شوق سے بولی جائے۔ اس میں تالیف و
تصنیف کا سلسلہ اسی جوش وخروش سے جاری رہے جس طرح
اب ہے۔ مگر باوجود اس کے ان کا تعلق دوسرے صُوبوں اور
تمام ہندوستان سے مضبوط اور مستحکم رہے۔ ظاہر ہے یہ نیک
مقصد صرف ہندوستانی زبان ہی پورا کر سکتی ہے۔ اس کے
علاوہ اس وقت عوام میں تبادلۂ خیالات اور میل ملاپ کا
ذریعہ ہمارے مُلک میں انگریزی زبان بنی ہوئی ہے۔ لیکن
انگریزی سے ہم لوگوں کا اتنا ہی واسطہ ہے کہ وہ حاکم قوم کی
زبان ہے یا اس وقت تمام دُنیا میں سب سے زیادہ ادبی
اور علمی ذخائر کی مالک کہلاتی ہے ایک خود دار اور باعزت
قوم کے لئے اس سے زیادہ شرم کی بات اور کیا ہو سکتی ہے
کہ وہ اپنی دیسی زبانوں کو چھوڑ کر ایک غیر مُلکی زبان کو
اظہارِ خیالات کا ذریعہ بنائے، اور اس کو قومی زبان کی جگہ
دے، اس لئے ہر خود دار ہندوستانی کا فرض ہے کہ وہ رُتبہ
جو اس وقت ہمارے مُلک میں غیر مُلکی زبان کو حاصل ہے
ہندوستانی زبان کو دے کر اپنے سیاسی اور مُلکی وقار کو

قائم رکھے ؎

جنوبی ہندوستان میں آجکل ہندوستانی کی مخالفت محض ان خطرات کی بنا پر ہو رہی ہے کہ ابتدائی اور ثانوی مدارس میں ہندوستانی زبان کا لازمی پڑھنا صوبائی زبان کو پس پشت ڈال دیگا، اور ہندوستانی زبان کی ترقی سے آہستہ آہستہ صوبائی زبان مُردہ ہو جائیگی۔ معلوم ہونا چاہیئے کہ ہندوستانی کی ترویج سے یہ مقصد ہرگز نہیں کہ صوبائی زبانوں کا شمار مُردہ زبانوں میں ہونے لگے، یا ان کو کسی قسم کا نقصان پہنچے، ہندوستانی سکیم کے ماتحت ہر صوبے میں صوبائی زبان کو وہی اہمیت حاصل رہیگی جو پہلے تھی۔ ہندوستانی محض دوسرے درجے کی زبان ہوگی، جس سے دوسرے صوبوں کے ساتھ دوستانہ تعلقات برقرار رہیں گے، بعض لوگ یہ خیال کر رہے ہیں کہ ہندوستانی کو تمام صوبوں میں ذریعہ تعلیم قرار دیدیا جائیگا۔ یہ سراسر وہم ہے۔ ذریعہ تعلیم ہر صوبے کی اپنی زبان ہوگی صوبائی زبانیں اپنے مخصوص صوبوں میں عدالتوں اور اسمبلی میں آزادانہ استعمال کی جائینگی، ہاں جو یونیورسٹیاں آل انڈیا حیثیت کی مالک ہونگی وہاں ہندوستانی کو ذریعہ تعلیم قرار دینا ضروری ہوگا تاکہ ہر صوبے کے رہنے والے خاطر خواہ فائدہ حاصل کرسکیں یہ مسلمہ امر ہے کہ بہترین لٹریچر مادری زبان ہی میں پیدا ہو سکتا

ہے اس لئے ہندوستانی کی ترویج سے صُوبائی لٹریچر کو بھی کسی قسم کا نقصان پہنچنے کا اندیشہ نہیں۔ اسی طرح سے جن صُوبوں کی مادری زبان ہندوستانی نہیں وہ بھی اپنی صُوبائی زبان کی خدمات بدستور جوش و خروش سے بجالاتے رہینگے لیکن سیاسی اور مُلکی ضرورتوں کو مدنظر رکھ کر انہیں اپنی زبان کو ضرور کسی قدر زیادہ عام فہم بنانا پڑیگا۔ اس بیان سے یہ غلط فہمی بھی خود بخود دُور ہو جاتی ہے کہ ہندوستانی محض کاروباری یا بازاری زبان ہوگی، یا کسی طریقے سے اپنی بُنیادی زبانوں کے لئے نقصان وہ ثابت ہو سکے گی، ان حالات کے پیش نظر یہ اُمید اور بھی زیادہ مضبوط ہو جاتی ہے کہ ایک زمانہ ضرور ایسا آئیگا جب ہندوستانی اپنی مقبولیت عامہ اور عام فہم مفید لٹریچر کی بدولت سب زبانوں کی سرتاج کہلائیگی ؛

رسم الخط کا جھگڑا

یہ تسلیم کر لینے کے بعد کہ ہندوستانی زبان آسان ہندی اور سیدھی سادی اُردو ہونی چاہئے، رسم الخط کا جھگڑا پیدا ہوتا ہے۔ ہندو اس بات پر مصر ہیں کہ دیوناگری رسم الخط کو آل انڈیا حیثیت دینی چاہئے اور مسلمانوں کی ضد ہے کہ فارسی رسم الخط کو رواج دیا جائے ؛

رسم الخط کا مسئلہ واقعی بہت پیچیدہ ہے۔ اور اس کی دقتیں تقریباً ہر زبان میں تکلیف کا باعث ہیں۔ انگریزی کے

رسم الخط کے خلاف بھی مدتوں سے جہاد جاری ہے اور ایک مخصوص جماعت ہمیشہ اس بات کی کوشش کرتی رہی ہے کہ مروجہ ہجوں پر تلفظ کے ہجوں کو ترجیح دی جائے۔ گویا ہجوں میں آواز کا تتبع کیا جائے تاکہ مقررہ ہجوں کو زبانی یاد کرنے میں وقت ضائع نہ ہو۔ اُردو لکھنے والے بھی اس دقت کو محسوس کر رہے ہیں لیکن آج تک کسی عالم نے اپنی کسی تحریر یا کتاب میں انگریزی زبان کے مصنفوں کی طرح اس دقت کا کوئی حل پیش نہیں کیا۔ ماننا پڑیگا کہ اُردو کی ادبی ترقی نے اس مسئلے کو ثانوی حیثیت دیدی ہے۔ لیکن اگر عوام اس دقت کا حل خود ہی تلاش کر لیں جیساکہ عام طور پر ہوا کرتا ہے تو عالم کو عامی پر اعتراض نہیں ہو سکتا۔ اور نہ ہونا چاہئے۔ اس رکاوٹ کو دور کرنے کے بعد ٹائپ کا نہ ہونا بھی مختلف اعتراضات میں نمایاں حیثیت رکھتا ہے لیکن مدت دراز کی کوششوں سے نستعلیقی ٹائپ وجود میں آچکا ہے جو بہت جلد مقبولیت کی سند حاصل کر لیگا، اور اس طرح سے فارسی رسم الخط پر سے یہ اعتراض بھی دور ہو جائیگا

ہندی کے رسم خط میں یہ خوبی بتائی جاتی ہے کہ اس میں ہجوں کی مصیبت نہیں بلکہ آواز کی پیروی کی جاتی ہے دوسرے ہندوستان کی بہت سی صوبائی زبانیں اس رسم الخط میں لکھی جاتی ہیں۔ نیز اس کا ٹائپ بھی موجود ہے۔ یہ سب آسانیاں

درست سہی لیکن اس بات کا کیا علاج ہے کہ جس قدر رقم جگہ اُردو لکھنے کے لئے درکار ہے ہندی اس سے چہار چند جگہ لیتی ہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ اُردو کی تحریر پڑھنا زیادہ آسان ہے۔ یہ باتیں ایسی ہیں جس کو ہر ہندی جاننے والا بھی تسلیم کرتا ہے۔ لیکن جس وقت کسی مسئلے پر تعصب کا رنگ چڑھ جائے تو دوسرے کی ہر اچھائی بُرائی معلوم ہوتی ہے اور اپنی چیز کی بُرائی بھی بھلی نظر آتی ہے۔ ان حالات کو دیکھتے ہوئے کانگریس نے فیصلہ کیا ہے کہ زبان کے انتخاب اور نام کا تصفیہ ہو جانے کے بعد رسم الخط کا جھگڑا فروعی رہ جاتا ہے۔ اس لئے بہتر یہ ہے کہ اگر مسلمان چاہیں تو فارسی رسم الخط میں لکھیں ہندوؤں کو کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیئے اور اگر ہندو پسند کریں تو دیوناگری خط استعمال کریں اس پر مسلمانوں کو نکتہ چینی نہیں کرنی چاہیئے۔ بعض کا خیال ہے کہ ایک زبان کے دو رسم الخط قرار دینے مضحکہ خیز ہیں اس لئے بہترین حل یہ ہے کہ ہر شخص رومن رسم الخط کو اختیار کرے کہ وہ آسان ہے۔ نیز ایسا کرنے سے کسی کو اعتراض کی گنجائش باقی نہیں رہیگی۔ مگر مصیبت یہ ہے کہ رومن رسم الخط بھی عیوب سے پاک نہیں۔ اِس لئے اس کی مقبولیت میں بھی شبہات ہیں۔ رومن کے حامی ٹرکی کی مثال دیتے ہیں کہ وہاں قدیمی رسم الخط کو چھوڑ کر رومن رسم الخط کو

ترجیح دی گئی ہے اور اس طرح بہت سے تضاد دُور ہو گئے ہیں۔ رومن کے مخالفین وہاں کی سیاسی فضا اور مُلکی حالات کو معرض بحث میں لاتے ہیں اور رومن کی خامیوں کو واضح کرتے ہیں۔ جو ایک حد تک بہت زیادہ وقیع ہیں،

خیفتاً رسم الخط کا جھگڑا فروعی تنازعہ ہے۔ اصل معاملہ طے ہو چکا ہے۔ ہمیں اس فیصلے کی عزت اور نگہداری کرنی چاہیئے۔ اور ایک دفعہ پھر اس زمانے کو زندہ کرنا چاہیئے جب اُردو زبان ہندی اور فارسی کے ملاپ سے وجود میں آ رہی تھی۔ اسوقت فرق صرف اتنا ہے کہ اب اُردو اور ہندی کی ترتیب اور تہذیب سے ایک ایسی زبان لباس ہستی پہنے گی جو ہندوستانی کہلائیگی اور ہندو مسلمانوں کی محبوب ہوگی، زبانی اتحاد سیاسی اور کاروباری تکدر کو دُور کریگا۔ مگر اُردو اور ہندی دونوں زبانیں اپنی اصلی جگہ پر قائم رہینگی اس نئی زبان کی ترویج سے ہماری زبانوں پر کوئی نقصان دہ اثر پڑنے کا اندیشہ نہیں۔ اگر مسلمان واقعی اُردو کو اپنی زبان سمجھتے ہیں تو اس کی خدمت وہ اور بھی زیادہ سچے جوش سے کریں تاکہ ان کی زبان ہندی سے پیچھے نہ رہ جائے۔

رسم الخط کی بحث ختم کرنے سے پہلے مہاتما گاندھی کی رائے کا نقل کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اس جھگڑے میں آخر کار دیوناگری خط کی جیت رہیگی کیونکہ ہندوستان کے

بیشتر صُوبوں میں اکثر صُوبائی زبانیں دیوناگری رسم الخط میں لکھی جاتی ہیں یا ان کا رسم الخط دیوناگری رسم الخط سے ملتا جلتا ہے۔ اس پیشینگوئی آمیز رائے سے اُردو کے رسم الخط کے حامیوں کو بددل نہیں ہونا چاہیئے۔ اگر وہ اُردو سے حقیقی محبت رکھتے ہیں تو اس کا رسم الخط کبھی مُردہ نہیں ہو سکتا۔ لیکن ہمت اور عمل کی ضرورت ہے ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

ہندوستانی کو ترقی دینے کے ذرائع

انتخاب کے مرحلے طے کر کے کسی ایک نتیجے پر پہنچ جانا جمہوریت کا معمولی سا کرشمہ ہے لیکن اس فیصلے کی عزت اور نگہداری کرنا بہت مشکل اور ہمت کا کام ہے اب ہمیں باہمی تنازعات مٹا کر ہندوستانی کو ترقی دینے کے وسائل پر غور کرنا چاہیئے۔ یاد رہے ہندوستانی ہماری وہی پیاری زبان ہے جسے کوئی اُردو کہتا ہے کوئی ہندی اور قومی زبان کے نام سے یاد کرتا ہے۔ ہمیں نام پر نہیں جانا چاہیئے۔ جو نام جس کو پیارا معلوم ہوتا ہے وہ اس کو اسی نام سے پُکارے مگر شرط یہ ہے کہ حقیقی مقصد کو نہ بھُولے،

ہندوستانی کو عمومیت اور مقبولیت دینے کے لئے ضروری ہے کہ ہر جگہ ہندوستانی کی انجمنیں قائم کی جائیں۔ ہر ممبر سے اخلاقی معاہدہ لیا جائے کہ وہ سچے دل سے ہندوستانی کا چرچا

کرے، عوام کے جلسوں کی کارروائی ہندوستانی زبان میں عمل میں آئے تاکہ مختلف صوبائی زبانیں بولنے والی قومیں ہندوستانی سے مانوس ہوجائیں۔ مشہور اور مقبول تصانیف کو ہندوستانی میں چھپوایا جائے۔ اچھے اچھے مقبول گیت اور نظمیں ہندوستانی میں لکھے جائیں اور مشہور گانے والے اپنی خوش الحانی سے ان کی مقبولیت بڑھائیں۔ کاروباری لوگوں اور عوام سے متعلق اشتہارات ہندوستانی زبان میں چھپوائے جائیں اخبارات اور رسائل کو ترغیب دی جائے کہ وہ اپنے پرچوں کے ذریعہ ہندوستانی کا پرچار کریں۔ جو پرچے سنسکرت آمیز ہندی لکھتے ہیں یا عربی اور فارسی کے مشکل الفاظ بکثرت استعمال کرتے ہیں ان سے التجا کی جائے کہ وہ عام فہم زبان استعمال کرکے اپنے پرچوں کی مقبولیت میں اضافہ کریں۔ نیز یہ کوشش کی جائے کہ ہندی اور فارسی رسم الخط کے پردے میں کوئی قوم ایک دوسرے کے لٹریچر سے بیگانہ نہ رہ جائے۔ فلم بنانے والوں اور محکمہ ریڈیو پر دباؤ ڈالا جائے کہ وہ عام فہم زبان استعمال کریں۔ ابتدائی تعلیم کے نصاب میں ایسی کتابیں داخل کی جائیں جن کی زبان نہایت پاکیزہ اور شستہ ہو اور حقیقی معنوں میں ہندوستانی کہلائی جائے۔ صوبجات متحدہ کا محکمۂ تعلیم چند سال سے اس تجویز پر عمل پیرا ہے۔ وہاں ابتدائی جماعتوں کے نصاب ایسی آسان اور پاک زبان میں لکھے جاتے

ہیں کہ رسم الخط کی تبدیلی کا اثر الفاظ پر نہیں ہوتا، ان کتابوں کو ہندی اور اُردو دونوں زبانوں میں چھپوایا جاتا ہے جو ہندی کا شوق رکھتے ہیں وہ ہندی رسم الخط کا نصاب خریدتے ہیں اور اُردو کے دلدادہ فارسی رسم الخط سے استفادہ کرتے ہیں۔ اگر یہ طریقہ ابتدائی مدارس کے نصاب انتخاب کرنے میں ہر جگہ برتا جائے تو ہندوستانی زبان بہت کم مدت میں مقبولیت عامہ حاصل کر سکتی ہے۔

اگر ہمارے مصنّفین اور ادیب ہندوستانی کی اہمیت اور مقبولیت کو پیش نظر رکھ کر ایسی کتابیں تصنیف کریں جو تمام ہندوستانی دان پڑھ سکیں تو ایک طرف مُلک کی بہت بڑی خدمت ہوگی اور دوسری طرف ان کی محنت اور جانکاہی کا صلہ ہزار چند ملیگا، اس کے علاوہ تجارتی مرکزوں اور مشہور دُکانوں کے ذریعے ہندوستانی کو رواج دینے کا کام بہت آسانی سے لیا جاسکتا ہے۔ اگر وطن پرست دُکاندار اپنی دُکانوں پر اس مطلب کے بورڈ آویزاں کریں کہ یہاں ہندوستانی بولی جاتی ہے تو گاہکوں کو ہندوستانی بولنے کی طرف رغبت ہوگی اور ہر شخص ہندوستانی بولنے کی کوشش کریگا۔ ظاہر ہے اس طریقے سے ان تجارتی افراد کو بہت فائدہ ہو سکتا ہے جو اکثر صوبائی زبانیں نہیں جانتے سوء اتفاق سے ہندوستانی کے

تاجر عام طور پر بے پڑھے لکھے ہیں۔ اگر کوئی غیر صوبے کا گاہک
ان کے پاس آجاتا ہے تو ان کو بڑی دقت کا سامنا پڑتا ہے۔
آخر کار انگریزی میں گفتگو ہوتی ہے مگر وہ بھی کسی انگریزی داں
کے ذریعے، ہندوستانی کی مقبولیت سے تجارت پیشہ افراد کو
خاص طور پر فائدہ پہنچیگا۔ اور ان دقتوں کا بہت جلد خاتمہ ہو جائیگا'
موجودہ صدی کے آغاز میں یورپ والے ایک نئی زبان
سپرانٹو کے نام سے پیدا کر رہے تھے، اس کی تخلیق کا مقصد
یہ تھا کہ یورپ میں سیر و سیاحت اور تجارت کرنے والوں کو
آسانی ہو۔ اس زبان کے سیکھنے میں بڑی قباحت یہ تھی کہ وہ
یورپ کی تمام زبانوں سے علیحدہ تھی، ہندوستان کی ملکی زبان
میں سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ ان تمام زبانوں کا مجموعہ
ہے جو ہندوستان کے مختلف صوبوں میں بولی جاتی ہیں۔
یورپ والے اگر مصنوعی زبان پیدا کرنے میں کامیاب ہو سکتے
ہیں تو کیا ہندوستانی ایک ایسی زبان کو رواج دینے میں
کامیاب نہیں ہو سکتے جو کم و بیش تمام ہندوستان میں بولی
اور سمجھی جاتی ہے۔ نیز صدیوں کے ارتباط اور اتحاد کا نتیجہ ہے'
موجودہ سیاسی بیداری کے دور میں ہندوستانی کا مستقبل
نہایت شاندار نظر آتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ملک کی بہتری
اسی میں ہے کہ سیاسی اور مذہبی اختلافات کے ہوتے ہوئے

ہندوستانی کا خیر مقدم کرے مذہبی اختلافات تو آج تک نہ مٹے ہیں نہ مٹینگے۔ لیکن زبان کا مسئلہ کوئی ایسا مسئلہ نہیں کہ جس کا مذہبی اعتقادات پر کوئی اثر پڑ سکے، بلکہ اگر باہمی اتحاد اور یگانگت پیدا ہو سکتی ہے تو ایک زبان ہونے سے ہو سکتی ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ اس متحد مقصد کو حاصل کرنے کے لئے متحدہ کوششیں شروع ہو گئی ہیں۔ امید ہے کہ آئندہ چند سالوں میں ہندوستانی کے رواج سے ایک ملک کے رہنے والے ایک مادر وطن کے سایہ میں تربیت اور پرورش پانے والے ایک زبان ہو کر متحد اور متفق ہو جائینگے اور اس یگانگت سے بہت سے فرعی اختلافات خود بخود مٹ جائیں گے ؂

اگر ہم ان سب وسائل سے فائدہ اُٹھائیں جو قدرتی طور پر ہم کو حاصل ہیں تو کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ ہندوستانی نصف صدی سے بھی کم مدت میں تمام ہندوستان کی قومی زبان نہ بن جائے کیا ہماری زبان جس کے بولنے والے کروڑوں کی تعداد میں موجود ہیں اپنی معمولی سی کوشش سے اور کئی کروڑ آدمی اپنے ہم زبان نہیں بنا سکتے۔ ایسا ضرور ممکن ہے لیکن بلند ہمت اور مضبوط ارادے کی ضرورت ہے۔ جن صداقت آمیز جذبات سے ہندوستانی کا مسئلہ اُٹھایا گیا ہے اور جس وطن پرستی کے جوش میں اس اہم اور مفید

تحریک کو جاری کیا گیا ہے۔ اس سے بڑی بڑی اُمیدیں قائم ہو گئی ہیں اور یقین ہوتا ہے کہ ہندوستانی کی ہمہ گیر رَو اس تیزی اور سُرعت سے تمام ہندوستان پر محیط ہو جائیگی کہ دیکھنے والے حیران ہونگے۔ عمومی تعلیم سیاسی بیداری، اور جمہوریت پسندی ان تمام مخالف اور ناموافق جذبات کا آہستہ آہستہ خاتمہ کردیگی جو اس وقت ہندوستانی کے راستے میں سنگ گراں معلوم ہوتے ہیں۔ ہندوستانی نہ صرف ہمسایہ اقوام کے ساتھ خوشگوار تعلقات پیدا کرنے کا موجب ہوگی بلکہ ایک صُوبے میں باہمی تنازعوں اور جھگڑوں کو مٹائیگی۔ ممالک غیر کی نظروں میں ہندوستان کی وقعت کو بڑھائیگی اور اپنے عام فہم اور مفید لٹریچر کی بدولت بہت جلد ان زبانوں کی ہم پلّہ بن جائیگی جو اس وقت اپنے ادبی ذخیروں اور کارناموں پر ناز کرتی ہیں ؂

فنّ تنقید

تنقید: | قُدرت نے انسان اور حیوان کو اچھّی اور بُری چیزیں تمیز کرنے کی قوّت ارزانی فرمائی ہے۔ حیوانات بے زبان ہیں اور الفاظ میں اپنے احساسات کو ظاہر کرنے سے قاصر ہیں اس لئے وہ اپنی حرکات وسکنات کے ذریعہ دلی نفرت اور رغبت کا اظہار کرتے ہیں۔ اور حضرت انسان اپنی قوّت گویائی اور حرکات وسکنات دونو کو کام میں لاکر اپنے دلی جذبات اور طبعی میلان دکھاتے ہیں۔ جوں جوں ان کی قوّت تمیز ترقی کرتی ہے احساسات بھی تیز تر ہوتے جاتے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ بُرے بھلے کی تمیز میں بھی نفاست اور تکلّف بڑھتا جاتا ہے۔ فن تنقید وتبصرہ انہی احساسات ممیزہ کی سریع الاثری کا مرہون منت ہے کہ انسان اپنی فراست اور ذکاوت کی مدد سے ادبی کارناموں کی خُوبیوں اور خامیوں سے بحث کرکے اپنے حالات اور واقعات کو فلسفۂ کائنات اور انسانی حالات سے منطبق کرنے کی کوشش کرتا ہے،

ارتقائے تنقید | اگر ہم ادبیات کی ابتدائی کُتب کا مطالعہ کریں

تو فن تنقید بھی ابتدائی مراحل میں نظر آئیگا۔ کسی اچھے شعر کو سن کر یا عمدہ نثر کو دیکھ کر کسی سنجیدہ اور معقول آدمی کا واہ واکہدینا یا تکیف ہوکر گردن ہلا دینا اس پر بہت بڑی تنقید سمجھی جائیگی لیکن ترقی کے منازل طے کرنے کے بعد باریک بین اور دُور رس نظریں محض سطحی نکتہ چینی اور اشاراتی حرکات پر اکتفا نہیں کرتیں بلکہ وہ نقد و نظر کے بے پایاں اور ناپیدا کنار سمندر کی تہ میں سے موتی نکالتی ہیں اور ہر بات میں وہ وہ مُوشگافیاں کرتی ہیں کہ دیکھنے والے ورطۂ حیرت میں غرق اور ان ادبی کاوشوں کی داد دینے پہ مجبور ہو جاتے ہیں ؛

علم ادب میں سب سے پہلے فن تنقید کو ارسطو اور افلاطون نے رُوشناس کرایا۔ اور ادبی تنقید کے متعدد اصول مرتب کئے پھر یورپ کے علماء نے ان مختصر مگر جامع اصولوں پر بڑی بڑی سنگین اور عالیشان عمارتیں کھڑی کر لیں۔ لیکن مشرق کے باشندے اپنی قدامت پرستی اور ناواقفیت کی بدولت محض ارسطو کے قائم کردہ اصولوں پر ہی قائم رہنا اپنے لئے باعث فخر سمجھے اور انہی ابتدائی اُلجھنوں میں پھنسے رہے۔ گزشتہ سَو سال میں جب مغرب کی علمی روشنی سے مشرق میں چراغ جلائے گئے اور علم و ادب کے دریا کی رو نے ادھر کا رُخ بدلا تو چمن اُردو کے باغبانوں کا انگریزی ادب کے سرسبز اور لہلہاتے

باغ دیکھ کر دل لہرایا۔ ان کو اپنی پیاری زبان کی ناداری پر ترس آیا۔ اور ان کی توجہ اس طرف منعطف ہوئی۔ ممالک مغرب کے ادیب میدان ادب میں بہت آگے بڑھ چکے تھے اُردو زبان کی عمر اور وسعت ہی کتنی ہے۔ لیکن اس کی ہمہ گیری اور علم دوستی علم کے ہر شعبے کو اپنے دامن میں پناہ دینے کو تیار رہی۔ اُنیسویں صدی کے پہلے ساٹھ سال تک فن تنقید اُردو زبان میں انہی ابتدائی مراحل میں تھا جو ارسطو اور افلاطون نے مقرر کیئے تھے، اور اُردو دان طبقہ مغرب کی ان تنقیدی مُوشگافیوں سے قطعی بے خبر تھا، جو مغرب کے ادیبوں کی بلند خیالی اور عرق ریزیوں کا نتیجہ تھیں، غرض انگریزی ادب نے اُردو پر اثر ڈالا اور تعلیم یافتہ طبقہ مغربی طرز پر تنقید کرنے کی طرف متوجہ ہُوا۔ بے شک اُردو ادبیات کی ترقی کے ساتھ ساتھ فن تنقید نے بھی ترقی ضرور کی ہے لیکن ابھی ضرورت ہے کہ ادیب اس طرف پوری توجہ صرف کریں۔ ہمارے ملک میں فن تنقید بہت ہی آسان خیال کیا جاتا ہے حالانکہ یہ فن وہ فن ہے جو مشکل ترین فنوں میں شمار ہونا چاہیئے، اگرچہ اُردو ادبیات کا دامن کم و بیش پانچ صدیوں پر پھیلا ہُوا ہے لیکن اس میں ایسی کتابیں نہ ہونے کے برابر ہیں جن میں نئے اصولوں پر کسی ادبی کارنامہ پر بحث و تمحیص کی گئی ہو۔

ہمارے ہاں فن تنقید شروع سے لے کر اب تک تنگ نظری۔ تعصب۔ شخص پرستی اور نامنصفانہ جانبداری کا شکار رہا ہے اور اس کی وجہ زیادہ تر یہ ہے کہ وہ لوگ جنہوں نے تنقیدنگاری کے فرائض انجام دیئے ہیں وہ عام طور پر علم تنقید نگاری کے اساسی اور ترقی یافتہ اصولوں سے پوری طرح واقف نہیں۔ اس لئے ان کی تنقیدیں عموماً سطحی۔ غیر فنّی اور نامنصفانہ کہلانے کی سزاوار ہیں،

۱۸۵۷ء کی گیر دار سے پہلے جس قدر ادبی تذکرے مرتب ہوئے بدقسمتی سے ان کی تنقیدیں عموماً قدیمی روائیتوں اور حکائیتوں کے اثر سے یک طرفہ تھیں، اگر اس وقت کے ماحول کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ ان ایام میں لکیر کے فقیر ہونے ہی سے صحت مذاق اور علوئے خیال کی سندیں ملتی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ قدیم زمانے کی تنقیدیں نقادوں کی تنگ نظری کی غمازی کرتی ہیں۔ چنانچہ غالب کا اپنے ہمعصروں میں نمایاں ہو کر نہ چمکنا اس دعوے کی روشن دلیل ہے ؛

بزرگوں سے سُنا ہے اور بعض تذکروں میں بھی مذکور ہے کہ "اُردو اخبار" میں جو ۱۸۳۶ء میں مولانا آزاد کے والد نے دہلی سے جاری کیا تھا، شہیدی کی شاعری پر مدتوں تنقیدی بحث جاری رہی۔ افسوس کہ وہ اخبار اب ناپید ہے اس لئے

اس کے متعلق کسی قسم کی قیاس آرائی مناسب نہیں لیکن اس بیان سے اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ مخالفین اور موافقین دونوں نے اپنے اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کے لئے شہیدی مرحوم کے کلام پر مختلف ادبی پہلوؤں سے بحث کی ہوگی اس بیان سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اس وقت ہمارے ادیبوں میں تنقید کا شوق ترقی کر رہا تھا، اور فن تنقید روایتی قیود سے آگے بڑھنا چاہتا تھا، ۱۸۵۷ء کے انقلاب سے جب زندگی کے ہر شعبہ میں انقلاب آیا۔ تو نقد و نظر کا نقطہ نظر بھی تبدیل ہوا، تنقیدی انقلاب نے سب سے پہلے "تذکرۂ آب حیات میں ظہور کیا، یہ تذکرہ اپنی تنقیدوں میں انقلابی خصوصیتیں رکھتا تھا اس لئے اس کے چھپتے ہی ادبی حلقوں میں ایک ہنگامہ برپا ہوگیا۔ مولانا آزاد کے شاگرد رشید حضرت ناصر نذیر فراق مرحوم فرمایا کرتے تھے کہ لکھنؤ کے ایک صاحب نے اس کا جواب لکھا، لیکن ملک نے اس کو قبول نہ کیا اس لئے اب اس کا کوئی نام بھی نہیں جانتا، بہرحال یہ نامعلوم تذکرہ مرزا دبیر کے خاندان میں سے کسی شخص نے لکھا تھا، بنائے مخاصمت یہ تھی کہ آزاد مرحوم نے مرزا دبیر پر میرانیس کو ترجیح دی تھی، اور مرزا صاحب کے والد کو کاغذ فروش بتایا تھا، ان بزرگ پر اس تحقیق نے ناقابل برداشت تازیانہ لگایا جس کے اثر سے انہوں نے پورے تذکرۂ آبحیات کا

جواب لکھ مارا۔ ظاہر ہے کہ وہ گُم شدہ تذکرہ گو معاندانہ سہی لیکن ادبی دلچسپیوں اور موشگافیوں سے خالی نہ ہوگا ؂

اس کے علاوہ آب حیات کی اشاعت کا اثر سب سے زیادہ غالب کے ہواخواہوں پر ہُوا۔ ان کا خیال تھا کہ آزادہ مرحوم نے غالب کے مقابلے میں ذوق کو چمکایا ہے اور غالب کے ساتھ سخت ناانصافی کی ہے۔ چُنانچہ حالی مرحوم نے جو غالب کے چہیتے شاگرد تھے یادگار غالب کے نام سے ایک ضخیم کتاب لکھ کر اپنے اُستاد کے کلام کے محاسن کو اُجالا تاکہ آب حیات کی جادُو بیانی اور اس کی ہمہ گیر مقبولیّت غالب کو گوشۂ گمنامی میں نہ ڈال دے۔ اُردو ادب سے دلچسپی رکھنے والے یادگار غالب کے اثرات کے قائل ہیں اور مولانا حالی کی ادبی کاوِش اور تنقیدی تحقیقات کی ہمیشہ داد دیتے رہیں گے۔

۱۸۷۰ء میں سرسید احمد خاں مرحوم نے تہذیب الاخلاق کے نام سے ایک رسالہ جاری کیا اور اس کے ذریعے ہندوستان کے قدیمی علوم و فنون کو زندہ رکھنے کی کوششیں صرف کیں۔ اس رسالے کے مقاصد بہت وسیع اور جامع تھے، چنانچہ تنقیدنگاری کے میدان میں بھی یہ رسالہ پیش پیش اور آزادخیالی کا علمبردار تھا، اور ہر بات میں اپنے بانیوں کی وُسعت نظر اور روشن خیالی کو ثابت کرتا تھا، مولانا حالی کی زندگی پر اس رسالے کے

بانی سرسید کے خیالات کا سب سے گہرا اثر پڑا وہ خوبیاں جو فطرت نے ان کے دل و دماغ میں ودیعت رکھی تھیں سرسید مرحوم کی آبیاریوں اور ہمت افزائیوں سے بارآور ہوئیں۔ اور انہوں نے تنقیدی نقطۂ نظر سے متعدد تصانیف کا ادب اُردو میں اضافہ کیا۔

حالی کی تنقید نگاری نے یادگار غالب سے جنم لیا اور وہ شعروشاعری، حیات سعدی اور حیات جاوید وغیرہ پر ختم ہوئی، اسی دور میں شبلی نعمانی افق اُردو پر ظاہر ہوئے، ان کی ذات میں مذہبی تقدس اور شوق ادبیات دونو مجتمع تھے اگر ان دونو مصنفوں کے تنقیدی کارنامے سامنے رکھے جائیں تو اُردو میں فن تنقید ایک مستقل فن کی حیثیت سے نظر آئیگا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اُردو ادبیات میں ابھی تک فن تنقید کو وہ اہمیت حاصل نہیں جو مغربی ممالک میں ہے۔ اس لئے ضرورت ہے کہ ادیب اس طرف متوجہ ہوں اور اپنی زبان کے علمی خزانوں میں مغربی ادب سے تنقیدی علم کی دولت منتقل کریں۔ اور اُردو ادبیات کو مالا مال کریں کیونکہ ادب کی تربیت اور ترقی کے لئے ترقی یافتہ معیار تنقید سے واقف ہونا ازبس ضروری ہے۔

فن تنقید کیا ہے	ہمارے ادیب متقدمین اور متاخرین کی طرح

اب تک فن تنقید کو فن تنقیص سمجھے ہوئے ہیں۔ گزشتہ صدی کے ادیب تنقید کو تقریظ کہتے تھے اور اس سے ادیب کی محض تحسین و تعریف مراد لیتے تھے، ان دونو تعریفوں میں جو تضاد ہے اس سے غلط فہمیاں پیدا ہوتی رہی ہیں اور ہمیشہ پیدا ہوتی رہینگی اور جب تک ہم لوگ تنقید کے صحیح مفہوم سے واقف نہ ہونگے ان کا امکان ہمیشہ باقی رہیگا۔

وہ لوگ جو تنقید کا مقصد کسی ادیب کے ادبی کارنامے کی بُرائیاں اور سُقم ظاہر کرنا سمجھے ہیں ہمارے ادب پر کُند چھری چلاتے اور ادبی ترقی کی راہیں مسدود کرتے ہیں۔ نیز وہ تنقید نگار جن کا مقصد صرف زیر تنقید تصنیف کی تعریفوں کے پُل باندھنا ہے وہ ادیبوں کو گمُراہ کرنے کے موجب ہیں افسوس کا مقام ہے کہ غلط تنقیدوں کی بدولت اکثر صاحب کمال ادیب جن کی ہمّت افزائی لازم تھی ادبیات سے متنفر ہو گئے اور سخن ناشناس احباب کی تعریفوں سے بہت سے نام نہاد ادیب مدارج کمال پر پہنچ گئے ظاہر ہے اس غلط روی نے ہماری ادبیات کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا۔

تنقید کے اصلی معنے یہ ہیں کہ کھرے اور کھوٹے میں تمیز کی جائے محاسن اور معائب کو ساتھ ساتھ اس طرح دکھایں کہ دُودھ کا دُودھ اور پانی کا پانی الگ ہو جائے۔ اگر کہیں

سرزنش کی ضرورت ہو تو اس خوبصورتی اور عمدگی سے اس ناگوار فرض کو ادا کیا جائے کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے، گویا نقاد کا فرض ہے کہ وہ تنقید سے تخلیقی اور تعمیری کام لے نہ کہ تخریبی اور تعزیری، بعض نقادوں کا تو یہ خیال ہے کہ نقاد کو معائب کی طرف جانا ہی نہیں چاہیئے لیکن ہم ایسی تنقید کو صحیح تنقید کہنے کے لئے تیار نہیں جس میں کسی ادبی کارنامے کے حسن و قبح کو عمدگی سے نہ دکھایا جائے۔ بعض غلط فہمیوں کی بنا پر ہمارے اکثر تنقید نگار تنقید کرتے ہوئے ذاتیات کی بحث میں پڑ جاتے ہیں۔ یاد رکھنا چاہیئے کہ ایسی تنقید جس میں ذاتی قضیوں کی بحث ہو صحیح تنقید نہیں کہلائی جا سکتی، وہ تو تنگ نظری اور تعصب سے آلودہ ہو جاتی ہے۔ اور ادب سے اس کا کوئی تعلق باقی نہیں رہتا۔

مغربی نقادوں کے آرا ہم عرض کر چکے ہیں کہ ہمارے ملک میں فنِ تنقید ابھی تک ابتدائی حالت میں ہے۔ برخلاف اس کے مغرب میں یہ فن بہت ترقی کر چکا ہے اور ان کے ہاں اس فن کی تربیت اور تحصیل کے لئے مستقل تصانیف موجود ہیں۔ ہم چند ایک مغربی ادیبوں کی بیش قیمت آرا کا ترجمہ پیش کرتے ہیں جن کے مطالعہ سے بخوبی سمجھ میں آ جائیگا کہ وہ تنقید سے کیا مراد لیتے ہیں:-

۱۔ رابرٹسن تنقید انسانی معلومات کے تمام شعبوں کے متعلق

صرف مقابلہ کرنے یا خیالات کے ٹکرانے کو کہتے ہیں ؎
٢- کاڈکن.... کسی کام کے کرنے کے دو طریقوں کے درمیان موازنہ کرنا اصلی تنقید ہے ؎
٣- ولیم ہنری ہڈسن تنقید وہ ادب ہے جو ادب کے متعلق لکھا گیا ہو۔ خواہ اس میں مصنّف کی ترجمانی کرنے کی کوشش کی گئی ہو خواہ تعریف و توصیف کی یا تجزیہ و تشریح کی ؎
٤- اناطول فرانس .... بہترین تنقید وہ ہے جس میں نقاد ان کیفیات کو بیان کرتا ہے جن کو اس کی روح کسی ادبی کارنامے سے حاصل کرتی ہے ؎
٥- چارلس سونبرن... سب سے مشکل اور اہم کام جو نقاد کرسکتا ہے وہ یہ ہے کہ کسی تصنیف کے ادبی محاسن کو پہچانے اور پھر یہ معلوم کرے کہ مصنف کی صناعی سے وہ کیونکہ محاسن بن گئے
٦- میتھیو آرنلڈ.... اپنی معلومات کے ذریعہ شگفتہ اور صحیح خیالات پیدا کرنا تنقید ہے ؎
٧- سر والٹر رالے ... مُردہ مصنفوں اور ان کے ادبی کارناموں کو زندہ کرنا تنقید ہے ؎

تنقید کے دو طریقے | ان خیالات سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ تنقید کا صحیح مفہوم کیا ہے۔ حقیقتاً فن تنقید اس قدر وسیع ہے کہ اس کی کوئی جامع اور مانع تعریف نہیں ہو سکتی ؛

بہر حال آجکل تنقید کرنے کے دو طریقے رائج ہیں تنقید نگار کسی ادبی کارنامے کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے اور آخرکار کسی خاص دل خوش کن یا یاس انگیز نتیجے پر پہنچ جاتا ہے

یا کسی تصنیف کو شروع سے آخر تک بغور دیکھنے کے بعد متفرق واقعات کو نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ بیان کر دیتا ہے۔ ظاہر ہے پہلی قسم کی تنقید ہر ادیب کا کام نہیں، اس کے لئے وسعت نظر منظم تخیل اور حسن بیان کی ضرورت ہے۔ لیکن دوسری قسم کی تنقید پر آسانی سے خامہ فرسائی کی جا سکتی ہے ممالک مغرب میں بھی دو طریقے عام طور پر رائج ہیں۔ اور ہمارے نئے نقاد اکثر انہی کی پیروی کرتے ہیں +

تنقید کے مقاصد اصلی

تنقید کا بہترین مقصد یہ ہے کہ نقاد زیر بحث ادبی کارنامہ کی صداقت کی تحقیق کرے اور وہ معلومات اور حقائق جو یہ ادبی کارنامہ ہمارے سامنے پیش کرتا ہے ان کا مقابلہ عام انسانی حالات سے کرکے دیکھے کہ فلسفۂ حیات سے ان کا کیا تعلق ہے۔ نیز یہ کہ زیر تنقید ادبی کارنامہ ادب کے معیار پر پورا بھی اترتا ہے یا نہیں، اور اس میں وہ خصوصیات موجود ہیں جو ایک ادبی کارنامے میں ہونی ضروری ہیں۔

تنقید کا مادہ چونکہ ہر انسان کی فطرت میں ودیعت ہے۔ اس لئے ہر شخص ہر چیز کے متعلق کچھ نہ کچھ رائے ضرور رکھتا ہے۔

لیکن یاد رہے ادبی تنقید محض رائے کے اظہار سے بالاتر ہے۔ اس کے لئے مبلغ علم۔ وسعت نظر اور حقائق شناسی کی ضرورت ہے۔ اور اس کے ساتھ حُسن بیان بھی لازم ہے تاکہ اپنی رائے کو نہایت موزوں اور مناسب الفاظ میں ظاہر کیا جاسکے۔ اس اصول کے ماتحت ایک عالم اور عامی کی تنقید میں جو فرق ہو سکتا ہے اس پر بحث کرنی بیکار ہے غالباً اسی وجہ سے مختلف علمیتوں اور مزاجوں کے انشا پردازوں اور ادیبوں نے تنقید کے مختلف مقاصد پیش کئے ہیں۔ جن کا یکجا کرنا نقیضین کو جمع کرنے کے مرادف ہے۔ ہاں وہ اصول اور قواعد جن پر سب متفق ہیں ضرور مفید ہوسکتے ہیں ؂

انشا پردازوں اور ناقدوں کا متفقہ فیصلہ ہے کہ ادب سے مادی فائدے کی امید رکھنا اس کی رُوحانی اور جمالیاتی خصوصیات کو خاک میں ملا دیتا ہے ادب کا حقیقی منشا یہ ہے کہ اس سے رُوح کو انبساط ہو۔ جب کوئی ادبی کارنامہ سامنے آئے تو انسان مادی دُنیا کے تفکرات اور کشاکش حیات کے بکھیڑوں کو بھول جائے۔ اور جتنی دیر اس کے مطالعہ میں مستغرق رہے اپنے آپ کو عالم بالا میں پائے۔ بجنسہٖ یہی مقصد ادبی تنقید کا ہے جب کوئی نقاد کسی ادبی کارنامہ پر تنقید کرنے کو بیٹھے تو اس کا تعلق عالم مادیات سے منقطع ہو جائے اور وہ عالم محسوسات میں ایک آزاد اور خوشنوا

طائر کی طرح اُڑتا پھرے، ظاہر ہے اس عالم بالا کی گردش میں جو مسرت اور انبساط حاصل ہوگی وہ نقاد کا دل ہی محسوس کر سکتا ہے۔ اور ہر شخص اس کی پرواز کے لطف نہیں اٹھا سکتا۔

تنقید بذات خود ادب ہے۔ اس لئے اس کے مقاصد وہی ہو سکتے ہیں جو ادب کے ہیں یعنی طرح طرح کی کیفیتوں کا طاری ہونا۔ مصنّف کے خیالات کی رو میں بے بس ہو کر بہے جانا وغیرہ وغیرہ لیکن تنقید تخلیق ادب سے مشکل فن ہے۔ ہر پڑھا لکھا شخص ادیب بن سکتا ہے لیکن نقاد نہیں بن سکتا، ہمارے ہاں بھی یہ مثل مشہور ہے کہ شعر کہنا آسان ہے لیکن شعر کو سمجھنا مشکل ہے۔ اس بیان میں بھی تنقید ہی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

کسی مصنّف کے کلام کو ادبی معیار سے جانچنا اور اس میں ان خوبیوں اور خصوصیتوں کو دکھانا جو عوام کی نظروں سے پوشیدہ ہیں تنقید نگار ہی کا کارنامہ ہے۔ اگر نقاد کسی ادیب کے جوہر نہ دکھائیں تو بہت سے مصنّف گمنام رہ جائیں۔ مثال کے طور پر ہم غالب کا نام نامی پیش کر سکتے ہیں۔ اگر تنقید نگار غالب کے کلام کی طرف توجہ نہ کرتے تو غالب کو موجودہ شہرت اور عظمت ہرگز نصیب نہ ہوتی، ان کے ملفوظات کی گہرائیوں تک پہنچنا اور ان کے مخصوص فلسفہ کو فلسفۂ زندگی سے منطبق کرنا ناقدوں ہی کا کارنامہ ہے، قابل نقاد اکثر اوقات ان حقائق تک

پہنچ جاتے ہیں جو اصل مصنّف کے دل و دماغ میں بھی نہیں گزرتے، تنقید نگار مصنّف کے کلام کا باقاعدہ تجزیہ کر کے اس کے ہر پہلو پر روشنی ڈالتے ہیں اور ثابت کرتے ہیں کہ مصنف کس پائے کا ہے اس نے اپنے موضوع کے کونسے حصّے کو نمایاں کر کے دکھایا ہے اور کونسا باب ناقدوں کے لئے دھندلکے میں چھوڑ دیا ہے۔ اس کے ظاہرا الفاظ سے کیا مراد ہے اور اندرونی طور پر وہ کس مسئلہ زندگی کو حل کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس کے علاوہ اس کی تصنیف میں ظاہر اور پوشیدہ خوبیاں اور خرابیاں کیا کیا ہیں۔ اس سے یہ نہ سمجھ لینا چاہیئے کہ نقاد کا فرض یہیں ختم ہو جاتا ہے۔ اس کا ایک اہم فرض یہ بھی ہے کہ وہ ان غلط فہمیوں کا ازالہ کرے جو کسی ادبی کارنامے کے متعلق کسی وجہ سے پیدا ہو گئی ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ محاسن کلام کا تجزیہ کر کے اسے اس طرح دکھائے کہ مصنّف کے اصلی جوہر نمایاں ہو جائیں۔

تنقید کا بہترین فائدہ یہ ہے کہ جن ادیبوں کی ادبی عظمت سے ہم واقف ہونا چاہتے ہیں صرف نقادوں کی تنقیدیں پڑھ کر یعنی بغیر ذاتی محنت اور تحقیق کے ہم پوری واقفیت حاصل کر لیتے ہیں برخلاف اس کے اگر ہمیں بذات خود ہر مصنّف کے متعلق تنقیدی چھان بین کرنی پڑے تو تھوڑی سی زندگی میں ہم بہت کم

ادیبوں کی ادبی عظمت سے واقف ہو سکتے ہیں ۔

تنقید، جہاں ادیبوں کو صحیح ادبی راستے پر گامزن رکھتی ہے اور بھٹکنے سے بچاتی ہے وہاں ایسے لوگوں کو ادیب بننے سے روکتی ہے جو خواہ مخواہ ادیبوں کی صف میں شامل ہو جاتے ہیں اس کے علاوہ صحیح تنقید ان حقیقی ادیبوں کی طبیعتوں کو اُکساتی ہے جن کے دل و دماغ میں ادبی جوہر پوشیدہ ہوتے ہیں لیکن غلط مذاق ادب ان کو چمکنے کا موقعہ نہیں دیتا ۔

صحیح تنقید کے ذریعے صحیح ادبی مذاق پیدا ہوتا ہے ۔ تمام ادیب اس بات پر متفق ہیں کہ ہر قوم کا ادب ان کی حقیقی زندگی کا آئینہ ہے ۔ اگر ادب بگڑتا ہے تو قوم بھی بگڑتی ہے ۔ اور اگر قوم تنزل پذیر ہوتی ہے تو اس کا ادب بھی اس کا ساتھ دیتا ہے ۔ ایسے نازک موقع پر تنقید نگار ہی آڑے آتے ہیں اور قوم کے مذاق کو درست کر کے اسے پستی کی طرف جانے سے روک لیتے ہیں ۔

تنقید کے ذریعے ایسے انشا پردازوں کی روک تھام کی جا سکتی ہے جو بے راہ روی اور خود غرضی سے غلط معتقدات اور باطل خیالات کی اشاعت اپنا شعار بنا لیتے ہیں یا ذاتی عناد اور تفرقہ پردازی کے ماتحت قومی ادب کو نقصان پہنچاتے ہیں تنقید ایسے ہی ادیبوں کے لئے زبردست محاسب کا کام دیتی ہے ۔

تنقید نگار کے فرائض تنقید کے مقاصد سمجھ لینے کے بعد تنقید نگار کے فرائض بھی کسی نہ کسی حد تک ضرور واضح ہو جاتے ہیں لیکن ہم مغربی نقادوں کی بیش قیمت آرا سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے ان کو الگ ترتیب دیتے ہیں تاکہ ہمارے ناظرین کے لئے وہ مشعل ہدایت کا کام دیں ۔

۱۔ جیسے ایک کامیاب طبیب کی کامیابی کا راز اس کی ذہانت فراست اور فنی قابلیت میں مضمر ہے اسی طرح نقاد کی کامیابی اس کی خداداد تنقیدی قابلیت پر منحصر ہے ۔

۲۔ نقاد کا اوّلین فرض یہ ہے کہ وہ ادیب کی عظمت کو تلاش کرے ۔ اس کے پوشیدہ جوہروں کو چمکائے اور اس کے مخصوص نقطۂ نظر سے اس کے خیالات کی ترجمانی کرے ۔

۳۔ نقاد کو چاہئے کہ وہ ایک کامیاب مقرر کی طرح عوام کو مخاطب کرے اور ادیب سے مخاطب نہ ہو۔ اس طریق کار سے ذاتیات کی بحث چھڑ جانے کا اندیشہ بالکل پیدا نہیں ہو سکتا ۔

۴۔ نقاد بننے کے لئے وسیع مطالعہ ۔ صائب رائے ۔ صحیح ادبی مذاق ، منطقی مزاج اور دقیقہ رس طبیعت کی ضرورت ہے ۔

۵۔ نقاد کا کام یہ نہیں ہے کہ وہ کھوٹے کھرے ہی کو جانچتا رہے کبھی ادیب کو جھٹلائے اور کہیں اس کی گوشمالی کرے اس کا فرض یہ ہے کہ وہ اس کے ادبی کارنامے کی وضاحت

کر کے، خود خوش ہو اور دوسروں کو بھی اپنی خوشی میں شریک کرے، نیز زیرِ تنقید ادبی کارنامے کی حقیقی عظمت کو اُجاگر کر کے ہمارے دل و دماغ پر پہلے سے زیادہ گہرے اور نمایاں نقوش پیدا کر دے۔

۶۔ چونکہ تنقیدی اصول نقادوں کی چھان بین اور تحقیقات سے مرتب ہوتے ہیں اس لئے تنقید نگار کا سب سے اہم فرض یہ ہے کہ پوری پوری تحقیق اور تفتیش کے بعد اپنے فیصلے صادر کرے۔ اور اپنی رائے کو ظاہر کرنے سے پہلے مصنّف کی قلبی کیفیتوں اور تخیئلی گہرائیوں کا اچھی طرح جائزہ کرتا کہ کسی قسم کی غلطی کا امکان باقی نہ رہے۔ اس کے علاوہ نقاد کو ان امور سے بدرجۂ اتم واقفیّت حاصل کرنے کی ضرورت ہے جن پر زیرِ تنقید مصنّف نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ تاکہ مصنّف کے خیالات کی تنقیح اور تشریح کرنے میں کوئی کمی نہ رہ جائے۔ ناقد کو مصنّف کی ذات اور اس کے خیالات اور حالات سے پُوری آگاہی ہونی چاہیئے تاکہ اس کے مخصوص نقطۂ نظر سے موضوع کے ہر پہلو پر نظر ڈالی جا سکے۔

۷۔ تنقید نگار کو لازم ہے کہ وہ پُرانے تنقید نگاروں کے خیالات اور تحقیقات سے مکمل استفادہ کرے تاکہ نئے اور پُرانے زمانے کے مقاصد و اصول تنقید سے واقف ہو جائے۔ اور ان کی

روشنی میں موازنہ اور مقابلہ کرنے میں کوئی دقّت پیش نہ آئے۔ مثل مشہور ہے چراغ سے چراغ جلتا ہے۔ اگر مختلف قسم کی آرا سامنے ہوں تو انسان بہت جلد اور آسانی سے کسی خاص نتیجے پر پہنچ سکتا ہے۔

۸۔ نقاد کو ادب کے ہر شعبے سے واقف ہونا چاہیئے۔ جملہ صنافِ سخن کی واقفیت تنقید نگاری کا اصل اصول ہے۔

۹۔ ادبی تنقید نگاری کے لئے ادبی تاریخ سے بھی پوری آگاہی ہونی چاہیئے تاکہ زمانۂ ماضی کے ادوار کی ادبی نشوونما اور عروج و زوال کے اسباب نقاد کے پیش نظر رہیں۔

۱۰۔ جس فن کی تصنیف پر تنقید کی جائے اس فن سے بھی کماحقّہ واقفیت ہونی چاہیئے تاکہ کوئی ایسی بات قلم سے نہ نکل جائے جو صدا بصحرا ثابت ہو اور تنقید کی اہمیت اور ناقد کی شخصیت کو نقصان پہنچائے۔

۱۱۔ تنقیدی رائے ہمیشہ تعصّب اور تکلّف سے پاک ہونی چاہیئے گویا نقاد کا فرض ہے کہ وہ ہمیشہ غیر جانبدار رہے اور تنقید کرنے سے پہلے اپنے شخصی تعلّقات کو بھول جائے تاکہ زیرِ بحث کارنامے کے عیب و ثواب دونو سامنے رہیں اور کسی مسئلے کی تہ تک پہنچنے میں کوئی رکاوٹ پیش نہ آئے۔

۱۲ نقاد کا لہجہ اور زبان نہایت نرم اور ملائم ہونی چاہیئے سخت

تنقیدی لہجہ اختیار کرنے سے اکثر اوقات عوام مصنّف سے
بدظن اور ان کی ناقدردانی سے بعض حساس ادیب تخلیق ادب
سے متنفر ہو جاتے ہیں۔ تنقید کا بہترین اصول یہ ہے کہ مصنّف
کو اس کی کمزوریوں سے ایک ہمدرد دوست کی مانند آگاہ
کیا جائے لیکن ہمیشہ خیال رہے کہ اس کی دلشکنی نہ ہونے
پائے، اور اس کے ساتھ عوام پر بھی تنقید کا کوئی ناخوشگوار اثر
نہ پڑے ؛

۱۲- تنقید نگار کو ہمیشہ یاد رکھنا چاہیئے کہ اس کی تنقید کو بھی پرکھنے
اور جانچنے والے موجود ہیں۔ چونکہ تنقید سے نقاد کی قابلیّت
اور علمیّت کا اندازہ اور اس کے خیالات کی بلندی اور پستی
ظاہر ہوتی ہے اس لئے تنقید نگار کا ہر فیصلہ باوزن تولے
پاؤ رتی ہونا چاہیئے تاکہ اس کی علمیّت اور قابلیّت پر کسی قسم کا
اعتراض وارد نہ ہو ؛

ہم عرض کر چکے ہیں کہ تنقید نگار ادبی مذاق کو سنوارنے والے
اور بھٹکے ہوئے ادیبوں کے لئے خضرِ راہ ہیں لیکن یاد رہے
ان کی نگہداشت بھی ازبس ضروری ہے - جیسے ادیبوں
کو آزاد چھوڑ دینا قوم اور اس کے ادب کے لئے خطرناک
ثابت ہو سکتا ہے اسی طرح تنقید نگاروں کی بے راہ روی
اور کج بحثی بھی خطرے سے خالی نہیں۔ اس لئے کسی تنقید کو

قبول کرنے سے پہلے ہمیں نقاد کے معیار تنقید کا ضرور تجزیہ کر لینا چاہیئے ۔

اصول تنقید

چونکہ عام طور پر تنقید مختلف جذبات اور احساسات کے ماتحت کی جاتی ہے اور نقادوں کا نظریۂ تنقید اور نقد علم ایک دوسرے سے مختلف ہوتا ہے اس لئے اصول تنقید کا مقرر کرنا نہایت دشوار ہے۔ بعض ناقدوں نے اس امر کی کوشش بھی کی ہے لیکن ان کو حسب دلخواہ کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ پھر بھی سطور ذیل میں ہم مبتدی کی رہنمائی کے لئے کچھ نہ کچھ اساسی تنقیدی اصول مقرر کرنے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ نو آموز نقاد کی طبیعت شروع ہی سے ایک صحیح راستے پر پڑ جائے اور تدریجی ترقی سے صحیح مذاق تنقید پیدا ہوتا چلا جائے ۔

۱۔ سب سے پہلے زیر تنقید ادبی کارنامے کی ظاہری شکل و صورت کا اچھی طرح جائزہ لینا چاہیئے تاکہ معلوم ہو سکے کہ مصنف اپنے ادبی کارنامے کے ظاہری خدوخال کی نگہداشت باحسن وجوہ کر سکا ہے یا نہیں۔ مثلاً اگر کسی نے کوئی افسانہ یا ڈرامہ لکھا ہے تو اس میں وہ خوبیاں موجود ہیں یا نہیں۔ جن کی بدولت ایک افسانہ افسانہ اور ایک ڈرامہ ڈرامہ کہلانے کا مستحق ہے یا اگر کسی شاعر نے کوئی نظم لکھی ہے تو اس میں اس مخصوص قسم

کی نظم کے لوازمات کی بھی نگہداری کی گئی ہے یا نہیں ؟
۲- نقاد کو ہمیشہ یاد رکھنا چاہیئے کہ متقدمین کے ادبی کارناموں کو زمانۂ حال کے ادبیات سے منطبق کرنا بڑی بھاری غلطی ہے ہر ادبی تصنیف اپنے زمانے کے خیالات اور حالات کا آئینہ ہوتی ہے - اور اس طرح سے ایک جداگانہ حیثیت رکھتی ہے- نقاد کا کام فقط اتنا ہے کہ وہ ادبی کارناموں کی ان خوبیوں کو تلاش کرے جو ادبی تشنگی کو دور کرتی اور احساسات لطیفہ میں ہیجان پیدا کرتی ہیں ؛
۳- موضوع کے لحاظ سے زبان اور اسلوب بیان میں کیا تعلق ہے - چونکہ ہر موضوع اور مبحث کے لئے ایک خاص انداز بیان اور مخصوص زبان کی ضرورت ہوتی ہے اس لئے اگر موضوع اور زبان کے تعلق کی نگہداشت نہ کی جائے تو مضمون بے لطف اور بے رنگ ہو کر رہ جاتا ہے - سودا کی غزلوں کو میر تقی کی غزلیں سامنے رکھ کر دیکھو- غزل کے لئے جس نرم و نازک اور جذبات انگیز زبان کی ضرورت ہے وہ میر صاحب کی غزلوں میں بدرجۂ اتم موجود ہے لیکن سودا کی غزلیات غزل کی زبان میں نہیں ؛
۴- مصنف کے ذاتی حالات - ماحول - اور اس کے ماخذوں پر پورا پورا عبور ہونا چاہیئے تاکہ مصنف کی دیانتداری اور

اس کی علمی ادبی قابلیت کا اندازہ ہو سکے۔ اگر نقاد زیر تنقید کارنامے کے ماخذوں سے ناواقف ہوگا تو کھوٹے کھرے میں تمیز نہیں کر سکیگا بلکہ وہ مصنف کے زور بیان کی رو میں بہتا چلا جائیگا۔ ہر قدم پر اس کے ساتھ غوطے کھائیگا اور اپنی منزل پر ایک طوفان زدہ اور شکستہ جہاز کی طرح پہنچیگا۔

۵۔ تنقید نگاری کا آخری اصول یہ ہے کہ تصنیف کی ادبی تکمیل پر نظر رکھی جائے۔ نقاد کی کامیابی کا دار و مدار اسی مخصوص اصول پر ہے۔ نقاد کا فرض ہے کہ وہ فطرت کے ان پہلوؤں کا جائزہ لے جو انہی صداقت اور حُسن سے دماغ کو متاثر کر سکتے ہیں اور دیکھے کہ اظہار حسن میں صداقت کا پہلو ملیامیٹ تو نہیں ہو گیا نیز معنوی اور ظاہری حسن کی نگہداشت کس حدتک کیگئی ہے کہ اس سے ترتیب و تناسب قائم ہوتا ہے۔ جہاں تفصیل تکمیل کی ضرورت ہے وہاں تشریح و توضیح سے کام لیا گیا ہے یا نہیں یا کہیں بیجا تفصیل بار خاطر تو نہیں ہو گئی۔ مصنف ذہنی مرقعے پیدا کر کے خلا کو پورا کرنے کی کوشش میں کس حدتک کامیاب ہوا ہے اس کے علاوہ زیر تنقید کتاب میں تناقص بیان تو نہیں کہ انشاپرداز کی یہ زبردست کمزوری ہے جا بجا متضاد بیانات سے مصنف کی ذاتی کمزوریاں ظاہر ہوتی ہیں۔ اور ان کے اثرات سے قارئین شش و پنج میں رہ جاتے ہیں گویا

وہ کسی فیصلہ کُن نتیجے پر نہیں پہنچتے ٭

افسوس ہے کہ اُردو زبان میں فنِ تنقید نے ابھی تک مستقل فن کی حیثیت اختیار نہیں کی اس مفید موضوع پر گذشتہ صدی کی صرف چند تصنیفات ہیں جو ابھی تک مستقل حیثیت رکھتی ہیں۔ باقی اللہ اللہ خیر صلاح درحقیقت یہ کام ان لوگوں کا ہے جو مشرقی اور مغربی علوم پر کامل عبور اور پوری دستگاہ رکھتے ہیں انہی معدودے چند حضرات کی کوششوں سے ہمارے فنِ تنقید کے نظریوں میں کچھ انقلاب پیدا ہُوا ہے ورنہ ہمارے عام تنقید نگار تو تنقید کا صحیح مفہوم سمجھنے سے بھی قاصر ہیں۔ اور جس طرح چاہتے ہیں ادبی کارناموں پر تنقیدی بحث کر ڈالتے ہیں ٭

اُردو زبان کے پاسبانوں اور باغبانوں کو بہت جلد فنِ تنقید کی طرف متوجہ ہونا چاہیئے کیونکہ ہر زبان اور قوم کی ترقی اس کے ادب کے عروج پر منحصر ہے۔ اور ادب کے عروج وزوال میں فنِ تنقید کو بہت بڑا دخل ہے۔ تنقید جہاں مُردہ ادبی کارناموں کو زندہ کرتی ہے وہاں قوموں کے خوابیدہ احساسات کو بھی بیدار کرتی ہے۔ غلط اور باطل خیالات کی بیخ کنی سے ذہنی ارتقاء کی منزلیں طے ہوتی ہیں اور مُردہ قومیں زندہ قوموں میں شمار ہونے لگتی ہیں تنقید کے ذریعے

ادیبوں اور ادب پسند طبیعتوں میں صحیح ادبی مذاق پیدا ہوتا ہے جس کا اثر براہ راست ملکی تہذیب و تمدن پر پڑتا ہے۔ اگر یہ سچ ہے کہ ہر قوم کا ادب اس قوم کی زندگی کی تفسیر ہے اور قومی عروج و زوال ادبی کارناموں میں مضمر ہے تو فن تنقید کو جاننا ہر ادیب کا فرض[1] ہے ؎



[1] اس مضمون کے لکھنے میں "رُوحِ تنقید" مصنفہ ڈاکٹر محی الدین قادری سے مدد لی گئی ہے ؎

ادب

ابتدائے تحقیقات

علوم و فنون کی تحقیقات اور مبادیات میں جو شرف یونان اور اہل یونان کو حاصل ہے وہ کسی اور ملک کو نہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ ہر نئے علم اور فن کی ابتدا یونان سے ہوتی تھی، باقی ممالک اس سے استفادہ کرتے اور یونانیوں کے قدم بقدم چلنے پر فخر کرتے تھے۔ گویا یونان ہی تہذیب وتمدّن اور علوم و فنون کا منبع خیال کیا جاتا تھا، یونانیوں نے اس دَور میں زندگی کے ہر شعبے میں تحقیق کے قدم بڑھائے اور ان میں کامیابیاں حاصل کیں۔ اسی دوران میں ادب کی تحقیقاتی تحریک کا بھی آغاز ہُوا۔ اور اس تحریک و تحقیق نے یہاں تک ترقی کی کہ تمام متمدّن اقوام عالم اس کی طرف متوجہ ہوگئیں۔ اب بھی جب کبھی ادبیات پر خامہ فرسائی کی جاتی ہے تو تحقیقات کا سلسلہ ہمیشہ یونانی ادیبوں کے پیش کردہ نظریوں سے ملایا جاتا ہے۔ کس قدر تعجب کی بات ہے کہ وہ اصول ادب جو ارسطو اور افلاطون نے آج سے سینکڑوں سال پیشتر قائم کئے تھے اب تک انتہائی وقعت اور

اہمیت رکھتے ہیں ۔ بلکہ یہ کہنا بیجا نہیں کہ اس وقت سے آج تک جس قدر عمارات ادب تیار کی گئیں ہیں ان کی بنیادیں انہی فلسفیوں کے فراہم کردہ مسالوں سے پختہ نظر آتی ہیں ۔

عبداللہ المامون کے عہد بابرکت میں جب عربوں نے اور علوم وفنون کے ساتھ یونانیوں کی کتابوں سے ادبیات کے اصولات اور قوانین نقد و نظر وغیرہ تراجم کے ذریعے حاصل کئے تو ان کی توجہ ادبیات کی طرف اور زیادہ بڑھ گئی ۔ چنانچہ انہوں نے اپنے ڈھنگ پر ادب کی مختلف قسمیں قرار دے کر تحقیق و تدقیق کے بعد ادب کی نئی نئی تعریفیں کیں ۔ لیکن درحقیقت ادبیات کے متعلق ان کے بنیادی اصول وہی یونان کے تھے، جن پر انہوں نے عربی مذاق کی سربفلک عمارتیں بلند کی تھیں ۔

ادب کی تعریف جب یونان کے علوم وفنون کو یورپ کے ممالک میں ترقی ہوئی ۔ تو علمائے یورپ کی نظریں بھی سب سے پہلے ادب ہی پر پڑیں حقیقت امر یہ ہے کہ ادب علوم کا ایک ایسا شعبہ ہے جس کے دلدادگان اور علوم کی نسبت بہت زیادہ ہیں ۔ ادبائے یورپ نے ادب کی ترقی میں بہت سرگرمی سے حصہ لیا، اور بڑی بڑی مُوشگافیاں کیں ۔ اس غیر معمولی دلچسپی کا اندازہ اس بات سے بہ آسانی ہو سکتا ہے کہ گزشتہ سو سال میں ان ادب پسند لوگوں نے

ادبیات کے متعلّق اس قدر کتابیں تصنیف کر دیں کہ انسان آسانی سے ان پر حاوی نہیں ہو سکتا، اگر یورپ کے تمام ادیبوں کی تصنیفات میں سے صرف ادب کی تعریفوں کے اقتباس جمع کئے جائیں تو ایک بہت معقول کتاب مرتب ہو سکتی ہے۔ ان ممالک کے ہر ادیب نے ادب کو ایک نئے نقطۂ نظر سے دیکھا ہے جو اس کی بلند خیالی اور وسعت نظر کی کافی سے زیادہ ضمانت ہے۔ افسوس ہے کہ ہماری زبان میں ادبی تحقیقات کی محض چند کتابیں موجود ہیں اور وہ بھی دَور حاضر میں لکھی گئی ہیں ان کتابوں کی تحقیقات زیادہ تر یورپین مصنّفین کی مرہون احسان ہے، اس سے پہلے جس قدر کتابیں ادبیات پر لکھی گئی ہیں وہ عربی کتب ادبیات سے ماخوذ ہیں۔ جن کی تحقیقات اگرچہ اٹل ہے لیکن بہت فرسودہ ہے،

ماہرین ادبیات عربی نے ادب کو شاخ در شاخ تقسیم کر کے اس کے متعلّق بہت کچھ اظہار خیالات کیا ہے۔ تقسیم ادب کے متعلّق ان کا خاص نظریہ یہ ہے کہ ادب دو قسم کا ہوتا ہے، اوّل طبعی اور دوسرے کسبی۔ طبعی ادب ان صفات کا نتیجہ ہے جن کو قدرت انسان کی طبیعت میں ودیعت رکھتی ہے۔ کسبی ادب درس وتدریس اور حافظہ کی مدد سے حاصل کیا جاتا ہے۔ اور وہ علوم جو اس کی تحصیل میں مدد دیتے ہیں۔ ان کو علم ادب

کہتے ہیں:۔

یورپین علمائے ادبیات کی رائیں ان قدیم عربی آرا سے بہت مختلف ہیں۔ یہ محققانہ آراء گذشتہ اور موجودہ صدی کی نئی تحقیقات اور ایجادات سے اثر پذیر نظر آتی ہیں۔ اور ہمارے سامنے ادب کی ایسی نئی شاہرائیں کھولتی ہیں جن سے تصورات کی دُنیا میں ایک قسم کا انقلاب پیدا ہو جاتا ہے۔ اگر ہم زیادہ غور و فکر کریں تو ان میں بہت کچھ تضاد بھی دکھائی دیتا ہے۔ لیکن انصاف یہ ہے کہ وہ کسی نہ کسی حد تک ادب کی صحیح تعریف ضرور کرتی ہیں۔ ہم یہاں ادب کی چند ایک ایسی تعریفیں درج کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ جو نہ صرف دلچسپ ہیں بلکہ کافی سے زیادہ اپنے اصلی مفہوم کو بھی ادا کرتی ہیں:۔

جان مورلے ......

ادب میں وہ کتابیں شامل ہیں جن میں خُلق۔ صداقت اور انسانی جذبات پر وسعت قلب اور سنجیدگی دماغ، اور دلچسپ طرز بیان کے ساتھ ساتھ بحث کی گئی ہو:۔

ہڈسن .....

ادب صرف ان کتابوں پر مشتمل ہے جو سب سے پہلے اپنے موضوع اور طرز بیان کے اعتبار سے عام انسانی مذاق کے مطابق ہوں۔ دوسرے ان میں ادیب نے زبان اور بیان کی

لطافتوں کو حاصل اصول قرار دیا ہو"۔

پاسنٹ ....

ادب نظم و نثر کے ان کارناموں کو کہتے ہیں جو تخیل کی پیداوار ہوں۔ اور زیادہ سے زیادہ افراد کو بہ نسبت کوئی عملی اثر ڈالنے یا تربیت دینے کے خوش رکھتے ہوں۔ اور خاص خاص معلومات بہم پہنچانے کی نسبت وہ معلومات عامہ کی بہم رسانی کی طرف زیادہ متوجہ ہوں۔

بروک ....

ادب لایق عورتوں اور مردوں کے لکھے ہوئے وہ احساسات اور خیالات ہیں جن کو پڑھ کر مسرت حاصل ہوتی ہے۔

ان تعریفوں کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ علم کے اور شعبوں کی نسبت ادب کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ دوسرے ادب انسانی تخیل کی پیداوار ہے۔ اس کا تعلق موضوع کی نسبت طرز بیان اور زبان سے زیادہ ہے اور وہ عام طور پر ان حقائق سے بحث کرتا ہے جن کا ظاہری تعلق مادیات سے نہیں ہوتا۔ گویا وہ ہماری جمالیاتی تشنگی کو دور کرتا ہے۔ اور اس کا مطالعہ ہمیں ایک قسم کی روحانی تسکین اور مسرت بخشتا ہے۔ اگرچہ عملی دنیا میں اس سے کوئی خاص فائدہ نہیں لیکن حقیقتاً وہ ایسے حقائق کو بے نقاب کرتا ہے۔ جن سے ہمارے دماغ کے

مختلف شعبے تہذیب و تربیت حاصل کرتے اور لطف اندوز ہوتے ہیں۔ الجرجانی کی تعریف کے مطابق اگر "ادب ہم کو غلطیاں کرنے سے روکتا نہیں۔ تو کم از کم ہماری غلطیوں کی تلافی ضرور کرتا ہے"۔[۱]

ادب اور فنون لطیفہ | خداوند کریم نے دُنیا میں مختلف قسم کے انسان پیدا کئے ہیں جو جُداگانہ قابلیتوں اور اوصاف کے مالک ہیں، ہر انسان اپنی مخصوص صفات اور قابلیتوں سے دوسرے انسانوں کی ضروریات زندگی مہیا کرنے میں مدد دیتا ہے۔ جن افراد کو خداوند تعالیٰ نے کسی فن لطیف سے متصف کیا ہے وہ ہمارے رُوحانیات اور جمالیات کے اشواق کو برقرار رکھنے کے لئے مواد مہیا کرتے ہیں۔ گویا فنون لطیفہ کا تعلق ہمارے ذوق جمالیات اور ذہنیات سے ہے۔ اور دیگر فنون کا واسطہ ہماری مادی ضروریات زندگی سے ہے۔

تمام علمائے ادب اس بات پر متفق ہیں کہ ادب کا دائرہ دوسرے فنون کے مقابلے میں بہت زیادہ وسیع ہے۔ کیونکہ کسی نہ کسی طرح انسانی زندگی کا ہر عمل دائرۂ ادب سے تھوڑا بہت تعلق ضرور رکھتا ہے۔ چنانچہ ادب فنون لطیفہ میں داخل ہے اور وہ نہ صرف فن لطیف ہے بلکہ سائنس بھی ہے اور علم بھی اس وجہ سے ادب پسند لوگوں کی تعداد اور علوم و فنون کے

دلدادگان کی نسبت بہت زیادہ ہے۔

دیگر فنون لطیفہ کی نسبت ادب کو زیادہ پسند اس وجہ سے کیا جاتا ہے کہ اس کا ذوق بہت آسانی سے پیدا ہو جاتا ہے۔ برخلاف اس کے دوسرے فنون لطیفہ کسی قدر دقّت سے حاصل ہوتے ہیں۔ اس لئے عوام ان کی طرف کم دلچسپی لیتے ہیں۔ اور یہ ادب کی خوبی ہے کہ وہ اور فنون کی نسبت زیادہ سہل الحصول ہے۔

بعض علما کا خیال ہے کہ ادب کا ہر شعبہ فنون لطیفہ میں شامل نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ ان میں سے ہر ایک فن لطیف کی خصوصیات کا مظہر نہیں۔ ان کے نزدیک اصناف ادب میں محض شاعری اور چند مخصوص اصناف کو فن لطیف کہا جا سکتا ہے۔

فنون لطیفہ میں عام طور پر معماری، سنگ تراشی، مصوّری، موسیقی اور شاعری کا شمار کیا جاتا ہے۔ یہ بحث مدّتوں جاری رہی ہے کہ ان فنون میں کون سے فن کو دوسروں پر برتری حاصل ہے۔ اس علمی مقدمہ کا فیصلہ کرنے کے لئے مصنّفوں نے دو طریقے اختیار کئے ہیں۔

(۱) وہ سب سے پہلے اس مادہ کو دیکھتے ہیں جس کے ذریعے کسی فن کی تکمیل یا ترتیب ہوتی ہے۔ اور مادہ کی کیفیت کو دیکھتے ہوئے فیصلہ صادر کرتے ہیں۔ مثلاً فن تعمیرات میں مسالہ مادی

ہوتا ہے۔ اور مادے کا درجہ سب سے گرا ہُوا ہے۔ اس لئے فنون لطیفہ میں تعمیرات کا درجہ سب سے پست ہے۔ اس سے برتر سنگتراشی کا۔ اس سے اوپر مصوری کا۔ پھر موسیقی اور سب سے آخر اور افضل شاعری کا کیونکہ اس کی ترتیب اور تشکیل میں مادیت کو بالکل دخل نہیں ؞

(۲) مقابلے اور موازنے کا دوسرا طریقہ مذکورہ بالا طریقے سے کچھ زیادہ مختلف نہیں۔ اس میں بھی وہی عرض اور جوہر کو فیصلے کا معیار قرار دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں جو چیزیں سُنائی دیتی ہیں انہیں قدرتاً ان چیزوں پر تفوق حاصل ہے جو دکھائی دیتی ہے۔ موسیقی اور شاعری کا دیکھنے کی نسبت سُننے سے زیادہ تعلق ہے اس لئے ان کو دیگر فنون لطیفہ پر فضیلت حاصل ہے۔ اور اس کی وجہ وہی ہے کہ ان کی تشکیل اور ترتیب سے مادی اجزا کا تعلق نہیں ؞

فن لطیف کی شناخت | علمائے ادب کے نزدیک ادب کا معیار صداقت ہے یہ ہم آیندہ صفحات میں ظاہر کرینگے کہ ادبی صداقت کسے کہتے ہیں۔ اظہار صداقت دو طریقوں سے ہو سکتا ہے۔ یا تو کسی خاص چیز یا واقعہ سے متعلق تمام حالات اور معاملات نہایت وفاداری اور دیانتداری کے ساتھ من وعن لکھ دیئے جائیں جس طرح کہ عام طور پر واقعہ نگار لکھا کرتے ہیں اور انمیں

اپنے خیالات اور احساسات کو بالکل شامل نہ کیا جائے یا اس کے متعلق ایک ایسا جذبات آمیز بیان دیا جائے جو پہلے بیان کی طرح محض خشک واقعات کا تسلسل نہ ہو بلکہ اس کو پڑھ کر اصلی واقعہ کی زندہ تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جائے اور معلومات عامہ کے ساتھ ساتھ دل و دماغ پر ایک مخصوص وجدانی کیفیت طاری ہو۔ پس اس آخری صنف کو جس میں اصل حالات بیان کرنے کی بجائے جذبات اور احساسات کو تحریک دی گئی ہے ہم ادب لطیف کہیں گے اور پہلی تحریر کو فنون لطیفہ سے خارج سمجھیں گے، اس تفصیل سے یہ بات بہت آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہے کہ فنون لطیفہ انسان کے دماغی روحانی اور وجدانی ذوق وشوق کے لئے ایک قسم کی لطیف غذا مہیا کرتے ہیں۔ بات یہ ہے فن لطیف کا ماہر محض سطحی واقعات کو نہیں دیکھتا۔ وہ واقعات کی تہ میں ایک نئی رُوح تلاش کرتا ہے اور جب وہ اپنے فن کی آزمائش کے لئے بیٹھتا ہے تو مشاہدات کی رَو میں اپنے ان لطیف اور پاکیزہ جذبات واحساسات بھی قلم و کاغذ کے سپرد کر دیتا ہے۔ جو مشاہدات سے اس کے حساس دل میں موجزن ہوتے ہیں اور اس کیفیت کے عالم میں وہ بعض ایسی عجیب وغریب باتیں لکھ جاتا ہے کہ پڑھنے اور سننے والے کا دل و دماغ اس سے لُطف حاصل کرتا ہے ۔

ظاہر ہے کہ ایک واقعہ نگار اپنی تحریر میں یہ خوبیاں پیدا نہیں کر سکتا، وہ ادیب کی طرح اپنی تحقیقات میں احساسات کو نہیں آنے دیتا۔ اس کی تحریر کا تعلق جذبات اور احساسات کی بجائے اصل موضوع کے مادی پہلو سے ہوتا ہے۔ اس لئے اس کی واقعہ نگاری کوئی جذباتی یا روحانی دلکشی پیدا نہیں کر سکتی؛ لیکن برخلاف اس کے فن لطیف کا ماہر اپنی تصنیف اور تحقیق میں جذبات اور احساسات کی برقی کیفیتیں پیدا کرتا ہے اور اس کی شخصیت اس میں جا بجا اپنی مخصوص قلبی کیفیات کا مظاہرہ کرتی ہے، جن کی بدولت اس کی تصنیف ریاضی اور فلسفے کے خشک مسائل کی طرح بے کیف نہیں رہتی ۔

ادب کی تخلیق

ادب کی تخلیق کے بارے میں یونان کے عدیم المثال فلسفی ارسطو نے بہت زیادہ وضاحت کے ساتھ بحث کی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تمام فنون لطیفہ فطرت کی محاکات ہیں۔ اور اس کی تخلیق کا باعث انسان کا فطری تقلیدی مادہ ہے اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ انسان میں قدرت نے تقلید اور نقل کا مادہ ودیعت کیا ہے۔ اس خصوصیت کی بدولت اس کو نقل اور تقلید میں بہت لطف آتا ہے۔ جب کسی چیز سے اس کا دل متاثر ہوتا ہے تو وہ اس کی نقل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اور قدرتی طور پر اس کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوتی ہے کہ

جس چیز کو وہ خود پسند کرتا ہے دوسرے بھی اسے پسند کریں، کہتے ہیں اسی تقلید اور نقالی پر انسان کی ترقی کا انحصار ہے۔ اگر انسان میں یہ تقلیدی صفت نہ ہوتی تو اس میں اور حیوانات و جمادات میں کوئی فرق باقی نہ رہتا۔ چونکہ انسان کو نقل کرنے میں لُطف آتا ہے اس لئے وہ نقل کرکے خود بھی خوش ہوتا ہے اور دوسروں کو بھی خوش کرنے کی کوشش کرتا ہے، بس اسی قسم کی کوششوں سے ادب کی تخلیق ہوتی ہے۔

جب انسان کا دل و دماغ فطرت کے نقوش اور کاروبار کائنات سے اثر پذیر ہوتا ہے۔ تو مختلف قسم کے تاثرات اس کے دل و دماغ میں پیدا ہوتے ہیں۔ وہ ان دماغی تاثرات اور قلبی کیفیات سے دوسروں کو بھی متاثر کرنے کی کوشش کرتا ہے اسی کوشش سے ادبیات کا آغاز ہوتا ہے، یاد رہے انسان کے ان تاثرات کا نتیجہ ان امور کی ہو بہو نقالی نہیں ہوتی، جن سے اس کا قلب و دماغ کوئی گہرا اثر لیتا ہے۔ بلکہ اس کی طبیعت کی شوخی، دماغ کی صناعی، طرز بیان کی خوبی، خیالات کی بلندی، اور قلب کی مخصوص حالتیں اس کے اظہار میں اپنی کیفیتیں دکھاتی ہیں۔ انہی تاثرات کی نمائش کا نام ادب ہے اور یہی تخلیق ادب کا موجب ہیں۔

مسئلہ تخلیق ادب پر گوسائیں کی رائے یہ ہے کہ "صرف فطرت کے

محاسن کی تقلید اور خوبصورت مناظر دیکھنے کی مسرت فنون لطیفہ کی اصلی مہیجات نہیں ہیں بلکہ ہمارا دماغ ان کا مطالعہ کرتا ہے پھر ان کی ترجمانی کرنے کی خواہش سے ادبیات کی ابتدا ہوتی ہے" یعنی کسی چیز کو دیکھنے کے بعد اس کے متعلق جو خیالات ہمارے دل و دماغ میں پیدا ہوتے ہیں۔ ان کو بہترین الفاظ میں قلم بند کر لینا ہی ادب پیدا کرتا ہے ؀

اسی عالم ادب کا خیال ہے کہ فطری اور جسمانی حُسن میں ایک قسم کی کمی ہوتی ہے۔ اسے معلوم کرنے کے بعد اس کو دُور کرنے کی کوشش کرنا ادبیات کی ابتدا ہے۔ اس کے نزدیک فطری اور جسمانی حسن کی کمی یہ ہے کہ حُسن صورت اور حُسن سیرت میں ایک خلیج واقعہ ہے۔ انسانی رُوح اسے پُر کرنے کی کوشش کرتی ہے تاکہ حُسن سیرت حُسن صورت کا مظہر بن جائے۔ اسی کوشش سے ادب کی تخلیق ہوتی ہے ؀

ایک اور مغربی انشا پرداز کا تخلیق ادب کے متعلّق یہ نظریہ وقیع نظر آتا ہے وہ کہتا ہے کہ انسانی رُوح کو دُنیاوی حُسن سے تشفی نہیں ہوتی۔ وہ اپنی تسلّی کے لئے کائنات کی خوبصورتی میں کچھ اضافہ کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ بس اسی اضافہ کی کوششوں کے نتیجہ کا نام ادب ہے ؀

نیومین کہتے ہیں "جو کچھ کہا جاتا ہے کہنے والے کی آواز سے زیادہ

دُور تک نہیں پہنچ سکتا، گویا وہ آواز کے ساتھ ہی فنا ہو جاتا ہے۔ جب الفاظ کسی طویل سلسلۂ خیالات کو ظاہر کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اور ان کو فضائے عالم تک پہنچانا پڑتا ہے۔ یا جب ان کو آئندہ نسلوں کے لئے محفوظ رکھنا ضروری سمجھا جاتا ہے تو ان کو لکھ لیتے ہیں۔ یہی تحریریں بعد میں ادب کہلاتی ہیں"۔

ایک ہندوستانی ادیب نے ادب کی تخلیق کو انسان کے پیٹ کے ہلکے پن کا نتیجہ قرار دیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ انسان فطرتاً پیٹ کا ہلکا ہے گویا اس کے پیٹ میں کوئی بات پچ نہیں سکتی۔ جونہی اس کے دل میں کوئی نئی بات آکر الفاظ کا جامہ پہنتی ہے۔ اس کا پیٹ نفخ ہو جاتا ہے۔ نفخ کی تکلیف بڑھ کر دردِ شکم کی صورت اختیار کر لیتی ہے ایسی صورت میں پیٹ کی گرانی کو ہلکا کرنے کے لئے ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ اس بات کو جس کی وجہ سے نفخ اور دردِ شکم پیدا ہُوا ہے تحریر یا تقریر کے ذریعے دوسروں تک پہنچا دے تاکہ پیٹ کی گرانی دُور ہو کر طبیعت ہلکی ہو جائے۔

بعض ادیبوں کا خیال ہے کہ انسان کی طبیعت میں فطرتاً نمائش کی خواہش ہوتی ہے اور اسی خواہش کی تکمیل کے ضمن میں ادب کی تخلیق عمل میں آتی ہے۔

چاہے ادب کو ارسطو کے خیال کے مطابق تقلیدی مادہ کا کرشمہ کہا جائے یا کارو بار کائنات سے قلبِ انسانی کے متاثر ہونے کا

نتیجہ خواہ اسے فطری اور جسمانی حُسن کے بیچ کی کڑی سمجھا جائے یا کائنات کی تسلی بخش آرائش کا بناؤ سنگار۔ اور چاہے انسان کے پیٹ کے ہلکے پن یا خواہش نمائش کو اس کی تخلیق کا باعث قرار دیا جائے۔ لیکن یہ بات ماننی پڑے گی کہ ادب کی تخلیق میں قوّت متخیلہ اور ہمارے جمالیاتی شوق کو بہت زیادہ دخل ہے۔ اور ہمارا ادب اسی شوق کی کارنمائی ہے"۔

ادب کی قسمیں

عام طور پر ادب کو نظم و نثر میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ لیکن اکثر علمائے ادب نے اس مسئلہ کو بہت پیچیدہ بنا دیا ہے۔ ہم اس طویل اور غیر دلچسپ بحث میں پڑنا نہیں چاہتے۔ اور ادب کی قسموں کے متعلق محض اس قدر عرض کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ کہ تمام ادب کو پہلے نظم و نثر میں تقسیم کرنا چاہیئے۔ پھر نثر کی تین قسمیں قرار دینی چاہئیں۔ اوّل وہ نثر جس کے مطالب و معانی اور اسلوب بیان استدلالی ہوں۔ دوسرے وہ جس کے مطالب معانی اور اسلوب بیان جمالیاتی ہوں اور تیسرے وہ جس میں یہ سب خوبیاں ہوں اور اس کے ساتھ اس میں شعریت ہو لیکن وزن نہ ہو۔

نظم کے متعلق محض اسی قدر کافی ہے کہ اس کے مطالب و معانی اور اسلوب بیان جمالیاتی ہوتے ہیں اور ان خصوصیات کے ساتھ اس میں وزن کا بھی التزام رکھا جاتا ہے۔

نظم و نثر ہر شخص یہ بات اچھی طرح جانتا ہے کہ نظم اور نثر میں محض وزن کا فرق ہے۔ لیکن اگر نظم عاری اور نثر مقفیٰ پر غور کیا جائے تو نظم اور نثر میں امتیاز کرنا دشوار ہو جاتا ہے۔ اور اس کے بعد فوراً دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ آخر نظم اور نثر میں وہ کونسی چیز ہے جس کو مابہ الامتیاز قرار دیا جا سکتا ہے۔

انگلستان کے مشہور شاعر ورڈزورتھ نے پہلے پہل وزن ہی کو نظم و نثر کا فرق قرار دیا تھا۔ لیکن بعد میں اس نے یہ نظریہ تبدیل کر دیا۔ اور وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ نظم و نثر میں اختلاف تخیلی اور غیر تخیلی کا ہونا چاہئے۔ ظاہر ہے اس شاعر اعظم کا یہ آخری نظریہ بھی درست نہیں کیونکہ نظم و نثر دونو تخیلی اور غیر تخیلی ہو سکتی ہیں۔

پیاٹر نامی ایک اور یورپین ادیب نے اس مسئلے پر ان الفاظ میں روشنی ڈالی ہے کہ شاعری دراصل اشیاء کے اس تعلق کے اظہار کو کہتے ہیں جو روح کے ساتھ قائم ہوتا ہے۔ افسوس کہ شاعری کی یہ تعریف بھی جامع اور مانع نہیں ہو سکتی کیونکہ نثر سے بھی اس مخصوص تعلق کا اظہار کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح سے نثر بھی نظم کے قریب پہنچ جاتی ہے۔

مشہور ادیب ملٹن نے صرف جوش کو نظم اور نثر کا فرق قرار دیا ہے۔ ظاہر ہے یہ تعریف غیر محدود ہے اور نظم و نثر کے اصلی اختلاف کو ظاہر نہیں کرتی۔ ملٹن صاحب یہ بھی فرماتے ہیں کہ نثر

سنجیدہ اور مُردہ صنف ادب ہے اور شاعری زندہ عبارت۔ اس نظریہ میں خرابی یہ ہے کہ یہی جوش اور زندگی نثر میں بھی پیدا کی جاسکتی ہے۔

یونانی نظریہ کے مطابق جو کچھ ایک انسان جوش، معصومیت اور سادگی کے عالم میں منہ سے نکالتا ہے وہ حقیقی شاعری ہے"۔ اس نظریہ میں بھی یہی دقّت ہے کہ نظم و نثر میں کوئی مخصوص امتیاز باقی نہیں رہتا۔

جانسن کا قول اس معاملے میں بالکل صاف ہے وہ کہتا ہے شاعری موزوں کلام ہے۔ اور وہ ایک فن ہے جس کے ذریعے انبساط اور صداقت کو ملاتے اور اس کام میں عقل کی مدد کے لئے تخیّل سے کام لیتے ہیں۔

مکالے کہتا ہے کہ شاعری الفاظ کو اس طرح سے استعمال کرنے کو کہتے ہیں کہ ہمارے دماغ کے سامنے کوئی مرقع آجائے یہ وہ فن ہے جس میں الفاظ کی مدد سے وہی کام لیا جاتا ہے جو ایک مصوّر مختلف رنگوں سے لیتا ہے"۔

شیلی کا خیال ہے کہ شاعری ذہنیات کی ترجمانی ہے۔ ہزلٹ کہتے ہیں کہ وہ تخیّل اور جذبات کی زبان ہے۔

امریکہ کے مشہور ادیب امرسن لکھتے ہیں "کہ شاعر کائنات اور فطرت کا مطالعہ کسی اور نظر سے کرتا ہے اور اس کی روشنی میں

وہ اپنی قوتِ متخیلہ کی مدد سے ایک بالکل نئی چیز ہمارے سامنے پیش کرتا ہے۔ وہ مادیات کے کاروبار میں حقائق اور روح کو تلاش کرتا ہے۔ اور اس کی اسی کوشش کے نتائج کو شاعری کہا جاتا ہے +

جیمس فوکس کہتے ہیں کہ شاعر واقعات کو تخیل کے پردے میں دکھاتا اور اپنے کلام سے ہماری دنیاوی پریشانیوں کو دور کرتا ہے۔ اور اس کے کلام سے ہماری اعلیٰ قسم کی قوتیں تحریک میں آتی ہیں +

ان خیالات اور تعریفوں کی مدد سے ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ شعر جذباتی اور جمالیاتی کیفیات کا مظہر ہے۔ اس میں ایک قسم کی برقی قوت پوشیدہ ہوتی ہے جو ہمارے مردہ عروق میں نئی زندگی پیدا کرتی ہے۔ نیز شعر ایسے روحانی۔ جذباتی اور جمالیاتی معموں کو حل کرتا ہے۔ جن کا تعلق براہ راست روح اور قلب کے ساتھ ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ اشعار سے ہمیں روحانی مسرت حاصل ہوتی ہے۔ ظاہر ہے یہ خوبیاں نثر میں بھی ہو سکتی ہیں۔ اور وہ اس کو شعر کے قریب پہنچا دیتی ہیں یا حقیقتاً شعر ہی بنا دیتی ہیں لیکن جو چیز نظم کو نثر سے ممیز کرتی ہے وہ محض وزن ہے۔ اور باقی خوبیاں اس کی قدر و قیمت میں اضافہ کرنے والی ہیں +

نثر — عام طور پر نثر بحر اور وزن سے آزاد ہوتی ہے۔ اس لئے وہ نظم کی نسبت زیادہ آسان ہے۔ جیسے نظم میں حقیقت اور صلیت کو تلاش کرنا حقیقی شاعر کا فرض ہے۔ اسی طرح نثر نگار بھی اصلیتوں اور حقیقتوں کو تلاش کر کے کسی خوش آیند نتیجے پر پہنچتا ہے۔ عمدہ نثر میں نظم کی طرح الفاظ کی نشست اور ان کے توازن کا بھی خیال رکھتے۔ اور مخصوص مطالب کو ادا کرنے کے لئے ویسے ہی مخصوص الفاظ و محاورات استعمال کرتے ہیں۔ وہ نثر جس سے رُوح۔ اخلاق اور دل و دماغ متاثر ہوتے ہیں اور معارف و حقایق کی تحقیق ایک قسم کی سروری کیفیت پیدا کرتی ہے۔ عام نثر سے بلند پایہ ہوتی ہے۔

ادب کا مقصد — یونان کے مشہور فلسفی افلاطون نے ادبیات کا حقیقی مقصد اخلاقیات اور صداقت کو قرار دیا ہے۔ چنانچہ اس نے اُن ادبیات کو بیکار محض سمجھتے ہوئے نصاب تعلیم سے نکال دیا جن کی تشکیل اور ترتیب تخیلات پر مبنی تھی، اس کا خیال تھا کہ ہر ادبی کارنامے میں اخلاقیات اور صداقت ضرور ہونی چاہئے ورنہ وہ صنف ادب میں شامل نہیں کیا جاسکتا۔

افلاطون کے اس نظریہ پر ادیبوں نے سخت نکتہ چینی کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر افلاطون کے معیار صداقت سے ادب کو جانچا جائے تو اس کا ذخیرہ اور دائرہ بہت ہی محدود رہ جاتا ہے۔

نیز اس کا شمار فنون لطیفہ میں بھی نہیں ہو سکتا، اس لئے بیشتر ادیبوں کو افلاطون کے معیار صداقت سے بہت کچھ اختلاف ہے۔ وہ یہ بات تو تسلیم کرتے ہیں کہ ادب میں صداقت اور اخلاق کا پہلو واقعی جزو لاینفک ہے، لیکن جس صداقت کا دعویدار افلاطون ہے۔ اس کا ادب سے دُور کا تعلق ہے۔ کیونکہ ادب خارجی صداقت کی ترجمانی نہیں کرتا۔ وہ داخلی صداقت کو بے نقاب کر کے اشیاء کی اس حقیقت کا انکشاف کرتا ہے جس کو عوام نہ دیکھ سکتے ہیں اور نہ سمجھ سکتے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ کام سائنس کا ہے کہ وہ اشیاء کی ظاہری صداقت سے بحث کرے ادب محض باطنی اور داخلی صداقت کی تحقیق اور انکشاف کرتا ہے۔

ادبی صداقت کے نظریہ پر بہت کچھ نکتہ چینی کی گئی ہے معترضین اعتراض کرتے ہیں کہ ادب جس قسم کی صداقت کی ترجمانی کرتا ہے اس کو حقیقی صداقت نہیں کہا جا سکتا۔ ادبی صداقت کے حامی اس کا یہ مسکت جواب دیتے ہیں کہ ادب کا مقصد محض اس غیر محسوس اور حقیقی تعلق کو ظاہر کرنا ہے جو اشیا اور انسان کے درمیان ہوتا ہے۔ وہ سائنس کی طرح اشیائے ظاہری تعلق کی تحقیق و تفتیش نہیں کرتا بلکہ وہ اس حقیقی تعلق کو واضح کرتا ہے جس سے انسانی قلب و دماغ پر مخصوص جمالیاتی کیفیتیں پیدا ہوتی ہیں۔

ایک ادیب عام حقائق کو نظر انداز کرتے ہوئے معمولی معمولی چیزوں سے متاثر ہو کر دُنیا کے سامنے بالکل اچھوتے اور نرالے تاثرات پیش کرتا ہے۔ اس کی اس نئی قسم کی تحقیقات سے ایک طرف ہماری معلومات میں اضافہ ہوتا ہے اور دوسری طرف اس کے تخیلی انکشافات سے ہماری رُوح اور قلب کو ایک قسم کی سُرمدی مسرّت حاصل ہوتی ہے۔ یہ درست ہے کہ عام نقطۂ خیال سے اس کی تحقیقات ظاہری حقیقت اور صداقت سے بے نیاز معلوم ہوتی ہے لیکن درحقیقت، وہ اسی صداقت کی تفسیر ہے جس کو ظاہر بین آنکھیں نہیں دیکھ سکتیں۔ بالفاظ دیگر ادبی حقایق کا اگرچہ مادی اشیاء سے کوئی ظاہرا تعلق نہیں ہوتا لیکن ہمارا دل و دماغ اچھی طرح محسوس کر سکتا ہے کہ ان کا تعلّق ہمارے روزانہ کے حالات اور مشاہدات سے بدرجہ اتم قائم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ادبی کریکٹروں کے ساتھ ہم اس بے تکلفی سے گُھل مل جاتے ہیں جیسے ہم میں اور ان میں کوئی فرق ہی نہیں۔ ہم ان کی خوشی میں خوش اور غم میں غمگین ہوتے ہیں اور ہماری ان سے ایسی دوستی قائم ہو جاتی ہے کہ ہم اپنے آپ کو ان سے علیحدہ خیال نہیں کرتے، اگر سچ پُوچھئے تو یہی ادب کا حقیقی مقصد ہے۔ جتنی دیر ہم ادب کے مطالعہ میں محو رہتے ہیں۔ اُتنی دیر کے لئے اس کاروباری اور دُکھوں بھری دُنیا سے ہمارا تعلّق منقطع ہو جاتا ہے۔ ادب کی رنگینیاں

اور دلچسپیاں ہمیں اپنے آپ میں اس قدر جذب کر لیتی ہیں کہ ہم تمام تفکراتِ دُنیاوی سے بیخبر ہو جاتے ہیں۔ جو لوگ ادب سے حقیقی دلچسپی رکھتے ہیں وہ اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ ان کا جس قدر وقت ادبیات کے مطالعہ میں گزرتا ہے وہ ان کی زندگی کا بہترین وقت ہوتا ہے۔

ادب زندگی کی تصویر ہے

میتھیو آرنلڈ کا مقولہ تھا کہ ادب انسانی زندگی کی تفسیر ہے۔ بعض ادیب اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہر عہد کا ادب اس عہد کی انسانی زندگی کی حقیقی تصویر ہے۔ یہ بات ہر شخص تسلیم کریگا کہ ہر عہد کے لوگوں کے مذاق۔ رجحان اور پسندیدگی کا اثر ان کے ادب پر ضرور پڑتا ہے۔ اور ہر عہد میں وہی ادب مقبولیت کی سند پاتا ہے جو عوام کے مذاق کی ترجمانی کرتا ہے اس لئے ہم ہر عہد کے مطبوع اور مرغوب ادب سے اس دور کے لوگوں کے مذاق کا بالکل صحیح صحیح اندازہ آسانی سے کر سکتے ہیں۔

اس کے علاوہ ادب میں ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ محض واقعات کا اظہار نہیں کرتا بلکہ واقعات کی تفسیر میں وہ تخیلی اور ذہنی کیفیات کا خاکہ ایسی تفصیل کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ جس کو دیانت دار واقعہ نگار کا قلم اور سینما فلم بھی منکشف نہیں کر سکتے۔ ادب کی اس خصوصیت کو دیکھتے ہوئے ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنے ادب کی

طرف سے ہمیشہ خبردار اور ہوشیار رہیں تاکہ ہمارے ادب میں تنزل اور انحطاط کے اثرات نمایاں نہ ہونے پائیں۔ اور کہیں وہ کوئی مبتذل صورت اختیار نہ کرلے۔ جس کے مطالعہ سے آنے والی نسلوں کو ہماری پست حالت کا علم ہو جائے اور وہ ہمارے عہد کے انحطاط پذیر ادبی کارنامے دیکھ کر ہم پر زہر خند کریں۔

ادب پر مذاق کا اثر اور اس کا عکس

یہ مسلمہ ہے کہ انسانی زندگی کے ہر دور میں ایک خاص ادبی رنگ کو مقبولیت حاصل ہوتی ہے۔ جو ادیب اس خاص رنگ اور مذاق کے مطابق ادب کی تخلیق میں حصہ لیتا ہے۔ اس کے ادبی کارناموں کو پسند کیا جاتا ہے اور باقی ادیب گمنامی اور کس مپرسی کے عالم میں فنا ہو جاتے ہیں۔

ایک ادیب شہیر نے ہر عہد کے مخصوص ادبی مذاق کی تشریح ایک نہایت دلچسپ اور پُرلطف تمثیل سے کی ہے۔ وہ کہتا ہے۔ کہ ہر عہد کا مخصوص ذوق ادب بعینہٖ ایسا اثر کرتا ہے جس طرح کوئی رنگین شیشہ روشنی پر، کہ مخصوص قسم کی شعاعیں اس میں سے گزر جاتی ہیں اور باقی اس میں جذب ہو کر رہ جاتی ہیں۔

لیکن کس قدر لُطف کی بات ہے کہ یہی ذوق ادب جس کے پردے میں بہت سے ادیب گمنام رہ کر فنا ہو جاتے ہیں بعض

ادیبوں کی ذہانت اور خاص طرز ادب سے تبدیل بھی ہو جاتا ہے۔
اس اجمال کی تفصیل اس طرح پر ہے کہ ایک ہوشیار کاریگر محض وہی چیزیں نہیں بناتا جن کی عوام کو ضرورت ہوتی ہے۔ بلکہ وہ عوام میں اپنی تیار کردہ نئی چیزوں کی مانگ پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ جب وہ اپنے اس ارادے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو اس وقت وہ اپنے آپ کو اپنے فن میں کامیاب سمجھتا ہے۔ بالکل اسی طرح ایک ذہین اور ہوشیار ادیب جس کا مذاق اپنے عہد کے مذاق سے مختلف ہوتا ہے۔ اس کی طبیعت کی اپج اور خیالات کی بلندی، اس کو عام ادیبوں سے بلند کرتی ہے۔ وہ اپنی نئی طرز اور کوششوں سے عوام کا مذاق تبدیل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ اور اپنی غیر معمولی ادبی قوت سے اس قاعدۂ کلیہ کو توڑ ڈالتا ہے۔ جس کے ماتحت غیر مطبوع ادیب مقبولیت حاصل نہیں کر سکتے، ایسے زوردار ادیب کی جد و جہد یقیناً بڑی دلچسپ ہوتی ہے جبکہ اس کے عہد کا مذاق اس کو راستہ دینے کو تیار نہ ہو لیکن وہ اپنے مخصوص ادبی زور سے اپنے لئے زبردستی جگہ پیدا کر لے، اور پھر نہ صرف اسی پر اکتفا کرے بلکہ اپنے عہد کے مذاق پر اس طرح چھا جائے کہ سب اس کا لوہا مان جائیں اور آخر کار اس کی شخصیت پر فخر کرنے لگیں۔

ادبیات کے افادی اور غیر افادی نظریہ	افادی اور غیر افادی نقطۂ نظر

پر بھی علمائے ادب کی مدتوں بحثیں ہوئی ہیں۔ ان میں سے ایک گروہ اس خیال کا ہے کہ ادبیات سے کچھ نہ کچھ مادی فائدہ ضرور ہونا چاہئے۔ دوسری جماعت کہتی ہے کہ مادی فوائد سائنس سے متعلق ہیں ادبیات کا تعلق تو محض باطنی صداقت اور رُوحانی کیفیت سے ہے، گویا ادب کا حقیقی منشاء یہ ہے کہ اس سے رُوح کو مسرت حاصل ہو۔ اور وہ عام اور ظاہری صداقت کی ترجمانی نہ کرے کہ یہ سائنس کا کام ہے بلکہ وہ اس صداقت کو بے نقاب کرے جو سائنسدانوں کی نظروں سے پوشیدہ اور ان کی دسترس سے بالاتر ہے، اور ایک ادیب کی دُوربیں آنکھیں ہی اس کو پاسکتی ہیں۔ ممکن ہے کہ ایک ظاہر پرست شخص اس شاعرانہ حقیقت کو بے معنی اور لغو قرار دے لیکن حقیقتاً اس کی تہ میں وہی حقائق مضمر ہوتے ہیں جن کی تلاش میں بڑے بڑے سائنس دان اور نام نہاد حقیقت شناس اپنی عمر کا بہترین حصّہ صرف کر دیتے ہیں مگر پھر بھی ان تک پہنچ نہیں سکتے ؞

جو لوگ ادبیات کو مادی استفادہ سے بالاتر سمجھتے ہیں وہ ایسے ادب کو جس میں ظاہری صداقت سے بحث کی جائے ادب لطیف کے زمرہ میں شامل نہیں کرتے، اور وہ حضرات جو ادب سے ظاہری فوائد اور حقائق کے طلبگار ہیں۔ اس قسم کے ادب کو غیر مفید سمجھتے ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ ادب جو ذہنی ارتقا کا

باعث نہیں ہوتا ہرگز ادب لطیف نہیں کہلایا جا سکتا۔ اس لئے یہ بات ہمیشہ یاد رکھنی چاہئے کہ حقیقی اور اصلی ادب مادی افادے سے بالاتر ہے۔ اور اس کی خوبی یہی ہے کہ وہ محض ذہنی مسرت بہم پہنچاتا ہے

ادب کے فوائد

ادب ہماری زندگی کا ایک اہم ترین شعبہ ہے۔ اس کا مطالعہ ہماری دماغی وسعت کا باعث ہے۔ فنون لطیفہ میں ادب کو دیگر فنون پر برتری حاصل ہے۔ اس لئے وہ بہترین فن لطیف ہے۔ ادب زندگی کے حقایق کی تفسیر ہے، ادبیات کے مطالعہ سے ہم کو ہر عہد کی جیتی جاگتی اور چلتی پھرتی تصویریں نظر آتی ہیں۔ اور اس کے ذریعے سے ہم کو بہت سے ایسی باتیں معلوم ہو جاتی ہیں جن کو کوئی واقعہ نگار یا تاریخ دان باوجود انتہائی کوششوں کے قلم بند نہیں کر سکتا، ادبیات کے توسّل سے ہم پرانے زمانے کی بڑی سے بڑی اور چھوٹی سے چھوٹی شخصیتوں کے ساتھ اس طرح گھل مل جاتے ہیں کہ ہم میں اور ان میں کوئی فاصلہ اور پردہ باقی نہیں رہتا، اس کے علاوہ جو ادیب یہ خدمات انجام دیتا ہے ہم اس کے بھی رازدار بن جاتے ہیں۔ اور اس رازداری کی بدولت ہمارے اور اس کے درمیان ایسے دوستانہ تعلّقات قائم ہو جاتے ہیں جن کے احساس سے ہمارا دل حد درجہ مسرور ہوتا ہے۔ نیز جب تک یہ دوستی

اور رازداری کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ ہم اپنے دُنیاوی تفکرات اور پریشانیوں کو بھول جاتے ہیں ہم اس کے ساتھ ہنستے ہیں کھیلتے ہیں، غمگین ہوتے ہیں، بُروں سے نفرت اور اچھوں سے محبّت کرتے ہیں۔ کبھی عوام سے ملتے ہیں کبھی اُمرا اور رؤسا کی صحبتیں دیکھتے ہیں۔ بادشاہوں کی رازداری کا شرف حاصل کرتے ہیں غرض زندگی کے ہر شعبے سے واقفیت بہم پہنچاتے ۔ اور ان حقیقتوں کو سمجھتے ہیں۔ جن کو فلسفی اور سائنسدان حل کرنے سے قاصر ہیں۔ یہی وہ باتیں ہیں جو دُنیا کا کوئی فن سوائے ادبیات کے مہیّا نہیں کر سکتا، اس کے علاوہ وہ قلبی سرور اور سرمدی کیفیّت جو ادب پیدا کرتا ہے کبھی زوال پذیر نہیں ہوتی۔ لوگ بُڈھے ہو جاتے ہیں۔ حادثات اور انقلابات ایام دُنیاوی مسرّتوں سے محروم کر دیتے ہیں لیکن ادبی مسرّتوں کو کبھی زوال نہیں آتا۔ جب ادبیات کے دفتر کُھلتے ہیں۔ انسان اپنے تمام آلام اور تفکّرات کو بھول بھلا کر ان میں اس طرح مستغرق ہو جاتا ہے کہ جیسے اس دُنیا ہی میں نہیں رہا۔ جب تک یہ مشغلہ جاری رہے۔ انسان اپنے آپ کو بھولے رہتا ہے۔ جن لوگوں کو ادب کا چسکا ہے۔ ان باتوں کے لُطف کچھ وہی سمجھ سکتے ہیں۔ اسی لئے بعض ادب پسند لوگ کہا کرتے ہیں کہ ادیب اور ادبیات کے دھنی ہمیشہ جوان رہتے ہیں۔ اور کبھی بُڈھے نہیں ہوتے۔

غرض ادب کا بہترین مقصد اور اصلی فائدہ محض رُوحانی مسرت ہے۔ اور رُوحانی مسرت بہم پہنچانا بہت بڑا کام ہے۔ لیکن ادب یہ خدمت بہت آسانی سے انجام دیتا ہے، اس سے یہ نہ سمجھ لینا چاہئے کہ رنجدہ اور الم انگیز موضوع ادبیات کے تحت میں نہیں آتے یا ایسے موضوعوں پر ادبیات کا رنگ نہیں چڑھ سکتا جن میں کسی قسم کی ظاہری دلچسپی نہیں ہوتی، یاد رہے ادیب کی صناعی اور اس کا زورِ بیان المناک حادثوں اور غیر دلچسپ واقعوں میں بھی غیر معمولی ادبی دلچسپی پیدا کر دیتا ہے۔ موضوع کے اعتبار سے ان کو پڑھ کر ہمارے جذبات کو ضرور ٹھیس لگتی اور تکلیف ہوتی ہے۔ لیکن اس روحانی تکلیف میں بھی ایک قسم کی رُوحانی مسرّت ہے۔ جو ادب کا ایک ادنیٰ کرشمہ ہے۔ بات یہ ہے کہ ادبی رنج بھی ایک قسم کی مسرّت کا حامل ہے۔ جب ہمارے دل کو تکلیف پہنچتی ہے تو ہم خوب جی کھول کر رو لیتے ہیں۔ اس طرح سے دل کا بوجھ ہلکا ہو کر ہماری طبیعت خود بخود شگفتہ ہو جاتی ہے۔ اس شگفتگی سے ہمارے غم دُور ہو جاتے ہیں اور ہم اپنے روزانہ کے کاروبار اور اشغال میں نہایت خوشی کے ساتھ مصروف ہو جاتے ہیں،

بہر حال بعض علمائے ادب کا خیال ہے کہ بہ نسبت الم انگیز ادبیات کے مسرّت انگیز ادب زیادہ وقیع ہے، کیونکہ مسرّت خیز

ادب کا انسانی زندگی کے کاروبار پر نہایت خوشگوار اثر پڑتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ہماری زندگی پہلے ہی مشکلات اور المیات کا مرقع ہے۔ ہر روز کے فرائض منصبی۔ دُنیاداری کے بکھیڑے، اور آئندہ کے تفکّرات جسم و جان کو ہمیشہ مضمحل رکھتے ہیں۔ ایسے حالات میں اگر ہمارے ادیب ایسا ادب پیدا کرنے کی کوشش کریں جو زندگی کے مسرّت انگیز حقایق اور موضوعوں پر روشنی ڈال کر ہماری دُکھوں بھری زندگی کو پُرلطف بنا دے اور ہمارے دلوں میں مسرّت کی ایک بہتی لہر پیدا کر دے تو سمجھنا چاہئیے کہ انہوں نے نہ صرف ادبیات کی بلکہ تمام بنی نوع انسان کی بہت گرانمایہ خدمت انجام دی، جس کے لئے وہ بہت زیادہ شکریے اور تحسین و آفرین کے مستحق ہیں۔

فنِ تقریر

فنِ تقریر

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ فنِ تقریر ایک فطری عطیہ ہے اور ہر شخص میں یہ قوت نہیں کہ فنونِ لطیفہ کی اس شاخ سے قلم لگائے اور گل و گلزار کھلائے۔ میرے نزدیک یہ نظریہ بہت ہی ہمت شکن ہے۔ اگرچہ یہ بات بالکل درست ہے کہ بعض انسانوں میں فنِ تقریر کا مادہ قدرتی طور پر عام لوگوں سے کسی قدر زیادہ ہوتا ہے لیکن یہ کہنا سراسر غلط ہے کہ فنِ تقریر خواص کی ملک ہے۔ ہمت کرے انسان تو کیا ہو نہیں سکتا، خداوند کریم نے ہر شخص کو قوتِ گویائی عطا فرمائی ہے وہ اس کو ترقی اور تربیت دینا ہمارے اختیار پر چھوڑا ہے۔ جن لوگوں کو جس قسم کا ماحول اور سوسائٹی ملتی ہے ان کی اٹھان اسی طرز پر ہوتی ہے۔ سیاسی بیداری نے ہمارے ملک میں ان گنت مقرر پیدا کر دیئے ہیں جو اپنی چرب زبانی اور شیریں بیانی سے ہزاروں سامعین کے دل مٹھی میں لے لیتے ہیں۔ غرض مختلف قسم کی تحریکوں کی بدولت اکثر بڑے بڑے مقرر پیدا ہو جاتے ہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ قوتِ تقریر ماحول کے اثر سے پیدا ہوتی

اور مقرر کی کوششوں سے پروان چڑھتی ہے۔ اگر ہم یہ کہیں کہ فن تقریر ہر انسان کا فطری حق ہے تو کسی قسم کی غلطی سرزد ہونے کا امکان نہیں یہ دوسری بات ہے کہ کوئی شخص خاموش یا گونگا بن جانا عین انسانیت خیال کرے ٭

فن تقریر کی اہمیّت

کامیاب اور بامراد زندگی بسر کرنے کے لئے ضروری ہے کہ جس طرح انسان اپنی دوسری قوتوں میں استعداد پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے اسی طرح فن تقریر میں بھی مشق بہم پہنچائے کیونکہ دُنیا کا کوئی کام بغیر تقریر کے نہیں چلتا۔ جو لوگ اچھے سلیقے اور عمدگی سے گفتگو کر سکتے ہیں سوسائٹی کی زینت کہلاتے ہیں اور ان کی خوب قدر و وقعت ہوتی ہے۔ برخلاف اس کے جو لوگ اپنے مفہوم کو حُسن و خوبی کے ساتھ دوسروں کے ذہن نشین نہیں کرا سکتے وہ ہمیشہ پھسڈی رہتے ہیں، معلوم ہونا چاہیئے کہ فن تقریر اور گفتگو میں محض تدریجی فرق ہے گفتگو میں تخاطب چند آدمیوں سے کیا جاتا ہے اور تقریر میں بے اندازہ آدمی مخاطب ہوتے ہیں۔ لیکن پھر بھی یہ ضروری نہیں کہ جو شخص گفتگو میں شائستہ اور باسلیقہ ہو وہ اچھی طرح تقریر بھی کر سکتا ہو ٭

فن تقریر کو موجودہ زمانے میں جو اہمیت اور وقعت حاصل ہے۔ وہ کسی سے پوشیدہ نہیں، ہماری حکومتوں کے قوانین عوام کی رائے کے مطابق بنتے ہیں۔ اور عوام کی رائے کو مقررین

اپنی جادو بیانی سے ہموار کرتے ہیں۔ سرکاری غیر سرکاری اور نیم سرکاری ادارے جن کے کاروبار کثرت آراء سے چلتے ہیں۔ ان میں عام طور پر وہی لوگ کامیاب ہوتے ہیں جو فن تقریر میں مہارت تامہ رکھتے ہیں۔ آج کل کے زمانے میں کوئی شخص اپنے پیشہ میں کامیاب نہیں ہوسکتا جب تک کہ وہ فن تقریر میں ماہر نہ ہو۔ ہر شخص اپنے فن کی خوبیاں اسی وقت سمجھا سکتا ہے جبکہ وہ اچھی طرح تقریر کر کے دوسروں کو قائل کرنا جانتا ہے دن رات کے تجربے اور آئے دن کے واقعات شاہد ہیں کہ اکثر لوگ جو اپنے فنوں میں کامل اور اپنے دعووں میں صداقت رکھتے ہیں محض اس وجہ سے ناکامیاب ہیں کہ اپنے خیالات کو صحیح طریقے سے دوسروں کے سامنے پیش نہیں کر سکتے، اور ان کے مقابلے میں وہ لوگ سو فیصدی کامیاب ہیں جن کے پاس مقابلتاً نہ سچائی اور قابلیت ہے اور نہ اُن کی باتوں میں کسی قسم کی گہرائی ہے مگر ان میں تقریر کی قابلیت ہے وہ اپنے لاطائل دعووں کو نہایت عمدگی سے بیان کر کے دوسروں کو قائل کرنا جانتے ہیں۔

مقرر کی شخصیت

مقرر کی شخصیت کا سامعین پر بہت گہرا اثر پڑتا ہے۔ اس لئے ان لوگوں کو جنہیں پبلک سے واسطہ پڑے لازم ہے کہ اپنی شہرت پر کسی قسم کا دھبہ نہ آنے دیں۔ اکثر

دیکھا گیا ہے کہ مقرر کی شخصیت سے مرعوب ہو کر سامعین بہت جلد اپنے خیالات بدل دیتے ہیں اور بڑے بڑے مرحلے بہت آسانی سے طے ہو جاتے ہیں برخلاف اس کے وہ مقرر جو اپنا وقار کھو دیتے ہیں یا جن کی عوام میں کوئی عزّت نہیں ہوتی اکثر ان کو پبلک سے کنارہ کش ہی ہونا پڑتا ہے ۔

اس کے علاوہ مقرر کو ہمیشہ یاد رکھنا چاہیئے کہ جو مجمع اس کے سامنے ہے وہ خود بھی ان میں سے ایک ہے۔ اگر وہ اپنے آپ کو اُن سے علیحدہ سمجھے گا تو اسے کبھی کامیابی نصیب نہ ہوگی اس کے بعد مقرر کو اپنے موضوع کا جائزہ لینا چاہیئے اگر وہ اپنے موضوع پر قادر نہیں اور الفاظ پر قدرت نہیں رکھتا تو اس کے مُنہ سے جو فقرہ نکلیگا وہ عوام کو تسلّی دینے کی بجائے بےچینی پیدا کریگا۔ اس طرح سے بار بار غلط فہمیاں پیدا ہونگی اور مقرر کی شخصیّت کو سخت نقصان پہنچائیں گی ۔ یہاں تک کہ اس سے مجمع بدظن ہو جائیگا۔ مقرر کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنی زبان پر حاوی ہو تاکہ کوئی بے ربط اور غیر ذمّہ دارانہ بات اس کی زبان سے نہ نکلے جو بعد میں اس کے یا عوام کے لئے مضر اور نقصان دہ ثابت ہو۔ اکثر مقرر جوش میں آکر بعض نہ کہنے کی باتیں بھی کہہ جاتے ہیں۔ جن سے نہایت تکلیف دہ نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ مقرر کا فرض ہے کہ وہ سامعین کو نہ بھولے ۔ ان کی نبض پر ہر وقت اس کا ہاتھ

رہے اور جس نشے سے وہ ان کو مدہوش کر رہا ہے اس کی مقدار کو ایک ہوشیار ڈاکٹر کی طرح نہایت احتیاط سے صرف کرے تاکہ مجمع اس کے قبضے سے باہر نہ نکل جائے۔ اور اس کے ساتھ ہی جوش وخروش میں اپنے حواس پر بھی قادر رہے۔ یاد رہے وہ مقرر جو خود جوش میں آکر اپنے آپ کو بھول جاتے ہیں سامعین کی نبض ان کے ہاتھ سے چھوٹ جاتی ہے۔ نہ ان کو یہ پتہ رہتا ہے کہ وہ خود کدھر جا رہے ہیں اور نہ یہ خیال رہتا ہے کہ سامعین کا کیا حال ہے۔ ہوشیار مقرر خود کبھی جوش میں نہیں آتا۔ وہ اپنے جوش کو سامعین کے اکسانے میں صرف کرتا ہے۔ اور ان پر پوری طرح حاوی رہتا ہے۔

مقرر کو اپنی زبان اور بیان پر اس لئے حاوی ہونا اور بھی ضروری ہے کہ وہ ان تقریروں کا مقابلہ کر سکے جو باقاعدہ محنت سے طیار کی جاتی ہیں۔ تاکہ ہر ضروری موقعہ پر اپنے خیالات کو نہایت برجستگی سے بلا تاخیر ادا کرے اور وہ لوگ منہ دیکھتے رہ جائیں جو اپنے خیالات کو ابھی ترتیب ہی دے رہے تھے اور اس فکر میں تھے کہ کونسا پیرایۂ کلام اور طرز بیان اختیار کریں، دیکھا گیا ہے کہ ایسے مقرر جو برموقعہ اور برمحل موثر اور عمدہ الفاظ میں اپنے خیالات کو پیش کر سکتے ہیں اکثر ان لوگوں کے مقابلے میں میدان مار لیتے ہیں جن کے پاس خیالات اور الفاظ کے لشکر موجود تھے گولا بارود اور سامان جنگ اس کثرت سے تھا کہ کامیابی یا انداز معلوم ہوتی تھی

لیکن جیت اس کی ہوتی جو عین وقت پر اپنی چھوٹی سی مسلّح فوج کے ساتھ بےخبری کے عالم میں مخالف پر آن ٹوٹتا، اور اس کو تیار ہونے تک کا موقعہ نہ دیا۔

برجستگی کے ملکہ کے ساتھ مقرر کے پاس کچھ نہ کچھ سامان جنگ ہونا بھی ضروری ہے گویا تقریر سے پہلے اسے اپنے موضوع پر اچھی طرح غور کر لینا چاہیئے مقرر کا اپنے موضوع پر سطحی نظر سے غور کرنا ناکامیابی کا باعث ہو سکتا ہے اس لئے مقرر کو اپنے موضوع کا دقت نظر سے مطالعہ کرنا چاہیئے تاکہ دوران تقریر میں جو کچھ زبان سے نکلے وہ اسکی گہری نظر اور بلند خیالات کی ترجمانی کرے نیز یہ اعتراض عائد نہ ہو کہ مقرر اصل موضوع سے ناآشنا ہے اور اس نے ادھر اُدھر کی سطحی باتیں ملا کر بات کا بتنگڑ بنا دیا ہے۔ اس کے علاوہ کسی موضوع تقریر کا مقرر کے چہرے پر اس وقت تک صحیح اثر پیدا نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ اس کو اچھی طرح نہ سمجھتا ہو۔ اس لئے موضوع کی واقفیت جہاں مقرر کی اصلی قابلیت اور حقیقی دلچسپی کی شہادت دیتی ہے وہاں اس کے شخصی وقار کو بھی بلند کرتی ہے۔

ہماری نظر سے اکثر ایسے مقرر گزرے ہیں جو الف کے نام بے بھی نہیں جانتے لیکن جب کبھی تقریر کا موقعہ آیا ہے تو وہ اکثر بڑے بڑے عالموں اور فاضلوں کے جلسوں میں اس جوش وخروش سے بولے ہیں کہ سُننے والے بیٹھے مُنہ دیکھتے تھے اور حیران تھے

کہ یہ چُھپا رستم کہاں سے آگیا۔ آپ کو سُن کر حیرانی ہوگی کہ ایسے لوگوں نے اکثر میدان بھی مارے ہیں۔ اس کی وجہ کیا تھی۔ یہی کہ وہ تقریر کے فن سے واقف تھے، حاضرین کو برچانا جانتے تھے اور اس کے ساتھ اپنے مطالب کو نہایت برجستگی اور عمدگی سے ادا کر سکتے تھے ایسے ہی لوگ وہ لوگ ہیں جن کی ذات با صفات سے بالکل خشک اور فرسودہ موضوع نہایت دلچسپ اور رنگین بن جاتے ہیں ایک لمبی چوڑی خشک تقریر میں ان کا کوئی چُبھتا ہُوا فقرہ۔ کوئی دلخوش کن پھبتی تمام کوفت کو دُور کر کے غیر دلچسپ موضوع کو دلچسپ بنا دیتی ہے تقریر کے متعلق یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ اکثر تقریریں جنہوں نے حاضرین پر جادُو کا اثر کیا ہے اور ایک دُنیا ان کو بہترین تقریر کا لقب دیتی ہے۔ اگر وہ پڑھی جائیں تو ان میں کوئی ایک خوبی بھی نظر نہیں آتی، جن کی وجہ سے انہیں بہترین تقریر کہا جا سکے بات یہ ہے کہ مقرر کا طرز تقریر۔ سامعین کی نبض شناسی، اس کی آنکھوں کی چمک، چہرے پر مختلف کیفیتوں کا طاری ہونا اس کی حرکات و سکنات۔ لباس وضع قطع، ذاتی اقتدار اور ماحول کا اثر وغیرہ تمام مل کر ایک خاص قسم کی فضا پیدا کر دیتے ہیں جس کا لطف وہی لوگ محسوس کر سکتے ہیں جو اس وقت موجود ہوں۔ ہونہار مقرر کے لئے ضروری ہے کہ وہ ایسے کامیاب مقرروں کی تقریروں سے استفادہ کرے پھر اس کو معلوم ہو گا کہ تقریر اور تحریر میں کیا فرق

ہے۔ اس بحث سے ہم اس نتیجے پر بھی پہنچتے ہیں کہ تقریر اور مقرر کو کسنے کی صحیح کسوٹی حاضرین ہی ہو سکتے ہیں جن پر تقریر کی جادو بیانی کا اثر پڑتا ہے *

آواز کی اہمیت | آواز کی دلکشی کی ایک دنیا قائل ہے۔ چنانچہ تقریر کی کامیابی اور ناکامی میں بھی آواز کو بہت زیادہ دخل ہے۔ لیکن افسوس کہ ہمارے مقررین عام طور پر آواز کی طرف خیال ہی نہیں کرتے۔ یاد رہے اچھی آواز سے سامعین کے دل و دماغ پر نہایت ہی اچھا اثر پڑتا ہے لیکن بُری آواز میں اچھی بات بھی سُننے کو جی نہیں چاہتا۔ طبیعت خود بخود نفرت کھاتی ہے وہ آوازیں جو کانوں پر گراں نہیں گزرتیں موضوع کی دلچسپی میں اضافہ کرکے اس کو زیادہ دلپذیر بناتی ہیں شیخ سعدی نے کسی شخص کے قرآن شریف کو بُری آواز سے پڑھنے پر کہا ہے

تو کہ قرآں بدیں نمط خوانی
ببری رونق مسلمانی

جب بُری آواز سے آسمانی کتابوں کو پڑھنے سے نقصان پہنچ سکتا ہے تو بد آوازی سے تقریر بدمزہ ہو جاتی ہیں کیا کلام ہے۔ اس لئے مقررین کو شروع ہی سے اپنی آواز کی تربیت کی طرف متوجہ ہونا چاہیئے اگر بچپن کے زمانے میں آواز کو درست کرنے کی طرف توجہ دی جائے تو اس میں دلکشی پیدا ہو جانی کوئی بڑی

بات نہیں ۔

ہمارے بعض مقرروں کو عادت پڑ جاتی ہے کہ وہ تقریر کرتے وقت کبھی اپنی آواز اس قدر بلند کر دیتے ہیں کہ سامعین کے کانوں کے پردے پھٹنے لگتے ہیں اور کبھی اس قدر آہستہ بولتے ہیں کہ قریب والوں کو بھی مشکل سے سنائی دیتا ہے اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ سٹیج پر بار بار گردش کرتے ہیں۔ اگر سوءِ اتفاق سے مقرر بیڈول جسم کا ہو تو اس کی یہ گردش عجب مضحکہ خیز صورت پیدا کرتی ہے۔ اور انہیں دیکھ کر بے ساختہ ہنسی آتی ہے آہستہ بولنے اور اپنے محور کے گرد گھومنے والے مقرر جس طرف اپنا رُخ پھیرتے ہیں ادھر کے لوگ تو انہیں سن سکتے ہیں لیکن باقی سامعین ان کے کلام بلاغت نظام سے محروم رہ جاتے ہیں ایسا کرنے سے نہ صرف تقریر کی دلچسپی میں کمی آتی ہے بلکہ حاضرین مجلس میں ایک قسم کی بیچینی سی پیدا ہو جاتی ہے۔ اگر مقرر اپنی غلطی کو محسوس نہ کرے تو یہ بیچینی مجمع میں کھلبلی پیدا کر دیتی ہے۔

بعض ماہرین کا خیال ہے کہ آواز کو بلند اور آہستہ کرنے سے جذبات کا صحیح طور پر اظہار ہوتا ہے۔ اور تقریر کی طرف عوام کی توجہ زیادہ بڑھتی ہے۔ اس نظریہ میں کوئی کلام نہیں لیکن آواز کو اتنا ہلکا کر دینا کہ بہت کم لوگ سن سکیں کسی طرح قابل تعریف نہیں۔ واقعی آواز میں مدوجزر ضرور ہونا چاہئے لیکن یہ بات بھی

ہمیشہ ملحوظ خاطر رکھنی لازم ہے کہ سامعین ہر لفظ کو پوری طرح سُن سکیں جس تقریر کے تمام الفاظ سامعین کے کانوں تک نہیں پہنچتے آپ یقین رکھیں نہ تو وہ تقریر کامیاب ہو سکتی ہے اور نہ سامعین میں دلچسپی پیدا کر سکتی ہے۔

ترقی کے موجودہ دور میں ایک آلہ لاؤڈ سپیکر کے نام سے ایجاد ہؤا ہے اسکے استعمال سے ہلکی آوازیں بلند ہو سکتی ہیں اس آلہ کے رواج سے ان لوگوں کو ضرور فائدہ ہے جو بلند آواز سے تقریر نہیں کر سکتے۔ لیکن ان آلات کے استعمال سے مقررین کو نقصان بھی پہنچتا ہے۔ جب اس برقی آلہ کو مقرر کے سامنے رکھا جاتا ہے تو اُس کو اپنی تمام تر توجہ سامعین کی طرف منعطف کرنے کی بجائے اس آلہ پر صرف کرنی پڑتی ہے۔ مقرر اپنے مُنہ کو ادھر اُدھر پھیر نہیں سکتا اور مقررہ فاصلے پر وہ ایک مجسمہ کی طرح اس آلہ کے سامنے کھڑے ہو کر تقریر کیئے جاتا ہے۔ اگر وہ ذرا بھی اپنی جگہ سے ہلے تو آلہ آواز کو قبول نہیں کرتا، اور اگر قبول بھی کرلے تو فاصلے میں کمی زیادتی ہونے سے آواز میں خرابی پیدا ہو جاتی ہے۔ لاؤڈ سپیکر کے استعمال میں سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ اس کی موجودگی میں مقرر کی حرکات و سکنات اور طرز تقریر میں فرق آجاتا ہے اور ان لوازمات تقریر کے فقدان سے عموماً سامعین بے لطف ہو جاتے ہیں۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ زیادہ سے زیادہ سامعین مقرر کو

آسانی سے سُن سکتے ہیں۔ اگر سوء اتفاق سے یہ آلہ کام نہ کرے جیسا کہ اکثر ہوتا ہے۔ تو مقرر کی بُری طرح بھد اُڑتی ہے اور جلسے میں کھنڈت پڑ جاتی ہے۔

اکثر دیکھا گیا ہے کہ بعض مقررین اس آلے کی موجودگی میں اپنی آواز پر بھروسہ کرتے ہیں اور اس کو استعمال نہیں کرتے، مقرر کو یاد رکھنا چاہئے کہ اگر کسی جلسے میں اس آلے کو استعمال کیا جا رہا ہو تو اپنی آواز پر بھروسہ کرنا اور یہ سمجھنا کہ ہماری تقریر ہر شخص بخوبی سُن سکتا ہے، بڑی سخت غلطی ہے۔ میرا مخصوص تجربہ یہ ہے کہ اس آلے کے ہوتے ہوئے اس کو استعمال نہ کرنے سے اچھے مقرروں کی تقریریں بے لطف ہو جاتی ہیں۔ کیونکہ سامعین کو بلند آواز سننے کا مزہ پڑ جاتا ہے اس لئے وہ ایسی آواز کو سننا پسند نہیں کرتے جسے بہت زیادہ توجہ صرف کر کے سُنا جا سکے۔ مسز سروجنی نائیڈو جو بُلبل ہندوستان کہلاتی ہیں اور تقریر کرنے میں مہارت تامہ رکھتی ہیں ایک دفعہ میں نے ان کی تقریر کو ناکامیاب ہوتے ہوئے بچشم خود دیکھا۔ محض اس لئے کہ ان سے پہلے مقررین برابر لاؤڈ سپیکر استعمال کر رہے تھے۔ لیکن انہوں نے اپنی آواز پر بھروسہ کیا اور اس آلے کو اپنے سامنے سے ہٹا دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ ان کی تقریر جو ہمیشہ دل کے کانوں سے سُنی جاتی ہے اور سامعین پر ایک سکتے کا عالم طاری کر دیتی ہے وہ

اثر پیدا نہ کر سکی جوان کا مخصوص حصہ ہے۔ سامعین بےچین ہو گئے مگر ان کی شہرت اور شخصی وقار کے رعب سے بندھے بیٹھے رہے۔ جو لوگ ان کی تقریر کو آسانی سے سُن سکتے تھے وہ سُنتے رہے باقی سرگوشیاں کرنے لگے اور ہر طرف سے بار بار خاموش خاموش کی آوازیں آنے لگیں، اگر اس جلسے میں یہ آلہ نہ ہوتا تو یہی تقریر ہر شخص پوری توجہ سے سُنتا اور باوجود غیر معمولی ہجوم کے ایسی خاموشی طاری ہو جاتی کہ سوئی گرنے کی آواز بھی سنائی دیتی۔

اداکاری | بعض لوگوں کا خیال ہے کہ فن تقریر اداکاری کے مرادف ہے۔ اس لئے مقرر کو تقریر کرتے وقت اداکاری کے فرائض بھی ادا کرنے چاہئیں۔ اس اصول کے پیش نظر ہمارے بعض مقرر آئینہ سامنے رکھ کر تقریر کی مشق کرتے ہیں۔ ان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ جو کچھ ان کی زبان سے نکلے جسمانی حرکات بھی اس کا ساتھ دیں۔ میرا خیال ہے اداکاری کے لئے اس قسم کی مشق واقعی ضروری ہے لیکن تقریر کو اس سے بہت کم تعلق ہے۔ تقریر اور گفتگو میں محض آواز کی بلندی کا فرق ہے۔ جب عام طور پر باتیں کرتے ہوئے اداکاری کے فن کو کام میں نہیں لایا جاتا تو پھر تقریر میں اس کی کیا خاص ضرورت ہے۔ ہاں اتنا یاد رکھنا ضروری ہے کہ جو بات کہے وہ دل سے نکلے، اس طرح سے مقرر کے چہرے پر خود بخود صحیح جذبات آشکارا ہو جاتے ہیں نیز

مسلسل مشق اور مہارت کے بعد جب سامعین کا رُعب مقرر کے دل سے دُور ہو جاتا ہے تو اسمیں آپ ہی آپ ایسی حرکات کرنے کی جرأت پیدا ہو جاتی ہے جو گفتگو کرتے ہوئے فطری طور پر چہرے اور اعضا سے ظہور میں آتی ہیں۔ باقاعدہ ہر لفظ کی تصویر بن جانا مقرر کا کام نہیں ممکن ہے شاعروں کو یہ فن کچھ زیب دے ورنہ اداکار شاعروں کی بھی اکثر کرکری ہوتے دیکھی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سامعین کا خیال مقرر کے الفاظ اور خیالات کی طرف سے ہٹ کر اس کی حرکات اور اداکاری کی طرف متوجہ ہوتا ہے جس سے نفس مضمون کی دلچسپی زائل ہو جاتی ہے ہاں اگر بعض اوقات لیکن بہت ہی احتیاط سے اداکاری صرف کی جائے تو ممکن ہے سامعین کو کسلمندی دُور کرنے کا موقعہ مل جائے۔ مگر وہ لوگ جو باقاعدہ اداکاری کا فن دکھاتے ہیں اکثر اپنی غیر معمولی حرکات کی وجہ سے پریشان ہوتے ہیں۔ سامعین کے سامنے کھڑے ہو کر کوئی ایک غیر معمولی حرکت کرنیسے سامعین کو چہ میگوئیوں کا موقعہ مل جاتا ہے جس سے تقریر پر نہایت بُرا اثر پڑتا ہے۔

تقریر کا آغاز اور انجام تقریر کرنے سے پہلے مقرر کو ہمیشہ سوچ لینا چاہیئے کہ وہ تقریر کس طرح شروع کریگا اور کن الفاظ پر ختم کریگا۔ انگریزی میں ایک مثل مشہور ہے "جو کام عمدگی سے شروع ہوتا ہے وہ آدھا ختم ہو جاتا ہے"، بجنسہٖ یہی حالت تقریر کی ہے جو شخص اپنی

تقریر نہایت عمدگی سے شروع کرتا ہے حاضرین اس کے متعلق فوراً فیصلہ کر لیتے ہیں کہ یہ اچھی تقریر کرنے والا ہے اس طرح سے قدرتی طور پر مقرر سے ہمدردی اور اس کی تقریر سے دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے۔ اگر سوءِ اتفاق سے کوئی اچھا مقرر اپنی تقریر کو غلط طریقے یا پُھس پُھسے انداز سے اُٹھائے تو سب کی رائے اس کے متعلق خراب ہو جاتی اور اس کی قائم شُدہ شہرت بھی بگڑ جاتی ہے۔

تقریر کے آغاز کی طرح اس کا اختتام بھی شاندار ہونا نہایت ضروری ہے اگر کوئی کامیاب مقرر اپنی عمدہ تقریر کو نہایت زوردار الفاظ میں ختم نہیں کرتا تو اس کی نہایت شاندار تقریر کا ستیاناس اُڑ جاتا ہے۔ اس کامیابی کو حاصل کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ جب مقرر اپنی تقریر کے اختتام کے قریب پہنچے تو سامعین کی نبض ٹٹولتا ہے۔ جس وقت دیکھے کہ سامعین اس کے ہم خیال بن چکے ہیں اپنی تقریر کو نہایت زوردار الفاظ میں ختم کر دے اگر کوئی مقرر اپنی تقریر کو صحیح وقت پر ختم نہیں کرتا تو اس کے چند آخری مگر غیر ضروری فقرے اس کی تقریر کو خراب کر دیتے ہیں اور وہ اثر جو اس نے نہایت محنت اور جانکاہی سے پیدا کیا تھا محض ایک آدھ منٹ کی بے ہنگام تقریر سے زائل ہو جاتا ہے۔

تقریر کرنے کے چار طریقے | تقریر کرنے کے عام طور پر چار طریقے ہو سکتے

ہیں۔ اوّل یہ کہ مقرر اپنی تقریر لکھ کر کسی محفل یا مجلس میں پڑھ دے
دوسرے لکھ کر زبانی یاد کرلے اور پھر سامعین کے سامنے دہرادے،
تیسرے جو کچھ کہنا چاہتا ہو اسے دل میں اچھی طرح سوچ لے اور
پھر اس کو باحسن و جوہ عوام کے سامنے پیش کر دے۔ یا اپنے موضوع
کے متعلق کچھ مختصر سے نوٹ لکھ لے اور ان کو پیش نظر رکھ کر حاضرین
کے سامنے اپنے خیالات بیان کر دے۔

ا تقریر کو لکھ کر پڑھنا سامعین کے لئے کسی طرح بھی لطف دہ
نہیں ہوتا۔ اس قسم کی تقریر دل سے اکثر لوگ گھبرا جاتے ہیں اور
آپس میں باتیں کرنے لگتے ہیں اس طرح سے مجلس میں اچھی خاصی
بےچینی پیدا ہو جاتی ہے۔ اگر خوش قسمتی سے کسی شخصیت کا دبدبہ سامعین
پر چھا جائے تو وہ زبردستی بندھے بیٹھے رہتے ہیں۔ اور دل ہی
دل میں دُعائیں مانگتے ہیں کہ یا اللہ کب یہ سلسلہ تقریر ختم ہوگا
اور کوئی دوسرا مقرر آئیگا، جو طبیعتوں کو گرمائیگا اگر صبر اور ضبط کا
پیمانہ چھلک جائے تو کھانسی اُٹھنے لگتی ہے۔ فقرے بازیاں
شروع ہو جاتی ہیں۔ پے درپے تالیاں بجا کر مقرر کا ناک میں دم کر
دیا جاتا ہے۔ آخر مقرر کو اپنا سلسلہ بیان کوتاہ کرنا پڑتا ہے۔
میں نے بڑے بڑے مجمعوں میں بڑے اچھے مقررین کا یہ حشر
ہوتے دیکھا ہے۔ ان کی تقریر کے بلند پایہ اور جانکاہ
تحقیقات و تخیلات کا نتیجہ ہونے کے باوجود انہیں جس قدر ناکامیابی

ہوتی ہے۔ اس کو کچھ وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جنہوں نے یہ سمے اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں۔ لکھی ہوئی تقریریں عام طور پر اس مجمع میں کامیاب ہوتی ہیں جہاں خاص طبیعتوں کے لوگ جمع ہوں۔ اور ان پر عوام کا لفظ صادق نہ آتا ہو۔ ہاں کامیاب مقررین لکھی ہوئی تقریروں کو بھی اپنی صناعی اور ہوشیاری سے دلچسپ بنا دیتے ہیں۔ وہ تمام طور پر جہاں مناسب سمجھتے ہیں لکھی ہوئی تحریر سے ہٹ کر کوئی ایک آدھ بات سامعین کو مخاطب کر کے ایسی کہہ جاتے ہیں جس سے مسلسل تقریر کی گرانی دور ہو جاتی ہے۔ لکھی ہوئی تقریر میں سب سے زیادہ خرابی یہ ہوتی ہے کہ مقرر کی آنکھیں کاغذ پر جمی رہتی ہیں اور وہ ادھر اُدھر نہیں دیکھ سکتا۔ اس طرح سے وہ جوش اور ولولے جو مقرر سے آنکھیں چار ہونے کے لئے سامعین کے دلوں میں پیدا ہوتے ہیں ان کے دلوں کو نہیں گرماتے لہذا سامعین کی طبیعت خود بخود اُکتانے لگتی ہے۔ لکھی ہوئی تقریر کو پڑھنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اسے اپنے سامنے رکھ لیا جائے۔ اور وہ اتنی یاد ہو کہ ایک فقرے پر نظر پڑنے کے بعد کئی کئی فقرے زبان پر بے ساختہ آجائیں۔ گویا مقرر کی نظریں کاغذ پر نہ جمی رہیں بلکہ وہ برابر سامعین سے مخاطب رہے۔ عام طور پر سامعین محض الفاظ سے متاثر نہیں ہوتے بلکہ مقرر کا طرز بیان اس کی آواز اور توجہ اور شخصیت تمام مل کر ان کے دل میں اثر پیدا کرتی ہیں۔ اس لئے تقریر کرنے کا اگر بہترین طریقہ

اختیار کرنا پڑے تو تحریر میں فن تقریر کے اصولوں سے جان ڈالنی چاہئے۔ ورنہ لکھی ہوئی تقریر کبھی کامیاب نہیں ہوسکتی اور خاص طور پر ایسے مجمع میں جس میں مختلف طبیعتوں اور علمیتوں کے سامعین ہوں۔

۲۔ تقریر کا لکھ کر زبانی یاد کرنا بہترین طریقہ خیال کیا جاتا ہے۔ اس طریقہ تقریر میں سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ سامعین کی موجودگی کا مقرر پر بہت کم اثر پڑتا ہے۔ ورنہ آپس میں بیٹھ کر چند آدمیوں کے سامنے کسی موضوع پر مسلسل گفتگو کر لینا دوسری بات ہے۔ اور کسی مجمع کے سامنے کھڑے ہو کر مسلسل تقریر کرنا کچھ اور معنی رکھتا ہے اگر آپ کو تقریر کرنے کی مہارت نہیں ہے اور آپ کو ایک چھوٹے سے مجمع کے سامنے تقریر کرنے کے لئے کھڑا کر دیا جائے تو جو کیفیتیں آپ پر گزریں گی ان کا اندازہ کچھ آپ ہی کر سکتے ہیں یا وہ لوگ جن کو کبھی اس قسم کے دلچسپ واقعات سے سابقہ پڑا ہے۔ سب سے پہلے دل میں بےچینی پیدا ہو جائیگی۔ اور آپ کے چہرے سے اس کا اظہار ہونے لگیگا۔ کبھی معلوم ہوگا پیاس لگ رہی ہے کبھی محسوس ہوگا پیشاب آرہا ہے۔ ممکن ہے دل بھی بیٹھنے لگے اور آخرکار آپ کو تقریر کرنے کا ارادہ ہی ترک کرنا پڑے۔ خیر یہ تو معمولی سی بات ہے کہ زبانی یاد کی ہوئی تقریر آپ بالکل ہی بھول جائیں۔ اور جس وقت آپ سٹیج پر تقریر کرنے کے لئے لڑکھڑاتے ہوئے پہنچیں تو اپنے آپ کو کلی طور پر خالی الذہن پائیں

آخر اپنی جیب سے لکھی ہوئی تقریر نکالتے ہی بنے۔ سامعین پر نظر پڑے تو ایک ایک کے دو دو نظر آئیں۔ اگر کسی کی ٹوپی دکھائی دے تو سارے ہال میں ٹوپی والوں کا ہجوم نظر آئے اور اگر اتفاق سے کسی پگڑی والے کو آنکھیں دیکھ پائیں تو تمام ہال پگڑ پوش دکھائی دینے لگے۔ یہ تو ان لوگوں کی حالت ہوتی ہے جن کی نظر سٹیج پر کھڑے ہو کر کچھ کام کرتی ہے ورنہ تجربہ یہ ہے کہ ابتدائی تقریر میں نظریں ہی کام کرنے سے انکار کر دیتی ہیں۔ اگر کچھ دکھائی دیتا ہے تو اتنا کہ بہت زیادہ ہجوم ہے اور کسی کا سر ہی نہیں ہے۔ اگر سوءِ اتفاق سے لوگوں کی آنکھیں نظر آتی ہیں تو معلوم ہوتا ہے ہر شخص حملہ کرنے کو طیار بیٹھا ہے۔ غالباً اسی لئے بعض لوگ کہا کرتے ہیں کہ جب تقریر کرو تو بھول جاؤ کہ تمہارے سامنے کوئی بیٹھا ہؤا ہے۔ جو کچھ کہنا ہو بے دھڑک کہے جاؤ اور کسی شخص کی پروا نہ کرو یا یہ سمجھو کہ تمہارے سامنے بہت سے بیوقوف جمع ہیں جن میں بالکل عقل سمجھ نہیں اس لئے جو کچھ تم چاہو کہہ سکتے ہو۔ ممکن ہے یہ طریقہ مبتدی کے کام کا ہو۔ لیکن جہاں تک تجربے کا تعلق ہے۔ یہ خیال بالکل غلط ہے۔ سامعین کو بھول جانا اور جو کچھ منہ میں آنا کہے چلے جانا فنِ تقریر کے منافی ہے۔ جب تک تقریر کرنے والا سامعین کی ذہنیت اور ان کے خیالات کی رَو کا ساتھ نہ دے اس وقت تک اس کی تقریر کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی۔ بہترین مقرر ہمیشہ سامعین کے

ساتھ چلتا ہے۔ ان کو اپنی سبک رفتاری اور حُدی خوانی سے ایسا محو کر لیتا ہے کہ بعد میں خود رہنما اور رہبر بن جاتا ہے۔ سامعین بے اختیار ہو کر اس کے پیچھے پیچھے بھیڑ یا چال سے چلے آتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ اپنے دلپذیر حُسنِ بیان سے جس طرف چاہتا ہے۔ ان کو لے جاتا ہے۔ ظاہر ہے رٹی ہوئی تقریر میں مقرر کو رہنما بننے کا پورا موقعہ ہرگز نہیں مل سکتا۔ بہت ممکن ہے کہ عوام کے خیالات اور ذہنیت کا کسی قدر پہلے سے اندازہ کر لیا جائے اور اس کے بعد تقریر لکھ لی جائے۔ لیکن یہ کیسے معلوم ہو سکتا ہے کہ آپ سے پہلے مقررین کیا کہنے والے ہیں۔ سر تا سر زبانی یاد کی ہوئی تقریریں سب سے بڑی قباحت یہی ہوتی ہے کہ مقرر پیشرو مقررین کی تردید یا تائید کرنے سے قاصر رہ جاتا ہے اس لئے اس کی تقریر پوری طرح کامیاب نہیں ہو سکتی۔ اس کے علاوہ زبانی یاد کی ہوئی تقریریں اکثر اوقات بہت تکلیف دہ ثابت ہوتی ہیں۔ اگر سوء اتفاق سے مقرر کوئی فقرہ بیچ میں سے بھول جائے تو قدرتی طور پر اس کو انہی الفاظ میں دوبارہ دہرانے کی کوشش کرتا ہے۔ جس سے سامعین کو فوراً معلوم ہو جاتا ہے کہ تقریر رٹی ہوئی ہے۔ اگر کوئی مقرر اس خامی پر حاوی آ جائے تو کہیں نہ کہیں تقریر سے ضرور اس کا عیب ظاہر ہو جاتا ہے۔ سب سے پہلے تو انداز کلام ہی بتا دیتا ہے کہ وہ الفاظ جو مقرر کی زبان سے

نکلتے ہیں اس کے اپنے دل و دماغ پر کیا اثر کر رہے ہیں۔
اگر ہر فقرہ مقرر کی آنکھوں اور اس کے چہرے پر اصلی جذبات
پیدا نہیں کرتا تو سمجھ لو کہ گراموفون کا ریکارڈ بج رہا ہے۔ اور
یہ کسی اور شخص کی آواز ہے جو مُردہ جسم میں سے نکل رہی ہے۔ اس
لئے نہایت ضروری ہے کہ جب تقریر لکھ کر یاد کی جائے تو وہ
اپنے الفاظ میں ہو ورنہ وہ گراموفون ریکارڈ سے زیادہ اثر نہیں
پیدا کرے گی۔ اس کے علاوہ اس کو ادا کرنے میں تیزی ہرگز نہ
برتی جائے جس سے احتمال ہو کہ تقریر زبانی یاد کر رکھی ہے۔
۳۔ تقریر کرنے کا تیسرا طریقہ یہ ہے کہ جو کچھ کہنا ہو اس پر پہلے
اچھی طرح غور کر لے اور پھر اس کو سامعین کے سامنے پیش کر دے
یہ طریقہ تقریر سب سے زیادہ مشکل ہے۔ کم سے کم مبتدی اس پر
کاربند نہیں ہو سکتا۔ اگر کوئی نو آموز اس طریقے پر چلنے کی کوشش
کرے تو سخت غلطی کرتا ہے۔ بڑے بڑے مقررین بھی اکثر
یہ طریقہ اختیار نہیں کرتے۔ کیونکہ اس کے لئے مقرر میں دو خوبیوں
کی ضرورت ہے سب سے پہلے وہ صحیح اور صاف فقرے بنا سکتا ہو
دوسرے اپنے خیالات کو نہایت عمدگی سے بہترین الفاظ میں
بیان کرنے کی قدرت رکھتا ہو۔ ہم بیان کر چکے ہیں کہ جب
انسان کسی مجمع کے سامنے کھڑا ہوتا ہے تو اس پر عجیب عجیب
کیفیتیں گزرتی ہیں۔ ایک طرف سامعین کا خیال ہوتا ہے دوسری

طرف نفسِ مضمون کا۔ ایک طرف سامعین کو اپنا ہم خیال بنانے کی کوشش کی جاتی ہے اور دوسری جانب اپنے خیالات کو صحیح طریقے سے پیش کرنے کی سعی جاری رہتی ہے۔ اس طرح انسان ایک مخمصے میں پھنس جاتا ہے۔ ایک طرف سے دامن سمیٹتا ہے وہ دوسری طرف اُلجھ جاتا ہے۔ اِدھر سے بچتا ہے اُدھر پھنس جاتا ہے۔ غرض تقریر وبالِ جان ہو جاتی ہے۔ اور مقرر کی ناکامیابی کے امکانات بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ جو لوگ فنِ تقریر میں مہارتِ تامہ رکھتے ہیں اگر وہ یہ طریقہ اختیار کریں تو کوئی مضائقہ نہیں اور بہت ممکن ہے کہ وہ کسی حد تک کامیاب بھی ہو جائیں لیکن مبتدی کے لئے یہ طریقہ کار ہرگز بار آور نہیں ہو سکتا، اس لئے حتی الامکان اس سے اجتناب ہی کرنا چاہیئے اور اپنے آپ کو خطرے میں نہ ڈالنا چاہیئے۔

۴۔ چوتھا طریقہ یہ ہے کہ اپنے موضوع کے متعلق کچھ نوٹ لکھے اور اطمینان سے بیٹھ کر ان پر اچھی طرح غور و خوض کر لے۔ جب تقریر کا موقعہ آئے تو ان کو سامنے رکھے اور ہر نوٹ کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرتا چلا جائے۔ اس طریقے پر چلنے کے لئے بھی حُسنِ بیان کی ضرورت ہے۔ اگر مقرر اپنی زبان پر قادر نہیں۔ اور فی البدیہہ صحیح فقرے نہیں بنا سکتا تو یہ طریقہ بھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ آجکل عام طور پر یہی طریقہ رائج ہے۔ اس میں بھی وہی خامیاں اور خرابیاں ہیں جو تقریر کو زبانی دہرا لینے میں ہیں۔

محض اتنا فرق ہے کہ جو کچھ کہنا ہے وہ مختصر طور پر کاغذ پر لکھا ہوا موجود ہے اور اس میں ایک خاص ترتیب بھی معین ہے۔ گویا انسان اپنی یادداشت پر بھروسہ نہیں کرتا۔ اس طریقے میں بڑا فائدہ یہ ہے کہ حالات کے ماتحت مقرر اپنے مقررہ موضوع میں مفید مطلب مواد اضافہ کرکے اپنی تقریر کو حسب ضرورت کم اور زیادہ بھی کر سکتا ہے۔ لیکن بات وہی ہے کہ یہ طریقہ تقریر اختیار کرنے کے لئے تقریر کرنے کی مہارت اور زبان پر پوری دستگاہ لازم ہے اس لئے بلندی مقررین کو یہ طریقہ نہایت کم مواقع پر استعمال کرنا چاہیئے ؛

بہترین تقریر

فن تقریر کے لئے بعض ماہرین کا قول ہے کہ بہترین تقریر وہ ہے جو مقرر کو زبانی یاد ہو اور نہایت عمدگی سے اس کو ادا کیا گیا ہو۔ وہ تقریریں جو فی البدیہہ کی جاتی ہیں عام طور پر صفائی بیان۔ حُسن کلام۔ ترتیب کی خوبی اور وسیع النظری سے معرا ہوتی ہیں۔ ظاہر ہے یہ خُوبیاں وسیع مطالعہ اور محنت شاقہ سے ہی پیدا ہو سکتی ہیں اِس لئے فی البدیہہ تقریروں میں یہ خوبی پیدا کرنی بہت دشوار ہے وہ شخص جو اپنے مطالب لکھ لیتا ہے اور پھر یاد کرکے تقریر کرتا ہے اگر سوءِ اتفاق سے کسی نہ کسی طرح سامعین کو معلوم ہو جائے کہ تقریر رٹی ہوئی ہے۔ تو مقرر اپنے مقصد میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا ؛

عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ تقریر میں ان لوگوں کی کامیاب ہوتی ہیں جن کی تقریر کچھ فی البدیہ ہو۔ کچھ زبانی یاد کی ہوئی مگر شرط یہ ہے کہ سامعین کو پتہ نہ چلے کہ تقریر کا کونسا حصّہ فی البدیہ تیار ہوا ہے اور کونسا حصّہ مقرر کو زبانی یاد ہے۔ جن لوگوں کو عام طور پر تقریریں کرنے کا موقعہ ملتا رہتا ہے وہ خود بخود محسوس کرنے لگتے ہیں کہ عموماً سامعین کے لئے کس قسم کی لفظی خوراک کی ضرورت ہے۔ اس لئے ان کو بہت سی چیزیں زبانی یاد رہتی ہیں۔ جہاں کہیں مناسب موقع پاتے ہیں وہ اپنے زبانی یاد کئے ہوئے مواد کو اس خوبصورتی سے اپنی تقریریں شامل کر دیتے ہیں کہ حاضرین محو ہو جاتے ہیں اور یہ محسوس نہیں کر سکتے کہ تقریر کا یہ حصّہ مقرر کو زبانی یاد ہے۔ اس طرح سے مقرر سامعین پر حاوی ہو جاتا ہے۔ اور اپنے خیالات کی رو میں ان کو بہا لے جاتا ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ جب انسان فن تقریر کے میدان میں قدم رکھے تو اپنے آپ میں وہ خوبیاں پیدا کرنے کی کوشش کرے جو ایک کامیاب مقرر میں ہو سکتی ہیں۔ فن تقریر سے دلچسپی رکھنے والوں کو ہمیشہ یاد رکھنا چاہیئے کہ تقریر کا مقصد محض اپنے خیالات کا اظہار نہیں ہے۔ بلکہ اس سے زیادہ کچھ اور بھی ہے جس کو نظر انداز کرنے سے تقریر کا مقصد فوت ہو جاتا ہے۔ لہذا تقریر کرنے سے پہلے یہ سوچ لینا ضروری ہے کہ جو کچھ ہم کہیں گے کیا حاضرین اس کو اطمینان سے سُن لینگے، ہمارے موضوع سے ان کو

دلچسپی اور ہمدردی ہو سکے گی اور کیا وہ ہمارے ہمخیال ہو جائینگے سامعین
کو اپنا ہمخیال بنانا تقریر کا اوّلین اور آخری مقصد ہے۔ اگر کوئی تقریر سامعین
پر یہ اثر پیدا نہیں کرتی تو سمجھ لو کہ وہ بالکل ناکامیاب ہی چلی ہے اس میں کتنی ہی خوبیاں
کیوں نہ ہوں۔ اس لئے تقریر کرتے وقت سامعین کی ذہنیت اور انکے
خیالات کو ہمیشہ سامنے رکھنا اور اپنے آپ کو بالکل بھول جانا چاہیئے۔ مقرر
کی شخصیت ہمیشہ اس وقت نمودار ہوتی ہے جب وہ عوام کے ساتھ ساتھ چلتے
چلتے ان سے آگے نکل جاتا ہے اور وہ اس کی قیادت کو تسلیم کر لیتے ہیں۔
مقرر کے لئے یہی بہترین موقعہ ہے کہ جس طرف چاہے ان کو لیجائے اور جو
چاہے ان سے کام لے، جس وقت کسی خاص جذبے کے ماتحت بہت سے
لوگ ایک جگہ جمع ہوتے ہیں۔ چاہے وہ کسی طبقے سے تعلق رکھتے ہوں
ان کی ذہنیت بالکل بچوں کی سی ہو جاتی ہے۔ اگر مقرر ان کے دل کی بات
کہے تو مارے خوشی کے اُچھل پڑتے ہیں اور اگر کوئی بات ان کی طبیعت
کے خلاف کہدے تو جھنجلاتے ہیں اور لڑنے مرنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔
قابل اور کامیاب مقرر ان کی نبض دیکھتا ہے۔ پہلے ان کے دل کی
باتیں سُنا کر ان کو خوش کرتا ہے۔ اور من و تو کے فرق کو مٹا دیتا ہے جب
مجمع اس کے ڈھب پر آجاتا ہے تو نہایت خوبصورتی سے وہ اپنے اصل
موضوع کی طرف رجوع کرتا ہے۔ اور اس گریز میں وہ ان کے جذبات
کو اپنے خیالات کے ساتھ متفق کر کے ان کو اپنا ہم خیال بنا لیتا ہے۔"

تعلیم نسواں

تعلیم نسواں کی اہمیت

کوئی قوم یا مُلک اس وقت تک ترقّی نہیں کر سکتا جب تک کہ اس کے افراد اعلیٰ قابلیت کے مالک نہ ہوں۔ اور اعلیٰ قابلیت بغیر اعلیٰ تعلیم و تربیت کے پیدا نہیں ہو سکتی چونکہ انسانی گروہ مرد اور عورت سے مرکّب ہے اور اللہ میاں نے اس مرکّب کے اجزا کو لازم اور ملزوم بنایا ہے۔ اس لئے تہذیب و تمدن کی ترقّی مرد اور عورت دونوں کی تعلیم کے بغیر ناممکن ہے کسی کا خیال ہے کہ مرد اور عورت تصویر انسانی کے دو رُخ ہیں بعض لوگ کہتے ہیں کہ زندگی کی گاڑی کے دو پہیئے ہیں اور بعض کے نزدیک گھر ایک سلطنت ہے۔ مرد اس کا حاکم ہے اور عورت اس کی وزیر۔ اگر مرد اور عورت تصویر انسانی کے دو رُخ ہیں۔ تو دونوں رُخوں کو ایک جیسا خوبصورت ہونا چاہئیے۔ اگر ایک گاڑی کے دو پہیئے ہیں تو یہ کیا کہ ایک تو ربڑ ٹائر ہو اور دوسرے پر لوہے کا ہال بھی نہ ہو۔ اور اگر مرد ہوم گورنمنٹ کا حاکم اور عورت وزیر ہے تو یہ کیسی مضحکہ خیز بات ہے کہ حاکم میں تو ہر ممکن قابلیت کا ہونا لازمی قرار دیا جائے اور عورت جو امور سلطنت خانگی کو عملی جامہ پہنانے والی

ہے۔ اس کے قوائے عقلی تعلیمی جلا سے مجلا نہ ہونے پائیں۔

عورت ناقص العقل کیوں ہے

ہم لوگ کہتے ہیں کہ عورتیں ناقص العقل ہیں اور ان کی عقل گدی میں ہوتی ہے اس لئے بڑے بڑے امور اور مہمات میں وہ دخل دینے کے ناقابل ہیں لیکن دیکھنا یہ چاہئے کہ آخر اس کمزوری کے کیا وجوہ ہیں۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ جب سے دنیا وجود میں آئی ہے عورت کو دیدہ و دانستہ تعلیم سے بے بہرہ رکھا گیا ہے۔ اور اس نرم و نازک ہستی کو ناقص العقل کا خطاب دیدیا گیا ہے ایک معمولی سی بات ہے کہ اگر اپنے جسم کے کسی عضو سے آپ کام نہ لیں تو تھوڑی ہی مدت میں وہ بیکار ہو جاتا ہے بعینہ یہی حال عورت کا ہے کہ ان کے قوائے عقلیہ کو جلاء تعلیم سے چمکایا نہیں جاتا اس لئے ان کی عقل سوائے ان کاموں کے جو انھیں دن رات پیش آتے ہیں۔ کام نہیں کرتی۔ جس سوسائیٹی نے عورت سے سپاہیوں کا کام لینا فرض سمجھا ہے وہاں عورتوں نے نہایت بہادری اور جانفشانی سے سپاہیوں کے کام بھی کئے ہیں اور مردوں کے برابر کی قربانیاں کی ہیں اس میں کوئی شک نہیں کہ عورتیں مردوں کے کام نہیں کر سکتیں۔ کیونکہ فطرت نے سوسائیٹی کا نظام قائم رکھنے کے لئے عورت کو خاص غرض و منشا کے لئے پیدا کیا ہے۔ اور ان کے فرائض مردوں کے کاموں سے ذرا مختلف مقرر کئے ہیں۔ لیکن ان کے مخصوص کام بھی ایسے ہیں

جن کے لئے اعلیٰ تعلیم و تربیت کی اشد ضرورت ہے۔

کتنے افسوس کی بات ہے ہم ہر وقت تو اس بات کی رٹ لگاتے رہتے ہیں کہ تعلیم یافتہ لوگوں کی صحبت میں بیٹھنا چاہیئے اور عورت جو ہماری زندگی کا جزو لاینفک ہے اس کا غیر تعلیم یافتہ رہنا پسند کریں، چونکہ عورت مرد کی مشیر اور راز دار ہوتی ہے اور فطرت نے عورت کے لئے مرد کے دل میں غیر فانی کشش اور محبت ودیعت کی ہے اس لئے نہایت ضروری ہے کہ ہماری شریک حیات و ممات بھی تعلیم کے فیضان سے بے بہرہ نہ ہو۔ تاکہ وہ اپنے فرائض کو عمدگی سے انجام دے سکے۔

انمل ازدواج جن گھرانوں کی عورتیں علم کی روشنی سے محروم ہوتی ہیں۔ ان کی تاریکی کی وسعت کا کیا کہنا ہے جس گھر میں جاتی ہیں اس کو اپنی تاریکی کے اثرات سے متاثر کر دیتی ہیں۔ پھوہڑ بد سلیقہ اور خدا جانے کیا کیا کہلاتی ہیں۔ دن رات خود ساس نندوں کے طعنے سنتی ہیں۔ تعلیم یافتہ شوہروں کے دل سے اُتر جاتی ہیں۔ خود بھی طرح طرح کے مصائب میں گرفتار رہتی ہیں اور اپنے متعلقین کی پریشانی کا باعث بھی بنتی ہیں۔ وہ واقعات کی رو میں بہ جاتی ہیں بلکہ دوسروں کو بھی اپنے ساتھ بہا لے جاتی ہیں۔ چونکہ علم سے بے بہرہ ہوتی ہیں اس لئے کسی قسم کا تدارک نہیں کر سکتیں ناموافق حالات سے زندگی اجیرن ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے

ملک میں ننانوے فیصدی خاندان خانگی زندگی کے لُطف نہیں اُٹھاتے
مرد اور عورتیں دونو بیاہ شادی کا نام سُن کر کانوں پر ہاتھ رکھتے
ہیں۔ اور راہبانہ زندگی بسر کرنے کو پسند کرتے ہیں *

اکثر دیکھنے میں آتا ہے کہ مرد تو اعلےٰ درجہ کا تعلیم یافتہ ہے
لیکن بیوی صاحبہ الف کے نام بے بھی نہیں جانتی۔ مرد جو کچھ چاہتا
ہے عورت وہ مہیا نہیں کر سکتی۔ شوہر اپنی بیوی کے خیالات بلند
کرنا چاہتا ہے لیکن وہ اپنے دماغ میں کسی نئے خیال کو جگہ دینا
تو کجا گزُرنے تک کا راستہ نہیں دیتی۔ مرد چاہتا ہے کہ گھر
صاف سُتھرا ہو۔ ہر چیز قرینے سے رکھی ہوا ور درست ہو۔ جس
چیز کی ضرورت پڑے زبان سے نکلتے ہی حاضر ہو جائے۔ جو
مہم درپیش ہو اس میں عورت بھی برابر کی مددگار ہو۔ لیکن عورت
کی حالت یہ ہے کہ گھر میں چوہے قلابازیاں کھا رہے ہیں۔ جس
چیز کی ضرورت ہے پتہ نہیں چلتا کہاں پڑی ہے۔ اگر کسی بات
میں مشورہ طلب کیا جائے تو ہمیں کیا پتہ کا دلدوز فقرہ زبان
پر ہے۔ حفظان صحت کا کچھ پتہ نہیں۔ آئے دن کوئی نہ کوئی بیمار
ہے۔ اگر بچہ گود میں ہے تو اور بھی بُرا حال ہے۔ نہ اپنی خبر
ہے نہ بچے کا ہوش ہے۔ گھر کیا ہے کباڑیئے کی دُکان ہے۔
صفائی سُتھرائی کی یہ حالت ہے کہ گھوڑوں گدھوں کے اصطبل
ان سے بہتر ہونگے۔ کہیں گوُموت پڑا ہے کہیں کوُڑے کے

ڈھیر ہیں - کوئی باہر کا آدمی آجائے تو دیکھ کر کیا کہے اور اپنے دل میں کیا خیال لے کر جائے - یہی وجہ ہے کہ بے پڑھی لکھی عورتیں عموماً تعلیم یافتہ مردوں کے دلوں میں گھر پیدا نہیں کر سکتیں - لاعلمی اور ناواقفیت سے نہ صرف ان کی اپنی زندگی وبال جان ہوتی ہے بلکہ مردوں کی زندگی کا لطف اور ترقی کا جوش بھی ٹھنڈا پڑ جاتا ہے - اس کی گھر کی دلچسپیاں کم ہوتی جاتی ہیں - اور محض وضعداری کا پاس گھر کے قیام کو سنبھالے رکھتا ہے - ایسے انمل جوڑوں میں اکثر اختلاف پیدا ہو جاتا ہے - اور باہمی بدمزگی سے زندگی بدمزہ ہو جاتی ہے - ہم تسلیم کرتے ہیں کہ بعینہ یہی حالت ان مردوں کی بھی ہوتی ہے جو عورتوں کے مقابلے میں تعلیم یافتہ نہیں ہوتے - اس لئے ضروری ہے کہ شادی بیاہ کرنے سے پہلے عورت اور مرد کی تعلیم و تربیت کا مقابلہ اور موازنہ کر لیا جائے تاکہ نئی زندگی شروع کرنے کے بعد کسی قسم کی بے لطفی پیدا ہونے کا امکان نہ رہے ۔

ہمارے ملک میں مردوں کی تعلیم کا تو عام چرچا ہے - لیکن عورتوں کی تعلیم کی طرف بہت کم لوگ متوجہ ہیں - ضرورت اس بات کی ہے کہ عورتوں کی تعلیم پر بہت زیادہ توجہ صرف کی جائے تاکہ ہم خیال جوڑے پیدا ہو سکیں - اور کشمکش حیات کی جنگ میں وہ پہلو بہ پہلو کام کر سکیں - بعض لوگ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ

عورتوں کی تعلیم اتنی اہم ہے۔ کہ مردوں کی تعلیم کے ادارے اس پر قربان کر دینے چاہئیں کیونکہ جب تک عورت تعلیم کے زیور سے آراستہ نہ ہوگی اس وقت تک بچوں کی تعلیم کا خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں ہوسکتا۔ اس میں کوئی شک نہیں جس گھر کی عورتیں تعلیمیافتہ ہوں اس گھر کے بچے تعلیم وتربیت میں ان بچوں سے ضرور بہتر ہوتے ہیں جس گھر میں تعلیم نسواں کا چرچا نہیں ہوتا۔

تعلیم کیسی ہونی چاہئے

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ عورتوں کو کیسی تعلیم دینی چاہئے۔ یہ تو مسلّمہ امر ہے کہ عورتوں کی تعلیم مردوں کی تعلیم سے الگ قسم کی ہونی چاہئے۔ چونکہ فطرت نے عورت کو خاص مقاصد کے لئے پیدا کیا ہے۔ اس لئے ان کی تعلیم ایسی ہونی لازم ہے جو اُن کے اصلی جوہروں پر جلا کرے اور ان کی مخصوص صفات کو ضائع نہ ہونے دے۔ سب سے پہلے تو یہ بات ہے کہ عموماً عورت بغیر مرد کی امداد کے زندگی بسر نہیں کر سکتی۔ اس میں چاہے اس کے باپ بھائی ہوں یا خاوند۔ چونکہ عورت فطرتاً کمزور اور نازک پیدا ہوئی ہے اس لئے وہ تنہا دُنیا کی سختیوں اور مصیبتوں کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اس لئے عورت کی مخصوص کمزوریوں کو ملحوظ رکھ کر اس کو ایسی تعلیم دینی چاہئے جو عورت کے اس رشتہ تعاون کو خوشگوار اور مضبوط بنانے میں ممد ثابت ہو۔ جو اس کی پیدائش کا حقیقی منشا ہے۔

بیشتر اس کے کہ ہم عورتوں کی تعلیم کے نصاب کا تعین کریں ہمیں دیکھ لینا چاہیئے کہ ہماری سوسائٹی میں عورتوں سے کیا کام لئے جاتے ہیں۔ کیونکہ جو تعلیم ان کاموں کو احسن طریقے سے انجام دینا سکھائیگی وہی تعلیم عورت کو مکمّل اور کامیاب عورت بنا سکتی ہے،،

ہمارے ہاں عورتوں سے عام طور پر خانہ داری کا کام لیا جاتا ہے اس لئے مناسب یہ ہے کہ ان کی تعلیم اس طریقے سے ہو کہ خانہ داری کے صحیح اصولوں سے ان کو واقفیت ہو جائے۔ حقیقت یہ ہے کوئی عورت خانہ داری کی قابلیت کے بغیر عورت کہلانے کی مستحق نہیں۔ بچّے پالنا۔ تیمار داری کرنا۔ کھانا پکانا حفظان صحت کے ابتدائی اصولوں سے کماحقہٗ واقف ہونا ہر عورت کا فرض ہے۔ اس کے علاوہ ان کی تعلیم کم از کم اتنی ضرور ہونی چاہیئے کہ بچّوں کی ابتدائی تعلیم کی دیکھ بھال کر سکیں۔ اور اپنے عزیزوں کو خط پتر لکھنے کے لئے دوسروں کی محتاج نہ ہوں۔ حساب دانی کی بھی کم وبیش ضرورت ہے تاکہ گھر کی آمد اور خرچ کا باقاعدہ حساب ہو سکے۔ عورتوں کی اخلاقی تعلیم کی طرف خاص طور پر توجہ کرنی چاہیئے کیونکہ جس گھر کی عورتوں کی اخلاقی حالت خراب ہوتی ہے اس گھر کے بچّوں کے اخلاق بھی بگڑ جاتے ہیں۔ اور وہ دُنیا میں ترقّی کے مدارج بدقت طے کر سکتے ہیں۔ عورت کی تعلیم کے مسئلے پر غور کرتے وقت ہمیشہ یاد رکھنا چاہیئے کہ جس قوم میں عورتیں باشعور اور سلیقہ مند

ہونگی وہ قوم اسی قدر متمدن اور شایستہ کہلائیگی۔ اس نظریے سے ثابت ہوتا ہے کہ عورتوں کو تعلیم دینا گویا قوم کو تعلیم دینا ہے۔ کیونکہ ابتداً بچے اپنی ماؤں کی نگرانی میں پلتے ہیں جو خصائص ماؤں میں ہوتے ہیں وہی بچوں میں پیدا ہو جاتے ہیں۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ اول تو مائیں خود اپنی اولاد کو دودھ پلائیں اگر کسی سبب سے ایسا ہونا ممکن نہ ہو تو پھر ایسی اَنّا تلاش کی جائے جس میں کوئی اخلاقی عیب نہ ہو تاکہ اس کے اخلاق واوصاف کا پرتو بچے پر نہ پڑے ؎

موجودہ تعلیم نسواں کے نقصانات

افسوس ہے کہ ہمارے ملک میں اس وقت تک عورتوں اور مردوں کو ایک ہی قسم کی تعلیم دی جاتی ہے اور یہ بہت بڑی غلطی ہے کیونکہ موجودہ تعلیم عورتوں کی ضرورت کے مطابق نہیں۔ یہ مسلّمہ امر ہے کہ عورتیں وہ کام نہیں کرتیں جو مرد کرتے ہیں۔ پھر ایسی تعلیم جو مردوں کے لئے مفید نہیں وہ عورتوں کے لئے کیسے مفید ہو سکتی ہے۔ ظاہر ہے کہ موجودہ طرز تعلیم سے سوسائٹی کو سخت نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ سب سے بڑا نقصان تو یہی ہے کہ شادی کے بعد عورتوں کی اعلیٰ تعلیم اکثر اکارت جاتی ہے۔ کیونکہ وہ مخصوص رسم ورواج کی وجہ سے مردوں کے دوش بدوش کام نہیں کر سکتیں۔

عورتوں کے لئے ہمیں ایسا نصاب مرتب کرنا چاہئیے کہ وہ نہایت کامیاب زندگی بسر کر سکیں۔ سب سے پہلے ان کے لئے خانہ داری

کی تعلیم ہونی چاہیئے جس میں خاص طور پر کھانا پکانے سینے پرونے حفظان صحت اور تیمار داری کی تعلیم دی جائے اور اس کے ساتھ ساتھ کوئی ایسی گھریلو صنعت یا دستکاری بھی سکھائی جائے جو بوقت ضرورت گزر اوقات کا ذریعہ بن سکتی ہو۔

ہم یہ نہیں کہتے کہ عورتوں کو اعلیٰ تعلیم نہیں دینی چاہیئے۔ ابتدائی تعلیم جو عورت کی مخصوص صفات قائم رکھنے کے لئے لازم ہے وہ یہی خانہ داری کی تعلیم ہے اب جو صاحب استطاعت ہیں وہ اگر چاہیں تو اپنی لڑکیوں کو شوق سے اعلیٰ تعلیم دلوائیں، ڈاکٹری پڑھائیں، نرسنگ سکھلائیں یا کوئی اور مناسب تعلیم دلوائیں۔ لیکن عورتوں کی ابتدائی تعلیم میں خانہ داری اور اس سے متعلقہ فرائض کو خاص اہمیت دینی چاہیئے۔

معلمی کی تعلیم

ماہرین تعلیم نے متفقہ طور پر فیصلہ کیا ہے۔ کہ ابتدائی تعلیم عورتوں کے سپرد کرنی چاہیئے۔ کیونکہ مردوں کی نسبت عورتیں بچوں سے زیادہ پیار رکھتی ہیں۔ اور ان کے عادات وخصائل سے کماحقہٗ واقف ہوتی ہیں۔ نیز بچے بھی مردوں سے زیادہ عورتوں سے مانوس ہوتے ہیں۔ اس لئے عورتوں کی تعلیم وتربیت کا اثر ان کے دل ودماغ پر بہت اچھا پڑتا ہے۔ اس کے علاوہ عورتوں کے پاک اور عمدہ کریکٹر کا پرتو بچوں کے کریکٹر بنانے میں غیر معمولی مدد دے سکتا ہے۔ کریکٹر کی مضبوطی اور پاکبازی تہذیب وتمدن

کی ترقی کے لئے نہایت ضروری ہے۔ اس معاملے میں یہ احتیاط بہت اہم ہے کہ بچّوں کو تنگ نظر اور توہم پرست ماؤں کی گودیں سے نکال کر ان کو اسی قسم کی اُستانیوں کے سپرد نہ کیا جائے۔ کیونکہ خلاف فطرت ماحول بچّوں کو بھی تنگ نظر توہم پرست اور بزدل بنا دیتا ہے۔ جس سے قومی اور مُلکی ترقی درماندگی اور بیچارگی کا شکار ہو کر رہ جاتی ہے ؀

خدا کا شُکر ہے کہ ہمارے مُلک میں اب تعلیم یافتہ اُستانیوں کی کمی نہیں رہی۔ لیکن ابھی لڑکیوں اور لڑکوں کی مخلوط ابتدائی تعلیم کا خیال زیادہ مقبول نہیں ہوا۔ تعلیم کی مقبولیّت کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ عنقریب چند سالوں میں مخلوط ابتدائی تعلیم مقبولیّت حاصل کرلے گی۔ اور وہ رسمی اور رواجی بندشیں جو اس طرز تعلیم کو اختیار کرنے میں حائل ہیں بہت جلد دُور ہو جائیں گی۔ اور ہمارے بچّے ابتدائی تعلیم عورتوں کی نگرانی میں حاصل کرنے لگیں گے۔ جن سے خاطر خواہ فوائد مرتب ہونگے ؀

تعلیم نسواں کا زبان پر اثر

چونکہ عورت قدرت کی صنعت کا نہایت اعلیٰ نمونہ ہے۔ اس لئے اس کی رفتار و گفتار اور افعال و اطوار بہت دلپذیر ہوتے ہیں۔ عورت کی پاکیزگی اور نفاست ماحول میں بھی شستگی اور عمدگی پیدا کرتی ہے۔ وہ اپنی قدرتی ساخت کے مطابق نرم و نازک زبان بولتی اور ویسی ہی چیزوں کو پسند کرتی ہے۔

اس کی قدرتی نفاست سے زبان میں بھی نفاست اور نرمی پیدا ہو کر کرختگی دُور ہوتی ہے۔ مُغلیہ سلطنت کے آخری دَور میں قلعہ معلی کی زبان بڑی مستند اور شُستہ خیال کی جاتی تھی۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ قلعے کی مستورات زیورِ علم سے آراستہ تھیں۔ ہر موضوع پر گفتگو کر سکتی تھیں۔ ضرورت کے مطابق دلپذیر اور دلنشین محاورے گھڑتی تھیں۔ عربی فارسی ہندی سنسکرت وغیرہ کے الفاظ میں سے اچھے اچھے ہلکے اور نازک نازک الفاظ اپنے استعمال کے لئے نکال لیتی تھیں۔ اور ان کو بات بات میں نہایت خوبصورت پیرائے میں استعمال کرتی تھیں۔ اس لئے جو الفاظ اور محاورات ان کی زبان سے نکلتے تھے مقبولیت کی سند پاتے تھے۔ اور فصیح کہلاتے تھے"

توہمات اور رسم و رواج اِس بات کو ہر شخص تسلیم کریگا کہ تعلیم سے بے بہرہ عورتیں عام طور پر بہت زیادہ توہم پرست ہوتی ہیں ان کے توہمات کو دُور کرنے کے لئے ضروری ہے کہ انہیں تعلیم دی جائے تاکہ وہ بے معنی توہمات سے ملک و قوم کی ترقی کے راستے میں رُکاوٹ پیدا نہ کریں۔ ہر خاندان میں مختلف قسم کی رِیتیں رسمیں عورتوں کی وجہ سے وجود میں آتی اور ان کی شدت سے پابندیاں کی جاتی ہیں ورنہ مرد کسی رِیت رسم کی پروا نہیں کرتے۔ بہت سے ترقی یافتہ اصول اسی وجہ سے عمومیت اور مقبولیت

حاصل نہیں کر سکتے کہ ہماری بے پڑھی لکھی عورتیں محض اپنے توہمات کی بدولت نہ تو ان کو خود قبول کرتی ہیں اور نہ مردوں کو قبول کرنے دیتی ہیں۔ تعلیم نسواں کی مقبولیت میں بھی رسم و رواج نے بہت رکاوٹیں پیدا کی ہیں۔ ورنہ تعلیم نسواں جیسی ضروری چیز سے اتنی بے پروائی نہ برتی جاتی "

جن گھرانوں میں تعلیم کی روشنی پہنچ جاتی ہے۔ وہاں آپ ہی آپ بہت سے نقصان دہ فضول اور مضحکہ خیز رسم و رواج ختم ہو جاتے ہیں گویا تعلیم کا جن توہمات کے بھوتوں کو لاتیں مار مار کر نکال دیتا ہے۔ ہندوستان میں تعلیم نسواں سے بہترین فائدہ یہی پہنچا ہے کہ فضول رسموں کا دن بدن خاتمہ ہو رہا ہے۔ اور مفید قواعد و ضوابط اُن کی جگہ لے رہے ہیں۔ بیاہ شادیوں تعویذ گنڈوں اور پیر پرستیوں وغیرہ میں جس قدر روپیہ بیکار ضائع کیا جاتا تھا۔ وہ اب مفید کاموں میں صرف ہوتا ہے جس سے خوشحالی اور فارغ البالی بڑھ رہی ہے۔ پہلے بیاہ شادیوں کے موقعہ پر بڑی بڑی رقمیں قرض لے کر رسوم عروسی ادا کی جاتی تھیں۔ اگر ان میں کسی قسم کی کمی رہ جاتی تو برادری میں ناک کٹ جاتی تھی۔ اور اکثر خاندان عمر بھر کے لئے طعن و تشنیع کا نشانہ بن جاتے تھے۔ پڑھے لکھے گھروں میں اب ان باتوں کی پروا بھی نہیں کی جاتی۔ جس قدر روپیہ فضول باتوں پر صرف ہوتا تھا وہ لڑکی کے نام بنک میں جمع کرا دیا

جاتا ہے۔ اس سے بہتر یہ رواج پیدا ہو رہا ہے کہ جو کچھ لڑکی کو دینا ہو وہ اس کی تعلیم پر خرچ کر دیا جائے۔ تاکہ میاں بیوی دونو مل کر کمائیں اور آرام کی زندگی نہایت عمدہ معیار پر بسر کریں۔ یہ حالات اس بات کی دلیل ہیں کہ ہمارے ملک میں تعلیم نسواں کی مقبولیت سے ایک خوشگوار دَور کا آغاز ہونے والا ہے۔

تعلیم نسواں کو کیونکر ترقی دی جاسکتی ہے

تعلیم کی جس قدر ضرورت ہمارے ملک میں ہے اتنی دنیا کے کسی اور ملک میں نہیں۔ اور تعلیم نسواں کی تو اور بھی زیادہ ضرورت ہے۔ باوجود مسلسل کوششوں کے تعلیم نسواں ابھی تک عوام میں مقبولیت تام حاصل نہیں کر سکی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے مرد ہی پڑھے لکھے نہیں تو عورتیں کیسے پڑھ سکتی ہیں۔ دوسرے زنانہ تعلیم کا نصاب بھی ضرورت کے مطابق نہیں۔ اس لیئے پڑھی لکھی عورتیں ازدواجی زندگی میں پڑتے ہی مصیبتوں میں گرفتار ہو جاتی ہیں۔ ناموافق ماحول سے زندگی دوبھر ہو جاتی ہے اور اکثر بُرے نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ ان بُرے نتائج سے تعلیم کی مقبولیت میں فرق آتا ہے۔ اور لوگ تعلیم نسواں سے بدظن ہو جاتے ہیں۔ اگر لڑکیوں کے لئے ابتدائی نصاب ایسا مقرر کر دیا جائے جو نسوانی زندگی کو چار چاند لگائے۔ خانہ داری سے دلچسپی پیدا کرے۔ اور ان نسوانی صفات پر جلا کر دے۔ جو عورتوں کے لئے باعث فخر ہو سکتی ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ مردانہ تعلیم کی نسبت

زنانہ تعلیم پر زیادہ توجہ صرف نہ کی جائے۔ تعلیم یافتہ عورتوں کے متعلق یہ عام شکایت ہے۔ کہ وہ تعلیم حاصل کرکے فضول خرچ اور آزاد ہو جاتی ہیں اور چراغ خانہ سے شمع محفل بن جاتی ہیں۔ اگر یہ اعتراض کسی حد تک درست ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ موجودہ نصاب تعلیم یافتہ عورتوں کے معیار زندگی عام عورتوں سے بہت زیادہ بلند کرکے انہیں بیرونی دُنیا کی طرف متوجہ کر دیتا ہے اس لئے ان کی خانگی زندگی عام عورتوں سے مختلف ہو جاتی ہے اور عوام کی تنگ نظری ان کو ملامت کا نشانہ بنا لیتی ہے"

تعلیم نسواں کی ترقی اور ترویج کے لئے نہایت ضروری ہے کہ اسے ایسے طریقوں سے پیش کیا جائے جو عوام کے مذاق کے خلاف نہ ہوں اور اس کے ساتھ ساتھ یہ کوشش بھی کی جائے کہ تعلیم کی وجہ سے بُرے نتائج پیدا نہ ہوں جو تعلیم کی مقبولیت عامہ میں خلل انداز ہوں"

امید ہے کہ ابتدائی جبری تعلیم سے تعلیم نسواں کو مزید ترقی اور مقبولیت حاصل ہوگی نیز حکومت اور قومی اداروں کی طرف سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے آسانیاں بہم پہنچانا اور ہونہار لڑکیوں کو وظیفے دے کر غیر ممالک میں بھیجنا پھر ان تعلیم یافتہ لڑکیوں کے لئے عمدہ روزگار مہیا کرنا تعلیم نسواں کی توسیع میں ضرور مددگار ثابت ہوگا۔ لیکن پھر بھی اس بات کی ضرورت ہے کہ

تعلیم نسواں کی ترویج و توسیع میں مزید کوششیں صرف کی جائیں کیونکہ کوئی ملک اس وقت تک ترقی کے مدارج آسانی سے طے نہیں کرسکتا۔ جب تک کہ اس کی عورتیں تعلیم یافتہ نہ ہوں۔ آپ خود غور کرسکتے ہیں کہ ماؤں کی تربیت کا اثر ان کی اولاد کی ترقی میں کس قدر ممد و معاون ہوتا ہے۔ جس ملک کی غیر تعلیم یافتہ مائیں ملک کے لئے باعث فخر سپوت پیدا کرسکتی ہیں۔ اگر وہ تعلیم کی دولت سے بھی مالا مال ہوں تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ ایسی اولاد پیدا نہ کرسکیں جن کی قابلیت اور لیاقت سے تمام دنیا فائدہ اُٹھائے اور ان کی خوشبو سے اطراف عالم مہک اُٹھیں ٭

کفایت شعاری

۹ کفایت شعاری کا اصلی مفہوم یہ ہے کہ فارغ البالی اور خوش حالی کے زمانے میں ہم پیش بینی سے کام لیں اور ہمیشہ اپنی آمدنی کی وسعت اور ذرائع کو مدنظر رکھ کر اپنے اخراجات کو آمدنی کے ساتھ ساتھ گھٹاتے بڑھاتے رہیں نیز اپنے سرمایہ کو خوب اچھی طرح سوچ سمجھ کر مفید کاموں میں صرف کریں۔ دُنیا کے انقلابات۔ دُکھ بیماری اور نامعلوم ضرورتوں کے خیال کو ہمیشہ سامنے رکھیں۔ اور ان لوگوں کی عبرتناک مثالوں سے درس عبرت حاصل کریں جو کبھی صدر نشین تھے مگر اپنی فضولخرچی کی بدولت تمام دولت کھو بیٹھے اور خاک نشیں ہو گئے۔ ان لوگوں کے حالات کو مدنظر رکھنا بھی مفید ہے جو کبھی اتنے فراخ دست تھے کہ فیاضی میں حاتم طائیؒ کا مقابلہ کرتے تھے مگر زمانے کی گردش اور حزم و احتیاط کے فقدان نے ان کو تنگ دست اور دوسروں کا دست نگر بنا دیا۔ ہمیں غور کرنا چاہیئے کہ وہ کیا اسباب تھے جنہوں نے ان کی امارت اور سرمایہ داری کا خاتمہ کر دیا اور ان سے کونسی ایسی غلطیاں سرزد ہوئیں کہ آج وہ کسی مشکل کشا اور مددگار کی تلاش

ہیں سرگرداں اور پریشان ہیں *

اگر نظرِ غائر سے ان حالات کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان لوگوں میں کفایت شعاری نہ تھی۔ وہ اپنے سرمایہ کو ایسے غیر مفید کاموں میں بے دریغ صرف کرتے تھے۔ جن میں ایک مرتبہ روپیہ صرف ہوکر دوبارہ ان کے ہاتھ میں واپس نہ آتا تھا۔ انکے خزانے روپیہ اُگلتے تھے لیکن نگلتے نہ تھے اِس لئے بہت کم مدت میں ان کے خزانوں کے پیٹ خالی ہوگئے۔ اور وہ لوگ بھی ان کا ساتھ چھوڑ گئے جو رات دن ان کا نمک کھاتے اور آگے پیچھے پھرتے تھے۔ اور ان کی باتوں کو حکم خدا اور حکم رسول سے کم وقعت نہ دیتے تھے۔ ان کی فضولخرچی سے یہ لوگ آقا بن گئے اور خزانوں والے غیر کفایت شعار لوگ لونڈی غلام کے درجہ کو پہنچ گئے

کفایت شعاری بڑی دولت ہے

کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ کفایت شعاری ہی دولتمندی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہی شخص دولتمند ہو سکتا ہے جو کفایت شعار ہوتا ہے۔ اور وہی قوم دولتمند کہلاتی ہے جس کے افراد کفایت شعار ہوتے ہیں۔ برخلاف اس کے جو لوگ فضولخرچ ہیں وہ کبھی دولتمند اور مالدار نہیں ہو سکتے ان کے اخراجات کو پورا کرنے کے لئے قارون کے خزانے بھی ناکافی ہیں۔ باوجود دولت کی فراوانی اور روپے کی کثرت کے ان کی ضرورتیں کبھی پوری نہیں ہوتیں۔

لیکن جو قومیں کفایت شعاری کے وصف سے متصف ہیں ان کا مستقبل درخشندہ ہوتا ہے۔ ترقّی اور مرادمندی ان کے قدم لیتی ہے۔ دولت کی تکثیر کے ساتھ ساتھ ان کی قدر و منزلت میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ یہی وہ قومیں ہیں جو متمدّن اور مہذّب کہلاتی ہیں اور ان کے کارنامے سنہری حروف میں لکھے جاتے ہیں۔ جن اقوام میں کفایت شعار لوگ نہیں ہوتے وہ ترقّی کی دوڑ میں ہمیشہ پیچھے رہتی ہیں ان کا کوئی فرد رفاہ عام کے کاموں کی طرف توجہ نہیں کرتا۔ اس کمی سے نادار طبقہ انحطاط پذیر ہوتا چلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ ترقّی اور عروج کا مادہ ان میں سے ہمیشہ کے لئے فنا ہو جاتا ہے۔

تجربہ سے ثابت ہو چکا ہے کہ کوئی حکومت رعایا کی امداد کے بغیر رفاہ عام کے کاموں پر کافی روپیہ صرف نہیں کر سکتی۔ کفایت شعاری کی عادات نہ ہونے کے باعث کسی کے پاس اتنا روپیہ نہیں ہوتا کہ وہ اپنی ضروریات کو قربان کر کے اس طرف توجہ کرے اس لئے رفاہ عام کے کام ہمیشہ پس پُشت پڑے رہتے ہیں۔ جن مُلکوں اور قوموں میں کفایت شعار لوگ ہوتے ہیں۔ وہ اپنی ضرورت سے زیادہ روپیہ پس انداز کرتے رہتے ہیں پس اندازی کی بدولت وہ لاکھوں اور کروڑوں روپے کے مالک بن جاتے ہیں۔ پھر اس روپے کو تجارت و صنعت میں لگا کر وہ لاکھوں روپے کا

فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ اس طرح سے خلق خدا کو بھی روزگار ملتا ہے یہی لکھ پتی اور کروڑپتی لوگ نہایت دریادلی سے لاکھوں اور کروڑوں روپیہ رفاہ عام کے کاموں پر صرف کرتے ہیں جس سے ان کا اپنا نام روشن ہوتا ہے اور جس قوم سے وہ تعلق رکھتے ہیں اس کی شُہرت ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ ان کے ملک اور شہر کے باشندے بھی ان کی فیاضی کی بدولت فخر حاصل کرتے ہیں ٭

کفایت شعاری کے زرین اصول

کفایت شعاری کا سب سے پہلا اور آخری زرین اصول یہ ہے کہ جتنی چادر دیکھو اتنے پاؤں پھیلاؤ اس لئے ہر عاقل و بالغ انسان کا فرض ہے کہ وہ ہمیشہ اپنی آمدنی اور خرچ کو ملحوظ رکھے اور کبھی اعتدال اور احتیاط کے اصول سے تجاوز نہ کرے۔ کسی عقلمند کا قول ہے کہ (۱) وہ شخص یقیناً عقلمند ہے جو اپنی آمدنی سے کم خرچ کرتا ہے۔ اور نامعلوم ضرورتوں کے لئے کچھ نہ کچھ پس انداز کرتا رہتا ہے۔ (۲) وہ شخص پرلے درجے کا بیوقوف ہے جو اپنی آمدنی سے زیادہ صرف کرتا ہے اور یہ نہیں سوچتا کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ (۳) اور وہ شخص نہ عقلمند ہے نہ بیوقوف جو نہ تو کچھ پس انداز کرتا ہے اور نہ اپنی آمدنی سے زیادہ صرف کرتا ہے۔ گویا جتنی چادر دیکھتا ہے اُتنے ہی پاؤں پھیلاتا ہے ٭

کفایت شعار بننے کا ایک گُر یہ بھی ہے کہ اپنی آمد اور خرچ کا باقاعدہ حساب رکھا جائے۔ اس سے فائدہ یہ ہوتا ہے کہ ضروری

اور غیر ضروری اخراجات کا پتہ چلتا رہتا ہے۔ اور کسی نہ کسی وقت یہ خیال ضرور آجاتا ہے کہ فلاں چیز پر ہم نے بیکار روپیہ خرچ کیا، اور فلاں چیز کو احتیاط سے استعمال نہ کرنے کے باعث اس پر دوبارہ روپیہ صرف ہوا بس یہی خیال آہستہ آہستہ انسان کو کفایت شعار بنا دیتا ہے اور فضول خرچ کرنے سے روکتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اگر ہر مہینے کے شروع میں آمدنی کو ملحوظ رکھ کر اخراجات اور ضروریات کا ایک خاکہ تیار کر لیا جائے تو بہت سی غیر ضروری مدوں کو روک کر ضروری مدوں پر خرچ کرنے کے لئے پہلے سے بندوبست ہو سکتا ہے ایسا کرنے سے انسان بہت سی پریشانیوں سے بچ جاتا ہے۔ سرکاری دفاتر میں مالی سال کے شروع میں اخراجات اور آمدنی کا خاکہ تیار کر لیا جاتا ہے۔ جو "بجٹ" کہلاتا ہے۔ حکومت بجٹ پر بحث و تمحیص سننے کے بعد اس کی منظوری دے دیتی ہے اگر اس قسم کے "بجٹ" ہر خاندان اور جماعت میں تیار ہوں تو ان سے خاطر خواہ فوائد مرتب ہو سکتے ہیں۔

کیا کفایت شعاری کنجوسی ہے

بعض لوگ کفایت شعاری کو کنجوسی سے تعبیر کرتے ہیں اس میں کوئی شک نہیں اگر کفایت شعاری بخل اور کنجوسی کی حد سے جا ملے تو وہ مذموم ہے۔ ایک بخیل شخص ناگزیر اخراجات پر بھی پیسہ صرف نہیں کرتا وہ روپیہ جوڑنے کے لئے ہر وقت ننانوے کے پھیر میں پھنسا رہتا ہے۔ کتنے افسوس کی

بات ہے کہ اس کے پاس روپیہ موجود ہوتا ہے لیکن وہ اپنی جائز ضرورت کو بھی پورا نہیں کر سکتا۔ اس کی طبیعت میں لالچ اور طمع جیسی مذموم صفتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اس کا بس نہیں چلتا ورنہ ہر جائز اور ناجائز طریقے سے دُنیا زمانے کی دولت اپنے پاس جمع کر لے بالفرض محال اگر اس کے پاس کہیں سے بے اندازہ دولت بھی آجائے تو اس کی نیت نہیں بھرتی۔ لالچ کی آگ ہر وقت اس کے دل و دماغ میں شعلہ زن رہتی ہے۔ لطف یہ ہے کہ دولت کی تکثیر سے ایسے لوگوں کو کوئی خاص فائدہ نہیں پہنچتا کیونکہ یہ آگ دولت میں اضافہ ہونے سے اور زیادہ بھڑک اُٹھتی ہے لالچ اور کنجوسی ان کے اخلاقی فضائل کو غیر محمود بنا دیتی ہے۔ سوسائٹی کو بھی ایسے لوگوں کے وجود سے بہت کافی نقصان پہنچتا ہے۔ کیونکہ جس قدر روپیہ ان کے قبضے میں جاتا ہے۔ پھر ان کے جیتے جی اس کو دُنیا کی ہوا نہیں لگتی۔ ایسا روپیہ جو کام نہ آئے اس کا ہونا نہ ہونا برابر ہے۔ کسی مُلک یا قوم کی ترقی کا انحصار اس بات پر ہے کہ اُس کی دولت مفید اور منفعت بخش کاموں میں لگتی اور نکلتی رہے۔ لیکن کنجوس کا روپیہ سوائے شخصی اطمینان کے اور کچھ فائدہ نہیں دیتا۔ اس لئے اس قسم کے لوگوں کا وجود مُلک و قوم کی ترقی کے راستے میں زبردست رُکاوٹ بن جاتا ہے۔

کفایت شعاری سے انسان کو	کفایت شعاری قناعت سکھاتی ہے

قناعت جیسی دولت حاصل ہوتی ہے۔ جو اپنی ضرورتوں کو آمدنی سے آگے بڑھنے نہیں دیتی اور آمدنی میں ناجائز طریقوں سے اضافہ کرنے سے روکتی ہے۔ ذاتی ضرورتیں جب آمدنی کے حدود میں محدود ہو جائیں تو انسان کشاکش حیات کے تفکرات سے بے نیاز اور مقصد تخلیق کی تکمیل کی طرف متوجہ ہو سکتا ہے۔ گویا کفایت شعار اور قانع لوگ ہی سوسائٹی اور ملک کے لئے برکت کا باعث ہیں برخلاف اس کے کاہل اور سست افراد جو دوسروں کی دولت پر نظر رکھتے ہیں قومی زوال اور تہذیبی انحطاط کا موجب ہیں۔

کفایت شعاری قومی عروج کا زینہ ہے	کفایت شعاری سے قوموں کے عروج وزوال پر بھی اثر پڑتا ہے۔ جو قومیں اپنے روپے کو

کفایت شعاری سے صرف کرتی ہیں اور بیجا روپیہ ضائع نہیں کرتیں ان کے پاس فوری ضرورتوں کو رفع کرنے کے لئے کافی روپیہ موجود رہتا ہے۔ جس حکومت کے پاس جتنی زیادہ دولت ہوتی ہے وہ اتنی ہی زیادہ مضبوط اور مستحکم کہلاتی ہے۔ اگر کوئی بیرونی حملہ آور تکلیف کا باعث ہو تو روپے کی بدولت حفاظتی تدابیر بھی نہایت آسانی سے اختیار کی جا سکتی ہیں۔ اندرونی فسادات کا انسداد اور انتظام بھی روپے ہی کے ذریعہ سے ہو سکتا ہے۔ جن ملکوں کے پاس روپیہ نہیں ہوتا ان کی اندرونی اور بیرونی

حالت ہمیشہ غیر اطمینان بخش رہتی ہے۔ یہی حالت انفرادی مالی حیثیت کی ہے۔ جن لوگوں کے پاس روپیہ ہو ان کی ہمتیں بلند۔ قلب مطمئن اور ارادے مستحکم ہوتے ہیں۔ ایسے ملک میں تجارت۔ زراعت اور صنعت دن دوگنی اور رات چوگنی ترقی کرتی ہیں اور رفاہ عام کے کاموں میں بھی خوب روپیہ صرف ہوتا ہے آخر کار یہی قومیں تہذیب و شایستگی کا سرچشمہ بن جاتی ہیں ؎

جن قوموں میں کفایت شعاری کا وصف نہیں ہوتا۔ ان میں دماغی انحطاط کے ساتھ ساتھ قومی تنزل بھی بڑھتا جاتا ہے۔ اگر اپنے گھرانے کا عروج۔ قوم کی ترقی انفرادی فضیلت منظور ہو تو بچوں کو کفایت شعاری کی عادات بچپن ہی سے ڈالنی چاہئیں جو عادات بچپن میں پڑ جاتی ہیں وہ جیتے جی قائم رہتی ہیں۔ چاہے کسی حیثیت کا آدمی ہو لیکن کفایت شعاری کی عادت ضرور ہونی چاہئے کیونکہ موت زندگی دُکھ بیماری اور اچھے بُرے وقت کا کچھ پتہ نہیں ہوتا۔ اگر کچھ پاس جمع ہو تو وہی بُرے وقت میں کام آتا ہے۔ مثل مشہور ہے بُرے وقت میں بُرا بیٹا اور کھوٹا پیسہ بھی کچھ نہ کچھ کام دے ہی جاتا ہے ؎

کفایت شعاری اور فارغ البالی میں تدریجی فرق ہے۔ جن لوگوں میں کفایت شعاری کا وصف نہیں ہوتا وہ کبھی فارغ البال نہیں ہو سکتے۔ کفایت شعاری سے جہاں انسان کو روحانی خوشی

اور اطمینان دلی حاصل ہوتا ہے۔ وہاں ہمتیں بھی بلند ہوتی ہیں۔ فضول خرچی کی عادات انسان کو کاہل بنا دیتی ہیں۔ اور زندگی کا لطف کھو دیتی ہیں۔ زندگی اجیرن اور بیکار معلوم ہوتی ہے۔ جو کچھ کمایا وہ اُڑا دیا۔ اگر کوئی غیر معمولی ضرورت آپڑی تو اب بیٹھے بغلیں جھانک رہے ہیں کہ یا اللہ کیا کریں۔ کسی وجہ سے بیکار ہو گئے تو ایک وقت سے دوسرے وقت کھانے کو نہیں۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اگر کام کر رہے ہیں تو کھانے کو مل رہا ہے اور اگر بیکار ہیں تو پیٹ پر پتھر بندھے ہوئے ہیں۔ اگر خود دار اور شریف ہیں تو پیٹ سے فاقے مگر طبیعت خوش ہے۔ اور اپنی حالت کو چھپائے ہوئے ہیں۔ اگر یہ باتیں نہیں تو بھیک مانگتے پھرتے ہیں۔ ہر ایک کے آگے اپنی مصیبت کا رونا روتے ہیں۔ در در مارے مارے پھرتے ہیں۔ گالیاں کھاتے ہیں گھڑکیاں سُنتے ہیں "کوڑی نہ رکھ کفن کو جس نے دیا ہے تن کو دیگا وہی کفن کو" جن لوگوں نے اپنا اصول زندگی بنا لیا ہے ان کے لئے محنت کر کے کمانے اور نہ کمانے کا نتیجہ ایک ہی ہے یعنی کچھ بھی نہیں۔ عقلمندی اس میں ہے کہ غیر اختیاری اور نامعلوم ضرورتوں کے لئے کچھ نہ کچھ جمع کر لیا جائے اور موجودہ ضرورتوں کو آیندہ پر ٹالا جائے کیونکہ کچھ پتہ نہیں کہ آئندہ زمانہ میں کونسی ضرورتیں پیش آجائینگی۔ جو لوگ کچھ پس انداز نہیں کرتے۔ جب تک وہ کماتے ہیں ان کے گھروں

ہیں عیش رہتا ہے۔ جب بیکار ہوئے یا مر گئے تو اولاد بھیک مانگتی پھرتی ہے۔ اور بنا بنایا خاندانی وقار اور عظمت آنکھوں دیکھتے خاک میں مل جاتی ہے (کفایت شعاری کے نہ ہونے کی وجہ سے سینکڑوں گھر ہر روز بے چراغ اور برباد ہوتے رہتے ہیں) عزت آبرو والے لوگوں کی اولاد نان شبینہ کو محتاج نظر آتی ہے۔ ان حالات کو دیکھتے ہوئے ضروری ہے کہ کفایت شعاری کی عادت ڈالی جائے اور کفایت شعاری کی عادت ڈالنا کوئی مشکل کام نہیں۔ اس کے لئے تھوڑی سی حزم واحتیاط کی ضرورت ہے ۔

ضرورتوں کو روکنا کفایت شعاری ہے

کفایت شعار بننے کے لئے اپنی ضرورتوں کو روکنا نہایت ضروری ہے۔ ہاں حقیقتاً ایسی ضروریات زندگی جن کو پورا کرنے کے بغیر گزارہ نہیں ہو سکتا۔ ان کو روکنا سخت غلطی ہے۔ واضح رہے کہ انسان کی اصلی ضرورتیں بہت ہی کم ہیں۔ لیکن ان میں بڑھنے کی قوت اور لچک بہت زیادہ ہے۔ خدا نے دُنیا کی تمام چیزیں انسان کی ضرورتوں کو پورا کرنے ہی کے لئے بنائی ہے۔ اس لئے ہر چیز انسان کے کسی نہ کسی مصرف کی ضرور ہے لیکن پھر بھی ہر ضرورت کو پورا کرنے سے پہلے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ آیا ہم اس کے بغیر گزارہ کر سکتے ہیں یا نہیں۔ اگر کسی ایسی ضرورت پر روپیہ صرف کیا جائے۔ جس کے بغیر اچھی طرح زندگی بسر ہو سکتی ہے تو اس پر روپیہ صرف کرنا کفایت شعاری

کے خلاف ہے۔ قاعدہ ہے کہ جس قدر انسان تکلّفات میں پڑتا
ہے اسی قدر اس کی ضروریات میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے
کامیاب زندگی بسر کرنے کے لئے ضروری ہے کہ سادگی کے اصولوں
کو نظرانداز نہ کیا جائے۔ کسی عقلمند کا قول ہے کہ کسی چیز کو دیکھ کر
اس کی ضرورت پیدا نہ کرو بلکہ پہلے اپنی ضرورت کو دیکھو پھر
اس چیز پر نظر اُٹھاؤ۔ بعض لوگوں کا قاعدہ ہے کہ ہر مہینے کے
شروع میں جب ان کی جیب میں پیسے آتے ہیں تو وہ بازار میں
خرید و فروخت کرنے کے لئے نکل جاتے ہیں۔ ان کو اپنی چند
ایک ضرورتوں کے سوا قطعی معلوم نہیں ہوتا کہ کیا خریدنا ہے۔
دُکان دُکان گھوم کر وہ ہر چیز کو دیکھتے ہیں اور جو چیز پسند
آتی ہے وہ خرید لیتے ہیں یہ طریقہ اپنی ضرورتیں بڑھانے کا بدترین
طریقہ ہے۔ ایسی عادات کا انجام یہ ہوتا ہے کہ ہمیشہ آمدنی سے
خرچ زائد رہتا ہے کیونکہ ہر مہینے میں چند ایک نئی چیزیں ضرور
گھر میں آجاتی ہیں۔ پھر ان چیزوں کے ساتھ کئی اور چیزوں کا
خریدنا بھی لازم ہو جاتا ہے اس طرح سے طرز معاشرت بلند
ہونے لگتا ہے اور آمدنی کے وسائل اُتنے ہی رہتے ہیں۔ ایسے
حالات میں قرض لے کر گزارہ کرنا پڑتا ہے۔ قرض سے خودداری
آزادی اور دیانتداری کے جوہر زنگ آلود ہونے شروع
ہو جاتے ہیں۔ اور آہستہ آہستہ گھر کی خوشی اور اطمینان قلب جیسی

دولت برباد ہو جاتی ہے۔ شیخ سعدی نے کیا خوب کہا ہے ؎

آنکہ شیراں را کند روباہ مزاج
احتیاج است احتیاج است احتیاج

کفایت شعاری عورتوں کا زیور ہے

ہر خاندان کی ترقی اور تنزل میں کفایت شعاری کو بہت دخل ہے۔ جس گھر میں میاں بیوی دونو فضول خرچ ہوتے ہیں اُس گھر پر ہر وقت تباہی منڈلاتی رہتی ہے۔ جن لوگوں کو خدا نے دولت فراوانی سے دی ہے ان کو بھی کفایت شعاری کی از حد ضرورت ہے کیونکہ قطرہ قطرہ دریا اور دانہ دانہ انبار بن جاتا ہے۔ اور بلے دریغ خرچ کرنے سے قارون کے خزانے بھی خالی ہو جاتے ہیں فضول خرچی سے تباہی زیادہ جلدی اور تیز رفتاری سے آتی ہے۔ خاص طور پر ایسے حالات میں کہ خرچ ہی خرچ ہو اور آمدنی کے وسائل نہ ہوں یا نسبتاً کم ہوں اسی لئے شادی سے پہلے ہونے والی بیوی کے متعلق یہ ضرور معلوم کر لینا چاہیئے کہ وہ فضول خرچ ہے یا کفایت شعار جس طریقے سے ہماری سوسائٹی میں شادیاں ہوتی ہیں۔ اندرونی حالات اور خصائل کا پتہ چلنا ذرا مشکل کام ہے۔ لیکن تیز نظر اور عقلمند انسان دوسرے گھر کے رنگ ڈھنگ۔ کپڑے لتے اور کھانے پینے کے طور طریقوں سے دوسرے کی ضروریات اور معیار زندگی کا کچھ نہ کچھ ضرور اندازہ لگا سکتا ہے۔ جن لوگوں کا

میلان عمدہ کھانے۔ نمائشی لباس اور ظاہرا بناؤ سنگھار کی طرف زیادہ ہوتا ہے وہی لوگ فضول خرچ ہوتے ہیں۔ اور انہیں کے متعلق عام لوگوں کی زبان میں کہا جاتا ہے کہ خرچ سے تنگ مگر شوقین زیادہ ہیں "

خدا محفوظ رکھے فضول خرچ بیویوں کی بدولت اکثر خاندان تباہ ہو جاتے ہیں اور وہ خاندان جن کی عورتیں کفایت شعار نہیں ہوتیں ہمیشہ مالی مشکلات میں مبتلا رہتے ہیں۔ گھر میں خوشی کبھی نام کو نہیں آتی۔ بلکہ پہلی تاریخ کیا آتی ہے لڑائی کا پیغام لاتی ہے۔ بیوی پلنگ پر چادر اوڑھے پڑھی ہیں۔ میاں الگ کمرے میں سر پہ ہاتھ رکھے بیٹھے ہیں۔ اگر میاں اپنے بل ادا نہ کریں تو آئندہ حساب کیسے چلے، بازار میں سے کیونکر گزریں اور اگر بیوی اپنے قرضے نہ چکائیں تو قرضخواہ کب دم لینے دیں۔ غرض کسی کو آج سے کل پر ٹالتے ہیں کسی کو تھوڑا بہت دے دلا کر بقایا جلد ادا کرنے کا وعدہ کرتے ہیں۔ کوئی قرضخواہ نالش داغ دیتا ہے تو کچہریوں میں مارے مارے پھرتے ہیں۔ ایسے گھروں کی ظاہرا ٹیپ ٹاپ دیکھو تو ہر چیز آسودہ حالی کی دلیل ہے۔ لیکن اگر کسی کا دل ٹٹولو تو زخمی۔ رُواں رُواں قرضدار۔ بوٹی بوٹی قرضے میں بندھی ہوئی۔ لیکن پھر بھی پیٹ سے فاقے مگر طبیعت خوش +

کفایت شعاری سیکھو	کفایت شعاری کی عادت ڈالنا کچھ زیادہ مشکل

نہیں ہے انسان میں تھوڑا سا پیش بینی کا مادہ ہونا چاہیئے۔ سب سے پہلے تو یہ فرض والدین کا ہے کہ وہ اپنے بچوں میں بچپن سے کفایت شعاری کی عادت پیدا کریں۔ اس کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ بچوں کا کچھ روزانہ خرچ مقرر کر دیا جائے۔ اور اس میں سے ہر روز کچھ نہ کچھ جمع کرا دیا جائے۔ ہر تیسرے چوتھے دن انہیں بتاتے رہیں کہ آج تمہارے اتنے پیسے جمع ہو گئے۔ اس کے ساتھ انہیں یہ بھی لالچ دیئے جائیں کہ جب تمہارے اتنے روپے جمع ہو جائیں گے تو تم کو فلاں اچھی سی چیز لے کر دینگے۔ بچہ اس لالچ میں آکر پس انداز کرنا سیکھ جاتا ہے۔ عام طور پر بچوں کو مختلف تہواروں پر کچھ نہ کچھ بڑوں کی طرف سے ملتا رہتا ہے۔ روزانہ کے پیسے اور تہواروں کے انعامات مل کر اچھی خاصی رقم بن سکتی ہے۔ یہ طریقہ کفایت شعاری سکھانے میں نہایت کامیاب اور نیز بہدف ہے اس کے علاوہ اگر گھروں میں مختلف افراد مل کر ماہوار یا ہفتہ وار ایک خاص مقررہ رقم کسی معتمد کے پاس جمع کرائیں۔ اور مقررہ میعاد کے بعد جب ایک معقول رقم جمع ہو جائے۔ تو تمام ممبر قرعہ اندازی کریں جس کے نام قرعہ نکل آئے وہ تمام رقم اس کو دیدی جائے۔ اس طرح سے ہر ایک ممبر کو چند روپے ماہوار دے کر ایک معقول رقم مل سکتی ہے۔ نیز کفایت شعاری اور پس اندازی کا یہ سلسلہ مدتوں جاری رہتا ہے۔ میں نے

دیکھا ہے اکثر گھروں کی عورتوں نے اس طریقے سے نہایت قیمتی قیمتی زیور بنائے بعض نے جائدادیں کھڑی کر لیں اور بعض نے اپنی اولاد کی نہایت دھوم دھام سے شادیاں کیں ؛

جو لوگ پس انداز کرنا نہیں جانتے ان کے لئے اور بھی بہت سے نہایت عمدہ طریقے رائج ہیں۔ جن پر عمل کرنے سے ارذل عمر کیلئے ایک معتد بہ رقم جمع ہوتی رہتی ہے۔ اکثر لوگ اپنی زندگی بچوں کی شادی اور تعلیم وغیرہ کا بیمہ کرا لیتے ہیں۔ نوکری پیشہ اپنی تنخواہ میں سے پراویڈنٹ فنڈ کے نام سے کچھ روپیہ باقاعدہ کٹواتے رہتے ہیں۔ جو ان کو ضرورت کے وقت قرض بھی مل جاتا ہے۔ موجودہ زمانے میں اس قسم کے بہت سے طریقے رائج ہیں۔ جن کی بدولت اگر کوئی ذرا بھی ہوشمند ہو تو کافی روپیہ پس انداز کر سکتا ہے ؛

غرض جس طرح بھی ہو ہر انسان کا فرض ہے کہ آئندہ کے لئے کچھ نہ کچھ بچائے گویا کفایت شعاری کی عادت ڈالے، کیونکہ کفایت شعاری بہت سے فضائل کا سرچشمہ ہے۔ اطمینان قلب اس سے حاصل ہوتا ہے۔ افلاس اور قرض کی مصیبتوں سے اس کے ذریعہ انسان محفوظ رہتا ہے۔ بُرے کاموں سے کفایت شعاری بچاتی ہے۔ عُمر کا آخری حصّہ اس کی بدولت آرام سے گزرتا ہے۔ خودداری اور وقار اس سے قائم رہتا ہے۔ گویا انسان کی عافیت اسی میں ہے کہ وہ کفایت شعار ہو۔

"اُردو اخبارات"

اُردو اخبار کی تاریخ | اُردو کا سب سے پہلا اخبار ۱۸۳۶ء میں شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد کے والد مولانا محمد باقر مرحوم نے دہلی سے جاری کیا تھا۔ یہ اخبار غدر ۱۸۵۷ء تک برابر جاری رہا۔ جہاں تک معلوم ہو سکا ہے اس اخبار کی حیثیت بالکل ایک ادبی رسالے کی سی تھی اس میں اکثر بڑے بڑے شعرا کا کلام اور ادبی تنقیدیں چھپا کرتی تھیں۔ چند اوراق خبروں اور سیاسی مسائل کے لئے مخصوص تھے، واقعات حاضرہ پر بھی بحث و تمحیص کی جاتی تھی۔ لیکن پھر بھی ادبی رنگ ہمیشہ غالب رہتا تھا۔ غدر سے پہلے دہلی سے ایک اور اُردو اخبار بھی جاری ہوا تھا اس کے ایڈیٹر سید محمد خاں سر سید احمد خاں مرحوم کے بڑے بھائی تھے۔"

۱۸۵۰ء میں لاہور سے منشی ہرسکھ رائے نے کوہ نور اخبار نکالا۔ یہ اخبار ریاستوں میں بہت مقبول تھا۔ شروع میں ہفتہ وار تھا پھر سہ روزہ ہوا اور آخر ہفتے میں تین بار شائع ہونے لگا۔ اس اخبار کے سٹاف میں منشی نولکشور بھی ملازم تھے، افسوس کہ

اس اخبار کو انہی لوگوں کے ہاتھوں زوال آیا جنہوں نے اس کے دفتر میں رہ کر اخبار نویسی سیکھی تھی۔ ان لوگوں نے کوہ نور سے علیحدہ ہو کر اپنے اپنے اخبارات نکال لئے۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ کوہ نور کچھ مدت بعد بند ہو گیا ۔

کوہ نور کے بعد شعلۂ طور اور مطلع نور کانپور سے۔ پنجابی اخبار اور انجم الاخبار لاہور سے اشرف الاخبار دہلی سے، وکٹوریا سیالکوٹ سے۔ قاسم الاخبار بنگلور سے۔ کشف الاخبار بمبئی سے۔ کارنامہ لکھنؤ سے اور جریدۂ روزگار مدراس سے جاری ہوا۔ یہ اخبار بہت ہی تھوڑی زندگی لے کر آئے تھے اس لئے تھوڑی تھوڑی مدت جاری رہنے کے بعد بند ہوتے چلے گئے ۔

۱۸۵۸ء میں منشی نولکشور نے اودھ اخبار جاری کیا۔ اس اخبار کی کوئی خاص پالیسی نہ تھی۔ وہ محض سیاسی شورش کے خلاف اور انگریزی حکومت کا طرف دار تھا اس لئے سرکاری حلقوں میں عام طور پر مقبول تھا۔ کم قیمت کو بھی اس کی شہرت اور مقبولیت میں غیر معمولی دخل تھا۔ ہر تعلیم یافتہ شخص اس کو آسانی سے خرید سکتا تھا۔ ماننا پڑیگا کہ اس اخبار نے تعلیم یافتہ طبقے میں اخبار بینی کا کافی شوق پیدا کیا۔ اس کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے بہ آسانی ہو سکتا ہے کہ وہ پہلے ہفتہ وار تھا، ترقی کر کے سہ روزہ ہوا پھر دو روزہ ہو گیا اور مدتوں تک کامیابی

سے چلتا رہا ۔

۱۸۷۷ء میں لکھنؤ سے اودھ پنچ جاری ہؤا۔ اس کے ایڈیٹر منشی سجاد حسین تھے۔ یہ پرچہ ظرافت نگاری میں اپنی وضع کا پہلا اور آخری اخبار تھا۔ اگرچہ بہت سے اخباروں نے اس کی نقل کرنے کی کوشش کی لیکن اس کے معیار پر نہ پہنچ سکے، اس اخبار کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ مذہبی سیاسی اور اخلاقی موضوعوں پر نہایت ظریفانہ پیرائے میں بے دھڑک نکتہ چینی کرتا تھا۔ اور نہ کہنے کی باتیں بھی مذاق مذاق میں اس طرح کہہ جاتا تھا کہ کسی کو ناگوار معلوم نہ ہوتی تھیں۔ منشی سجاد حسین کے انتقال کے ساتھ اس کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ ان کے ہمعصروں میں سے کوئی شخص بھی ایسا نہ نکلا جو اس معیار کو قائم رکھ سکتا۔ یہاں یہ ذکر کرنا بیجا نہ ہوگا کہ آجکل ہمارے اخبارات میں جو ظریفانہ کالم نظر آتے ہیں وہ اودھ پنچ ہی کا اثر ہے۔ افسوس یہ ہے کہ ان کے ایک کالم میں وہ چٹکیاں اور گدگدیاں نہیں ہوتیں جو اودھ پنچ کی ہر سطر میں شروع سے لے کر آخر تک زعفران زار کی کیفیت پیدا کرتی تھیں۔ بہر حال یہ بھی کیا کم غنیمت ہے اس مرحوم اخبار نے اخباری دنیا میں دلچسپی کا ایک نیا شعبہ ہمیشہ کے لئے جاری کر دیا ۔

۱۸۸۳ء میں لکھنؤ سے ہندوستانی اخبار جاری ہؤا۔ یہ اخبار بھی اپنی طرز کا پہلا اخبار تھا۔ اس سے پہلے کسی اخبار کو یہ جرأت

نہ تھی کہ سیاسی اور ملکی معاملات پر قلم اٹھا سکے۔ سیاسیات کے نام سے لوگوں کے دل دھڑکنے لگتے تھے۔ اور غدر ۱۸۵۷ء کے جاں گداز نظارے آنکھوں کے سامنے آجاتے تھے۔ اس اخبار نے سیاسی معاملات پر بڑے جوش و خروش سے قلم اٹھایا اور اہل ملک میں سیاسی بیداری پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اسی شان کا دوسرا پرچہ لاہور سے رفیق ہند کے نام سے جاری ہوا وہ بھی سیاسیات پر بیباکانہ نکتہ چینی کرتا تھا۔

۱۸۸۷ء میں لاہور سے منشی محبوب عالم نے پیسہ اخبار جاری کیا۔ یہ اخبار کم قیمت ہونے کی وجہ سے مدتوں عوام میں مقبول رہا۔ اس کی پالیسی عام معاملات میں معتدل اور سیاسیات میں حکومت ہند کے ساتھ تھی۔ غالباً یہی بات اس کی بقا اور مقبولیت کا باعث رہی۔

جرنلزم کی تعلیم

جن اخبارات کا ذکر اوپر آیا ہے یہی وہ اخبارات ہیں جنہوں نے ہمارے ملک میں اخبار نویسی کی تعلیم دی ہے ورنہ یورپ کی طرح ہندوستان میں جرنلزم سکھانے کے ادارے نہ تھے۔ اب ایک آدھ کالج اس مفید مقصد کے لئے جاری ہوگیا ہے۔ ممکن ہے ان کالجوں کے تعلیم یافتہ اخبار نویس آئندہ زمانہ میں کوئی بہتر مثال پیش کر سکیں ورنہ حقیقت امر یہ ہے کہ اسوقت جس قدر اعلےٰ معیار کے مقالے اور افتتاحیے لکھنے والے ایڈیٹر

ہیں وہ نہ تو کسی باقاعدہ جرنلزم کے کالج کے تعلیم یافتہ ہیں اور نہ ان کے پاس اخبار نویسی کی کوئی سند یا ڈگری ہے۔ انہوں نے یہ فن ذاتی تجربے۔ مشق اور مطالعہ کی بدولت حاصل کیا ہے۔

ہندوستانی جرنلزم کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ہمارے جس قدر سیاسی لیڈر آسمان سیاسیات پر آفتاب اور مہتاب ہو کر چمکے ہیں ان کا تعلق کسی نہ کسی اخبار سے ضرور رہا ہے۔ ممکن ہے اور ممالک میں بھی ایسی چند بلند مرتبہ ہستیاں موجود ہوں لیکن ہندوستان کے قومی لیڈر سو فیصدی اخباری قوت کی تخلیق ہیں۔ اس کے علاوہ ان عدیم المثال رہنماؤں کی شان میں یہ بات اور بھی چار چاند لگاتی ہے کہ انہوں نے اپنے اخبارات سے کبھی مالی فائدہ نہیں اُٹھایا۔ دن رات محنتیں کر کے اپنی صحتیں خراب کر لیں لیکن اخبارات کی آمدنی ان کے ذاتی اخراجات کو بھی بمشکل پورا کر سکی۔ ممکن ہے بعض لوگ اس قلیل آمدنی کو ہمت شکن اور مایوس کن خیال کریں لیکن وطنیت کا جوش اور قوم کی محبت ان کے ارادوں کو بلند اور ہمتوں کو مضبوط رکھتی تھی۔ بس یہی ان کی محنت شاقہ کا صلہ تھا۔

بدنام کنندۂ نکو نامے چند

دُنیا کا قاعدہ ہے کہ ہر شخص شہرت اور عزت پر جان دیتا ہے اور اس کو بہت کم محنت اور قابلیت سے

حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ قیاس ہے کہ یہی وجہ اخبار
نویسی کی مقبولیت کی ہے اور اسی سبب سے اخبار اور رسالے
جاری کرنے کا شوق ہمارے ملک میں وبا کی طرح پھیل گیا ہے جو
شخص بھی دو حرف لکھ سکتا ہے وہ اخبار یا رسالہ جاری کرنے کے
خیال میں دیوانہ نظر آتا ہے۔ کیونکہ اخبار کی ادارت سے ایڈیٹر
صاحب بہت آسانی کے ساتھ لیڈر بن سکتے ہیں۔ اس نا تراشیدہ
مذاق کا نتیجہ یہ ہے کہ آئے دن نئے نئے اخبارات اور رسائل
جاری ہوتے رہتے ہیں اور تھوڑی سی مدت کے بعد ان کا کہیں
پتہ بھی نہیں چلتا۔ اس وبائی بیماری سے اخباری دُنیا کو بہت
سخت نقصان پہنچ رہا ہے۔ سب سے بڑا نقصان تو یہی ہے کہ
مدتوں تک کسی اخبار کی بقا کا یقین ہی نہیں ہوتا۔ اس لئے
لوگ بہت سمجھ سوچ کر چندہ دیتے ہیں کہ کہیں ان کا روپیہ اخبار
بند ہو جانے سے ضایع ہی نہ ہو جائے ٭

اس کے علاوہ ہمارے بعض اخبار نویسوں نے غیر ملکی یورپین
اخبار نویسوں سے اخباری مخالفت اور انفرادی تذلیل کے
ڈھنگ سیکھ لئے ہیں۔ چنانچہ اکثر اخبارات کسی خاص شخصیت
یا جماعت کی مخالفت اور تذلیل کرنے کے لئے جاری ہو جاتے
ہیں ان اخبارات کی زندگی عام طور پر اسی وقت تک کی ہوتی
ہے جب تک جذبۂ مخالفت کارفرما رہتا ہے۔ ایسے پرچے نہ

صرف ملکی ادب کو اپنی بدمزاقی اور کینہ توزی سے نقصان پہنچاتے ہیں بلکہ عوام کے مذاق کو بھی پست اور رکیک بنا دیتے ہیں۔ ان کو ہر صحیح مذاق شخص نفرت اور حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے۔ یہ اخبارات دوسروں کے وقار کو کم کر کے اپنی عزت بڑھانی چاہتے ہیں لیکن اس ذلیل کوشش میں وہ اپنا وقار بھی کھو بیٹھتے ہیں۔

ناتجربہ کار ایڈیٹروں کے میدان صحافت پر قبضہ کر لینے سے یہ شکایت بھی اردو پریس کے متعلق عام طور پر پیدا ہو گئی ہے کہ اردو اخبارات کی کوئی خاص پالیسی نہیں ہوتی، وہ جس طرف بھی اپنا فائدہ دیکھتے ہیں اس طرف بے دریغ جھک جاتے ہیں۔ نیز وہ ایڈیٹر جن کو اپنی پالیسی کا کسی قدر احترام ہوتا ہے عام طور پر اختلافی امور پر صحیح رائے ظاہر کرنے سے کتراتے ہیں اور اگر کچھ سپرد قلم فرماتے ہیں تو اس طرح کہ نہ الیٰ ہذی نہ الیٰ ہذی گویا بات کو گول مول کر کے ٹال دیتے ہیں۔ اس قسم کے اخبار بھی بہت زیادہ خطرناک ہیں کیونکہ وہ اپنے پڑھنے والوں کو صحیح نتیجہ پر پہنچنے سے روکتے ہیں۔ اخبارات کو اپنی پالیسی بہت صریح اور صاف رکھنی چاہیئے اور حق بات کہنے میں نقصان اور خطرات سے نہیں ڈرنا چاہیئے اصل میں جب تک ہمارے ملک میں اخبارات شخصی ملکیت ہیں۔ اور مالی مشکلات ان کی گریباں گیر ہیں اس وقت تک ان سے

بے لاگ تنقید اور نکتہ چینی کی توقع رکھنا بے سود ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اخبارات مشترکہ سرمایہ سے جاری کئے جائیں تاکہ وہ اپنے مخصوص حلقے کے سیاسی اور ادبی مذاق کے آئینہ دار ہوں اور ان کے ایڈیٹر چند در چند انتظامی اور مالی مشکلات سے بے نیاز ہو کر نہایت دیانتداری اور یک دلی کے ساتھ اپنے فرائض کو انجام دیں ؎

ہمارے ملک میں الگ الگ خیال کی سیاسی پارٹیاں بہت کم عرصے سے وجود میں آئی ہیں۔ صوبائی حکومتیں علیحدہ علیحدہ ہو جانے سے اب مختلف الخیال سیاسی جماعتیں پیدا ہو رہی ہیں۔ امید ہے کہ عنقریب ہر پارٹی اپنے اپنے پروپاگنڈے کے لئے مستقل سرمایہ سے علیحدہ علیحدہ اخبار جاری کرے گی۔ اس طریق کار سے ایسے غیر مستقل اخبارات خود بخود ناکامیاب ہو کر بند ہو جائیں گے جن کا کسی پارٹی سے تعلق نہیں یا ان کے پاس کوئی مستقل سرمایہ موجود نہیں ؎

سیاسیات اور ہندوستانی اخبارات | موجودہ سیاسی کشمکش نے ہمارے[۵] اخباروں کی کایا پلٹ دی ہے۔ ورنہ اینگلو انڈین اخبارات محض اعلےٰ افسروں کے مشاغل سے بھرے ہوئے ہوتے تھے۔ ان میں بڑے بڑے شہروں اور پہاڑوں کے رہنے والے انگریز

---

[۵] از پنڈت جواہر لال نہرو ؎

افسروں کی دعوتوں ناچ رنگ کی محفلوں اور کھیل تماشوں کے حالات خوب تفصیل سے لکھے جاتے تھے۔ اور ہندوستانی سیاسیات کا ہندوستانی نقطۂ نظر سے کبھی کوئی ذکر بھی نہ آتا تھا۔ ہندوستانی سیاسی تحریک کے متعلق نہایت مختصر اور مبہم خبریں ناموزوں جگہوں پر درج کردی جاتی تھیں تاکہ ان کو کوئی اہمیت نہ دی جائے۔ ہاں اگر کوئی شخص ہندوستانی سیاسی تحریک کی ہنسی اُڑاتا تھا تو اسے خوب بڑھا چڑھا کر لکھا جاتا تھا ؛

عام طور پر ہمارے ہندوستانی اخبارات بھی اینگلو انڈین معاصرین کی نقل کرنے کے عادی تھے، لیکن وہ قومی تحریک کو بھی کچھ وقعت دیتے تھے۔ ہمارے اخبارات کو بھی افسروں کے تغیر و تبدل اور ان کی الوداعی پارٹیوں سے اینگلو انڈین اخبارات کی طرح خاص دلچسپی تھی، ہندوستانی اخباروں کے مالک بڑے بڑے زمیندار اور سرمایہ دار تھے اس لئے ان کی پالیسی بھی انہی لوگوں کے ہاتھ میں تھی۔ غرض ہمارے اخباروں کو عام طور پر عوام سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ مزے کی بات یہ ہے کہ انہی اخبارات کو قومی پریس کا لقب دیا جاتا تھا ؛

گزشتہ بیس پچیس سال میں قومی تحریک کی بدولت بہت زبردست انقلاب رونما ہؤا ہے اسی کا نتیجہ ہے کہ اینگلو انڈین اخبارات بھی ہندوستانی سیاسیات کے لئے معقول جگہ نکالنے پر

مجبور ہیں۔ اگر وہ ایسا نہ کریں تو اکثر ہندوستانی ان کو خریدنا بند کر دیں۔ پھر بھی وہ ہندوستانی سیاسی مسائل کو ہمیشہ اپنے رنگ میں پیش کر کے ان کی اہمیت کو کم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

سیاسی بیداری نے ہندوستانی اخبارات کا زاویۂ نگاہ کافی وسیع کر دیا ہے اب ان کی توجہ عوام کی طرف دن بدن بڑھتی جاتی ہے لیکن پھر بھی وہ اکثر سرمایہ داروں کے مفاد کی حمایت کرتے ہیں کیونکہ آخر کار انہی کے سرمایہ سے چلتے ہیں کچھ اخبارات ایسے بھی ہیں جو زیادہ آزاد خیال ہیں اور وسیع نظری سے کام لیتے ہیں۔ مگر انہیں مطابع کے سخت گیر قوانین اور سنسر کا خوف آگے بڑھنے سے روکتا رہتا ہے۔ ایسے اخبارات کی اکثر ضمانتیں اور پریس بھی ضبط ہو جاتے ہیں۔ جس کی وجہ سے وہ کبھی پنپ نہیں سکتے"۔

اخبارات کے کارنامے گزشتہ پچاس سال میں ہمارے اخبارات نے جس قدر ترقی کی ہے ہم اس پر بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمارا پریس ابھی یورپین ممالک کے پریس سے بہت پیچھے ہے۔ اور اس کا سبب یہ ہے کہ ان ممالک کو اخبارات کے متعلق کئی سو سال کا تجربہ حاصل ہے لیکن ہمارے ملک میں اخبار کی تاریخ محض سو سال سے شروع ہوئی ہے۔ اندریں حالات جس قدر ترقی اردو پریس نے کی ہے وہ دوسرے ممالک کے مقابلہ میں

بہت زیادہ اور اہم ہے اور اس بات کی دلیل ہے کہ بہت تھوڑی مدت میں ہمارے اخبارات اعلیٰ معیار پر پہنچ جائینگے ۔

ہمارے اخبارات کا سب سے بڑا کارنامہ اور خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے مُلک میں سیاسی بیداری پیدا کرنے میں بہت زیادہ مدد دی ہے۔ اور ان کا مقصد مالی منفعت سے ہمیشہ بالاتر رہا ہے۔ یورپین ممالک میں عام طور پر اخبارات تجارتی مقاصد کے پیش نظر چلائے جاتے ہیں لیکن ہمارے اخبارات کا مطمح نظر شروع سے لے کر آج تک سیاسی آزادی رہا ہے۔ اگر ہم یہ کہیں تو بیجا نہ ہوگا کہ ہندوستانی اخبارات کی تاریخ آزادی کی تحریک کے دوش بدوش چل رہی ہے نیز قومی تحریک میں ہمارے اخبارات نے جس قدر مالی اور جانی قربانیاں پیش کی ہیں ان پر ہر اخبار نویس بجا طور پر فخر کر سکتا ہے ۔

غدر ۱۸۵۷ء کے بعد سے ہندوستانی سیاسیات کا نام سُن کر کانپنے لگتے تھے۔ لیکن آج ہمارے مُلک میں مختلف الخیال سیاسی جماعتیں موجود ہیں۔ جو ہر سیاسی موضوع پر اپنے اپنے زاویۂ نگاہ کے مطابق نہایت بے باکانہ انداز سے اظہار خیالات کرتی ہیں۔ اس کے علاوہ ہر شخص سیاسیات سے تھوڑی بہت دلچسپی ضرور لینے لگا ہے اور کچھ نہ کچھ اپنی رائے بھی رکھتا ہے یقیناً یہ ہمارے اخبارات ہی کی کوششوں کا شاندار نتیجہ ہے ۔

اخباری ترقی سے پہلے ایک وہ زمانہ تھا کہ اپنے شہر کی ضروری خبریں بھی مدتوں تک معلوم نہ ہوتی تھیں۔ اور صحیح خبریں ملنا تو ناممکنات سے تھا۔ افواہیں اور رنگ آمیزیاں حقیقت کو چھپا کر کچھ کا کچھ بنا دیتی تھیں اب یہ حال ہے کہ بات مُنہ سے نکلی اور کوٹھوں چڑھی، اور کیا مجال کہ اس میں ذرا بھی تغیر و تبدل ہو۔ ملکی خبروں کا تو ذکر ہی کیا ہے صبح ہوتے ہی تمام دُنیا کی خبریں پڑھ لو۔ شام کو نئے اخبار لو اور دن بھر کے واقعات اور حادثات سے آگاہی حاصل کر دو"

تجارت کی ترقی اور توسیع بھی بہت زیادہ اخبارات کی مرہون منت ہے۔ اخبارات کے ذریعہ تجارت اور صنعت میں جس قدر اضافہ ہوا ہے اس کا شکریہ ادا نہ کرنا حد درجہ کی ناانصافی ہے۔ آج سے چند سال پہلے ہمارے اخبارات اشتہارات کی طرف متوجہ نہ تھے، لیکن اب غیر ملکی اخبارات کی دیکھا دیکھی انہوں نے اس طرف بھی توجہ کی ہے۔ اس طریق کار سے ایک طرف تجارت میں ترقی ہونے کی امیدیں قوی تر ہو گئی ہیں اور دوسری طرف گزشتہ مالی نقصانات کی تلافی ہو جانے کے امکانات بڑھ گئے ہیں امید ہے اگر ہمارے اخبارات اپنے بلند مقاصد کے ساتھ ساتھ تجارتی پہلو کو بھی ملحوظ رکھیں گے تو ان کی مالی حالت بہت جلد سُدھر جائیگی نیز ہمارے پریس کا معیار اور زیادہ بلند

ہو سکیگا ،،

خبریں، اشتہارات اور پالیسی | عام طور پر ہر اخبار کسی نہ کسی خاص پالیسی کے ماتحت جاری کیا جاتا ہے یہ دوسری بات ہے کہ آیندہ چل کر تجربات کسی اخبار کی پالیسی کو متزلزل یا تبدیل کر دیں ایسے اخبارات جن کی پالیسی ہر قدم پر بدلتی رہتی ہے اپنے وقار کو خود ضائع کر دیتے ہیں اور غیر مستقبل پالیسی سے عوام کی نظروں میں ان کی کوئی وقعت نہیں رہتی ۔ عام طور پر کسی اخبار کی مقبولیت کا انحصار اس کی پالیسی اور خبروں پر ہوتا ہے ۔ جس اخبار کی پالیسی مضبوط، خبریں صحیح اور زیادہ ہوں اس کو عوام بہت پسند کرتے ہیں اگرچہ خبروں اور پالیسی میں بظاہر کوئی خاص تعلق نہیں لیکن اتفاقات زمانہ سے یہ دونو چیزیں یکجا ہو گئی ہیں اور ایک دوسرے سے اس طرح پیوست ہوئی ہیں کہ اب ان کو علیحدہ کرنا تقریباً ناممکن ہے ۔ اس وضع کو نبھانے کے لئے ہر اخبار کا فرض ہو گیا ہے کہ وہ پُر وثوق اور صحیح خبریں بڑی بڑی رقمیں ادا کر کے خبر رساں ایجنسیوں سے حاصل کرے اور ہر بڑے شہر میں اپنے نمایندے اور رپورٹر رکھے ،،

اخبارات اپنی مخصوص پالیسی پر کاربند رہ کر آہستہ آہستہ اپنی ایک ہم خیال جماعت پیدا کر لیتے ہیں ۔ یہ جماعت اپنے اخبار سے توقع رکھتی ہے کہ وہ ہمیشہ اپنی پالیسی پر قائم رہے ۔ اگر

سوءِ اتّفاق سے کوئی اخبار اپنی پالیسی سے انحراف کرتا ہے تو اس کے پڑھنے والوں میں خفگی اور ناراضگی کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ اور آخر کار یہ جماعت اس اخبار سے بدظن ہو کر کوئی دوسرا ایسا اخبار تلاش کرتی ہے۔ جو ان کے خیالات کی صحیح ترجمانی کرتا اور ان کے جذبات اور احساسات کا حقیقی معنوں میں آئینہ دار ہوتا ہے +

بہت سے لوگ محض خبریں ہی پڑھنے کے شوقین ہوتے ہیں۔ وہ عام طور پر اُس اخبار کو پسند کرتے ہیں جو زیادہ سے زیادہ خبریں درج کرتا ہے۔ بعض لوگ محض تجارتی اشتہارات دیکھنے کے لئے اخبار خریدتے ہیں۔ ایسے لوگوں پر اخبار کی پالیسی تبدیل ہونے کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔ چاہے اخبار کچھ ہی لکھتا رہے ان کو اپنے شوق سے کام ہے۔ وہ تو صرف یہ دیکھتے ہیں کہ اخبار میں مفید مطلب خبریں اور اشتہارات موجود ہیں یا نہیں۔ ایسے اخبارات جن کو اس قسم کے خریدار مل جائیں انہیں خاص طور پر خوش قسمت اخبار سمجھنا چاہئے۔ وہ اپنی پالیسی پر چاہے سختی سے پابند رہیں یا آئے دن اس کو تبدیل کرتے رہیں ان کے خریداروں میں کوئی کمی نہیں آسکتی۔ یہ خوش قسمت اخبار باوجود شدید مخالفت کے بھی متزلزل نہیں ہو سکتے۔ بلکہ آہستہ آہستہ اپنی ہم خیال جماعت پیدا کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔

جس سے ان کی بنیادیں اور بھی زیادہ مضبوط ہو جاتی ہیں۔
جب کسی اخبار کی پالیسی قائم ہو جاتی ہے اور اس کے ساتھ اس کا حلقۂ اثر بھی کافی وسعت اختیار کر لیتا ہے تو پھر اس کو اشتہارات کی بھی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ اب اگر اشتہار باز کسی بات پر اخبار سے ناراض ہو جائیں تو ان کی بے توجہی سے اخبار کو کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا۔ اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ کسی اخبار کے خلاف ناراضگی کا جذبہ پھیل گیا اور اشتہار بازوں نے اس کا مقاطعہ کر کے انہوں نے اپنے اشتہارات دوسرے اخباروں کو دینے شروع کر دیئے تاکہ اخبار کو نقصان پہنچے۔ لیکن تھوڑی ہی مدت کے تجربے نے ثابت کر دیا کہ اس مقاطعہ سے ان کی اپنی تجارت کو نقصان پہنچا اور وہ اخبار بدستور اپنی جگہ پر قائم رہا۔ کیونکہ وہ اپنے لئے ایک مخصوص حلقۂ اشاعت پیدا کر چکا تھا۔ اور اس قلیل عرصے میں دوسرے اخبار اس کے باقاعدہ خریداروں کو چھین کر اس کے پیمانے پر نہیں پہنچ سکتے تھے، آخر الامر یہ مخالف جماعت مجبور ہو گئی کہ اسی اخبار کا دروازہ کھٹکھٹائیں اور اپنی تجارت کو مزید نقصان پہنچانے کے موجب نہ بنیں۔
فرض کیجئے عوام میں سٹہ بازی، گھڑدوڑ اور شراب خواری وغیرہ کی وبا پھیل جاتی ہے۔ تباہ کن اور عبرتناک انجام

دیکھ کر مصلحین کو اصلاح کی سوجھتی ہے۔ اخبارات میں بھی ان بُری رسوم کی بیخ کنی کے لئے بڑے بڑے پُرزور مقالے اور افتتاحیے سپردِ قلم کئے جاتے ہیں۔ عوام میں ناراضگی کی لہریں ٹھاٹھیں مارنے لگتی ہیں۔ اخبارات والے جانتے ہیں کہ ان شوقوں کے رسیا ان کا اخبار گھڑدوڑ یا سٹہ بازی کی خبروں کی وجہ سے خریدتے ہیں۔ اگرچہ وہ ان کے خلاف بہت شد ومد سے لکھتے رہتے ہیں۔ لیکن یہ مخصوص خبریں چھاپنے سے باز نہیں آتے۔ کچھ مدت بعد یہ تحریک خود بخود ختم ہو جاتی ہے اور خبروں اور پالیسی کے تضاد کی بدولت یہ بُری رسمیں بدستور جاری رہتی ہیں۔ اسی طرح اگرچہ ہمارے مُلک کا ہر فرد شراب نوشی کے خلاف ہے اور تمام اخبار نویس بھی ہمیشہ اس بُری عادت کے خلاف لکھتے رہتے ہیں۔ لیکن اگر ہم ان کے اخبارات کی اوراق گردانی کریں تو شراب کا اشتہار کہیں نہ کہیں ضرور نظر آئیگا ہم شراب کو بُرا سمجھتے ہیں اور اس کا ذکر تک بھی اپنے گھر میں نہیں آنے دیتے لیکن اس بات کا ہمارے پاس کیا علاج ہے کہ اخباری دلچسپی کی بدولت ہر ہفتے یا روزانہ ہمارے گھر میں شراب کا اشتہار یا کاغذی بوتلیں ضرور آ جاتی ہیں مگر پھر بھی ہم پڑھتے ہیں وہی اخبار جو چاہے شراب کی بوتل کی تصویر دیکھ کر لاحول ولا قوۃ ہی کیوں نہ کہنا پڑے ۔

اخبارات کی طاقت اور کمزوریاں

اخبار کی طاقت کی تمام دُنیا قائل ہے۔ نپولین اعظم کہا کرتا تھا کہ ”جرنلسٹ مصلح قوم اور ناصح مشفق ہے۔ وہ قوم کا فاضل اُستاد اور سچّا رہنما ہے۔ اس کو حکومت کا لایق اور با اعتماد مشیر ہونے کا قدرتی طور پر فخر حاصل ہے نیز ہزاروں مسلح سپاہیوں سے جنگ کرنی آسان ہے لیکن چار ایڈیٹروں سے مقابلہ کرنا بہت زیادہ خطرناک اور مشکل ہے“۔

اخبار کی طاقت کا انحصار اس کی پالیسی پر ہے۔ اس لئے اخبارات کو اپنی پالیسی پر بڑی سختی سے قائم رہنا چاہیئے اگر پالیسی کو قائم رکھنے کے لئے بڑی سے بڑی مالی قربانیاں بھی پیش کرنی پڑیں تو دریغ نہیں کرنا چاہیئے۔ جو اخبارات اپنی طاقت کو بیکار باتوں میں ضائع کرتے ہیں وہ محض اپنی طاقت ہی کو نہیں بلکہ اس جماعت کی طاقت کو بھی نقصان پہنچاتے ہیں جس کی نمایندگی کا ان کو فخر حاصل ہوتا ہے۔ افسوس ہے کہ ہمارے اکثر اخبارات بعض مخصوص کمزوریوں کی وجہ سے بے پیندی کے بدھنوں کی طرح حادثات اور واقعات کے جھکولوں سے لڑھکتے پھرتے ہیں۔ اور ذرا سے دباؤ سے مُرغ باد نما کی طرح اپنے محور کے گرد گھوم جاتے ہیں۔ وہ اپنی طاقت کا صحیح اندازہ نہیں کرتے اور اپنی غیر مستقل پالیسی کی بدولت جرنلزم کے شریف اور باعزّت، پیشے کو لعن طعن کا نشانہ بناتے ہیں۔

اخبارات کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہونی چاہئے کہ بڑے
بڑے حادثوں اور تصادموں میں بھی مغلوب نہ ہوں۔ حق بات
کے لئے اگر جان و مال کی قربانی بھی دینی پڑے تو دریغ نہ کریں۔
ایڈیٹر قوم کا ایک بہادر سپاہی ہے۔ اس کا فرض ہے کہ بہادر
سپاہی کی طرح ہمیشہ خدمات انجام دینے کے لئے تیار رہے۔ یہی
وہ عدیم المثال معیار ہے جس کو ہمارے پیشرو اخبار نویسوں نے
قائم کیا ہے۔ کس قدر فخر کی بات ہے کہ ہمارے اخبار نویس لیڈر اور
ایڈیٹر دونوں کے فرائض ادا کرتے رہے ہیں۔ اور ان کی شہرت
اور عزت میں ان دونوں فنوں کو برابر کا دخل ہے۔ افسوس ہے
کہ ہمارا پریس دن بدن نااہل اور ناتجربہ کار اخبار نویسوں کے
قبضے میں جا رہا ہے جس سے پریس کی آزادی میں سخت رکاوٹیں
پیدا ہو رہی ہیں۔ اس کے علاوہ ذاتیات۔ تعصب۔ ناانصافی
اور نااتفاقی پریس کی طاقت کو کمزور کر رہی ہے ضرورت اس
بات کی ہے کہ جرنلزم جیسے صبر اور جرأت آزما پیشے کو وہی لوگ
اختیار کریں جن میں اس کی قابلیت موجود ہے۔ اور وہ اس کے
فرائض سے بحسن و خوبی عہدہ برآ ہو سکتے ہیں ؎

اگرچہ انفرادی تذلیل اور دل آزاری سے بدتر کوئی اور گناہ
نہیں لیکن ہمارے اخبار نویسوں کو اس سے خاص دلچسپی ہوتی
جاتی ہے یہ مسلمہ امر ہے کہ کوئی شخص کمزوریوں سے خالی نہیں۔

لیکن پھر بھی ہمارے اکثر نام نہاد ایڈیٹر شخصی کمزوریوں کو تشہیر کرکے خوب لطف اندوز ہوتے ہیں۔ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ یہ بھی ایک خاص فن ہے جو ہمارے ایڈیٹروں نے یورپین اخبارات سے سیکھا ہے۔ لیکن وہ لوگ بھی اسے معیوب سمجھتے ہیں۔ آجکل ایسے اخبارات کو اگر کوئی معقول اسامی نہیں ملتی تو انہیں اپنا اخبار بند کرنا پڑتا ہے جب تازہ شکار نظر آتا ہے وہ پھر برآمد ہو جاتے ہیں اور اپنے شکار کو قابو میں لانے کے لئے بے غل وغش گندگی اُچھالتے ہیں جب شکار پھنس جاتا ہے تو اپنا لُقمہ لے کر مگرمچھ کی طرح دریا میں غائب ہو جاتے ہیں۔ ایسے اخبارات اور اخبار نویسوں سے جرنلزم کا شریف پیشہ سخت بدنام ہے۔ جب تک عوام کے دلوں میں اس کی روک تھام کا خیال پیدا نہ ہوگا ملک کی فضا اس قسم کی آلائشوں سے کبھی پاک نہیں ہو سکتی "

جس جماعت سے کسی اخبار کا تعلق ہوتا ہے وہ اس کے کارناموں کو بحیثیت مجموعی مخالف جماعتوں کی تحصیلات اور کارناموں پر ضرور فوقیت دیتا ہے۔ یہ صورت بالکل نیچرل اور فطری امر ہے لیکن اس وقت ضرور قلق ہوتا ہے جب دوسری جماعت کے اچھے کاموں پر روز روشن میں خاک ڈالی جاتی ہے اور ہر اچھی بات کو بُرے رنگ میں پیش کیا جاتا ہے۔ ترقی کے مدارج طے کرنے کے لئے ضروری ہے کہ پریس کا

مزاج منصفانہ اور اعتدال پسند ہو۔ نکتہ چینی کا حق یقیناً ہر اخبار کو حاصل ہے لیکن ناجائز اور زبردستی کے اعتراضات جن سے تعصب کا تعفن آئے کسی طرح مستحق تحسین نہیں ہو سکتے ایسے ہی مواقع پر اخبارات کی اصلیت ظاہر ہوتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ وہ کس درجہ منصف مزاج واقعہ ہوئے ہیں ‡

ہمارے بعض اخبارات کو سنسنی خیز اور جاذب نظر عنوانات اور خبریں درج کرنے میں کمال حاصل ہے۔ اس شوق کے پورا کرنے میں وہ ایسے ایسے دلکش عنوانات قائم کرتے ہیں کہ انسان مندرجہ سطور پڑھنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ لیکن بیشتر اوقات ان کے تحت میں کچھ بھی دلچسپی نہیں ہوتی۔ ہم پیشتر عرض کر چکے ہیں کہ اخبار اور خبروں کا آپس میں کوئی تعلق نہیں اخبار کا اصلی مقصد اس کا افتتاحیہ اور وہ مضامین ظاہر کرتے ہیں جن کی اشاعت کے لئے اخبار جاری کیا جاتا ہے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ دن بدن خبروں کی طرف اخبارات کا رجحان زیادہ بڑھ رہا ہے۔ اور یہ اینگلو انڈین اور انگریزی اخبارات کا اثر ہے' یاد رہے اگر خبروں کو اخبارات میں زیادہ اہمیت دی گئی تو ہمارے اخبارات مستقبل قریب میں محض خبروں کا مجموعہ بن کر رہ جائیں گے اور آخر کار اخبارات کا مقصد اعلیٰ فوت ہو جائیگا ‡

چونکہ اخبارات میں خبریں درج کرنے کا رواج شروع ہی سے

چلا آتا ہے اس لئے اس کو ترک کرنا تقریباً ناممکن ہے۔ بہر حال خبروں کے اندراج میں بڑی احتیاط سے کام لینا چاہیئے۔ کسی مشہور اخبار نویس کا قول ہے" خبر یہ نہیں ہے کہ فلاں شخص کو کُتے نے کاٹ لیا۔ اس میں کونسے تعجب کی بات ہے کُتا انسان کو کاٹا ہی کرتا ہے۔ خبر تو یہ ہونی چاہیئے کہ فلاں انسان نے کُتے کو کاٹ لیا" اگر ہم غیر ضروری خبریں اخبارات میں درج کرنے سے پرہیز کریں تو یہی جگہ کسی اور مفید مقصد کے لئے صرف ہو سکتی ہے۔ میرے نزدیک اخبارات کو محض ان واقعات اور حادثات پر روشنی ڈالنی چاہیئے جن کا عوام کی ضروریات زندگی سے فطری تعلق ہے۔ غیر فطری واقعات کا اعادہ تھوڑی دیر کے لئے دلچسپی ضرور پیدا کر سکتا ہے لیکن ان کو انسانی زندگی کا صحیح آئینہ دار کسی حالت میں بھی نہیں کہا جا سکتا۔ اور نہ ان کے بیان سے اخبار کا اصلی مشن پورا ہوتا ہے۔

اخباری نمایندے اور ایڈیٹر موجودہ زمانہ میں جس طرح اور فنون ہیں اس طرح ایڈیٹری یعنی اخبار نویسی بھی ایک معقول اور با عزت فن خیال کیا جاتا ہے۔ مغربی ممالک میں اخبار نویس بہت عزت کی نگاہوں سے دیکھے جاتے ہیں اور ان کو بڑی بڑی معقول تنخواہیں ملتی ہیں۔ بر خلاف اس کے ہندوستان میں اخبار نویسوں کی بہت بُری حالت ہے۔ سب سے پہلے تو اس فن کو بیکاروں کا مشغلہ

سمجھا جاتا ہے اگر کوئی شخص اپنی ہمت اور قابلیت سے اپنے لئے کوئی مخصوص جگہ پیدا کرلے تو اس کی واقعی قدر و منزلت بھی خوب ہوتی ہے۔ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ حُسن اتفاق سے ہمارے جتنے بڑے بڑے سیاسی اور قومی لیڈر ہیں۔ان کی سیاسی اور قومی زندگی کی ابتدا اخبار نویسی سے ہوئی ہے۔اور غالباً ان کی شُہرت پر رشک کھا کر بہت سے نااہل لوگ اس میدان میں کُود پڑے ہیں۔جو اپنے تلخ تجربات کے ایک حد تک خود ذمہ دار ہیں۔ہمارے مُلک میں اگرچہ اخبار نویسی کوئی منفعت بخش ذریعہ روزگار نہیں لیکن اس کی عزّت اور وقعت بہت ہے بشرطیکہ کوئی اخبار نویس اپنے اعتبار کو خود خاک میں نہ ملائے اخبارات کی بدولت ایک ایڈیٹر کو جس قدر مواقع عام میں مقبولیت اور اعتبار حاصل کرنیکے ملے ہیں وہ کسی دوسرے پیشے میں میسّر نہیں آتے۔اُسے زیادہ سے زیادہ اور ہر قسم کے آدمیوں سے تبادلۂ خیالات اور ان کی خدمات انجام دینے کے موقعے ہمیشہ ملتے رہتے ہیں۔اگر اس میں قابلیت اور لیاقت ہو تو وہ ان سے بیش از بیش فایدہ اُٹھا سکتا ہے۔ہم تسلیم کرتے ہیں کہ ہر شخص کو خوش کرنا بہت مشکل کام ہے لیکن اگر صداقت اور بے غرضی کے معیار کو ملحوظ خاطر رکھا جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ اخبار نویس کو اپنے شریفانہ پیشے میں خاطر خواہ کامیابی حاصل نہ ہو۔

بہر حال تعلیم یافتہ طبقے کے لئے فن صحافت میں ترقی کرنے کی بہت گنجائش ہے۔ اگرچہ ہمارے ملک میں اخبارات کی تاریخ محض سو سال پرانی ہے لیکن گزشتہ تیس چالیس سال میں اخبارات نے بہت ترقی کی ہے۔ آجکل ہندوستان کے ہر بڑے شہر سے کوئی نہ کوئی اخبار ضرور شائع ہوتا ہے اور وہ بہت کافی شوق سے پڑھا جاتا ہے۔ جہاں تعلیم کا چرچا ہے وہاں بے پڑھے لکھے لوگ بھی اخبارات دوسروں سے پڑھوا کر سنتے ہیں۔ ایسے حالات میں اگر ہر بڑے شہر سے مقامی اخبارات نکالے جائیں تو صحافت میں بہت جلد ترقی ہو سکتی ہے۔ ظاہر ہے یہ بات کچھ زیادہ مشکل نہیں۔ ہر شہر میں بڑے بڑے اخبارات کے نمایندے اور رپورٹر موجود ہیں وہ اس کام کو نہایت خوش اسلوبی سے انجام دے سکتے ہیں۔ اس قسم کے مقامی اخبارات سے بہت بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ مقامی خبریں اور حالات عوام میں بیداری اور احساس زندگی پیدا کر دینگے۔ دوسرے ان اخبارات کو بہت سا ضروری مواد مفت میں ہاتھ آ جائیگا جو صوبائی یا آل انڈیا مقبولیت کے مالک ہیں۔ اس طریق کار سے اخبار نویسی کے فن میں بھی بہت زیادہ ترقی ہونے کی امید ہو سکتی ہے کیونکہ چھوٹے چھوٹے مقامی اخبارات کے ایڈیٹر بہت کم مدت میں بڑے بڑے اخبارات کو چلانے کی قابلیت پیدا کر لینگے۔ اور اسی طرح نئی پود ان کی جگہ کام کر کے فن اخبار نویسی

کی تعلیم حاصل کرتی چلی جائیگی۔

ہم عرض کر چکے ہیں کہ ہمارے اُردو اخبار عام طور پر ایڈیٹروں ہی کی ملکیت ہیں۔ اور ان کی آمدنی اس قدر قلیل ہے کہ وہ باقاعدہ کوئی سٹاف نہیں رکھ سکتے۔ اگر کوئی ایڈیٹر صاحب اپنی چادر سے باہر پاؤں پھیلاتے ہیں تو ان کے اخبار کا چند روز ہی میں دیوالہ نکل جاتا ہے۔ غرض مالی کمزوریاں اُردو اخبارات کو عام طور پر پنپنے کی مہلت نہیں دیتیں یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے نمایندوں اور رپورٹروں کو بھی ان کی محنت کا کوئی معقول صلہ نہیں دے سکتے۔ ادھر اخباری نمایندے بھی اپنے فرائض نہایت بے پرواہی سے انجام دیتے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ غلط اطلاعوں کی بدولت وہ اکثر قانونی پیچیدگیوں میں پھنس جاتے ہیں اور سخت نقصان اُٹھاتے ہیں اس بے احتیاطی کی وجہ سے بڑا نقصان یہ ہے کہ اب ہمارے اخبارات کی سچ بات کا بھی کوئی اعتبار نہیں کرتا۔ اگرچہ معقول اخبارات ہر بات کی تصدیق کرکے اپنے اخبار میں درج کرتے ہیں۔ لیکن پھر بھی کھویا ہوا اعتبار دوبارہ ذرا مشکل ہی سے پیدا ہوتا ہے۔ ہمارے ملک میں اینگلو انڈین اخبارات کی صداقت مسلمہ خیال کی جاتی ہے۔ وہ اگر کوئی جھوٹی بات بھی لکھ دیں تو سچ کا گمان گذرتا ہے۔ اکبر نے اس بارے میں کیا خوب کہا ہے ؎

گھر سے آئی ہے خبر ان کا ہُوا ہے چہلم
پانیر لکھتا ہے بیمار کا حال اچھا ہے

اُردو پریس کو چاہیئے کہ پانیر جیسی صداقت پیدا کرے۔ اور ایسی خبر ہرگز نہ چھاپے جس کی دوسرے دن تردید کرتے ہوئے افسوس کا اظہار کرنا پڑے۔ ہمارے اخبارات کی عام طور پر حالت یہ ہے کہ اگر کہیں تھوڑی سی جگہ خالی رہ جاتی ہے تو اس کو کسی نہ کسی طرح پُر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور یہ خیال نہیں کرتے کہ تھوڑی سی جگہ خالی چھوڑ دینے سے کوئی نقصان نہیں ہوتا لیکن ایک غیر مصدقہ اور لچر بات درج کر دینے سے اخبار کو بہت زیادہ ضعف پہنچتا ہے۔ ہمارے ہوشیار اخبار نویس ایسے موقعہ پر اپنا کمال اس طرح دکھاتے ہیں کہ فلاں جگہ بڑا خونریز فساد ہُوا۔ بہت سے آدمی مجروح ہوگئے۔ کئی ایک کو پولیس نے گرفتار کر لیا۔ باقی بھاگ گئے اس کے بعد لکھتے ہیں۔ تحقیق کرنے پر معلوم ہُوا کہ یہ خبر بالکل بے بنیاد ہے۔ لیجیئے جگہ بھی پُر ہوگئی اور جھگڑا بھی جاتا رہا۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ اس قسم کی حرکات سے اخبار کی شہرت پر کیا اثر پڑا۔

ایڈیٹروں کو چھوڑ کر جو واقعی بڑے دلچسپ انسان ہوتے ہیں۔ ہمارے اخبارات کے نامہ نگار رپورٹر اور نمایندے بھی کچھ کم دلچسپ نہیں ہوتے۔ ان کی قابلیت سے صرف نظر کر کے

ذرا ان کے کارنامے ملاحظہ فرمائیے۔ فرض کیجئے کہ کوئی نہایت اہم جلسہ ہو رہا ہے۔ اخبارات کے نمایندے بھی پلیٹ فارم کے قریب کرسیوں پر جلوہ افروز ہیں۔ متانت اور وقار ان کے چہروں سے ٹپکتا ہے۔ بات بات پر ان کا قلم چل رہا ہے۔ مقررین کی نظریں سامعین سے زیادہ ان پر پڑ رہی ہیں کہ تقریر کی کامیابی اور ناکامیابی کی یہی لوگ کسوٹی ہیں۔ جلسہ تو بخیر و خوبی ختم ہوا اب ہر مقرر ان کے ساتھ نہایت تپاک سے مل رہا ہے اور باتوں باتوں میں خوشامدیں ہو رہی ہیں کہ ان کی تقریر کے متعلق اچھی رپورٹ لکھی جائے۔ تاکہ غیر حاضر افراد کے دلوں پر انکی قابلیت کا ایک دفعہ سکّہ جم جائے۔ خیر اب دوسرے دن صبح کو اخبارات میں دیکھئے کیا گوہر افشانیاں ہوتی ہیں۔ کس کی قسمت پھوٹتی اور کس کی جاگتی ہے، اور ایڈیٹر صاحب کی جادو بیانی کیا رنگ لاتی ہے۔ لیجئے صاحب لیجئے اخبار ملاحظہ فرمائیے۔ ارے بھئی خدا کے لئے ذرا دیکھئے تو یہ کیا لکھا ہے میں نے تو یہ ہرگز نہیں کہا تھا۔ یہ تو بڑے سخت الفاظ ہیں۔ خدا جانے اس کا کیا انجام ہوگا۔ سخت پریشانی ہے۔ چلئے فلاں شخص کے پاس چلیں وہ بھی تو وہیں موجود تھا۔ اسے اچھی طرح یاد ہوگا۔ میں نے اپنی تقریر میں ہرگز یہ نہیں کہا تھا۔ ارے فلاں صاحب ہیں کیوں صاحب کیا کام ہے۔ بھائی خدا کے لئے جلدی آؤ۔ لو بتاؤ تو میں نے یہ اپنی تقریر میں کب کہا تھا۔ وہاں رات کی بات کب

یاد ہے پتہ نہیں کس نے کیا کہا تھا۔ اچھا چلو کوئی اور اخبار دیکھیں ارے اس میں بھی یہی لکھا ہے۔ معلوم ہوتا ہے تمام اخباروں کے نمایندے میرے دشمن ہو گئے ہیں۔ اس میں تو اور بھی زیادہ سنسنی خیز عنوانات ہیں۔ اب دیکھئے کیا ہوتا ہے۔ خدا جانے پولیس وارنٹ گرفتاری لے کر آئیگی۔ اگر تقریر کا اثر کسی خاص جماعت پہ پڑتا ہے تو آج ہی شام کو ایک جلسہ ہوتا ہے۔ جس میں عدم اعتماد اور نفرت وحقارت کا اظہار کیا جائیگا۔ کیا پتہ کوئی شر انگیز مقدمہ بھی داغ دے۔ ممکن ہے جلسہ گاہ سے اُٹھ کر سارا ہجوم گھر پر دھاوا بول دے۔ جان بھی بچے یا نہ بچے۔ معلوم نہیں شہر چھوڑ کر بھاگنا پڑے۔ ہاتھ باندھ کر معافی مانگنے پر مجبور کیا جائے یا بائیکاٹ ہی کر دیا جائے۔ مشورہ ہوتا ہے چلو ایڈیٹر صاحب سے ملاقات کریں۔ شاید وہ بھلا مانس تردید کر دے۔ بصد مشکل ایڈیٹر صاحب کے درشن ہوئے۔ وہ بیٹھے سیاسیات پر خامہ فرسائی فرما رہے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے تمام دُنیا کے سیاسی معاملات ان کی اُنگلیوں میں کھیل رہے ہیں۔ ایک سطر لکھتے ہیں اور دس تیور بدلتے ہیں۔ بات کرنے کی نوبت ہی نہیں آتی۔ ان کا مقالہ ختم ہونے کے بعد بات ہوئی۔ وہ کہتے ہیں رپورٹر غلط نہیں لکھ سکتا۔ اور اس بات کی تصدیق اس چیز سے ہوتی ہے کہ دوسرے نمایندوں نے بھی یہی کچھ لکھا ہے یہ کہتے ہیں کہ سراسر غلط ہے۔ میرے ساتھ

گواہ بھی موجود ہے۔ غرض بڑی لمبی چوڑی بحث کے بعد کچھ فیصلہ ہو گیا۔ اگر اس پر عمل بھی ہوا تو چین کی نیند سوئے۔ ورنہ کئی کئی ہفتے رات کی نیند اور دن کا چین حرام ہو گیا۔ کیا عجب ہے کہ پبلک کے معاملات میں حصّہ لینے ہی سے توبہ کر لیں اور اگر ان اخبار والو پر بہت ہی غصّہ آیا تو اپنا اخبار نکال مارا اور ایڈیٹر اور لیڈر بن بیٹھے۔ اب خود کوزہ، وخود کوزہ گر، وخود گل کوزہ، خود رند سبو کش،

اس قسم کے دلچسپ واقعات کچھ اردو اخبار نویسی ہی سے مختص نہیں۔ ہر ملک میں اس قسم کے معاملات اکثر پیش آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حکومت قانون ساز مجلسوں میں اپنے شارٹ ہینڈ کے ماہر موجود رکھتی ہے تاکہ پبلک کے اخباری رپورٹر تقریروں کو تبدیل نہ کرنے پائیں۔ پھر بھی بعض اوقات یہ لوگ بڑی بڑی متضاد اور مضحکہ خیز باتیں اپنی رپورٹوں میں لکھ جاتے ہیں۔ پبلک کے عام جلسوں میں تو ان لوگوں کی بن آتی ہے۔ جو چاہیں وہ لکھ لیں اور جس ضروری بات کو چاہیں بغیر کسی کھٹکے کے نظر انداز کر دیں۔ یہ بات عام طور پر مشہور ہے کہ جن مقرروں کا ایڈیٹروں اور اخباری نمایندوں سے کچھ تعلق ہوتا ہے ان کو لیڈر بننے اور شہرت حاصل کرنے میں کوئی تکلیف نہیں اُٹھانی پڑتی۔ اگر ایسے لوگوں کی تقریریں آپ کو اخباریں پڑھنے کا اتفاق ہو تو آپ کو ان کی شان بہت ہی ارفع و اعلیٰ دکھائی دے گی۔ ان کی تقریریں

وہ تمام اچھی باتیں موجود ہونگی جو ان کی زبانِ مبارک سے نکلنا تو دُور ان کے دماغ سے چھو کر بھی نہ گزُری تھیں۔ اگر رپورٹر صاحب کسی قدر منصف مزاج ہیں تو اپنی طرف سے کچھ اضافہ نہیں کرینگے بلکہ تقریر کے اچھے حصّوں کو چھاپ دینگے اور بے معنی اور لغو باتوں کو حذف کر دینگے۔ اخبار پڑھنے سے آپ بے کم و کاست اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ ان صاحب سے زیادہ کسی اور مقرر نے شاندار اور پُر مغز تقریر نہیں کی۔

ان حالات سے اندازہ ہوتا ہے کہ رپورٹروں اور نمایندوں کے تقرریں بھی بڑی حزم و احتیاط سے کام لینے کی ضرورت ہے۔ ورنہ اُن کی بے اعتدالیوں سے بھی ہمارے پریس کو وہی نقصانات پہنچنے کا اندیشہ ہے جو ایڈیٹروں کی غیر ذمہ داری سے ممکن ہو سکتا ہے۔

بہر حال صحافت کی طاقت مسلم ہے۔ ہم اس سے وہ وہ کام لے سکتے ہیں جو بڑے بڑے لشکر اور فوجیں بھی انجام نہیں دے سکتیں۔ اِس لئے ہمیں اپنے اخبارات کا معیار بلند۔ اور ان کو بدنام کُن الزامات سے بچانے کی کوشش کرنی چاہیئے تاکہ وہ وقت جلد آجائے جب ہمارے اخبارات دُنیائے صحافت میں غیر فانی شہرت اور لازوال طاقت کے مالک کہلانے لگیں۔

آبادی

ماہرین نے حساب لگایا ہے کہ محض ایک مرد اور ایک عورت کے ذریعہ سے ۱۷۵۰ سال میں اتنے ہی انسان پیدا ہو سکتے ہیں جتنے اس وقت صفحہ عالم پر موجود ہیں۔ اگر یہ حساب صحیح ہے تو اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ آبادی میں بڑھنے کی کس قدر وسعت ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور ماہر معاشیات نے آبادی کے متعلّق یہ نظریہ قائم کیا ہے کہ آبادی دو سے تین، تین سے چھ، چھ سے بارہ، بارہ سے چوبیس اور اسی طرح ہر عدد پر دوگنی ہوتی چلی جاتی ہے۔ بعض لوگوں نے اس نظریے پر اعتراضات بھی کئے ہیں لیکن ساتھ کے ساتھ اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ آبادی واقعی بہت سرعت سے بڑھتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ اندازے نہایت پریشان کُن ہیں۔ اور کسی نہ کسی حد تک اصلیّت پر مبنی ہیں۔ اسی لئے متفکرین اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ چاہے دُنیا کی مالی حالت کتنی ہی بہتر کیوں نہ ہو جائے لیکن وہ کبھی بڑھتی ہوئی آبادی کی کفالت نہیں کر سکتی یہی وجہ ہے کہ مسئلہ آبادی ہر مُلک میں نمایاں حیثیت اختیار کرتا جاتا ہے۔ مردم شماری کا رواج بھی شاید اسی احساس کا نتیجہ ہو

ورنہ کم از کم اس سے مسئلہ آبادی کی طرف عوام کی توجہ تو ضرور منعطف ہوتی ہے ؛

اس مضمون میں ہم آبادی کے متعلق اعداد و شمار کا جایزہ لیتے ہوئے ہندوستان کی عمومی حالت پر روشنی ڈالیں گے اور دکھائینگے کہ آبادی کے ارکان کون کونسے ہیں۔ آبادی کیونکر بڑھتی ہے، ملک کی آبادی کو کتنے حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ اموات و پیدائش کی کمی اور زیادتی کا کیا اثر پڑتا اور اس سے کیا ظاہر ہوتا ہے۔ آبادی کی کثرت کا صحیح معیار کیا ہو سکتا ہے۔ اگر ہمارے ملک کی آبادی ضرورت سے زیادہ ہے تو اس سے کیا نقصانات ہو رہے ہیں۔ آخر میں ہم ان تجاویز پر بھی بحث کرینگے جن پر عمل کرنے سے آبادی کو بڑھنے سے روک کر انسانی زندگی کے معاشی معیار کو بلند کر کے عوام کی خوشحالی کے اسباب کو ترقی دی جا سکتی ہے ؛

سنہ ۱۹۳۱ء کی مردم شماری میں ہندوستان کی آبادی ۳۵ کروڑ ۲۹ لاکھ سے زائد افراد پر مشتمل تھی۔ جس رفتار سے آبادی بڑھ رہی ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اب ۳۶ کروڑ تک پہنچ چکی ہوگی ورنہ عوام کا اندازہ تو یہ ہے کہ اس وقت ہندوستان کی آبادی کم و بیش ۳۷ کروڑ کے لگ بھگ ہے۔ ہمارے ملک کی آبادی کا مسئلہ دن بدن خطرناک صورت اختیار کر رہا ہے۔ اس لئے تعلیم یافتہ طبقہ کچھ مدت سے اس کی طرف متوجہ ہے اور جن گھرانوں میں

بن بُلائے مہمان نازل ہو رہے ہیں وہ اس سے متاثر ہیں۔ لیکن ہمارے اہل مُلک نے اب تک اس مُہلک مرض کے انسداد کی طرف بحیثیت مجموعی توجہ نہیں کی، ضرورت ہے کہ مسئلہ آبادی پر ٹھنڈے دل سے غور اور اس کے اسباب و علل پر باقاعدہ بحث کی جائے تاکہ یہ پیچیدہ اور اہم مسئلہ آسانی سے سمجھ میں آجائے ،،

معاشی ذرایع

آبادی کے کم اور زیادہ ہونے کا انحصار زیادہ تر کسی مخصوص خطے کی آب وہوا۔ حفاظت جان و مال، معیار راحت و آرام وسائل و ذرایع معاش اور اقتصادی ترقیات پر ہے۔ جس مقام کا ماحول قُدرتی عطیّات سے مالا مال ہوتا ہے۔ اور حضرت انسان اس سے پورا پورا فایدہ اُٹھانا جانتے ہیں وہاں آبادی کی کثرت ہوتی ہے۔ گویا جہاں کہیں معاشی ذرایع بکثرت ہونگے وہاں زیادہ آبادی کی گنجائش ہوگی۔ اور وہاں کے باشندے دوسرے محروم القسمت مقامات کی نسبت زیادہ خوشحال اور تعداد میں بکثرت ہونگے ، ہمارا ہندوستان چونکہ زراعت پیشہ مُلک ہے اس لئے ان مُلکوں کی نسبت کم آباد ہے جن میں صنعت وحرفت کو عروج حاصل ہے چنانچہ تحقیقات کے مطابق اس وقت ہندوستان میں تقریباً دوسو افراد فی مربعہ میل آباد ہیں ،،

ہم کسی مُلک کی معاشی حالت، کا اندازہ اس کی فی مربعہ میل آبادی سے نہیں لگا سکتے، امریکہ اور مصر کی آبادی فی مربعہ میل کے

حساب سے برابر ہے۔ لیکن ان کی معاشی حالت میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ برخلاف اس کے انگلستان اور امریکہ کی آبادی میں بہت زیادہ فرق ہے لیکن معاشی اعتبار سے دونوں ملکوں کی حالت ایک جیسی ہے۔ اس لئے کسی ملک کی معاشی حالت کا اندازہ کرنے کے لئے آبادی کا گنجان اور کم ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ زیر بحث ملک کی حالت کا اندازہ کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم اس کی آبادی اور معاشی حیثیت کا جایزہ لیں:۔

بعض لوگوں کا خیال ہے جہاں بارشیں زیادہ ہوں وہاں آبادی زیادہ ہوتی ہے ہم تسلیم کرتے ہیں کہ بارش کا اثر زرعی علاقوں پر نہایت عمدہ ہوتا ہے لیکن یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ حد سے زیادہ بارش ہونے سے نقصانات بھی ہوتے ہیں اس لئے ہمارے ملک میں جہاں جہاں بارشیں بکثرت ہوتی ہیں وہاں نسبتاً آبادی بہت کم ہے۔ اگر عمدہ زراعت سے آبادی پر اثر پڑتا ہے تو مصنوعی آبپاشی کو بھی کسی علاقے کی آبادی گھٹانے بڑھانے میں بہت دخل ہے۔ ہندوستان کا بہت کم رقبہ ہے جسے مصنوعی ذرایع سے سیراب کیا جاتا ہے۔ اس لئے یہاں آبپاشی کو بھی آبادی سے دور کا تعلق ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ عمدہ زراعت کا انحصار زمین کی اصلیت پر ہے۔ اگر کہیں قابل زراعت زمین ہموار ہے تو وہاں چپہ چپہ پر زراعت ہو سکتی ہے۔ برخلاف اس کے اونچی نیچی اور

غیر ہموار زمینیں عام طور پر نا قابل زراعت ہیں۔ ہندوستان میں یقیناً ان علاقوں میں آبادی بکثرت ہے جہاں سطح زمین ہموار اور زرخیز ہے۔ بنگال اور صوبجات متحدہ میں بہت زیادہ آبادی ہے۔ لیکن آسام میں ناموافق آب و ہوا اور کثرت باران کی وجہ سے معاشی ذرایع محدود ہیں اس لئے وہاں آبادی بھی کم ہے۔ زمین کا عمدہ ہونا بھی اسی وقت مفید اور آبادی پر اثر انداز ہو سکتا ہے جبکہ بارش ضرورت کے مطابق ہو۔ چونکہ ہندوستان میں بارش خاص انداز سے نہیں ہوتی اس لئے اس کو بھی آبادی میں کوئی خاص دخل نہیں ہو سکتا۔ اس کے علاوہ حُبّ وطنی یعنی ترک وطن نہ کرنے کی عادات ذرایع آمدورفت کی کمی وغیرہ کا بھی آبادی پر کچھ نہ کچھ اثر ضرور پڑتا ہے۔ بدقسمتی سے یہ اثرات یہاں بالکل مفقود ہیں بیرونی ملک تو دُور رہے ہندوستان کے باشندے اپنے ملک میں بھی ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا پسند نہیں کرتے ۔

تقسیم آبادی (۱) مذہب

ہندوستان کی آبادی کی تقسیم کا ایک نمایاں پہلو یہ بھی ہے کہ یہاں آبادی مذہب کے اعتبار سے مخصوص خطوں میں پھیلی ہوئی ہے۔ اگرچہ ذرایع آمدورفت کی ترقی نے ہر قوم کے لوگوں کو دُور دُور پہنچا دیا ہے لیکن پھر بھی ہنوز زیادہ تعداد میں وسط و جنوب ہند میں آباد ہیں۔ صوبۂ مدراس میں ہنود کی آبادی ۸۹ فیصدی ہے۔ آسام۔ بہار۔ اوڑیسہ۔ صوبجات

متحدہ و متوسطہ میں اور اقوام کی نسبت ہنود کی کثرت ہے۔ صوبۂ سرحد بلوچستان اور کشمیر میں مسلمان بہت زیادہ ہیں پنجاب مشرقی بنگال اور سندھ میں بھی مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ برما میں بُدھ مت کے پیرؤں کی ۸۵ فیصدی آبادی ہے۔ سکھ قوم محض پنجاب میں آباد ہے۔ ہندوستان میں تقریباً ½12 لاکھ جینی ہیں جن میں سے نصف سے زائد صوبہ بمبئی اور ریاست بڑودہ میں رہتے ہیں۔ پارسی اور یہودی بھی بمبئی کے حدود میں زیادہ ہیں۔ عیسائی زیادہ تر جنوبی ہندوستان میں جاگزیں ہیں پراچین اقوام کے لوگ عام طور پر بہار اوڑیسہ صوبجات متوسطہ، بنگال، برما۔ راجپوتانہ اور حیدر آباد دکن وغیرہ میں پھیلے ہوئے ہیں ۔

ہندوستان کی آبادی کی یہ مخصوص کیفیت ہے کہ ہر فرقے کے پیرؤں کا شعار مذہبی عقائد اور رسوم جدا جدا ہیں۔ مثلاً مسلمانوں کا یہ عقیدہ ہے کہ جو پیدا ہوتا ہے وہ اپنا رزق اپنے ساتھ لاتا ہے۔ ہر شخص کو روٹی دینے والا خدا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں۔ کہ رزاق مطلق خدا ہی ہے لیکن ہمیں خداوند تعالیٰ نے عقل اس لئے دی ہے کہ ہم دُنیا کے ہر مسئلے پر غور و خوض کر سکیں، ضرر رساں چیزوں سے پرہیز کر کے اپنی عقل اور سمجھ کی برکت سے خوشحال زندگی بسر کریں، آبادی کا مسئلہ بھی دُنیاوی مسئلہ ہے۔ اور اس کو اختیار تمیزی پر چھوڑا گیا ہے اسی لئے ہم اُس وقت تک

شادی بیاہ نہیں کرتے جب تک شریک زندگی اور اولاد کے فرایض سے سبکدوش ہونے کا مقدور نہیں رکھتے، جو لوگ ازدواج کے اس پہلو کو مدنظر نہیں رکھتے وہ ہمیشہ پریشان رہتے ہیں۔ بلکہ ان کی پریشانی کا سلسلہ بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔ جس قدر افراد بڑھتے ہیں اسی قدر دنیاوی نعمتوں سے فائدہ اُٹھانے کے مواقع کم ہوتے جاتے ہیں۔ ایک خاندان میں جتنے افراد زیادہ ہوتے ہیں اتنا ہی ورثہ ان کو کم ملتا ہے۔ کثیر الاولاد لوگ اس بات کو اچھی طرح جانتے ہیں اور وہ لوگ بھی خوب سمجھتے ہیں جن کو براہ راست نقصان پہنچتا ہے۔ کثرت اولاد کی بدولت آمدنی زیادہ حصوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ اور تقسیم ہوتے ہوتے کچھ بھی باقی نہیں رہتا۔ یہاں تک کہ ہر شخص کو ازسرنو آیندہ زندگی کے عیش و آرام کے لئے سرمایہ جمع کرنا پڑجاتا ہے۔

(۲) پیشہ — ہندوستان کے ۷۱ فی صدی باشندوں کا انحصار زراعت یا اس سے متعلقہ پیشوں پر ہے اگر اس میں ۳ فیصدی اور افراد شامل کر لئے جائیں تو وہ لوگ بھی آجائینگے۔ جو خانہ بدوشوں کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ اور فصلوں کے بونے اور کاٹنے میں زمینداروں اور کاشتکاروں کو کسی نہ کسی طرح مدد دیتے ہیں۔ ہندوستان میں صنعت و حرفت دس فیصدی آبادی کے لئے روزی کمانے کا ذریعہ ہے مگر

زیادہ تعداد غیر منظم صنعتوں میں مصروف ہے۔ یہ لوگ عام طور پر معمولی ضرورت کی چیزیں اور زرعی آلات وغیرہ بناتے ہیں۔ منظم صنعت وحرفت کے کارخانے محض ایک فیصدی آبادی کے لئے روزگار مہیا کر سکتے ہیں۔ تجارت اور ذرایع نقل وحمل میں تقریباً چھ سات فیصدی افراد کو کام مل سکتا ہے۔ اور بہت ہی کم افراد ہیں جو زرعی تحصیلات کو بیچنے کی خدمات انجام دیتے ہیں۔ تحفظ اور نظام ملک کا کام تقریباً نصف کروڑ یا ½۱ فیصدی آدمیوں سے چل رہا ہے۔ باقی افراد خانہ داری اور دیگر غیر منفعت بخش پیشوں اور کاموں سے شکم پُری کرتے ہیں۔ ہمارے بعض صوبے مثلاً بمبئی۔ بنگال۔ بہار۔ اوڑیسہ وغیرہ اگرچہ صنعت اور تجارت کے مرکز ہیں لیکن پھر بھی اُن کی بیشتر آبادی کی گزران زراعت ہی پر ہے ؛

تمام دُنیا میں جتنے مہذب ممالک ہیں ان میں فقط ہندوستان ہی ایک ایسا ملک ہے جس کی آبادی کا گُزرہ محض زراعت پر ہے گویا بہت ہی کم تعداد ان لوگوں کی ہے جو صنعت وحرفت اور تجارت وغیرہ سے روزی پیدا کرتے ہیں۔ ظاہر ہے۔ اگر ہندوستان جیسا طویل وعریض ملک محض زراعت پر قناعت کریگا تو اس کا مستقبل کبھی درخشندہ نہیں ہو سکتا، کیونکہ زراعت پر بھروسہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ہم بارش پر اعتماد کرتے

ہیں۔ اگر سوءِ اتفاق سے بارش نہ ہو تو سمجھ لو قیامت آگئی، یا اگر بارش ضرورت سے زیادہ ہوگئی تو خوشحالی کی تمام امیدیں منقطع ہوگئیں۔ ۱۸۸۰ء میں قحط سالی کی روک تھام کے لئے حکومت ہند نے ایک کمیشن مقرر کیا تھا۔ تحقیقات کے بعد اس کمیشن کے ارکان اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ ہندوستان کی بیشتر آبادی کا انحصار محض زراعت پر ہے۔ اور یہی سبب ان کی تباہ حالی کا ہے۔ قدرت کی ستم ظریفیاں ان کو کبھی پنپنے کا موقعہ نہیں دیتیں۔ اس کا علاج انہوں نے یہ تجویز کیا تھا کہ ہندوستانیوں کو صنعت وحرفت کی طرف متوجہ کیا جائے۔ خدا کا شکر ہے کہ ملک میں صنعت وحرفت کو ترقی دینے کی طرف عوام متوجہ ہیں اور اکثر کارخانے اور ادارے اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے جاری ہوگئے ہیں لیکن ضرورت ہے کہ اس طرف زیادہ سے زیادہ توجہ صرف کی جائے۔

(۳) شہر اور دیہات | ہم ہر ملک کی آبادی، شہروں اور دیہاتوں کے اعتبار سے بھی تقسیم کرسکتے ہیں چنانچہ اگر ہندوستان کے شہروں اور دیہاتوں کا شمار کیا جائے تو شہروں کی نسبت دیہاتوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ اور یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ ہندوستان زرعی ملک ہے ہمارے ملک میں تقریباً پونے تین ہزار شہر ہیں اور سات لاکھ دیہات، ہندوستان کے

شہروں کی آبادی زیادہ سے زیادہ گیارہ بارہ فیصدی ہے۔ یورپ کے ملکوں کا جایزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ انگلستان میں ۸۰ فیصدی اور امریکہ میں ۵۲ فیصدی شہری آبادی ہے۔ بہرحال ہمارے ملک میں صنعت وحرفت کی ترقی کے ساتھ ساتھ بہت سے دیہات شہر بن رہے ہیں۔ چنانچہ ۱۹۱۱ء اور ۱۹۲۱ء کے درمیان ہمارے پچاس ہزار آبادی والے شہروں میں ۴۵ فیصدی سے زائد اضافہ ہوا لیکن اس سے کم آبادی کے شہر بہت ہی کم ترقی کر سکے۔ دوسرے ملکوں کے مقابلہ میں یہ ترقی آٹے میں نمک کے برابر ہے۔ ۱۸۹۰ء میں جرمنی کے نوّے فیصدی باشندے دیہاتوں میں رہتے تھے لیکن آجکل ۵۴ فیصدی شہروں میں آباد ہیں۔ اسی طرح آسٹریلیا کی دیہاتی آبادی ۱۸۴۳ء میں ۹۱ فیصدی تھی لیکن ۱۹۱۱ء کے اعداد وشمار کے مطابق تقریباً ۷۳ فیصدی شہری آبادی ہوگئی گویا ۲۷ فیصدی دیہاتی آبادی باقی رہ گئی ۔

ہندوستان میں شہری آبادی کم ہونے کا صاف مطلب یہ ہے کہ ہم لوگ نئی تہذیب کی دوڑ میں دوسرے ممالک سے بہت پیچھے ہیں۔ ممکن ہے دیہاتی لوگ بعض خوبیوں میں شہریوں سے بہتر ہوں لیکن ماننا پڑیگا کہ جو تہذیبی خصوصیات شہریوں میں ہوتی ہیں گاؤں والے عموماً ان سے محروم ہیں اس لئے وہ سیدھے سادے کہلاتے ہیں۔ بہرکیف ہندوستان کی بیشتر آبادی جو

دیہاتوں میں آباد ہے اس کی وجہ سے ہندوستان ان ممالک کا
مقابلہ نہیں کر سکتا جن کی شہری آبادی زیادہ ہے۔ ہندوستان
کو دوسرے ممالک کے برابر لانے کے لئے ضروری ہے کہ دیہاتوں
کو شہروں میں تبدیل کیا جائے یہ مقصد محض صنعت و حرفت اور
تجارت وغیرہ کو ترقی دینے ہی سے حاصل ہو سکتا ہے۔ تہذیب
و تمدن چونکہ شہروں ہی میں ترقی پاتا ہے اِس لئے ہمیں اپنے شہروں
کی آبادی بڑھانے میں بڑی احتیاط سے کام لینا چاہیئے ورنہ
اندیشہ ہے کہ بمبئی اور کلکتہ کی طرح کے شہر اپنے باشندوں کے
لئے چند در چند خطرات کا موجب بن جائینگے۔ اگر ہر صوبے میں ان
شہروں کو ترقی دی جائے جن میں صنعت و حرفت اور تجارت کو
ترقی دینے کے لئے آسانیاں موجود ہیں تو اس سے فائدہ یہ
ہوگا کہ آبادی ایک ہی شہر میں نہیں بڑھیگی، بلکہ سارے مُلک
کو ترقی کا موقعہ ملیگا +

(۴) زن و مرد | آبادی کو زن و مرد کے لحاظ سے تقسیم کرنے سے
معلوم ہوتا ہے کہ بڑے بڑے چند گھرانوں کی عورتوں کو چھوڑ کر
عام گھروں کی عورتیں کچھ نہ کچھ مزدوری ضرور کرتی ہیں اس لئے
ان کی کارکردگی کا اُجرت پر بھی کافی اثر پڑتا ہے ۱۹۲۱ء کے
اعداد و شمار کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت ہزار مردوں کے
مقابلہ میں ۹۴۵ عورتیں تھیں، ان اعداد و شمار کا دوسرا

ملکوں کے ساتھ مقابلہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ یہاں لڑکیاں زیادہ تعداد میں پیدا ہوتی ہیں۔ لیکن دس سال کی عمر کے بعد ان کی تعداد کم ہونی شروع ہوتی ہے۔ اور سن بلوغت کو پہنچنے تک بہت ہی کم رہ جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ بتلائی جاتی ہے کہ ہندوستان کا ماحول لڑکیوں کے لئے دوسرے ممالک کی نسبت ناموافق ہے۔ قدیم زمانے میں تو لڑکیوں کا گلا پیدا ہوتے ہی گھونٹ دیا جاتا تھا کہ خسر بننے کی شرمندگی نہ اُٹھانی پڑے۔ اگرچہ اب یہ بات نہیں رہی لیکن پھر بھی پردے کی غیر معمولی پابندیاں اور دیگر مُلکی رسمیں ان کی صحت خراب کر کے بہت جلد ان کو موت کے گھاٹ اُتارتی ہیں، بلوغت سے پہلے شادی کرنے کی قدیمی رسم اور زچگی کے بیوقت تجربے سے بہت زیادہ جانیں ضایع ہوتی ہیں۔ حفظانِ صحت کے اصولوں سے ناواقف ہونے کی وجہ سے بڑی بڑی خطرناک اور مُہلک بیماریاں لگ جاتی ہیں۔ نسوانی آبادی کا تاریک ترین پہلو یہ ہے کہ عام طور پر عورتیں اپنی جان کو عزیز نہیں رکھتیں اور مرد بھی عورت کی چنداں پروا نہیں کرتے مفلوک الحالی اور لاعلمی کی وجہ سے زچگی سے پہلے اور بعد پُوری طرح آرام نہیں کیا جاتا عام طور پر دائیاں اپنے فن سے کماحقہٗ واقف نہیں ہوتیں اس لئے ان کی بے احتیاطیوں سے زچاؤں کو سخت نقصان پہنچتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیشہ عورتوں کی تعداد

مردوں سے کم رہتی ہے۔

اس سلسلے میں یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ عام طور پر بڑے بڑے شہروں میں مردوں کی آبادی عورتوں سے زیادہ ہوتی ہے۔ اس کی حقیقی وجہ یہ ہے کہ بڑے بڑے شہروں میں جو لوگ مضافات سے محنت مزدوری کرنے کے لئے آتے ہیں وہ اپنی عورتوں کو ساتھ نہیں لاتے، کیونکہ عورتوں کو اکثر مزدوری نہیں ملتی، اس لئے وہ دیہاتوں ہی میں رہتی ہیں۔ اور محنت مزدوری کر کے اپنا پیٹ پالتی ہیں۔ اس غیر متناسب نسبت کا شہر کی اخلاقی حالت پر جو کچھ اثر پڑتا ہے اس پر روشنی ڈالنے کی ضرورت نہیں۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس کا باعث پردہ کا رواج ہے حقیقتاً پردہ کی وجہ سے جو عورتیں گھروں سے باہر نہیں نکلتیں ان کی تعداد بہت ہی کم ہے۔ کہا جاتا ہے۔ کہ اگر عورتیں محنت مزدوری نہ کریں تو مرد زیادہ کما سکتے ہیں۔ افسوس کہ ہمارے ملک کی مالی حالت ایسی نہیں کہ عورتیں بیکار رہیں اگرچہ مرد کی بلند ذہنیت کا تقاضا یہی ہے کہ عورتیں گھروں میں آرام کریں، اور محض خانہ داری کی خدمات انجام دیں لیکن قلیل آمدنی کی وجہ سے سب کچھ گوارا کیا جاتا ہے۔

(۵) عمر | ہمارے ملک کی آبادی کو اگر عمر کے لحاظ سے تقسیم کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ دس سال سے کم عمر کے بچے اور

بڑی عمر کے آدمیوں کی نسبت زیادہ تعداد میں محنت مزدوری کرتے ہیں۔ لطف یہ ہے کہ جوں جوں عمریں بڑھتی جاتی ہیں محنت کرنے والے افراد کی تعداد میں کمی ہوتی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ لوگ جو ستر سال سے زیادہ عمر پاتے ہیں ان کی تعداد ہزار پیچھے ۷ ارہ جاتی ہے۔ اگر ہم اس لحاظ سے ہندوستان کا دوسرے ممالک سے مقابلہ کریں تو بہت ہی افسوسناک نتائج برآمد ہوتے ہیں، ہندوستان میں مدت عمر اسقدر کم ہے کہ ۵۰ سال کی عمر کو پہنچتے تک بیشتر لوگ راہئ ملک عدم ہوجاتے ہیں۔ اس تحقیق کا سب سے زیادہ بھیانک پہلو یہ ہے کہ ہمارے ملک کے محنت کش بچے دس اور بیس سال کی عمر میں تقریباً نصف کے قریب مر جاتے ہیں۔ انگلستان میں عام طور پر بچوں کو پندرہ سال کے بعد کام میں لگایا جاتا ہے اور وہ تقریباً ۶۵ سال تک محنت مزدوری کرتے رہتے ہیں لیکن ہندوستان کی حالت یہ ہے کہ بہت چھوٹی عمر میں بچے محنت مزدوری کرنی شروع کر دیتے ہیں۔ بری خوراک اور بیوقت کی محنت سے اول تو وہ دیر تک زندہ ہی نہیں رہتے اگر بچ جاتے ہیں تو ان سے بڑی عمر میں کام کاج نہیں ہو سکتا، ہندوستان میں ۱۰ سال سے لے کر ۴۰ سال تک محنت مزدوری کی قابلیت رہتی ہے۔ اعداد و شمار سے معلوم ہوتا ہے کہ ہماری محنت کرنے والی آبادی

چالیس فیصدی سے زیادہ نہیں ہوتی، لیکن انگلستان اور فرانس میں تقریباً ساٹھ فیصدی لوگ اس گروہ میں شامل ہیں۔ اگر عوام کی صحت کی حفاظت کی جائے تو بہت سی جانیں بیوقت ضایع ہونے سے بچ جائیں اور اس طرح سے خود بخود محنت کرنیوالے گروہ کی تعداد میں اضافہ ہو جائے "۔

یہاں یہ بھی بتا دینا ضروری ہے کہ عموماً "تقسیم اعمار" میں تبدیلیاں بھی واقعہ ہوتی رہتی ہیں کبھی قدرتی طور پر شرح اموات و پیدایش میں تبدیلی ہو جاتی ہے۔ کبھی جنگیں اور فسادات۔ قحط سالی اور وبائیں وغیرہ اموات کی تعداد میں غیر معمولی اضافہ کر دیتی ہیں۔ ان سب ناگہانی بلاؤں کا اثر مختلف عمر کے لوگوں کی زندگیوں پر مختلف پڑتا ہے مثلاً جنگ میں نوجوان زیادہ مارے جاتے ہیں قحط اور وبا سے بھی مختلف گروہوں کو کم و بیش نقصان پہنچتا ہے۔ قحط میں جوانوں سے زیادہ بچے مرتے ہیں۔ وبائیں جوانوں کا زیادہ شکار کرتی ہیں اور نوجوانوں کی اموات ہی سے آبادی کو سخت نقصان پہنچتا ہے کیونکہ ایک طرف آبادی کم ہوتی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ رفتار پیدایش سست ہو جاتی ہے۔

ہندوستان میں جب ۱۹۱۸ء میں انفلوانزا نے وبا کی صورت اختیار کی تو نوجوان طبقے کو سخت نقصان پہنچا۔ نوجوانوں کی کمی سے آبادی کی رفتار سست پڑ گئی اور اس کے ساتھ ہی محنت

کرنے والے گروہ میں بھی معتد بہ کمی واقع ہوئی ٭

(۵) پیدائش و اموات | مفکرین کا خیال ہے کہ ہندوستان کی آبادی کا صحیح اندازہ محض پیدائش و اموات کے اعداد و شمار ہی سے ہو سکتا ہے - بیرونی ممالک میں انتقال مکانی کا بھی آبادی پر اثر پڑتا ہے لیکن ہندوستان کے باشندے زمین جنبد نہ جنبد گل محمد کے مصداق ہیں، پیدائش و اموات کے لحاظ سے ہندوستان اطراف عالم میں سب سے بلند درجہ رکھتا ہے - آبادی گھٹانے کے دیگر ارکان یہاں مفقود ہیں ۱۹۱۱ء کے گوشوارے سے پتہ چلتا ہے کہ اوسطاً یہاں ہر صوبے میں ہزار پیچھے ۴۲ افراد کا اضافہ اور ۳۹ افراد کی کمی ہوئی ہے برخلاف اس کے انگلستان میں فی ہزار ۲۱ کی پیدائش اور ۱۹ کی اموات وقوع میں آئیں اور ۱۹۲۶ء میں یہ تعداد کم ہوتے ہوتے بتدریج ۱۵ اور ۱۲ ہو گئی - اسی سال ہندوستان میں بھی کسی قدر کمی واقعہ ہوئی اور پیدائش و اموات کی تعداد ۳۵ اور ۲۷ تک آ گئی ٭

قاعدے کی بات ہے جن ممالک میں پیدائش افراد زیادہ ہوتی ہے وہاں اموات بھی زیادہ ہوتی ہیں چونکہ ہمارے ملک کا نمبر پیدائش کے لحاظ سے سب سے اونچا ہے اس لئے یہاں اموات کا درجہ بھی بلند ہے - ہندوستان میں اموات کی کثرت کا اصل سبب مفلوک الحالی ہے - پوری خوراک نہ ملنے سے

امراض کا مقابلہ نہیں ہو سکتا، اس لئے وبائی امراض مثلاً ملیریا ہیضہ۔ پلیگ۔ چیچک اور انفلوانزا وغیرہ سے لکھو کھا جانیں تلف ہو جاتی ہیں۔ قوت مدافعہ نہ ہونے کے سبب سے کمزور انسان طویل العمر نہیں ہو سکتے، وبائی امراض ہر ملک میں ہوتے ہیں لیکن جہاں حفظان صحت کی اچھی طرح نگہداشت کی جاتی ہے وہاں نقصانات بہت کم ہوا کرتے ہیں۔ چنانچہ یورپین ممالک میں وبائی امراض سے بہت کم جانیں تلف ہوتی ہیں عمر طبعی سے پہلے مر جانے سے ہمارے ملک کو ناقابل تلافی نقصان پہنچ رہا ہے۔ وہ لوگ جو مسلسل محنت اور لاتعداد روپیہ صرف کر کے زندگی کے مختلف شعبوں میں تجربہ حاصل کرتے ہیں عین اس وقت داعی اجل کو لبیک کہتے ہیں جب ان کی قابلیت اور تجربے سے ملک کو حقیقی فایدہ پہنچنے کا وقت آتا ہے۔

ہندوستان کی شرح اموات میں کمسن بچوں اور نوجوان مستورات کی اموات نمایاں نظر آتی ہیں۔ $\frac{1}{5}$ نوزائیدگان تقریباً ایک سال کے اندر ہی اندر مر جاتے ہیں۔ افسوس کہ اموات کے میزان کا $\frac{1}{5}$ حصہ بچے ہی پورا کرتے ہیں۔ لطف یہ ہے کہ بڑے بڑے شہروں میں بچوں کی اموات زیادہ ہوتی ہیں۔ اگرچہ وہاں حفظان صحت کے نام نہاد محکمے بھی موجود ہوتے ہیں۔ بمبئی میں فی ہزار ۶۵۵ بچے مرتے ہیں لیکن لندن میں ہزار پیچھے محض ۶۰ کی اوسط ہے۔

باوجود انتہائی چیخ پکار اور انسداد کے اس ملکی نقصان میں کمی نہیں ہوئی، لیکن تعجب کی بات ہے کہ یورپ کے ممالک میں دن بدن شرح اموات میں معتد بہ کمی واقع ہو رہی ہے۔ تحقیقات کے مطابق اس کے عام وجوہ یہ ہیں کہ یہاں بیاہ شادیاں سن بلوغت تک پہنچنے سے پہلے کر دینے کا رواج ہے اس سے صحت خراب ہو جاتی ہے۔ اور تندرست بچے پیدا نہیں ہو سکتے اگرچہ اب قانون بھی بنا دیا گیا ہے لیکن اس سے کوئی خاص فایدہ نہیں ہو سکا۔ بعض غیر تعلیم یافتہ عورتیں اپنے بچوں کو افیون وغیرہ کھلانے کی عادت ڈال دیتی ہیں کہ خود آسانی سے کام کاج کر سکیں مفلسی کی وجہ سے زچہ کی حفاظت بہت کم ہوتی ہے اس لئے بیشتر زچاؤں کی جان زچہ گیری کے زمانے ہی میں ضائع ہو جاتی ہیں پھر کمزور ماؤں کا دودھ بچوں کی صحت خراب کر دیتا ہے۔ شہروں میں خالص دودھ اور عمدہ خوراک میسر نہیں آتی اس لئے بچہ اور زچہ دونو کمزور ہوتے ہیں۔ اور عمر طبعی سے پہلے اپنی جان شیریں جان آفرین کے سپرد کر دیتے ہیں ٭

آبادی کا ازدیاد اگر ہم ہندوستان کے گزشتہ پچاس سال کی آبادی کا جایزہ لیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس عرصے میں یہاں آبادی میں کوئی خاص اضافہ نہیں ہوا اس کی وجہ یہ ہے شرح اموات و پیدائش تقریباً برابر رہی ہے۔ برخلاف اس کے

یورپ کی آبادی نے اس زمانے میں بہت ترقی کی اگرچہ وہاں شرح پیدائش زیادہ نہیں لیکن تعداد اموات بھی اس کے مقابلے میں بہت کم ہے۔ ۱۸۷۲ء اور ۱۹۲۱ء کے درمیان ہندوستان کی آبادی محض ۲۰ فیصدی بڑھی، ۱۹۱۸ء میں انفلوئنزا پھیلا اور بارشوں کی قلت سے فصلیں تباہ ہوئیں۔ اس کے علاوہ جنگ عظیم سے ہندوستان کی نوجوان آبادی کو سخت نقصان پہنچا۔ ۱۹۲۱ء اور ۱۹۳۱ء کے درمیان اگرچہ کوئی مصیبت نازل نہیں ہوئی لیکن پھر بھی ہماری آبادی میں محض ½۱۰ فیصدی اضافہ ہوا ؎

عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ دن بدن دنیا کی آبادی بہت سرعت سے بڑھ رہی ہے لیکن اس بات کا تاریخی کتب سے ثبوت نہیں ملتا۔ اطراف عالم میں جس قدر آبادی بڑھی ہے وہ محض موجودہ دور کا کارنامہ ہے۔ گزشتہ صدی میں دُنیا کی آبادی ۹۱۰۰ ہزار لاکھ سے ۱۸۵۱۰ ہزار لاکھ ہوئی ہے۔ اس کے اسباب یہ بتائے جاتے ہیں کہ اُنیسویں اور بیسویں صدی میں سائنس کی ترقی سے صنعت وحرفت تجارت اور زراعت کو عروج حاصل ہو کر دُنیا کی مالی حالت بہتر ہوئی اس لئے آبادی بھی زیادہ سے زیادہ بڑھی، آجکل ماہرین معاشیات اور سیاست دانوں کے دماغ اس مسئلے کی طرف متوجہ ہیں کہ آیا آبادی کی موجودہ تیز رفتاری موجودہ خوشحالی کے معیار کو قائم رکھ سکے گی یا نہیں، یا یہ کہ ترقی کا

دور گزر چکا ہے اور اب ہمیں آبادی کو بڑھنے سے روکنا چاہیئے تاکہ دوبارہ معیار زندگی پست نہ ہو جائے۔ بیشتر مفکرین اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ مزید ترقی کے امکانات نہیں ہیں اگر اور زیادہ آبادی بڑھی تو موجودہ معیار زندگی پست ہو کر بہت جلد خوشحالی کا دور خواب و خیال ہو جائیگا۔

ہندوستان میں بھی یہی مسئلہ درپیش ہے۔ اور خیال یہ ہے کہ آبادی کی ترقی ملک کی مفلوک الحالی کا باعث ہو رہی ہے۔ لیکن مخالف جماعت اسکی تردید کرتے ہوئے آبادی کے ازدیاد کا احساس مفلسی کا باعث خیال کرتی ہے۔

پیشتر اس کے کہ ہندوستانی آبادی کے ازدیاد پر بحث کی جائے ضروری ہے کہ ہم "ازدیاد آبادی" کے صحیح معنی کو واضح کردیں تاکہ ملک کی اصلی حالت آئینہ ہو جائے۔ کثرت آبادی کا ماہرین نے یہ نظریہ پیش کیا ہے۔

جب کسی مخصوص زمانے میں محنت کا صلہ محنت کرنے والوں کی تعداد کے کم اور زیادہ ہونے سے اثر پذیر ہونے لگے تو سمجھنا چاہیئے کہ تکثیر حاصل کا وقت آگیا۔ جس طرح ہر ایک صنعت میں تکثیر حاصل کا درجہ مقرر ہوتا ہے اس طرح دوسری صنعتوں میں بھی یہ درجہ معین ہے۔ اگر آبادی اس قدر کم ہو کہ تمام صنعتوں کو اس درجے تک نہ لا سکے تو آمدنی کم ہو گی اس کا

علاج یہ ہے کہ آبادی بڑھائی جائے برخلاف اس کے اگر آبادی اس قدر زیادہ ہو کہ اس درجہ سے آگے گزر جائے تو اس حالت میں بھی آمدنی کم ہوگی۔ اور اس کا علاج یہ ہے کہ آبادی کو کم کیا جائے۔ گویا ازدیاد آبادی کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنی مقررہ معاشی معیار سے آگے بڑھ جائے ۔

اگر آبادی زیادہ بڑھتی ہے تو محنت کرنے والوں کی تعداد بھی بڑھ جاتی ہے ان کے بڑھنے سے ملک کی دولت میں بھی اضافہ ہونا چاہیئے۔ اگر ضرورت سے زیادہ ان کی تعداد ہو جائے تو آمدنی میں کمی ہو جاتی ہے۔ گویا پیداوار دولت اور ان لوگوں میں ایک خاص مقررہ نسبت قائم رہنی چاہیئے۔ جن میں دولت تقسیم ہوتی ہے۔ اگر یہ لوگ کم ہونگے تو ان کو زیادہ حصہ ملیگا اور اگر زیادہ ہونگے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تو ان کا حصہ کم ہو جائیگا۔ چنانچہ جب آبادی بڑھتی ہے اور اس کے ساتھ دولت نہیں بڑھتی تو یہی صورت پیدا ہو جاتی ہے بس یہی پہچان آبادی کے بڑھنے اور کم ہونے کی ہے ۔

اگر انسانوں کو آزاد چھوڑ دیا جائے اور کسی قسم کی رکاوٹیں ان کے راستے میں حائل نہ ہوں تو ملک کی آبادی چند سال میں تگنی چوگنی ہو جانی معمولی سی بات ہے۔ اندریں حالات اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ہم جس قدر بھی مالی ترقی کر جائیں وہ

طبعی آبادی کو سنبھالنے کے لئے بالکل ناکافی ہے۔ اس حقیقت سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ جس ملک میں بغیر کسی رکاوٹ کے آبادی بڑھنے کا رواج ہو وہاں آبادی یقیناً ضرورت سے زیادہ ہوگی، اس کے علاوہ شرح اموات و پیدائش کی کثرت بھی اس بات کی دلیل ہے کہ آبادی کی کثرت ہے۔ اور وہ لوگ قدرتی طور پر فنا ہوتے جاتے ہیں جن کے بوجھ کو زمین اٹھانے کے قابل نہیں۔

اس نظریئے کی روشنی میں اب ہم ہندوستان کی حالت کا جائزہ لیتے ہیں۔ سب سے پہلے ہمیں یہ دیکھنا چاہئے کہ ہندوستان میں آبادی کو روکنے کے لئے کچھ انسدادی تدابیر بھی اختیار کی گئی ہیں یا نہیں۔ اگر ہم اس نتیجے پر پہنچیں کہ ہمارے ملک میں انسدادی تدابیر بہت ہی کم عمل میں آتی ہیں اور آبادی کی روک تھام قدرتی طور پر ہوتی رہتی ہے تو اس سے خود بخود ثابت ہو جاتا ہے کہ ہندوستان میں آبادی ضرورت سے زیادہ بڑھ رہی ہے۔

آبادی کی روک تھام دو طریقوں سے ہوتی ہے اول قدرتی طور پر یعنی وبائیں جنگیں فسادات اور حادثات سے آبادی کم ہو جاتی ہے لیکن جن ملکوں میں حفظان صحت کا اچھا انتظام ہے وہاں وباؤں سے کوئی خاص نقصان نہیں پہنچتا آخر کار مجبور ہو کر خود اختیاری طریقوں سے آبادی کو سست رفتار بنانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ مثلاً عام طور پر شادی بیاہ بہت ہی کم ہونے لگتے ہیں کیونکہ

لوگ بچوں کو پالنے اور بیوی کے اخراجات برداشت کرنے کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ اس لئے یا تو شادی نہیں کرتے اور اگر کرتے ہیں تو اس وقت جب وہ تمام اخراجات کے کفیل ہو سکتے ہیں کوشش کی جاتی ہے کہ اولاد پیدا نہ ہو یا ایک بچے اور دوسرے بچے کی پیدائش میں کافی وقفہ ہو، اکثر کئی سال تک بچوں کو دودھ پلانے کی وجہ سے دوسری اولاد دیر میں ہوتی ہے (۳) بعض ناعاقبت اندیش لوگ اپنے بچے قبل از وقت یا پیدائش کے بعد ضایع کر دیتے ہیں۔ مفلسی بذات خود اولاد پیدا کرنے میں زبردست رکاوٹ بن جاتی ہے ٭

اور ممالک کی نسبت ہمارے ملک کے دستور اور رسم و رواج کچھ نرالے ہی ہیں۔ مغربی ممالک میں شادی بیاہ کو مذہبی حیثیت سے کوئی خاص وقعت نہیں دی جاتی لیکن اسلام میں رہبانیت گناہ خیال کی جاتی ہے۔ اس لئے مسلمانوں میں شادی کرنے کی رسم کو مذہبی اہمیت حاصل ہے۔ ہندو بھی شادی کرنا اس لئے ضروری سمجھتے ہیں کہ ماتمی رسم بیٹا ادا کرے تاکہ روح کو ابدی چین نصیب ہو۔ اس کے علاوہ بعض مذموم رسموں کے ماتحت سن بلوغت کو پہنچنے سے قبل شادی کر دی جاتی ہے۔ والدین اپنے ہاتھ سے شادی کرنے میں خوشی محسوس کرتے ہیں اس لئے اُس وقت کا انتظار نہیں کرتے کہ اولاد اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے قابل ہو جائے۔

چونکہ عورتیں خانہ داری کی خدمات انجام دیتی ہیں اس لئے شادی کرنے میں تامل نہیں کیا جاتا۔ عام طور پر عورتیں محنت مزدوری بھی کرتی ہیں اِس لئے خیال کیا جاتا ہے کہ شادی کرنے سے اخراجات نہیں بڑھیں گے۔ اسی طرح بچّوں کو بھی بہت تھوڑی عمر میں کسی نہ کسی کام پر لگا دیا جاتا ہے۔ چونکہ ہندوستان میں معیار زندگی بہت ہی پست ہے اس لئے بچّے بغیر تعلیم حاصل کئے کوئی نہ کوئی معمولی سا کام کرنے لگتے ہیں۔ اس سے نقصان یہ ہے کہ وہ اپنے پیشے کی باقاعدہ تعلیم حاصل نہیں کر سکتے، اس طریق زندگی سے جو نقصان مُلک کو پہنچتا ہے وہ ظاہر ہے ۔

اب ذرا اعداد و شمار بھی دیکھئے ہمارے ملک میں مرد محض ۹۰ فی ہزار غیر شادی شدہ ہیں اور عورتیں ۳۶۰ فی ہزار، اور مُلکوں کے مقابلے میں یہ تعداد بہت ہی زیادہ ہے۔ اس کے علاوہ تمام ہندوستان میں تقریباً ہزار پیچھے آٹھ سو لڑکیوں کی شادی پندرہ سال کی عمر تک کر دی جاتی ہے۔ تعلیم یافتہ طبقے میں آجکل دیر میں شادیاں کرنے کا رواج ہو رہا ہے۔ اور حکومت نے کمسنی کی شادی کو روکنے کے لئے ایک قانون بھی بنا دیا ہے۔ اس لئے امید ہے کہ تھوڑے عرصے میں کمسنی کی شادیاں بالکل بند ہو جائینگی۔

ہندوستان کے مخصوص حالات کے پیش نظر، ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ہماری آبادی ضرورت سے زیادہ رفتار سے

بڑھ رہی ہے۔ اوّل تو خود اختیاری انسداد کی تدابیر اختیار ہی نہیں کی جاتیں۔ اور اگر ان کا کچھ اثر ہے بھی تو بہت ہی کم جس کو حساب وشمار میں نہیں لایا جا سکتا، یہاں یہ ظاہر کر دینا ضروری ہے کہ وہ لوگ جو آبادی بڑھانے کے معاملہ میں اپنی چادر سے باہر پاؤں پھیلاتے ہیں۔ آخرکار انہیں ایسے طریقے اختیار کرنے پڑتے ہیں جن کی اجازت اخلاق مذہب اور قانون ہرگز نہیں دیتا۔ امید کی جاتی ہے کہ سماج کی اصلاح اور تعلیم کی روشنی بہت جلد عوام کو بیدار کر دے گی۔ اور ہر شخص اُس وقت ازدواج کی طرف متوجہ ہوگا جب وہ اپنے آپ میں اس بارِ گراں کے اُٹھانے کی ہمت پائیگا۔ حالات سے ظاہر ہے کہ ہمارا مُلک ہر سال باقاعدہ ان لوگوں کی کثیر تعداد موت کی بھینٹ چڑھاتا ہے جو ضرورت سے قبل پیدا ہو جاتے ہیں۔ اس کا سبب بعض لوگ یہ بتائینگے کہ یہ حفظان صحت کے فقدان کا نتیجہ ہے۔ ہمیں اس حقیقت سے انکار نہیں۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ حفظان صحت کا فقدان کس وجہ سے ہے۔ اگر یہ مفلسی کا نتیجہ ہے تو مفلسی اس بات کی دلیل ہے کہ مُلک کی آبادی زیادہ اور آمدنی کم ہے اور یہی حقیقت امری ہے کہ ہندوستان کے نوّے فیصدی باشندے فقر و فاقہ کی زندگی بسر کر رہے ہیں ٭

پس جس وقت کسی مُلک میں نوزائیدگان کی تعداد اس قدر

بڑھ جائے کہ شخصی اور مُلکی آمدنی ان کی کفیل نہ ہو سکے تو اس وقت سمجھ لینا چاہیئے کہ ملک کی آبادی ضرورت سے زیادہ بڑھ رہی ہے۔ بعینہٖ یہی حالت ہندوستان کی ہے۔ یہاں شرح اموات و پیدائش دونو دُنیا کے تمام مُلکوں کی نسبت بہت زیادہ ہے۔ ضرورت ہے کہ ہم اپنے مُلک کی بہبودی کی طرف متوجہ ہوں اور اپنی چادر کو دیکھتے ہوئے اپنے پاؤں پھیلائیں ؛

مُلکی آمدنی کی تقسیم کسی مُلک کی مالی حالت کا اندازہ لگانے کے لئے ضروری ہے کہ اس کی تمام آمدنی کو ایک جگہ جمع کر کے تمام افراد پر تقسیم کر دیا جائے تاکہ معلوم ہو سکے ہر شخص کی اوسطاً آمدنی کیا ہے۔ ہندوستان کے متعلق اعداد و شمار آمدنی جمع کرنے کے بعد اندازہ کیا گیا ہے کہ ہر شخص کے حصے میں ۶۵ روپے سالانہ یعنی ساڑھے پانچ روپے ماہوار کے قریب آتے ہیں۔ اوّل تو اس اندازے میں فرق نہیں ہو سکتا اگر ہوگا تو بہت تھوڑا۔ اب خیال کیجئے کہ ہمارے مُلک میں کتنے افراد ہیں جن کی ماہوار آمدنی ساڑھے پانچ روپے سے بھی کم ہوگی۔ کھاتے پیتے گھروں کے ننچ کے نوکر بھی اس سے زیادہ کما لیتے ہیں۔ اور وہ لوگ جو امیر خیال کئے جاتے ہیں ان کی آمدنی سینکڑوں سے ہزاروں تک پہنچتی ہے، جس مُلک میں انفرادی اور مجموعی اوسط آمدنی کا یہ حال ہو تو یہ کونسی حیرت خیز بات ہے کہ اوسط آمدنی محض پانچ روپے ہو، ان حالات

سے صاف ظاہر ہے کہ ہمارے مُلک میں ایسے لوگ کثیر تعداد میں موجود ہیں جن کو کئی کئی وقت روٹی میسّر نہیں آتی، اگر ہم اپنے مُلک کی اس حالت کا یورپ کے ممالک سے مقابلہ کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ ہر یورپین کی اوسط آمدنی تیرہ سَو روپیہ سالانہ ہے ملاحظہ فرمائیے ہماری آمدنی میں اور ایک یورپین کی آمدنی میں کس قدر فرق ہے۔

اس مفلسی کا اثر ہم لوگوں کی عُمروں کو گھُن کی طرح کھا رہا ہے۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ ہر ہندوستانی کی اوسط عمر ۲۳ سال سے زیادہ نہیں، جو لوگ ۲۳ سے زیادہ زندہ رہتے ہیں وہ ان لوگوں کی عمروں سے فائدہ اُٹھاتے ہیں جو اوسط عمر تک پہنچنے سے پہلے مرجاتے ہیں۔ عمروں کے لحاظ سے بھی انگلستان کے باشندے ہم لوگوں سے بہت بڑھے ہوئے ہیں وہاں ہر انگریز کی اوسط عمر تقریباً ۵۵ سال ہوتی ہے۔

ان اعداد و شمار سے ظاہر ہوتا ہے کہ دوسرے ملکوں کے مقابلے میں ہمارے ملک کی آبادی کی کیا حالت ہے۔

اراضی کی تقسیم ہم بتا چکے ہیں کہ ہندوستان ایک زرعی مُلک ہے اور اس کی خوشحالی اور فارغ البالی کا انحصار کلیتاً زراعت پر ہے۔ اب ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ ہندوستان میں جس قدر آبادی ہے اس کے لئے ہماری قابل کاشت زمینیں کافی ہیں یا نہیں۔

گزشتہ مردم شماری کے مطابق ہندوستان میں فی مربع میل ۱۹۵ آبادی تھی۔ برطانوی ہندوستان کی کُل زمین کا جایزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ ۲۳ کروڑ ۲۰ لاکھ ایکڑ رقبہ میں کاشتکاری ہوتی ہے ۴ کروڑ ۷۰ لاکھ ایکڑ رقبہ بنجر پڑا ہے۔ اس کے علاوہ ۱۶ کروڑ ۴۰ لاکھ ایکڑ مزید رقبہ قابل زراعت ہے لیکن اسے کام میں نہیں لایا جاتا۔ نیز ۱۴ کروڑ ۵۰ لاکھ ایکڑ زمین ناقابل حصول ہے اور ۴ کروڑ ۹۰ لاکھ ایکڑ میں جنگلات ہیں، اس تقسیم اور شمار کو دیکھتے ہوئے اندازہ کیا گیا ہے کہ ہندوستان کی قابل کاشت زمین ابھی مزید آبادی کے لئے خوراک بہم پہنچا سکتی ہے ۔

اگر ان زمینوں کو تمام آبادی میں تقسیم کردیا جائے تو ۱۰۷۵ ایکڑ زمین ہر شخص کے حصے میں آتی ہے۔ لیکن اگر ان زمینوں کو نکال دیا جائے جو بنجر پڑی ہیں یا جن میں زراعت نہیں ہوسکتی یا زراعت کے علاوہ کسی دوسرے کام میں آتی ہیں تو برطانوی ہندوستان میں ہر آدمی کو تین چوتھائی ایکڑ زمین بمشکل مل سکتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اتنی زمین ایک آدمی کے سال بھر کے گزارے کے لئے کبھی کافی نہیں ہوسکتی ۔

سنہ ۱۹۳۳-۳۴ء میں کُل بیس کروڑ ۶۵ لاکھ ایکڑ زمین میں کھانے پینے کی فصلیں بوئی گئی تھیں یا دوسرے الفاظ میں برطانوی

ہندوستان کے کُل ایک تہائی حصہ میں زراعت ہوتی تھی۔

ان اندازوں سے ماہرین اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ ہندوستان کی زراعت ہندوستان کے لئے کافی ہے لیکن حالات بتا رہے ہیں کہ بیشتر آبادی فاقہ کشی سے بیحال ہے اور آبادی کا ازدیاد مزید بےچینی اور نقصان کا باعث ہو رہا ہے۔

ضبط تولید موجودہ ترقی کے دور میں آبادی کو روکنے کا کام ضبط تولید سے لیا جاتا ہے۔ اگرچہ تمام متمدن اقوام ضبط تولید پر عامل ہیں لیکن ہمارے ملک میں اس کو بہت ہی بُرا خیال کیا جاتا ہے۔ چنانچہ آج سے دس سال پہلے ایک شخص نے ضبط تولید کا پرچار کرنے کی بدولت کافی نقصان اُٹھایا۔ اس پر مقدمہ چلایا گیا۔ اور ہر طرف سے لعنت ملامت کی پھٹکار بھی پڑی، لیکن امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ عوام اس مفید تحریک کی اہمیت کو سمجھتے جاتے ہیں۔ بلکہ بڑے بڑے شہروں میں حکومت کی طرف سے ضبط تولید کے ادارے قائم کر دیئے گئے ہیں۔ جہاں ضبط تولید کا باقاعدہ پرچار کیا جاتا ہے اور اکثر ضرورتمند لوگ ان سے فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ ضرورت ہے کہ ان اداروں کا فائدہ عوام تک پہنچانے کی زیادہ سے زیادہ کوشش کی جائے۔

ضبط تولید کی مخالفت کرنے کی زیادہ تر وجہ یہ ہے کہ ہمارے ملک میں ہر تحریک مذہب کی پُشت پناہی سے کامیاب ہوتی

ہے، سوء اتفاق سے مذہب ضبط تولید کے خلاف ہے مسلمانوں کے دلوں میں یہ عقیدہ راسخ ہے کہ جو شخص پیدا ہوتا ہے وہ اپنا رزق ساتھ لاتا ہے۔ غالباً اسی وجہ سے مسلمانوں میں مفلسی زیادہ ہے۔ دوسرے رہبانیت مسلمانوں میں گناہ ہے۔ ہندوؤں میں بھی اسی قسم کے عقاید ہیں۔ اس لئے کوئی شخص بھی ضبط تولید کو اچھا نہیں سمجھتا۔ لیکن جب اولاد کی کثرت ہوتی ہے تو ہر شخص گھبراتا ہے۔ ایک شخص کو میں نے بچشم خود آنسوؤں سے روتا ہؤا دیکھا کہ ان کے ہاں غیر ضروری مہمان نازل ہونے والا تھا اور وہ اس کا بوجھ اُٹھانے کے قطعی ناقابل تھے، لیکن اگر کچھ تسلی تھی تو یہی کہ خدا رزاق ہے، بات یہ ہے کہ ہر شخص کو اتنا ہی بوجھ اُٹھانا چاہیئے جو وہ آسانی سے اُٹھا سکتا ہے۔ اور اسے اتنے پاؤں نہیں پھیلانے چاہئیں کہ فاقہ کشی کی نوبت آجائے اور اس کے مرنے کے بعد چند گداگر باقی رہ جائیں جو در بدر مارے مارے پھریں۔

یہاں یہ بتلا دینا بھی ضروری ہے کہ ضبط تولید کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ کثرت اولاد وغیرہ سے بچنے کے لئے اگلے زمانے میں بھی بعض طریقے مطبوع خاص وعام رہے ہیں۔ لیکن وہ ایسے وحشیانہ طریقے تھے کہ مذہب قانون اور اخلاق ہرگز ان کی اجازت نہیں دیتا۔ آجکل کے زمانے میں بھی کوئی بیوقوف سے بیوقوف

شخص ان پرانے وحشیانہ ذرائع کو اختیار کرنے کا مشورہ نہیں دے سکتا۔ اگر کوئی شخص وہ غیر مہذب طریقے آجکل استعمال کرتا ہے تو قانون کی گرفت اور قدرتی انتقام سے کسی طرح محفوظ نہیں رہ سکتا ۔

ضبط تولید کے متعلق مدتوں بحث مباحثے جاری رہے ہیں۔ جو لوگ اس کے حامی ہیں وہ اس کے فائدوں پر نظر رکھتے ہیں اور نقصانات کو یہ کہتے ہوئے نظرانداز کرتے ہیں کہ ہر چیز کے دو پہلو ہیں۔ عقل کا تقاضا یہ ہے کہ برائیوں کو ترک کرے اور خوبیوں سے فایدہ اٹھائے۔ ضبط تولید کے حامی یورپ کی خوشحالی، شرح اموات میں کمی، اور طویل العمری وغیرہ کو ضبط تولید ہی کا نتیجہ تصور کرتے ہیں۔ مخالفین کی یہ رائے ہے کہ ضبط تولید سے بد خلاقی بڑھ جائیگی۔ دوسرے انسان فطرت کے راستے میں روڑے اٹکا کر گناہ کا موجب ہوگا۔ موافقین اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ وہ عفت جو کسی خوف کی وجہ سے قائم ہو اس کا اخلاقی حیثیت سے ہونا یا نہ ہونا برابر ہے۔ نیز بعض لوگ محض اس وجہ سے شادی نہیں کرتے کہ وہ اولاد کا بوجھ نہیں اٹھا سکتے اگر ان کو ضبط تولید کے اصولوں سے واقفیت ہوگی تو شادی سے پرہیز نہیں کرینگے۔ اس طرح سے اخلاقی خرابیوں کے امکانات اور بھی کم ہو جائیں گے دوسرے پرانے زمانے کے ضبط تولید کے غیر مہذب طریقے عمومیت

حاصل نہیں کرینگے۔ اس کے علاوہ کوئی مذہب حزم و احتیاط کے خلاف نہیں اور نہ ہو سکتا ہے۔ ایک گروہ یہ اعتراض کرتا ہے کہ ضبط تولید سے مفلس لوگ فایدہ نہیں اٹھا سکتے جن کو حقیقتاً اس کی ضرورت ہے، اس لئے وہ دوسرے وحشیانہ طریقے اختیار کرتے ہیں۔ آبادی کا یہ پہلو اور بھی زیادہ اندوہناک ہے لیکن دیکھنا یہ ہے کہ جس قدر سرمایہ ایک بچے کے پالنے پر صرف ہوتا ہے کیا ضبط تولید میں اس سے بھی زیادہ صرف ہو جاتا ہے "

ضبط تولید کے متعلق یہ کہنا کہ ہر طبقے کے لوگوں کو اس سے فایدہ اٹھانا چاہیئے بڑی سخت غلطی ہے۔ اس سے انہی لوگوں کو استفادہ کرنا چاہیئے جنہیں حقیقتاً اس کی ضرورت ہے۔ ضرورت کے موقع پر حزم و احتیاط اخلاقی اور مذہبی نقطہ نظر سے کبھی مذموم نہیں ہو سکتا۔ مثلاً وہ عورتیں یا مرد جو متعدی اور دیگر خطرناک امراض میں مبتلا ہوں جن سے آیندہ نسلوں کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے اگر ضبط تولید سے مدد لیں تو ان کو کون مطعون کر سکتا ہے۔ یا وہ عورتیں جو کسی وجہ سے زچگی کا بار نہیں اٹھا سکتیں نیز وہ مرد اور عورتیں جو اتنی روزی پیدا نہیں کر سکتے کہ اپنے بال بچوں کو اچھی طرح پال پوس سکیں ان کے لئے ضبط تولید غیر مترقبہ نعمت ہے "

یہ تمام احتیاطیں اس لئے ہیں کہ غیر ضروری افراد کا اضافہ نہ ہو اور انسانی زندگی کی خوشحالی کا معیار بلند ہو بہت ممکن ہے کہ ہمارے

سائنس دانوں کے خوش آیند خوابوں کی تعبیریں سچّی ہوجائیں اور وہی زمین جو آجکل سائنس کے لئے تنگ معلوم ہوتی ہے مزید آبادی کے لئے وسیع ہوجائے لیکن موجودہ حالات کو نظر انداز کر کے آیندہ پر تکیہ کرنا کبھی عقلمندی میں شمار نہیں ہو سکتا، شاید آیندہ نسلیں ہمارے اس حزم واحتیاط پر ہنسیں اور ہمیں بیوقوف کہیں لیکن اگر وہ ہمارے ماحول میں ہوتیں تو ضرور رحم سے ہمدردی رکھتیں اور ہماری تائید کرتیں۔ کہ بڑھتی ہوئی آبادی ایک خوفناک طوفان ہے جو خوشحالی کے اسباب کو اپنے ساتھ بہالے جائیگا۔ اور صدیوں تک قوموں کو دوبارہ اُبھرنے اور ترقی کرنے کا موقعہ نہ دیگا ؞

"ہندو مسلم فساد"

فساد کی جڑ

قدرت نے انسان کو مختلف قسم کی قوّتیں عطا کی ہیں۔ ان میں سے ایک کا نام قوّت غضبی ہے۔ جب انسان کو کسی خواہش کے پُورا کرنے سے روکا جائے تو یہ قوّت اس وقت جوش میں آتی ہے اور بام مراد تک پہنچنے میں جو چیزیں، سدِّ راہ ہوتی ہیں ان کو دُور کرنے کی کوشش کرواتی ہے۔ اس قوّت میں خوبی یہ ہے کہ نقصان پہنچنے سے پہلے اس کے اسباب کو دُور کرتی ہے۔ اگر سُوءِ اتفاق سے کوئی نقصان پہنچ جائے تو غضب کی آگ بھڑک اُٹھتی ہے۔ اور وہ اس وقت تک ٹھنڈی نہیں ہوتی جب تک انتقام نہ لیا جائے۔ عام طور پر جوشِ انتقام اس قدر شدید ہوتا ہے کہ انسان مذہب۔ رشتہ داری، قانون اور خوفِ خدا غرض سب کچھ بھول جاتا ہے ؎

اس بحث سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ قوّتِ غضب نہایت بُری قوّت ہے۔ قوّتِ غضب میں جہاں بُرائیاں ہیں وہاں اچھّائیاں بھی ہیں۔ اگر کسی میں قوّتِ غضبی نہ رہے تو طبیعت کے ولولے اور امنگیں مٹ جائیں، اور انسان کا ترقی کرنا ناممکن ہو جائے

اس قوت کا فقدان انسان کو بے غیرت، بے حیا اور پست ہمت بنا دیتا ہے۔ اس لئے اس قوت کی تربیت میں بہت احتیاط سے کام لیتے ہوئے اسے حدِ اعتدال سے آگے پیچھے ہٹنے نہ دینا چاہیئے +

آج تک دُنیا میں جس قدر فسادات انقلابات اور بغاوتیں عمل میں آئیں وہ اس قوت کے تحریک میں آنے سے واقعہ ہوئی ہیں۔ دُنیا میں سب سے پہلا خُونی فساد ہابیل اور قابیل میں ہُوا تھا جس میں ذاتی منفعت کے لئے سگے بھائی نے سگے بھائی کو قتل کر کے اپنے غصّے کی آگ کو اس کے خُون سے ٹھنڈا کیا تھا۔ اس کے بعد سے قوتِ غضبی کو ٹھنڈا کرنے کا یہ طریقہ ایسا مطبوع اور مقبول ہُوا کہ بنی نوع انسان آجتک اس قدیمی سُنّت پر عمل پیرا ہیں +

جب ایک جگہ رہنے والوں میں حسد اور رشک کی ہوا آتش غضب کے مشعلے بھڑکاتی ہے تو محبّت اور ہمدردی کم ہو کر نفرت کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ یہ منافرت یگانوں کو بیگانہ کر کے آپس میں دشمنی پیدا کرتی ہے۔ دشمنی اپنے آپ کو ظاہر کرنے کا اس طرح راستہ ڈھونڈھتی ہے جس طرح رُکا ہُوا پانی پھُوٹ بہنے کے لئے کوئی جگہ تلاش کرتا ہے۔ دُشمنی بڑھنے سے ظاہری رواداری بھی مفقود ہو جاتی ہے اور مخالف جماعت کا

ہر فرد بھوکے شیر کی طرح ایک دوسرے کے کھانے کو دوڑتا ہے"
بعینہ یہی حالت ہندوستان کی ہے۔ یہاں ہم مذہب اور ہم قوم جماعتوں میں بھی دشمنی ہے۔ اور غیر مذہب فرقوں میں بھی نفاق اور نفرت ہے۔ مخالفانہ اور معاندانہ جذبات اس قدر ترقی کر گئے ہیں کہ ہندو مسلمانوں میں آئے دن خون خرابے اور فسادات ہوتے رہتے ہیں۔ ان کی تحقیقات کے لئے سرکاری اور غیر سرکاری کمیشن مقرر کئے گئے اور انہوں نے فسادات کے مختلف اسباب تحقیق کئے۔

سرکاری اور غیر سرکاری تحقیقات

سرکاری کمیشنوں کی تحقیقات کا لب لباب یہ ہے کہ ہندو مسلمانوں سے اس لئے خائف ہیں کہ مسلمانوں نے ہندوستان پر جو خالص ہندوؤں کا ملک تھا تقریباً ایک ہزار سال حکومت کی اور ہندو تہذیب اور جذبہ آزادی کو سخت صدمہ پہنچایا اور ان کی دولت اور مال کو یہاں سے لے جا کر اپنے اسلامی ممالک کو مالا مال کیا ہے۔ اس کے علاوہ جو چیزیں مسلمانوں کے نزدیک حرام ہیں وہ ہندوؤں کے ہاں جائز ہیں۔ اب جبکہ آزادی کا زمانہ ہے اور ہر شخص کو اپنے مذہب کے احکام بجا لانے میں کُھلی آزادی ہے تو ہندو اپنے کھوئے ہوئے حقوق کو حاصل کرنا چاہتے ہیں اور ان کی بجا آوری پر مصر ہیں۔ لیکن مسلمانوں کو یہ بات گوارا نہیں، یہی حالت مسلمانوں کی ہے۔ جب وہ اپنے حقوق کو پائمال ہوتا ہوا

دیکھتے ہیں تو آتش غضب سے مشتعل پا ہو جاتے ہیں اس طرح سے
ایک قوم کے خلاف دوسری قوم کے جذبات بھڑک اٹھتے ہیں۔
اس کے علاوہ موجودہ حکومت کے زیر سایہ ہندوؤں نے بہت
ترقی کی ہے اور مسلمانوں سے تقریباً ایک صدی آگے نکل گئے ہیں
برخلاف اس کے مسلمان مذہبی عصبیت کی بدولت دنیاوی ترقی
میں ہندوؤں سے بہت پیچھے ہیں۔ اس لئے دونو قوموں میں
منافرت کے جذبات بھڑک رہے ہیں ؎

غیر سرکاری کمیشنوں کی تحقیقات اس کے بالکل برعکس ہے
وہ کہتے ہیں۔ اگر ہندؤں کو مسلمانوں سے دشمنی یا نفرت ہوتی تو
اس زمانے میں ہونی چاہئے تھی جب ان کی آزادی کو چھینا اور
ان کی تہذیب کو نقصان پہنچایا گیا تھا، لیکن ان دنوں ہندو
مسلمانوں کا اتحاد مسلم تھا اور ایک دوسرے سے تعلقات نہایت
خوشگوار تھے، ابتدائی حملہ آوروں سے شکایت یقیناً تھی کہ وہ
ہندوستان کی دولت اپنے ملک میں لے جاتے تھے لیکن ہمایوں
کی دوبارہ حملہ آوری کے بعد سے یہ شکایت پیدا نہیں ہوئی۔ اکبر
اعظم نے اتحاد اور محبت کے وہ پیمان کئے تھے کہ ابھی تک ان کا
نقش دلوں پر باقی ہے۔ مذہبی احکام بجالانے میں جن پابندیوں
کا الزام لگایا جاتا ہے ان کو عمومیت کی سند نہیں دی جاسکتی،
ہاں موجودہ حکومت کی پالیسی یہ ہے کہ دو قوموں کو آپس میں

لڑا کر کمزور کیا جائے اور پھر ان پر حکومت کی جائے۔ مزید برآں
اقتصادی اور معاشی مشکلات رواداری اور حسن سلوک کی دشمن ہیں،
نیز مذہبی تعصب اور فرقہ پرستی کی آگ بھڑکانے والے ہمیشہ دراندازی
کرتے رہتے ہیں۔ ابتدائی تعلیم جن لوگوں کے ذریعہ دی جاتی ہے
وہ بچوں کے دل میں دوسری قوم کی طرف سے خیالات خراب
کرتے ہیں۔ دلوں کی سادہ لوح پر یہ نقش ایسے بیٹھتے ہیں کہ مٹائے
نہیں مٹتے، اخبارات محض پیسے کمانے کے لئے اشتعال انگیز اور
جھوٹی سچی خبریں شائع کرکے۔ ہر مسئلہ کو فرقہ دارانہ رنگ دے کر
کچھ سے کچھ بنا دیتے ہیں۔ اس فرقہ پرستی کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ آدمی
تو ہندو مسلمان ہوتے ہی تھے اب ہر چیز ہندو مسلمان ہو گئی ہے۔
اگر ریل میں سفر کرنے کا اتفاق ہو تو خوانچے والوں کی طرح طرح کی
آوازیں سنئے ہندو پانی، مسلمان پانی۔ اسلامی چنے۔ ہندو چائے،
مسلمان چائے، غرض کونسی چیز ہے جو ہندو مسلمان کی تفریق اور
فرقہ پرستی کی شہادت نہیں دیتی، اس کے علاوہ فرقہ پرستی میں
ان لوگوں کو بھی دخل ہے جن کا ذریعہ معاش سوائے لٹھ بازی اور
شر انگیزی کے کچھ اور نہیں، اگر وہ ہندو مسلم فساد برپا نہ کریں تو
کھائیں کہاں سے۔ ایسے لوگ گلی کوچوں میں چیلوں اور گدھوں
کی طرح منڈلاتے رہتے ہیں۔ جونہی کسی ہندو مسلمان میں اونچی
نیچی بات ہوئی اور یہ لوگ خم ٹھونک کر اِدھر اُدھر سے نکل آئے۔

انفرادی معاملہ اجتماعی بنا اور اجتماعی بن کر سارے شہر کی فضا پر چھا گیا۔ بلکہ فرقہ پرست اخباروں اور حریفوں کی تقریر و تحریر سے ملک کے ہر گوشے میں آگ کی طرح پھیل کر دلوں میں تکدر خیزی اور نفرت انگیزی کا موجب ہوا۔

اُستاد ذوق نے کیا خوب کہا ہے ؎

دِل کے دو حرف ہیں وہ بھی ہیں جُدا ایک سے ایک
کس طرح کوئی کرے یار وفا ایک سے ایک

ہندو مسلم فسادات اور انکے نتائج

ایک تو قدرت نے انسانوں کو مختلف الطبع بنایا ہے اس پر مذہب کی تفریق معاشی اور انسانی مدارج و مراتب اور آب و ہوا کا اختلاف وہ اثر رکھتا ہے جو کریلے کی بیل کے نیم پر چڑھ جانے سے ظاہر ہوتا ہے۔ نفرت کی دبی ہوئی چنگاریاں شرارے بن کر نکلتی ہیں اور خرمن امن میں آتش زنی کرتی ہیں۔ باہمی تعلقات بگڑ کر دلوں میں فرق آ جاتا ہے۔ دشمنی اپنے آپ کو ظاہر کرنے کے راستے ڈھونڈھتی ہے۔ معمولی سی بات بڑی بات بن جاتی ہے۔ ایک آدمی کا جھگڑا قوم کا جھگڑا کہلاتا ہے۔ فسادات برپا ہوتے ہیں۔ ان فرقہ دار فسادوں کا افسوسناک پہلو یہ ہے کہ ان لوگوں کو جانی اور مالی نقصان پہنچتا ہے جن کو فساد سے دُور کا واسطہ بھی نہیں ہوتا اور ان کا قصور محض اس قدر ہوتا ہے کہ وہ کسی مخالف مذہب کی پیروی کرتے ہیں گھروں سے نکلنا تو ہے ہی

خطرناک گھر بیٹھے بھی جان محفوظ نہیں کیا پتہ کس وقت کوئی شر انگیز گھر کو آگ لگا دے یا موقعہ تاک کر حملہ کر دے اور بیٹھے بٹھائے لینے کے دینے پڑ جائیں۔ بازار کے بازار بند پڑے ہیں۔ کاروبار بالکل بند ہیں۔ تاجروں کا لاکھوں کا نقصان ہو گیا۔ جن کی ہر روز کی آمدنی روزانہ کا خرچ ہے وہ فاقوں سے تڑپ رہے ہیں۔ فساد کرنے والے کُشت و خون کر کے روپوش ہو گئے اور ان کی لائی ہوئی مصیبت سے ہر شخص پریشان ہے کہ دیکھئے کیا ہوتا ہے۔ اور یہ فساد کیا رنگ دکھاتا ہے۔ گلی کوچوں میں سپاہیوں کی روند کھٹا کھٹ گشت لگا رہی ہے۔ گھر گھر میں تلاشیاں اور گرفتاریاں ہو رہی ہیں۔ ایسے موقعہ پر دشمنوں کی بن آئی ہے۔ جس سے دشمنی ہے اس سے دشمنی نکالنے کا بہترین موقعہ ہاتھ آیا ہے۔ گھن بھی چنوں کے ساتھ پس جائیگا۔ اور گیرو دار کا ایسا سماں بندھیگا کہ اس سے مدتوں چھٹکارا نہ ہو گا۔ مقدمے چلیں گے جس کے خلاف جُرم ثابت ہو گا وہ قید کی کڑیاں جھیلیگا۔ کئی ایک کو پھانسی کی سزا ملے گی، کوئی عبور دریائے شور بھیجا جائیگا۔ پہلے مقدمے بازیوں کے لئے قوم سے چندہ جمع کیا گیا تھا۔ اب پسماندگان کے لئے ضرورت ہے۔ باقاعدہ دفتر کُھل گئے ہیں۔ سینکڑوں نہیں ہزاروں روپے مذہب اور قوم کے نام سے آرہے ہیں۔ دس بیس ضرورتمندوں کو بھی خوش قسمتی سے کچھ نہ

کچھ مل جاتا ہے باقی یار لوگوں کے جلسے جلوسوں میں صرف ہوتا ہے۔ قوم کی خدمت ہو رہی ہے۔ لیڈروں کے عیش ہیں۔ خدا ایسے فساد روز برپا کرے ع خدا شرے برانگیزد کہ خیر ما دراں باشد

سیاست | ایک گروہ کا خیال ہے کہ اس قسم کے فرقہ دارانہ فساد حکومت کے ایماء سے ہوتے ہیں۔ جب حکومت دیکھتی ہے کہ کوئی جماعت حکومت کے مُنہ آنا چاہتی ہے۔ تو اس کو دبانے کا ایک ڈھنگ یہ بھی نکالتی ہے کہ اس کو دوسری مخالف جماعت سے لڑا دیا۔ پہلے تو تماشا دیکھا پھر جس جماعت کو دبانا منظور ہُوا اس پر سختی کرنی شروع کر دی، اس کی تمام طاقت کسی مخصوص مسٔلے سے ہٹا کر اپنے آپ کو سنبھالنے اور بچانے پر مرکوز کر دی' اس الزام میں کچھ حقیقت ہو یا نہ ہو حکومت ہند دو کو لڑا کر حکومت کرنے کی دیرینہ پالیسی کی وجہ سے بہت کافی بدنام ہے۔ فساد کے بعد جب کوئی تیسری جماعت صُلح سلوک کرانے کے لئے اُٹھتی ہے تو وہ اس پالیسی ہی کی آڑ میں کامیابی حاصل کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ تیسری طاقت کی اسی وقت ضرورت پڑتی ہے جب دو برابر کی طاقتیں نبرد آزما ہوں۔ اور آپس میں کوئی معقول تصفیہ نہ کر سکیں ؞

ان فسادوں سے جو کچھ ہوتا ہے وہ تو سب کو معلوم ہے۔ افسوس یہ ہے کہ دو ہمسایہ قومیں ان آویزشوں کی بدولت

ایک دوسرے سے دُور ہو جاتی ہیں۔ جو قوم کمزور ہوتی ہے وہ حکومت کی پناہ ڈھونڈھتی ہے۔ جس کو اپنی قوت پر ناز اور بھروسہ ہوتا ہے وہ اپنی طاقت کو ایسے مقصد کے لئے صرف کرتی ہے۔ جس سے تمام مُلک کو بحیثیت مجموعی نقصان پہنچتا ہے۔ اور حکومت کی گرفت مضبوط ہوتی ہے

انسداد:۔

ہندوستان میں آجتک جس قدر جنگیں اور انقلاب ہوئے ہیں وہ عام طور پر مذہب ہی کے نام پر ہوئے ہمارے اہل مُلک بحیثیت مجموعی ابھی اس منزل پر نہیں پہنچے کہ محض اخلاق، قانون اور آزادی کے نام پر جانیں قربان کر سکیں یا یہ سمجھنا چاہیئے کہ ہر تحریک کے بانیوں نے مذہب کی برقی اور غیر فانی قوت سے فائدہ اُٹھایا۔ اور دوسرے جذبات کو برانگیختہ کرنے کی کوشش نہ کی۔ ان حالات میں یہاں کوئی تحریک اسوقت تک کامیاب نہیں ہو سکتی جب تک کہ اس پر مذہب کا رنگ نہ چڑھایا جائے۔ لُطف یہ ہے کہ مذہب کی آڑ میں یہ فسادات ہوتے ہیں لیکن اُن کی تہ میں کوئی نہ کوئی سیاسی یا معاشی راز پوشیدہ ہوتا ہے۔ اسی لئے قومی لیڈروں کا خیال ہے کہ ہندوستان میں امن و سکون معاشی مسائل کو رُو بہ اصلاح لانے سے ہو سکتا ہے۔ اس نظریہ میں میں میخ نکالنا خلاف تدبّر ہے۔ اس لئے اس پر بحث کرنے کی

ضرورت نہیں ورنہ کونسی بات ہے جس پر کسی نہ کسی پہلو سے بحث نہ ہوسکتی ہو۔ بہرحال یہ ماننا پڑیگا کہ اگر مُلک کی معاشی حالت سُدھر جائے تو بیش از بیش مناقشات دُور ہو جائینگے ؎

مذہب

عام طور پر ہر شخص مذہب کی اہمیّت اور ضرورت کا قائل ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ دُنیا کا سب سے پہلا اور آخری قانون مذہب ہی ہے جس نے بنی نوع انسان کو اپنے فرایض سے آگاہ کیا اور ایک مخصوص روش پر رواداری اور امن پسندی کی زندگی بسر کرنی سکھائی۔ اس کے علاوہ مذہب کی ترقی اور ناقابل تسخیر طاقت سے بھی کوئی انکار نہیں کرسکتا۔ دُنیا میں جس قدر فتوحات مذہب کے نام سے ہوئی ہیں ان سے اہل علم بے خبر نہیں ہیں۔ کمزور اور تباہ حال قومیں مذہب کی قوّت سے طاقتور اور کامیاب ہوئیں۔ صدیوں کی غلامی کی زنجیریں اس بے پناہ قوّت نے توڑیں۔ وحشی اور خونخوار قومیں مذہب کی جلا سے تہذیب اور شایستگی کے آسمان پر درخشندہ ستاروں کی طرح چمکیں۔ مذہبی رواداری اور ہمدردی نے دشمنوں اور غیر مذہبوں کو اپنے اندر اس طرح جذب کر لیا کہ من و تو کا فرق باقی نہ رہا لیکن یہی مذہب جو کبھی اخوت اور یگانگت پیدا کرنے میں بے مثل تھا آجکل نفاق انگیزی اور حسد و بُغض کی آگ سُلگاتا اور فساد کے شُعلے بھڑکاتا ہے۔ اس کا معمولی سا کرشمہ یہ ہے کہ پرائے تو پرائے اپنے بھی بیگانے ہوتے جاتے ہیں ؎

تعلیم ہمارے ملک میں ایک گروہ اس خیال کا پیدا ہو گیا ہے جو ہر مذہب کو نفرت کی نظر سے دیکھتا ہے۔ سوءِ اتفاق سے یہ گروہ تعلیم یافتہ افراد پر مشتمل ہے۔ اس لئے کہنے والے یہ کہتے ہیں کہ یہ موجودہ تعلیم کا اثر ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ تعلیم کا اثر نہیں بلکہ مذہب کا اثر ہے۔ مذہب پرستوں نے ہر مذہب کو اتنا محدود کر دیا ہے کہ اس میں آزادی کی گنجائش نہیں رہی، اس لئے جن لوگوں کو تعلیم آزاد خیال بنا دیتی ہے وہ نام نہاد مذہبی پابندیوں سے متنفر ہو جاتے ہیں۔ مذہب کے نام سے پناہ مانگتے ہیں۔ اور محض نام کے ہندو اور مسلمان رہ جاتے ہیں۔ حُسنِ اتفاق سے فسادات کی تحقیقات کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ فسادات میں جس قدر لوگ عملی حصہ لیتے ہیں وہ جاہل ہی ہوتے ہیں۔ تعلیم یافتہ اوّل تو ان سے بالاتر ہیں اور اگر ان فسادات میں ان کا کچھ حصہ ہوتا ہے تو محض اس قدر کہ بھس میں چنگی ڈال جمالو دُور کھڑی، جیسے انھوں نے اپنا فرض ادا کر دیا اب عوام لڑتے مرتے پھریں۔ وہ تو اس وقت گھر سے باہر نکلیں گے جب دوبارہ امن و سکون قائم ہو جائیگا۔ اور بکھری ہوئی اور کمزور شدہ قوم کو مجتمع کرنے کا سوال پیدا ہوگا۔

اخبارات فسادات کرانے میں اخباروں کو بھی بہت دخل ہے۔ اس کی زیادہ تر وجہ یہ ہے کہ ہمارے اخبارات عام طور پر شخصی ملکیت ہیں جو شخص مالک ہے وہی ایڈیٹر ہے اور وہی اپنی پالیسی کا

ذمہ دار ہے۔ کوئی دوسرا شخص اس کو پوچھنے والا نہیں کہ کیا لکھتے ہو اور کیوں لکھتے ہو۔ اور صحافتی تعلیم نہ ہونے کی وجہ سے ایڈیٹروں کی تحریریں اکثر جادہ اعتدال سے ہٹ جاتی ہیں۔ حالات اور واقعات کی روان کو اپنے ساتھ عوام کی طرح بہالے جاتی ہے۔ حالانکہ ایڈیٹر میں بھی وہی خصوصیات ہونی چاہئیں جو ایک کامیاب مقرر کے لئے ضروری ہیں۔ اگر وہ عوام کو اپنا ہمخیال نہیں بنا سکتا تو کامیاب ایڈیٹر کہلانے کا ہرگز مستحق نہیں بلکہ فن صحافت کے لئے اس کی ذات سخت خطرناک ہے۔ ایسے ایڈیٹر عام طور پر خود بھی مصیبتوں میں مبتلا رہتے ہیں اور دوسروں کو بھی اپنی خام کاریوں سے تکلیفیں پہنچاتے ہیں۔ دو قوموں کو آپس میں لڑا دینا یا مخالف بنا دینا ان کے بائیں ہاتھ کا کرتب ہے۔ بڑھتے بڑھتے یہی مخالفت ہمہ گیر فساد کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ ایسے موقعوں پر ان کی بن آتی ہے۔ اشتعال انگیز سُرخیاں اور عنوان دے کر معمولی معمولی خبروں کو وہشت خیز اور وحشت انگیز بناتے ہیں۔ اس پر اخبار فروش گروہ اور زیادہ نون مرچ لگاتا ہے۔ اور وہ اخبار جس کو کوئی پُوچھتا تک نہیں ہزاروں کی تعداد میں بکنے لگتا ہے۔ اخبار فروشوں کی اشتعال انگیز آوازیں سُن سُن کر شہر میں سنسنی پھیل جاتی ہے۔ اور وہ لوگ جو مدتوں سے موقعہ کی تاک میں بیٹھے تھے اپنے دلوں کی بھڑاس نکالنے کے لئے پکتے ہوئے پھوڑوں کی

طرح ذرا سے اشارے پر پھوٹ بہتے ہیں۔ بلکہ فساد برپا کرنے کی خود صورتیں پیدا کرتے ہیں ٭

جمہوریت

جمہوریت پسند حضرات کا دعویٰ ہے کہ جمہوریت کی حکومت عوام کی حکومت ہے اور اس کے زیر سایہ وہ جھگڑے اور فساد نہیں ہوتے جو دوسری قسم کی حکومتوں میں پیدا ہو سکتے ہیں لیکن آہستہ آہستہ تجربہ سے ثابت ہو رہا ہے کہ جمہوریت کی بدولت جس قدر فساد اور مناقشے رُونما ہوتے ہیں۔ اور قسم کی حکومتیں اس سے مبرّا ہیں۔ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ جمہوری حکومت ظاہرا طور پر بہت زیادہ تسلّی بخش ہے اور عوام میں بیداری پیدا کرنے کی موجب ہے لیکن اس کی پیدا کردہ بیداری اگر صحیح طریقے سے ترقی نہ کرے تو نہ صرف قوم کے لئے مضر ہے بلکہ دوسری ہمسایہ قوموں کے لئے بھی خطرناک ہے۔ آئے دنوں کے الیکشنوں اور انتخابوں سے ہمارے مُلک کی طاقت کو جس قدر نقصان پہنچ رہا ہے وہ اہل نظر سے پوشیدہ نہیں۔ اگر تھوڑی دیر کے لئے یہ تسلیم کر لیا جائے کہ یہ ہنگامے جمہوریت کے اساسی اصولوں کی خلاف ورزی سے پیدا ہوتے ہیں تو ماننا پڑیگا کہ جمہوریت کی درآمد ہمارے مُلک میں قبل از وقت ہے اور اس طرز حکومت سے بجائے فایدے کے مُلک کو نقصان پہنچ رہا ہے۔ اور ہندوستان بحیثیت مجموعی پستی اور تنزّل کی طرف جا رہا ہے۔

بلکہ میں تو یہ کہونگا کہ جمہوریت کی آڑ میں منافرت اور نفاق کے بیج بوئے گئے ہیں۔ جس سے خانہ جنگی کے جذبات نشوونما پا رہے ہیں "

انسداد کی تدابیر:۔

رواداری:۔ انسداد کی تدابیر میں سب سے پہلا درجہ باہمی رواداری کا ہے۔ اگر ہر مذہب کے اساسی قوانین کی چھان بین کی جائے تو معلوم ہوگا کہ دُنیا کا کوئی ایسا مذہب نہیں جو رواداری کا سبق نہیں دیتا۔ ہندو اور مسلمان دونو کے مذہب میں رواداری کی تعلیم موجود ہے۔ بلکہ ہندو مذہب میں کسی جاندار کو ستانا گناہ عظیم خیال کیا جاتا ہے۔ لیکن جب فساد برپا ہوتا ہے تو ہندو مذہب کے نام لیوا چھری کٹاری ہو جاتے ہیں وہ قوم جو چیونٹیوں اور سانپوں کو مارنا گناہ خیال کرتی ہے۔ انسانوں کو بیدریغ ذبح کر ڈالتی ہے۔ یہی حالت مسلمانوں کی ہے مذہب کے نام پر جان دیدینا ان کو غازی اور شہید بناتا ہے اور دُنیا و عقبیٰ میں ان کے مرتبے بلند کرتا ہے۔ اگر ہمارے مذہبی مبلغ اور شریعت کے حامل مذہبی تعلیم میں رواداری کو زیادہ اہمیت دیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہمسایہ قوموں کے مذہبی احساسات کا احترام نہ کیا جائے۔ لیکن ہمارے مذہبی رہنما تو اپنے لئے یہ بات قابل فخر سمجھتے ہیں کہ انہوں نے اپنی جماعت کے دلوں میں

عصبیت اور تنافر پیدا کر دیا اور ان فرقوں کو بھی ایک دوسرے کے مقابلے میں لا کھڑا کیا جو فروعی اختلاف رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ سمجھدار طبقہ مذہب سے متنفر ہو گیا ہے۔ نیز حالات کا جایزہ لینے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ فسادات میں عملی حصّہ لینے والے عام طور غیر مہذب انسان ہوتے ہیں لیکن ان کے اعمال بد کا بُرا اثر ہمیشہ مہذب طبقے ہی پر پڑتا ہے۔

حدود بندی

انسان کا خاصہ ہے کہ اپنے ہم خیال گروہ میں رہنا سہنا پسند کرتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اپنی جماعت کے لوگوں میں رہنے سے بہت آرام پہنچتا ہے۔ لیکن وہ جماعت جو ہم مذہبی کے پیش نظر کسی خاص جگہ پر چھاونیاں چھاتی ہے اور دوسری قوموں اور مذہبوں کے لوگوں کو وہاں آباد نہیں ہونے دیتی وہ ضرور کسی نہ کسی حد تک شہر کے امن کے لئے مخدوش ہوتی ہے۔ تجربوں سے ثابت ہو چکا ہے کہ اگر خالص ہندو یا مسلم آبادی میں کوئی مخالف مذہب کا آدمی جا پھنسے تو اس کو زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچ سکتا ہے اور اس کی کوئی پرسش نہیں ہو سکتی۔ برخلاف اس کے جن محلّوں میں ہندو مسلمان دونو فرقے آباد ہیں وہاں رواداری اور ہمسائگی کے حقوق ہر حالت میں قائم رہتے ہیں چونکہ دونو فرقوں کو برابر کا خطرہ ہوتا ہے اس لئے کوئی بھی ایسی حرکت نہیں کرتا جو دوسرے کو

ناگوار گزرے اور اس کے اثر بد سے تمام اہل محلہ کا امن وسکون غارت ہو جائے ۔

یہی حالت تعلیم کی ہے ۔ جن مدرسوں میں ایک مذہب کے طلبا تعلیم پاتے ہیں۔ ان میں رواداری کا مادہ تربیت نہیں پاتا لیکن وہ مدارس جہاں مختلف مذہبوں اور فرقوں کے افراد ایک جگہ بیٹھ کر پڑھتے ہیں وہاں کے طلبا میں محبت یگانگت اور دوستی استوار ہوتی ہے ۔ ان مدارس کے طلبا یقیناً قومی مدارس کے طلباء پر اس حثیت سے فوقیت رکھتے ہیں ۔ جیسے تعلیم کے زمانے میں وہ ایک دوسرے کے مذہبی جذبات کا احترام کرتے ہیں اسی طرح تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد بھی وہ ہمسایہ قوموں سے دوستی اور محبت قائم رکھنے کے اسباق نہیں بھولتے۔ اس کے علاوہ شوء اتفاق سے بعض اساتذہ اپنے ماحول اور تعلیم کے اثر سے پرلے درجے کے متعصب ہوتے ہیں تعلیمی اداروں کے لئے اس قسم کے اُستاد بہت ہی خطرناک ہیں ۔ اور خاص کر ایسے مدرسوں کے لئے جن میں ایک مذہب کے طالبعلم تعلیم حاصل کرتے ہوں ۔ چونکہ جماعت میں دوسرے مذہب کے طلبا نہیں ہوتے اس لئے ان کو تعصب کا زہر گھول گھول کر پلانے کا پورا پورا موقعہ مل جاتا ہے ۔ بچوں کے دلوں پر اُستاد کی عظمت اور اس کا پُرزور طرز تکلم ایسے گہرے نقوش اور اثرات پیدا کرتا ہے

کہ وہ عمر بھر محو نہیں ہو سکتے اگر قومی مدرسوں میں بھی مختلف مذہب کے طلباء کو یکجا کرنے کی کوشش کی جائے تو متعصب اساتذہ خود بخود احتیاط سے کام لیں۔ اور اپنا تعصب اپنی ذات تک یا اپنے خاص حلقۂ اثر میں محدود رکھیں۔ اس کے ساتھ ہمیں نصاب تعلیم سے بھی شکوہ ہے، جب ہم بچوں کے لئے نصاب تعلیم مرتب کرنے بیٹھتے ہیں تو اکثر ایسے موضوع کو بھی شامل کر لیتے ہیں جن سے تعصب اور منافرت کے جذبات بھڑکتے ہیں۔ خاص طور پر تاریخ کے نصاب اس لحاظ سے بہت ہی مطعون ہیں ہم تسلیم کرتے ہیں کہ تاریخی واقعات کو مٹایا نہیں جا سکتا۔ لیکن ابتدائی تعلیم میں ایسے تاریخی واقعات کو داخل کرنا بہت ہی خطرناک ہے جن سے ہندو مسلم اتحاد اور یگانگت کو ٹھیس لگتی ہے اور دو ہمسایہ قوموں کے درمیان نفرت اور نفاق کی خلیج وسیع ہوتی ہے۔

ہمارے ملک میں ہندو مسلم فسادات اس کثرت سے ہونے لگے ہیں کہ کوئی دن ایسا نہیں جاتا جس دن کہیں نہ کہیں سے فساد کی خبر نہ آئے۔ اگر فساد نہ بھی ہو تو معمولی سے معمولی انفرادی جھگڑوں کو فرقہ وارانہ رنگ دیدیا جاتا ہے۔ میری آنکھوں دیکھی بات ہے۔ کوئی پندرہ سولہ سال کا ذکر ہے۔ ایک سرکاری کالج میں کچھ جھگڑا ہو گیا۔ جو طلبا اس قضیہ کے بانی مبانی تھے وہ ہم قوم تھے۔ معاملہ بڑھتے بڑھتے مقدمہ کی صورت میں سرکاری

عدالت تک پہنچ گیا۔ موقعہ پاتے ہی فرقہ پرست حضرات آن دھمکے اور اس کو ہندو مسلم سوال بنا دیا۔ بادی النظر میں تعجب ہوتا ہے کہ آپس کا جھگڑا فرقہ دارانہ کیسے بن گیا۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ مخالف قوم اس ضلعے میں اپنا قومی کالج کھولنا چاہتی تھی، اس کو موقعہ ہاتھ آیا۔ ایک طرف سے تمام ہندو وکلا پیروی کرنے کے لئے تیار ہو گئے اور دوسری طرف سے تمام مسلمان وکلا۔ جس قوم کو نقصان پہنچتا تھا اس کی آنکھیں کھل گئیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس مقدمہ کی ہار جیت میں کالج کے رہنے اور نہ رہنے کا سوال پیدا ہو گیا تھا۔ آخر کار مستغیث نے عدالت سے مقدمہ اُٹھا لیا اور آپس میں فیصلہ کر لیا۔

اس ایک واقعہ پر کیا منحصر ہے ہزاروں واقعات اس قسم کے ہوتے ہیں۔ جن سے ہمسایہ قوموں کے باہمی تعلقات خراب ہوتے جاتے ہیں۔ اس کا بہترین علاج یہ ہے کہ ہر محلّے اور علاقے میں ہندو مسلمانوں کے مشترکہ بورڈ اور مصالحتی کمیٹیاں قائم کر دی جائیں۔ اس کے علاوہ کوشش کی جائے کہ ہر محلّے میں ہندو مسلمان دونوں آباد ہوں تاکہ ایک دوسرے سے میل جول اور ہمسائگی کے باعث آپس میں محبت اور دوستی پیدا ہو۔ قاعدہ ہے جہاں محبت ہوتی ہے وہاں درگذر اور برداشت کا مادہ پیدا ہو جاتا ہے اور معمولی معمولی کیا بڑے بڑے معاملات

محض باہمی ارتباط کی بدولت نہایت خوش اسلوبی سے طے ہو جاتے ہیں ؎

مُلکی تقسیم

ہندو مسلم نفاق اور فساد کی بدولت آجکل ایک جماعت اس خیال کی پیدا ہو گئی ہے۔ کہ ہندوستان کو ہندو مسلمانوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ گویا ہندوستان کے ایک حصے میں خالص مسلمان آبادی ہو جائے اور دوسرے میں نری ہندو آبادی، اس تجویز کو عمل میں لانے سے وہی نقصانات اور احتمالات ہیں جو خالص ہندو مسلم محلے آباد کرنے سے ہو سکتے ہیں۔ اس نظریئے کے حامی اس طریق کار کو مُلک کے لئے مفید سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہندو مسلم فسادات کا یہی آخری علاج ہے۔ بعض ممالک میں ایسا ہوا بھی ہے ان کا دعویٰ ہے کہ اگر یہ طرز عمل اختیار نہ کیا گیا تو قدرتی طور پر آہستہ آہستہ ایسا ہو جائیگا۔ جن لوگوں کو کسی خاص صوبے میں متواتر نقصان اور تکلیفیں پہنچینگی وہ خود بخود ان صوبوں میں منتقل ہو جائینگے جہاں ان کا جان و مال زیادہ محفوظ رہیگا۔ اور زیادہ آسانیاں میسر ہونگی، کہنے والے یہ کہتے ہیں کہ فلسطین میں یہی صورت اختیار کی گئی ہے لیکن وہاں تو اسکا خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں ہؤا۔ بلکہ وہاں کی حالت بد سے بدتر ہو گئی ہے۔ اور آخر کار حکومت نے فیصلہ کیا ہے کہ مجوزہ تقسیم کو باطل قرار دیدیا جائے۔ بہرحال اگر ہندوستان کی نت نئی مصیبتوں کا اسی طریق کار سے خاتمہ ہو سکتا

ہے تو یہ صورت نہایت تکلیف دہ ہے۔ افسوس کا مقام ہے کہ وہ دو قومیں جو آپس میں شیر و شکر تھیں۔ اب ایک دوسرے سے اتنی متنفر ہو گئی ہیں کہ ایک جگہ رہنا بھی گوارا نہیں کر سکتیں +

فرقہ دارانہ تناسب ہمارے مدبرین نے فرقہ دارانہ تصادم کا ایک علاج یہ بھی کیا ہے کہ ہر سرکاری اور پبلک کے ادارے میں ملازمتوں میں فرقہ دارانہ تناسب قائم رکھنے کے قوانین بنائے ہیں۔ اس طریق کار سے بہت سی شکائتیں دُور ہو گئی ہیں اور اب وہ بات نہیں رہی کہ جس قوم کا آدمی برسر اقتدار ہُوا اُس نے اپنے ہم مذہب اور ہم قوم آدمی رکھ لئے اور دوسری قوموں کے حقوق کو پائمال کر دیا لیکن باوجود اس قانون کے اب بھی یہ حال ہے کہ جہاں کہیں جس کا بس چلتا ہے۔ وہاں وہ کچھ نہ کچھ کر ہی گزرتا ہے۔ اور اپنے تعصب کی بدولت تمام ماحول کو مکدر کر دیتا ہے۔ قاعدہ ہے ایک مچھلی تمام جل کو گندہ کرتی ہے۔ اگر کہیں ایک مرتبہ کسی شخص کے ساتھ ناانصافی یا جبر و تشدد ہوتا ہے وہاں اس کے اثرات مدتوں تک ... باقی رہتے ہیں۔ اور ایک شخص کی زیادتی سے تمام قوم بدنام ہو جاتی ہے۔ پھر وہی مثل صادق آتی ہے "کریں موچھوں والے پکڑے جائیں ڈاڑھی والے"۔ اگر آپس میں خوشگوار تعلقات ہوں تو یہ معمولی باتیں ہیں لیکن جب بغض و عناد اپنے اظہار کے بہانے تلاش کرنے کے درپے ہوں تو بات کا بتنگڑ بن جانا کون بڑی

بات ہے ۔

بہرحال فرقہ دارانہ تناسب بہت ہی اچھی اور معقول تجویز ہے لیکن جب اس چادر کو زیادہ پھیلایا جاتا ہے اور چاروں طرف سے کھینچ کر فرقہ دارانہ گندگی کو ڈھانکنے کی کوشش کی جاتی ہے تو اس کشیدگی سے چادر کے تار تار ہونے کے بعد جو کچھ برآمد ہوتا ہے اس کو مذاق سلیم اور طبع لطیف ہرگز گوارا نہیں کر سکتی، مثلاً ہر ریڈیو سٹیشن ماہوار ایک مقررہ رقم صرف کرتا ہے۔ اسے پروگرام کی ترتیب اور روپے کی تقسیم میں بھی فرقہ دارانہ تناسب قائم رکھنا پڑتا ہے۔ اگر سوء اتفاق سے فرقہ دارانہ تناسب پورا نہیں ہوتا تو اس کو ہندو مسلم آرٹسٹ مہیا کرنے پڑتے ہیں۔ چاہے پروگرام خراب ہو یا درست رہے لیکن فرقہ پرستوں کو تو اپنے حلوے مانڈے سے کام ہے۔ لطف یہ ہے کہ اگر پروگرام پر نکتہ چینی کی جائے تو ریڈیو والے فوراً فرقہ دارانہ تناسب کی آڑ لے لیتے ہیں۔ اور اپنی مجبوریوں اور پابندیوں کا اظہار کر کے اپنی جان چھڑاتے ہیں۔ ایک محکمۂ ریڈیو پر کیا منحصر ہے تقریباً ہر محکمہ میں فرقہ دارانہ تناسب کا تاریک پہلو نمایاں نظر آتا ہے۔ جس سے اس کی خوبیاں ماند پڑ گئی ہیں ۔

دردمندانہ اپیل | اے ہندو مسلمانو ۔ تم ایک ملک کے رہنے والے ہو۔ تمہارے حالات اور واقعات ایک جیسے ہیں ۔ وہ بھی دن تھے

جب تم بھائیوں بھائیوں کی طرح رہتے تھے۔ ایک دوسرے کا مصیبتوں میں ساتھ دیتے تھے۔ تمہاری محبت اور یگانگت دوسرے ملکوں کے سامنے مثال کے طور پر پیش کی جا سکتی تھی، کبھی تم نے غور کیا وہ کیا اسباب ہیں جو تم دونوں میں محبت کی جگہ نفرت اور عناد کو دے رہے ہیں اور تم دن بدن ایک دوسرے سے دُور ہوتے جا رہے ہو۔ آئے دن کے فسادات اور لڑائی جھگڑے تمہارے مُلک کی اصلی حالت کا عکس ہیں۔ کیا تم محبت کے اس سبق کو بھول گئے جو تمہارے آبا واجداد نے تمہاری گھٹی میں ڈالا تھا تم دونوں ایک دوسرے کے ہمسائے میں کس محبت اور امن سے رہتے تھے، صدیوں کے امتداد اور انقلاب تمہاری دلی کیفیتوں اور خیر اندیشیوں میں فرق نہ آنے دیتے تھے، کیا تم ہی وہ لوگ ہو اور سچ مچ تمہاری رگوں میں انہی نیک نہاد بزرگوں کا پاک خُون گردش کر رہا ہے جن کے دل ہمدردی اور محبت کے جذبات سے معمور رہتے تھے جن کی حرکت سے ایک دوسرے کے جذبات کا احترام فیاضی کرتا تھا۔ اور ہر بات سے رواداری اور پاسداری ٹپکتی تھی، نہیں تم ہرگز وہ نہیں ہو۔ تم تو ایک دوسرے کے دُشمن اور خُون کے پیاسے ہو۔ تمہارے خیالات اور تمہاری طاقتیں ایسی ناپاک اور ذلیل مقصد کی طرف رجوع ہیں جس سے تمام مُلک میں بےچینی پھیل گئی ہے۔ تمہاری کشاکش اور مخالفت سے کسی ایک قوم کا

بھی جان و مال محفوظ نہیں رہا۔ وہ اطمینان قلب اور آرام جان جو ہندوستان سے مخصوص تھا، اس کی روائتیں اور حکائتیں باقی رہ گئی ہیں۔ اے قوموں اپنے دلوں کا جایزہ لو۔ حالات کو دیکھو۔ مصلحت وقت کو پہچانو، اسوقت ملک کے سامنے گرسنگی اور افلسی کے دو ہیبت ناک دیو دانت نکوسے کھڑے ہیں۔ اگر تم دونو نے مل کر اس درد کا مداوا نہ کیا تو یہ تم دونو کو نگل جائینگے۔ وقت کا تقاضا ہے اور حالات مجبور کر رہے ہیں کہ تم اپنی متفقہ کوششیں ان اہم مسئلوں کے حل پر صرف کرو۔ یہ ملک کی خدمت کا وقت ہے لڑائی جھگڑے کا موقعہ نہیں"

اے ہندو مسلمانو - تم دونو اسی ملک کے باشندے ہو۔ تم کو یہیں رہنا ہوگا۔ تمہارے لئے کوئی نئی سرزمین پیدا نہیں ہوگی۔ پھر کیا وجہ ہے کہ تم بیگناہوں کا خون بہاتے ہو۔ یہ تمہیں کونسے مذہب نے سکھایا ہے کہ دوسرے مذہب کے آدمی کو قتل کرو۔ مذہب جو نظام عالم کے قیام کا باعث ہے اور روحانی تسکین دینے کا مدعی ہے۔ کیا وہ یہی سبق دیتا ہے حقیقت یہ ہے کہ تمہارے طرز عمل سے تمہارے مذہب بدنام ہیں اگر تمہاری حالت یہی رہی تو دیکھنا ایک دن وہ آئیگا جب تمام دنیا مذہب کے نام سے متنفر ہو جائیگی اور لا مذہبی کو فخر خیال کرے گی"

اے ہمسایہ قوموں آپس میں گلے مل جاؤ۔ قدیمی روایات کو ازسرنو

زندہ کرو۔ جو لوگ امن کے دشمن ہیں اپنی توجہ اور قوت اُن کی اصلاح کی طرف مرکوز کرو۔ یہ آئے دن کے جھگڑے اور فسادات لباس انسانیت پر بدنما دھبے ہیں۔ مذہب انسان میں ما یوسی گناہ ہے۔ اپنی ہمتیں اور ارادے بلند رکھو۔ تاریخ عالم شاہد ہے کہ اس قسم کے ناہنجار اور ناخوشگوار واقعات اکثر قوموں کو پیش آئے ہیں۔ لیکن بلند ہمت اور زندہ قوموں نے ان کی تاریک اور مکدر گہرائیوں سے نکل کر درخشندہ اور ہمت افزا دور ہیں ثم رکھا ہے۔ کاش موجودہ کشاکش تمہارے لئے بھی ایک درخشندہ دور کا پیش خیمہ ہو +

انتظام

فسادات کو روکنے کے لئے حکومت کی طرف سے بہت کوشش کی جاتی ہے لیکن عموماً شکایت یہ ہے کہ فسادات رونما ہونے سے پہلے ان کی روک تھام کا انتظام نہیں کیا جاتا۔ حکومت عام طور پر اس وقت تک خاموش رہتی ہے جب تک کوئی حادثہ پیش نہ آجائے۔ جب سے صوبائی حکومتیں قائم ہوئی ہیں اسوقت سے حکومت کی پالیسی میں بہت نمایاں فرق پیدا ہو گیا ہے چنانچہ ایک قانون غنڈہ ایکٹ کے نام سے بنایا گیا ہے جس کے ماتحت ان لوگوں کو شہر بدر کر دیا جاتا ہے جو فسادات اور شرارت انگیزی کے لئے بدنام ہیں۔ معلوم ہونا چاہیئے کہ فسادات کا انتظام اور روک تھام محض حکومت پر

فرض نہیں بلکہ امن پسند شہریوں کے بھی کچھ فرائض ہیں۔ اکثر ان کی خاموشی اور غیر دلچسپی فسادات کو ترقی دیتی ہے۔ اگر وہ اپنے فرائض کو محسوس کریں تو فسادات کا بہت آسانی سے قلع قمع کیا جا سکتا ہے۔ اگر ہر شہر کے مختلف علاقوں میں ہندو مسلمانوں کی اتحادی انجمنیں قائم کر دی جائیں اور ان کے کارکن محکمۂ پولیس سے تعاون کریں تو فسادات کے جراثیم اپنا اثر دکھانے سے پہلے فنا کئے جا سکتے ہیں، اور ایسے لوگوں کا خاطر خواہ اور قبل از وقت انتظام کیا جا سکتا ہے۔ جو فساد برپا کرنے اور کرانے میں کسی قسم کا حصّہ لیتے ہیں۔ تھوڑے عرصے کا ذکر ہے کہ بمبئی میں ہندو مسلم فساد برپا ہوئے حکومت بمبئی نے نہایت دانشمندی کا ثبوت دیتے ہوئے ہر اس شخص کو کسی نہ کسی طرح پابند کر لیا جس سے نقص امن کا اندیشہ تھا۔ ایسا کرنے سے ممکن ہے بعض بے گناہوں پر بھی سختی ہوئی ہو لیکن دیکھنا یہ ہے کہ اس سے فائدہ کیا پہنچا۔ وہ فساد جس سے تمام شہر کا امن خطرے میں پڑ گیا تھا، بہت آسانی سے دُور ہو گیا۔ اگر اس قسم کے ذرائع ہر جگہ استعمال کئے جائیں تو امید ہے بہت سے بیگناہوں کی جانیں اور مال تلف ہونے سے بچ جائیں اور ان لوگوں کے مزاج خود بخود راستی پر آ جائیں جنہوں نے فساد کرانا اپنا پیشہ بنا لیا ہے +

ہندوستان میں ہندو مسلم فسادات اس کثرت سے ہونے

لگے ہیں کہ ان سے تمام ملک کے لئے خطرہ پیدا ہو گیا ہے۔ اس لئے نہایت ضروری ہے کہ فسادات کے اصلی اسباب دریافت کر کے ان کو دور کیا جائے۔ جب تک اصلی اسباب کو دور نہیں کیا جائیگا اسوقت تک ان فسادات کا ہرگز خاتمہ نہیں ہو سکتا۔ فسادات کے اساسی اسباب دریافت کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ جہاں کہیں فسادات کے جراثیم پیدا ہوتے نظر آئیں۔ ان کی طرف فوراً توجہ کی جائے۔ اس مقام کے ہر قوم کے باا ثر آدمیوں کو ایک جگہ جمع کر کے حالات پر غور کیا جائے اور وہ طریقے اختیار کئے جائیں جن سے عوام کے بھڑکے ہوئے جذبات اور بگڑے ہوئے خیالات سکون پذیر ہو کر راستی پہ آجائیں۔ اس قسم کی انجمن بنانے سے ایک فائدہ یہ بھی ہوگا کہ ان لوگوں کا آسانی سے پتہ لگ جائیگا جو فسادات کی آگ پر تیل چھڑک کر اس کو زیادہ بھڑکاتے ہیں۔ ایسی کانفرنسوں میں ان لوگوں کو ہرگز شامل نہیں کرنا چاہیئے جو فسادات کے بانی مبانی خیال کئے جاتے ہیں۔ کیونکہ وہ کسی صلح خیز نتیجے پر پہنچنے میں روڑے اٹکائیں گے اور بنے بنائے کام کو بگاڑ دینگے۔

ایسی کانفرنسوں کا مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ ہندو مسلمانوں میں بدمزگی کے اساسی اسباب دریافت کرتے ہوئے یہ معلوم کریں کہ ان اسباب کو کن طریقوں سے دور کیا جا سکتا ہے۔ نیز

ہندو مسلمانوں کی بلا تفریق مذہب و ملت کونسی ضرورتیں ہیں جو پوری نہیں ہوتیں۔ جن کی وجہ سے آپس میں بدمزگی پیدا ہوتی ہے۔ ان ضرورتوں کو پورا کرنے سے ظاہری حالات اور باہمی تعلقات میں کیا تبدیلی واقعہ ہوگی۔ آیا اس طریق کار سے فسادات کا خاتمہ ہوسکیگا۔ ہندو مسلمان کن طریقوں سے ایک دوسرے کو زک پہنچا رہے ہیں۔ یہ طریقے اختیار کرنے کا باعث کسی جماعت کی تعلیمی کمزوری۔ سیاسی پستی یا معاشی انحطاط تو نہیں ہے۔ اگر کوئی جماعت حقیقت میں دوسری جماعت سے پیچھے ہے تو اس کا سبب اس کے اپنے مذہبی قوانین اور رسم و رواج تو نہیں یا واقعی وہ دوسری قوم کی دراز دستی اور بدسلوکی کا شکار ہیں +

اگر اس طریقے سے صحیح جذبات کے ساتھ اس ٹیڑھے مسئلہ پر غور کیا جائے تو بہت جلد ہندو مسلم فسادات کا خاتمہ ہوسکتا ہے۔ موجودہ زمانے میں جبکہ یورپ جنگ عظیم کے خطرات میں مبتلا ہے۔ اور اندیشہ ہے کہ جنگ کے چھڑ جانے سے انسانی قوتوں جانی اور مالی نقصانوں سے تمام اقوام عالم کا شیرازہ بکھر جائیگا تو کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ حکومت ہند۔ ہندوستان میں امن عامہ پیدا کرنے کی بدل خواہشمند نہ ہو۔ اور اس مسئلے کے حل کرنے میں اہل ملک کی پوری طرح امداد نہ کرے +

بیروزگاری

بیروزگاری کی عمومیت آجکل بیروزگاری کی بہت ہی گرم بازاری ہے۔ کوئی جگہ ایسی نہیں جہاں بیروزگاروں کی انجمنیں قائم نہیں یا بیروزگاری کے خلاف جہاد نہ ہو رہا ہو۔ مدت سے مسئلہ بیروزگاری پر حکومت اور رعایا کی توجہ مرتکبز ہے لیکن ابھی تک اس کا کوئی عمدہ حل دریافت نہیں ہؤا۔ سرکاری اور غیر سرکاری کمیٹیاں اور کمیشن مقرر ہوئے تاکہ بیروزگاری کو دُور کرنے کے لئے مناسب تجویزیں سوچیں لیکن کسی صورت سے بھی یہ مشکل اور اہم مسئلہ حل نہیں ہو سکا۔ اور نہ مستقبل قریب میں اس آفت کے دُور ہونے کے امکانات نظر آتے ہیں اصل میں بیروزگاری مادرِ ہند کے بدن پر ایک ایسا خوفناک زخم ہے جس کو جتنا زیادہ کھجایا جا رہا ہے اسی قدر زیادہ بڑھ رہا ہے اور اس کے اندمال کی کوئی صورت نظر نہیں آتی ۔

بیروزگاری قدیم الایام ہے بیروزگاری کا مسئلہ کوئی نیا مسئلہ نہیں ہے۔ مدتہائے دراز سے نہ صرف ہندوستان بلکہ کل ممالک عالم اس مصیبت میں گرفتار ہیں۔ بیکاری ہندوستان میں بھی

مدتوں سے ہے۔ اور دن بدن اس میں ترقی ہو رہی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ پہلے بیکاری کے شکار دیہاتی اور جاہل تھے اور اب تعلیم یافتہ طبقہ بھی اس مصیبت میں گرفتار ہے۔ ہمارے ملک میں بیروزگاری کے خلاف صدائے احتجاج تعلیم یافتہ لوگوں کی طرف سے بلند کی جارہی ہے۔ ورنہ دیہاتی جس طرح بھی ممکن ہے اپنا گزارہ کر رہے ہیں۔ بیکاری کی وجہ سے مصیبت ان لوگوں پر اور بھی زیادہ ہے۔ جو اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے اپنا نام نہاد معاشی معیار بلند کر بیٹھے ہیں۔ اور اب کوئی ایسا کام کرنے کو طیار نہیں جس سے ان کا معیار زندگی پست ہو۔ اسی لئے وہ ذلت کی زندگی پر موت کو ترجیح دیتے ہیں چنانچہ جب ان کو حسب منشاء کوئی کام نہیں ملتا تو وہ خودکشی کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔

بیروزگاری کے نتائج

اخباروں میں آئے دن اس قسم کی وحشتناک خبریں شایع ہوتی رہتی ہیں کہ فلاں شخص نے بیکاری سے تنگ آکر خودکشی کر لی۔ کسی نے بیروزگاری سے مایوس ہو کر اپنے آپ کو ریل گاڑی کے آگے پھینک دیا۔ کہیں سے خبر آتی ہے کہ بیکاری سے فاقہ کشی کی نوبت آئی اور فاقہ کشی کی تاب نہ لا کر کوئیں میں چھلانگ مار دی۔ غرض بیکاری اور بیروزگاری سے تعلیم یافتہ افراد نیم جاں ہو رہے ہیں مثل مشہور ہے کہ پے درپے فاقے حرام کو بھی حلال کر دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے اعلیٰ تعلیم یافتہ

جن کی تعلیم پر کم از کم چالیس پچاس روپے ماہوار سے کم خرچ نہیں ہوئے اب پندرہ بیس کی ملازمت کرنے پر بھی آمادہ ہو گئے ہیں۔ اس پر قیامت یہ ہے کہ اتنے کی ملازمت بھی نہیں ملتی کوئی دستکاری آتی نہیں کہ کام کر سکیں۔ محنت مزدوری کرنے کے لئے جسم میں طاقت اور خون نہیں۔ وہ تو کتابوں اور امتحانوں نے چوس دیا۔ محض سندیں ہیں جن کو بیٹھے دیکھا کرو اور دل ہی دل میں کڑھا کرو کہ عزیز وقت بیکار ضائع کیا اور کچھ بھی نہ پایا"۔

ایک عدیم النظیر مثال

تین چار سال کا ذکر ہے کہ لاہور میں ایک گریجویٹ نے بیکاری سے تنگ آ کر بوٹوں پر پالش کرنے کا کام شروع کیا تھا۔ وہ بڑے شوق اور انہماک سے یہ کام کرتا تھا۔ سڑک پر سینکڑوں اور ہزاروں آدمی اس کو دیکھنے کے لئے جمع ہو جاتے تھے۔ آخر حکام پولیس نے تنگ آ کر اس کا چالان کر دیا۔ عدالت میں مقدمہ پیش ہوا۔ اس نے کہا میں حکومت کی توجہ بیروزگاری کی طرف دلانا چاہتا ہوں اور تعلیم یافتہ افراد میں پیٹ پالنے کے لئے ذلیل سے ذلیل کام کرنے کی جرأت پیدا کرتا ہوں۔ میں اپنے فعل سے ثابت کرتا ہوں کہ ہمارے ملک میں تعلیم کی یہ قدر ہے کہ کھانے کو روٹی اور تن ڈھانکنے کو کپڑا نہیں

ملتا۔ مگر جوتیوں پر پالش کر کے انسان آسانی سے روزی پیدا کر سکتا ہے ۔

مسئلہ بیروزگاری ایسا ہمہ گیر مسئلہ ہے کہ زندگی کے ہر شعبے پر اس کا اثر پڑ رہا ہے۔ بیکاری کی وجہ سے تجارت میں کساد بازاری ہے۔ اقتصادی حالت تباہ ہے۔ معاشی معیار پست ہو رہا ہے۔ سیاسی بےچینی سے حکومتوں کی بنیادیں متزلزل ہیں۔ صنعت و حرفت کو اس سے نقصان پہنچ رہا ہے۔ تعلیم کی اس سے بیقدری ہے۔ اقوام عالم کے اخلاق اس سے خراب ہو رہے ہیں۔ غرض انسانی زندگی کے ہر شعبے میں انحطاط کا عمل جاری ہے جس سے عمومی تنزّل کا سخت ترین خطرہ سامنے نظر آتا ہے ۔

ہندوستان کی مخصوص دقتیں

بیروزگاری کے معاملے میں ہندوستان کی دقتیں مخصوص ہیں۔ ماہرین کا خیال ہے کہ ہندوستان ابھی ارتقائی منزل طے کر رہا ہے اِس لئے یہ کہنا بیجا ہے کہ یہاں بیکاروں کے لئے کوئی کام نہیں رہا۔ جس مُلک میں ترقی کرنے کا میدان وسیع ہو وہاں اس قسم کی شکایت کرنا غلطی ہے۔ ہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ جن کاموں میں مخصوص قابلیّت کی ضرورت ہے۔ اس کے لئے ویسی قابلیت کے آدمی یہاں موجود نہیں ہیں۔ دوسرے الفاظ میں جس قسم کی

تعلیم و تربیت عام طور پر لوگوں کو دی جاتی ہے۔ ویسا کام ان کو نہیں ملتا۔ اس لئے بیروزگاری کی شکایت برابر بڑھ رہی ہے۔ اور ملک میں بےچینی روزافزوں ہے۔

ہندوستان کا تعلیم یافتہ طبقہ زیادہ تر دفتری ملازمت کا خواہشمند ہے۔ ظاہر ہے کہ دفاتر ہر سال اُتنے آدمیوں کو ملازمت نہیں دے سکتے جتنے ہر سال تعلیم سے فارغ ہوتے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ صنعتی اور زرعی تعلیم حاصل کی جائے۔ اور اس کے بعد اپنی ذاتی کوشش سے کوئی کام شروع کیا جائے۔ صنعتی ادارے بہت سے بیروزگاروں کو روزگار دے سکتے ہیں۔ صدیوں کے تساہل اور جمود نے ہم لوگوں کی ہمّت کو پست کر دیا ہے۔ اور ہم یہ سمجھنے لگے ہیں کہ کوئی ایسا کام سرسبز اور کامیاب نہیں ہو سکتا جس میں حکومت کی امداد شامل نہ ہو۔ یہی بات ترقی اور عروج کے منافی ہے۔ بیروزگاری کے وبال کو دُور کرنے کے لئے حکومت پر انحصار کرنا اور خود ہمت نہ کرنا اس پیچیدہ مسئلہ کو پیچیدہ تر بنا رہا ہے۔

موجودہ تعلیم کے نقائص

موجودہ طرز تعلیم سے ہمیں اور بھی زیادہ نقصان پہنچ رہا ہے۔ اعلیٰ تعلیم کی بدولت معیار زندگی بلند ہوتا جا رہا ہے اور آمدنی کے وسائل کم ہو رہے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک گھر میں ایک شخص کمانے والا ہے۔ وہ اپنی اولاد کو

عام دستور کے مطابق مروجہ اعلیٰ تعلیم دلواتا ہے۔ تعلیم حاصل کرنے کے بعد کثیر تنخواہ کی ملازمت نہ ملنے کے باعث اولاد بیکار رہتی ہے۔ آخر کار نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس گھر کا معیار زندگی پست ہو جاتا ہے۔ نمائش کا شوق چھوٹی موٹی نوکری کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ اس لئے مفروضہ معیار کو قائم رکھنے کے لئے یا قرض لیا جاتا ہے یا چوری کی جاتی ہے یہی وجہ ہے کہ تعلیم یافتہ گروہ میں انقلاب اور بغاوت کے خیالات نشو ونما پا رہے ہیں۔ اور حکومت رفاہ عام کے کاموں کو پس پشت ڈال کر اپنی کوششیں اس گروہ کی اصلاح اور انسداد میں صرف کر رہی ہے +

سرکاری ملازمت کا شوق

اس میں کوئی شک نہیں کہ تعلیم یافتہ لوگوں کی بیکاری کا مسئلہ محض موجودہ طرز تعلیم کا نتیجہ ہے یہ تعلیم اس لئے رائج کی گئی تھی کہ حکومت ہند کو اپنے دفاتر میں کام کرنے کے لئے کلرکوں کی ضرورت تھی۔ تھوڑے سے عرصے میں یہ ضرورت پوری ہو گئی۔ لیکن طرز تعلیم میں کوئی تبدیلی نہیں کی گئی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بیروزگاروں کی تعداد دن دگنی اور رات چوگنی ہو رہی ہے۔ گورنمنٹ کے ملازموں کی عزت، فارغ البالی اور کثیر تنخواہ کو دیکھتے ہوئے ہر تعلیم یافتہ شخص کی یہی خواہش ہوتی ہے کہ وہ بھی حکومت کی ملازمت کر لے۔ لیکن ملازمتیں اتنی کہاں ہیں کہ ہر ایک کی یہ آرزو پوری ہو سکے۔ ملازمت کے امیدواروں کی زیادہ تعداد کو

دیکھ کر حکومت نے مقابلے کے امتحان کا دستور نکالا ہے تاکہ بہترین امتحانی قابلیت کا شخص انتخاب ہو سکے۔ اب حالت یہ ہے کہ اگر چند آدمیوں کی ضرورت ہوتی ہے تو ہزاروں آدمی امتحان دے کر ناقابلیت کی سند لیتے ہیں۔ اور بیکار مارے مارے پھرتے ہیں۔ اور کہتے ہیں نوکری کریں گے تو گورنمنٹ کی۔ اگر ہندوستان کے تمام اخباروں کو جمع کر کے ان صفحات کا جایزہ لیا جائے۔ جن میں مختلف قسم کی ملازمتوں کی ضرورت کے اشتہارات ہوتے ہیں تو بلاشبہ ہزاروں ملازمتوں کے اشتہار نکلیں گے۔ لیکن حکومت کی ملازمت کے دلدادہ نجی کی نوکری کو حساب وشمار ہی میں نہیں لاتے اس کی وجہ یہ ہے کہ نجی کی ملازمتوں میں زیادہ ہمت اور محنت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور یہ صفتیں موجودہ تعلیم کھو دیتی ہے۔ سرکاری ملازمت تو انسان کو محض اس قابل بنا دیتی ہے کہ کرسی پہ بیٹھ کر چند سطریں لکھ دی جائیں۔ زبانی باتیں ہوں اور عمل کا نام تک نہ ہو ٭

وحشت انگیز جماعت کی تنظیم بیروزگاری کا نتیجہ ہے

بیروزگاری کی وجہ سے ملک میں ایک انقلابی جماعت پیدا ہو گئی ہے جس سے حکومت اور عوام کا معاشی نظام درہم برہم ہو رہا ہے۔ آئے دن نہایت وحشتناک خبریں اخباروں میں گشت لگاتی رہتی ہیں۔ چلتی گاڑیوں میں ڈاکے پڑتے ہیں۔ بنکوں اور ساہوکاروں کو لوٹا جاتا ہے۔ ریل کی پٹڑی توڑ کر

اَن گنت جانیں ضایع کی جاتی ہیں - پُرامن مجمعوں پر بم پھینک کر بے گُناہ لوگوں کا خُون بہایا جاتا ہے. بیروزگاری اور بیکاری کے سبب سے حکومت کے خلاف دو نہایت منتظم جماعتیں پیدا ہوگئی ہیں - دہشت انگیز جماعت نے حکومت اور پبلک کو اپنے دہشت انگیز کاموں سے خوفزدہ کر رکھا ہے - دوسری جماعت حکومت کا خاموشی سے مقابلہ کرنے والی ہے - حقیقت میں وہ دہشت انگیز جماعت سے کہیں زیادہ خطرناک ہے - کیونکہ وہ اپنی غیر متشدّد پالیسی سے عوام میں حکومت کے خلاف نہایت مدبرانہ طریقے سے نفرت اور حقارت کا جذبہ پھیلاتی ہے - سچ یہ ہے کہ اسی جماعت میں سے تشدّد پسند جماعت پیدا ہوئی ہے - جو پُرجوش نوجوانوں پر مشتمل ہے - ان کا خیال یہ ہے کہ ہندوستان میں جس قدر بیروزگاری اور تباہ حالی پیدا ہوئی ہے - وہ غیر مُلکی حکومت کے غیر ہمدردانہ سلوک کا نتیجہ ہے - اِس لئے وہ کھُلے بندوں حکومت کی مخالفت اور اُس کے اقتدار کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں - جب پکڑے جاتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم حکومت کو خوابِ خرگوش سے بیدار کرنا چاہتے تھے - ان تحریکوں کا انجام چاہے کچھ ہی ہو - لیکن یہ بدیہی امر ہے کہ دہشت انگیزی سے ڈرایا تو حکومت کو جاتا ہے - لیکن اس کا نقصان براہ راست عوام کو پہنچتا ہے - بہرحال حکومت کا فرض ہے کہ اس طرف فوراً توجہ

دے اور جلد سے جلد بیروزگاری کا انسداد کرے تاکہ ملک میں امن قائم رہے ؛

موجودہ تعلیم سے صنعت وحرفت کو نقصان پہنچا ہے ؛ ؛

موجودہ تعلیم میں سب سے بڑا نقص یہی ہے کہ اس میں محض دماغی نشوونما کا پہلو مدنظر رکھا گیا ہے۔ اور عملی تعلیم کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے۔ انٹرینس تک نہ تو کوئی دستکاری سکھائی جاتی ہے۔ اور نہ تجارت زراعت اور صنعت وحرفت کا شوق طبیعت میں پیدا کیا جاتا ہے۔ اس تعلیم سے ان لوگوں کو خاص طور پر زیادہ نقصان پہنچتا ہے۔ جن کے گھروں میں کوئی صنعت وحرفت جاری ہے مثلاً ایک بڑھئی کا بیٹا انٹرینس پاس کرنے تک اپنے آبائی کام کو کبھی ہاتھ نہیں لگاتا دس سال کے عرصے میں دستکاری کا شوق بالکل فنا ہو جاتا ہے اس طرح سے صناعوں اور کاریگروں کے گھرانوں سے موجودہ تعلیم صنعت وحرفت کا خاتمہ کر رہی ہے۔ اور عوام دستکاری وغیرہ کو ذلیل اور نیچ پیشہ خیال کرنے لگے ہیں جس سے ہندوستان کی گھریلو صنعتوں کو خاص طور پر سخت نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے؛

صنعتی تعلیم کی ضرورت

گزشتہ سالوں میں حکومت نے ہر صوبے میں بہت سی صنعتی تجارتی اور زرعی درسگاہیں جاری کی ہیں جن کو کافی مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ ان درسگاہوں کے تعلیم یافتہ طالب علموں کو ہماری یونیورسٹیوں کے تعلیم یافتہ لوگونکی نسبت

جلدی سے نوکری مل جاتی ہے۔ اور وہ بیکاری کے مضر اور نقصان دہ اثرات سے محفوظ رہتے ہیں ؎

موجودہ تعلیم کی اہمیت

بیشک ہندوستان میں صنعتی تعلیم کی از حد ضرورت ہے۔ لیکن موجودہ طرز کی تعلیم گاہوں کے دروازے قطعی بند کر دینا بھی نقصان سے خالی نہیں۔ موجودہ تعلیم کے ذہنی ارتقاء سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا اس کو جاری رکھنے کے لئے محض اتنی احتیاط کی ضرورت ہے۔ کہ ابتدائی تعلیم کے زمانہ میں اس بات کا خاص خیال رکھا جائے کہ طالب علم کا دلی رجحان کس طرف ہے۔ ثانوی تعلیم اس کے شوق کو دیکھ کر شروع کی جائے۔ تاکہ وہ خاطر خواہ ترقی کر سکے۔ زمانے کی رَو میں بہ جانے سے اسی قسم کے نقصانات ہوتے ہیں جن کا تعلیم یافتہ طبقہ شکار ہو رہا ہے؎

صنعتی تعلیم میں بھی احتیاط کی ضرورت ہے

اگر صنعتی تعلیم کی درسگاہیں علمی درسگاہوں کی طرح کثرت سے کھول دی گئیں۔ اور ان میں طلباء اسی بہتات سے داخل ہو گئے جس طرح علمی مدرسوں میں ہیں تو یقیناً ہندوستان کی صنعتیں جو ابتدائی اور ارتقائی منازل طے کر رہی ہیں ان لوگوں کی کثیر تعداد کو جذب نہیں کر سکیں گی۔ اس لئے صنعتی تعلیم کے ساتھ ساتھ نہایت ضروری ہے کہ ایسے صنعتی مرکز بھی کھولے جائیں۔ جو صنعتی مدرسوں کے تعلیم یافتہ طلباء کو ملازمتیں بہم پہنچا سکیں ؎

اسی طرح ان طلبا کا زرعی درسگاہوں میں داخل ہونا بھی کوئی معنی نہیں رکھتا۔ جن کے پاس زمینیں نہیں ہیں۔ زرعی درسگاہوں کا اصلی مقصد یہ ہے کہ زمینداروں کے لڑکے اعلیٰ زرعی تعلیم حاصل کرنے کے بعد اپنی زمینوں کی کاشت اور انتظام نہایت اعلیٰ پیمانہ پر کریں۔ اور بجائے اس کے کہ وہ شہروں میں نوکری کے لئے مارے مارے پھریں۔ فارغ التحصیل ہو کر اپنے گھروں میں جا کر رہیں۔ اور اپنی تعلیم و قابلیت سے زراعت کو ترقی دیں۔ امید ہے کہ اس تحریک سے دیہاتوں کی تباہ حالی خوشحالی سے بدل جائیگی +

ہندوستان کی تباہ حالی کے اسباب اندازہ کیا گیا ہے کہ ہندوستان میں اسوقت تقریباً چار کروڑ انسان بیکاری کا شکار ہیں یعنی ہر سو آدمیوں میں سے گیارہ بیروزگار ہیں۔ اس کی وجہ زیادہ تر اقتصادی کمزوری بتائی جاتی ہے۔ ہماری مالی حالت بھی کچھ پوشیدہ نہیں ہر ہفتے لاکھوں اور کروڑوں روپے کا سونا ہمارے مُلک سے باہر چلا جاتا ہے۔ تجارتی کیفیت یہ ہے کہ اوّل تو ملک میں پیداوار ہی ضرورت سے کم ہوتی ہے۔ اور اگر زیادہ ہو تو ان چیزوں کے تبادلے میں بیرونی ممالک میں بھیج دی جاتی ہے۔ جہاں کی مصنوعات ہمارے مُلک میں آتی ہیں۔ ہندوستان کی صنعتیں ترقی کے میدان میں اس قدر پیچھے

ہیں کہ غیر ممالک ہمارے مُلک میں اپنی مصنوعات ہماری تیار کی ہوئی مصنوعات سے کم قیمت پر فروخت کرتے ہیں۔ مقابلہ نہ کر سکنے کی وجہ سے ہماری صنعتیں ترقی نہیں کرتیں اور دن بدن تباہ ہوتی جاتی ہیں۔ چنانچہ دوسرے ملکوں کے سستے مال کی درآمد سے ہماری اقتصادی حالت بد سے بدتر ہو گئی ہے۔ اس کے علاوہ مشینوں کے عام استعمال نے ان گھریلو صنعتوں کا خاتمہ کر دیا ہے جن سے چھوٹے چھوٹے گھرانے اپنی روزی پیدا کر لیتے تھے۔ موجودہ تعلیم نے معیارِ زندگی کو غیر معمولی طور پر بلند کر کے ہندوستان جیسے غریب مُلک کو اور زیادہ مالی مشکلات میں مبتلا کر دیا ہے۔ جن لوگوں کے پاس روپیہ ہے وہ اس کو مفید صنعتوں میں صرف کر کے عوام کو فائدہ پہنچانا نہیں جانتے۔ ہم لوگوں کا روپیہ اگر صرف ہوتا ہے تو ایسے کاموں پر جن سے مُلک کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا بلکہ محض انفرادی خوشی حاصل ہوتی ہے۔

ہمارے تجارتی مرکزوں میں بھی کساد بازاری کا دَور دورہ ہے۔ اسکی وجہ زیادہ تر یہ ہے کہ ہماری مصنوعات دیگر ممالک کی مصنوعات سے مہنگی تیار ہوتی ہیں۔ اور مقابلے کی تاب نہیں لا سکتیں۔ اس کے علاوہ ہمارے مُلک کے پاس تجارت کے لئے روپیہ بھی بہت کم ہے۔ تعلیم کو لیجئے تو اس کا بھی یہی حال ہے۔ صنعت و حرفت کے لئے جس قسم کے آدمی درکار ہیں۔ وہ ڈھونڈے نہیں ملتے۔ اگر ملتے ہیں

تو غیر ملکی تعلیم یافتہ جن کو اتنی زیادہ تنخواہ دینی پڑتی ہے کہ کوئی صنعت آسانی سے ان کا بوجھ برداشت نہیں کر سکتی۔ ہماری یونیورسٹیاں جس قسم کے تعلیم یافتہ پیدا کر رہی ہیں وہ سوائے سرکاری دفاتر کے کسی اور مصرف کے نہیں ہوتے اور کوئی حکومت بھی اتنی کثیر تعداد کو ہر سال اپنے دفاتر میں جذب نہیں کر سکتی۔ اگر زراعت کو مغربی ممالک کے انداز پر پیمانۂ کثیر پر لایا جاتا ہے تو اس کے لئے اسقدر روپے کی ضرورت ہے کہ زمینداروں کے پاس موجود نہیں اور پھر اس سے ایک دم اتنا منافع نہیں ہو سکتا کہ لگایا ہوا روپیہ ایک دو سال میں واپس آجائے مشینوں کے عام استعمال نے گھریلو صنعتوں کو تباہ کر دیا ہے تعلیم کے رواج نے معیار زندگی اسقدر بلند کر دیا ہے کہ ہر گھر کی آمدنی اس کو قائم نہیں رکھ سکتی۔ لوگوں کو عام طور پر روپیہ جمع کرنے کا بہت زیادہ شوق ہے اس کو یا تو صندوقوں میں بند کر کے رکھ دیا جاتا ہے یا زیور بن جاتے ہیں۔ اس طرح سے دن بدن روپیہ کم ہو رہا ہے۔ اور روپیہ کے کم ہونے کا اثر تجارت کی ترقی پر پڑ رہا ہے۔ اس کے علاوہ شادی بیاہ اور مرنے جینے کے رسم و رواج بہت صرف طلب ہیں۔ امیر غریب ان رسموں کو ادا کرنے سے قرضدار ہو جاتے ہیں اور مدتوں تک اس سے سبکدوش نہیں ہو سکتے۔

بیروزگاری کے انسداد کی تدبیریں	ہندوستان کی حالت کو دیکھتے ہوئے

نہایت ضروری ہے کہ محض اُنہی لوگوں کو یونیورسٹی تعلیم دی جائے جن کے والدین مدّتوں بے دریغ روپیہ خرچ کر سکتے ہیں اور حقیقتاً وہ طالب علم بھی اس قابل ہونے چاہئیں کہ یونیورسٹی کی تعلیم آیندہ زندگی میں ان کے لئے مفید ہو۔ یہ کھُلی ہوئی حقیقت ہے کہ ہمارے مُلک کی ترقی صنعت و حرفت سکھانے کی درسگاہیں کھولنے پر مبنی ہے۔ ان کے ساتھ ساتھ مشترکہ سرمایہ سے ایسے بڑے بڑے کارخانے کھولنے بھی ضروری ہیں جو صنعتی اداروں کے تعلیم یافتہ لوگوں کو آسانی سے جذب کر لیں اس کے علاوہ فنّی اور صنعتی تحقیقات کے ادارے بھی کھولے جائیں جو نہایت قابل طلبا کو تنخواہیں بھی دیں اور ان سے مفید کام بھی لیں نیز دیہاتوں میں تعلیم کی روشنی پھیلائی جائے تاکہ دیہاتیوں کی جہالت دُور ہو اور وہ ان نقصانات سے محفوظ رہیں جو اپنی سادگی اور بے علمی کی وجہ سے عموماً اُٹھاتے ہیں۔

آجکل یہ تجویز بھی زیرِ غور ہے کہ پچاس سال کی عمر ہونے کے بعد سرکاری ملازموں کو پنشن دیدی جائے۔ اور ان کی جگہ نئے ملازم بھرتی کئے جائیں۔ نیز جن عہدوں کی تنخواہیں بہت زیادہ ہیں وہ کم کر دی جائیں۔ بڑی بڑی تنخواہوں پر غیر ممالک سے کوئی شخص نہ بُلایا جائے اور کم صرف پر یہی کام اپنے مُلک کے آدمیوں سے لیا جائے۔ نیز ملٹری پر کم سے کم روپیہ صرف کرنے کی تجویز پر

زور دیا جا رہا ہے تاکہ اس روپے کو ہندوستان کی ترقی اور بہتری کی مدوں پر صرف کیا جائے ۔

حال ہی میں حکومت ہند نے یہ تجویز پیش کی ہے کہ گورنمنٹ کی ملازمت میں داخل ہونے کے لئے ۱۸ سالہ نوجوانوں کا داخلے کا امتحان لے لیا جائے اور ۴ ۲ سال تک ان کو ملازمت کا امیدوار رکھا جائے۔ ایسی تجویز سے بھی بیروزگاری میں تخفیف ہونی مشکل ہے کیونکہ سر دست دقت یہ درپیش ہے کہ جتنے امیدوار ہیں اتنی ملازمتیں موجود نہیں ہیں۔ اس قسم کا امتحان ملازمتوں کی تعداد میں اضافہ نہیں کر سکتا۔ اس لئے بیروزگاری کا صحیح حل نہیں کہلایا جا سکتا۔ ملازم رکھنے کے نت نئے اصول بنانے سے بھی بیروزگاری دُور نہیں ہو سکتی۔ اصل میں اس مسئلے کا صحیح حل یہ ہے کہ حکومت اور رعایا متفقہ کوششوں سے طلبا کو یونیورسٹی کی تعلیم حاصل کرنے سے پہلے اس قسم کی ابتدائی تعلیم کا شوق دلائیں جس سے درسی تعلیم ختم کرنے کے بعد وہ کسی صنعتی ادارے میں کچھ نہ کچھ کام سیکھنے لگیں۔ اس کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ ملک کے معاشی سرچشموں کو ترقی دی جائے۔ اور زراعت تجارت اور صنعت و حرفت کا شوق طلبا کے دلوں میں ابتدائی تعلیم کے زمانے ہی میں پیدا کر دیا جائے تاکہ ان کی توجہ ملازمت حاصل کرنے کی طرف سے ہٹ جائے اور وہ شروع ہی سے اور پیشہ کی طرف دلی شوق سے متوجہ ہو جائیں۔ امید ہے کہ اس

طریقے سے محض بیروزگاری کا مسئلہ ہی حل نہیں ہوگا بلکہ مُلک کی اقتصادی حالت بھی بہتر ہو جائیگی ؛

عملی پیش قدمی موجودہ دَور میں ہر صوبائی حکومت بیروزگاری کی طرف متوجہ ہے۔ اور اس بارے میں بہت سے صُوبوں نے عملی طور پر کچھ نہ کچھ پیش قدمی بھی کی ہے۔ مثلاً پنجاب میں یہ قرار پایا ہے کہ تعلیم یافتہ نوجوانوں کو زمین کا ایک اتنا بڑا ٹکڑا کاشت کرنے کے لئے دیدیا جائے جس میں کاشتکاری کر کے وہ معقول روزگار مہیّا کر سکیں۔ لیکن شرط یہ ہے کہ اس زمین میں خود کاشتکاری کی جائے۔ اس کے علاوہ بعض مفید گھریلو صنعتوں کی تعلیم بھی دی جا رہی ہے جس سے امید بندھتی ہے کہ بیروزگاروں کی ایک معقول تعداد کے لئے روزگار مہیّا ہونے کے ذرائع بہت جلد وسیع ہو جائینگے ؛

حکومت صوبجات متحدہ بھی اس میدان میں کسی اور صُوبے سے پیچھے نہیں۔ وہاں بھی ہر سال بہت سے تعلیم یافتہ نوجوانوں کو انتخاب کر کے ان کو گھریلو صنعتوں کی تعلیم دی جا رہی ہے۔ تعلیم حاصل کرنے کے بعد ان نوجوانوں کو حکومت کی طرف سے کچھ مالی امداد بھی ملتی ہے جس سے وہ اپنا کاروبار شروع کر سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ یو۔پی کی حکومت کی سب سے زیادہ توجّہ تعلیمی ترقی کی طرف ہے۔ ان کا خیال ہے کہ وردھا سکیم بہت سے

تعلیم یافتہ نوجوانوں کے لئے روزگار مہیا کر دے گی ۔

ابھی چند دن ہوئے حکومت بہار نے اعلان کیا تھا کہ حکومت کی طرف سے بیروزگاروں کے لئے جو محکمہ اطلاعات قائم کیا گیا تھا وہ اطلاعات مہیا کرنے کے علاوہ تعلیم یافتہ بیروزگاروں کے لئے صنعتی تعلیم اور علمی اور عملی ٹریننگ دینے کا بھی انتظام کر رہا ہے ۔

بمبئی کے ہندوستانی تاجروں کی انجمن نے حکومت ہند کے سامنے تجویز پیش کی ہے کہ ۱۹۴۱ء کی مردم شماری میں متوسط طبقہ اور مزدور پیشہ لوگوں کے متعلق بیروزگاری کی تفصیلات بھی حاصل کی جائیں تاکہ حالات کا صحیح اندازہ کر کے کوئی عملی قدم اٹھایا جائے ۔

صوبہ مدراس میں حکومت کی طرف سے اعلان کیا گیا ہے کہ حکومت کے زیر غور یہ تجویز ہے کہ تعلیم یافتہ بیروزگاروں کو زرعی اور گھریلو صنعتوں وغیرہ کی تعلیم دینے کے لئے ہر ضلع میں ایک تعلیمی مرکز جاری کیا جائے ۔ اس مفید سکیم کا تجربہ شروع میں چار ضلعوں میں کیا جائیگا یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ ہر ضلع کے ایسے مرکز کو پانسو ایکڑ زمین بھی دی جائیگی اور اس کے علاوہ اس فنڈ میں سے کچھ مالی امداد بھی ملے گی جو ہر برسر روزگار سے ایک روپیہ چندہ لے کر جمع ہو گا ۔ تجویز یہ ہے کہ ہر وہ شخص جو بیس روپے ماہوار تنخواہ لیتا ہے اور تین سال سے ملازم ہے چاہے وہ کوئی

بچ کا کام کرتا ہے یا سرکاری ملازمت میں ہے اس سے بیروزگاروں کی امداد کے لئے ایک روپیہ چندہ لیا جائے۔ اس طریقے سے جس قدر روپیہ جمع ہو حکومت اسی قدر رقم اپنی طرف سے اس میں شامل کردے۔ اور پھر یہ رقم بیروزگاری دُور کرنے کے لئے صرف کی جائے۔

اس کے علاوہ حکومت مدراس نے تعلیمیافتہ بیروزگاروں کی مردم شماری بھی کی ہے جس سے صُوبے کی صحیح حالت کا اندازہ ہوتا ہے۔ ظاہر ہے یہ ایسے اقدامات ہیں جن سے بیروزگاری کی اصلی کیفیت آئینہ ہو کر مُلک و قوم کی تمام تر توجہ اس طرف منعطف ہو جائیگی اور واثق امید ہے تعلیمیافتہ افراد کی بیروزگاری کا کچھ نہ کچھ انسداد ہو سکیگا۔

درخشندہ مستقبل | اسوقت حکومت اور رعایا کی توجہ ہندوستان کی ترقی اور بیروزگاری کے مسائل پر مرتکز ہے اگر یہ ضروری مسائل اور ان کو حل کرنے کی کوششیں اسی طرح جاری رہیں تو بہت جلد ہمارا مُلک ایک ایسے دَور میں قدم رکھیگا جس میں تجارت، زراعت اور صنعت وحرفت غرض زندگی سے متعلق ہر شعبہ میں ترقی ہو گی۔ اور اس ترقی کی بدولت ہمارے مُلک سے بیروزگاری عنقا ہو جائیگی۔

”گداگری“

ابتدا | گداگری کی ابتدا اور تدریجی ترقی کی چھان بین کے لئے کچھ زیادہ جانکاہی اور عرق ریزی کی ضرورت نہیں۔ قیاس و ادراک کی رہنمائی سے معلوم ہوتا ہے کہ جب نوع انسان نے عالم خاک کو آباد کیا ہوگا تو تھوڑی سی مدت کے بعد گداگری کا آغاز ہو گیا ہوگا۔ کیونکہ جب حضرت انسان علیتین سے اس تیرہ خاکدان میں تشریف لائے تو ان کے سر پر مصائب و آلام کے ایسے بوجھ لدے ہوئے تھے کہ ”اُٹھائے نہ اُٹھے اور گرائے نہ بنے“ کے پورے پورے مصداق تھے، وہ ہر چند اپنی غیر فانی املاک کو ورثے میں تقسیم کرتے تھے لیکن اس لازوال اور بچکدار ترکے میں کچھ ایسی برکت تھی کہ کسی طرح کمی نہ آتی تھی، جس طرح شدائد زمانی اور آفت ہائے آسمانی اب بھی لوگوں کو لنگڑا، لولا، لنجہ، اپاہج بنا کر دوسروں کا محتاج بنا دیتی ہیں اسی طرح اسوقت بھی اپنی کرنی میں کمی نہ کرتی ہونگی، یہ آلام و مصائب انسانی زندگی کے ابتدائی دور میں آزمایش کے لرزہ خیز نام سے موسوم تھے اور لوگ ان کو خوشی خوشی برداشت کرتے تھے۔ لیکن اب ہم ان کو جزا اور

سزا کا نام دیتے ہیں اور عقل کی گرہ کشائی سے ان سے سبکدوش ہونے کی کوشش بھی کی جاتی ہے چونکہ ہمدردی ذاتِ انسانی کا مخصوص جوہر ہے اس لئے جو شخص اس ابتلا اور آزمایش میں گرفتار ہو جاتا ہے ہم اس سے پوری پوری ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں اور دامے، درمے، قدمے، امداد کا مستحق بھی سمجھتے ہیں، ان حالات کو پیشِ نظر رکھ کر ہم کہہ سکتے ہیں کہ ابتدائے آفرینش سے گداگری نے بھی انسان کی طرح عروج و زوال کے مدارج طے کئے ہونگے جب انسان کا گزر مدارجِ زوال میں ہوگا تو گداگری اسوقت عروج کی منزلوں میں ہوگی ؛

علمی گداگری ٹھیک ان دنوں جب یونان علوم و فنون کا مرکز تھا اور اس کی روشنی افرادِ عالم کی نظروں کو خیرہ کر رہی تھی۔ وہاں ایک نئی قسم کی گداگری کا آغاز ہوا جسے علمی گداگری کہیں تو بجا ہے۔ دانایانِ یونان نے قرار دیا کہ علوم و فنون صحیح معنوں میں اہلِ یونان کی کفالت اور سرپرستی ہی سے ترقی کر سکتے ہیں اس لئے طلبا کا پیٹ پالنا ہر کھاتے پیتے شخص کا فرض ہے تاکہ طالب علم بیفکر ہو کر تعلیم حاصل کریں۔ اور فارغ التحصیل ہو کر اطرافِ عالم میں علم کی روشنی پھیلائیں۔ چنانچہ یونان کی قدیمی یونیورسٹی کے طلبا کالے چغے پہنتے اور اپنی پیٹھ پر ایک جھولی لٹکائے رکھتے تھے تحصیل علم سے فارغ ہو کر وہ شہر کے گلی کوچوں

میں نکل جاتے، شہر والے بغیر مانگے ان کی جھولیوں میں روٹیاں ڈال دیتے وہ نہایت اطمینان سے اپنی اقامت گاہوں میں واپس آتے جو کچھ اس طرح سے مل جاتا وہ بے فکر ہو کر کھاتے اور تحصیل علوم و فنون میں مشغول رہتے۔ اگر کوئی شاہزادہ بھی یونان کی یونیورسٹی میں علمی پیاس بجھانے آتا تو وہ بھی باوجود دولت کی ارزانی اور روپے پیسے کی فراوانی کے اس شریف رسم کی پابندی کرتا اور عام طالب علموں کی طرح تعلیم پاتا۔

کئی ہزار سال گزر گئے زمانہ کہیں کا کہیں پہنچ گیا لیکن وہ یونانی رسم اب تک جاری ہے۔ ہماری یونیورسٹیوں کے گریجوایٹ اب بھی وہی کالے چُغے پہنتے ہیں اور وہی جھولی اپنی پُشت پر لٹکاتے ہیں جو "ہُڈ" کہلاتی ہے۔ زمانے کی ترقی نے طالب علموں سے ٹکڑ گدائی چُھڑا دی ورنہ گزشتہ صدی تک ہندوستان میں یہ یونانی رسم رائج تھی، مسجدیں اور مندر علوم کے سرچشمے گنے جاتے تھے، ملاؤں کی گھر گھر روٹیاں مقرر تھیں، مُلا جی روٹیاں جمع کرنے کا کام اپنے طالب علموں سے لیتے، تر مال خود کھا جاتے جو باقی بچتا اسے سکھا دیتے اور سُوکھی ہوئی روٹیاں اپنے عزیز طالب علموں میں تقسیم کر دیتے، جس شاگرد سے زیادہ خوش ہوتے اس کو سُوکھی ہوئی شیرمالیں اور باقرخانیاں عطا فرما کر اپنی خوشنودی اور شفقت کا اظہار فرماتے، وہ علم کے پیاسے طالب علم سُوکھے ٹکڑوں کو پانی میں بھگو بھگو کر کھاتے علم کے

چشموں سے اپنی پیاس بجھاتے اور ان علوم کو زندہ رکھتے جن کا اب نام لینے والا بھی کوئی نہیں، سبحان اللہ ان سوکھے ٹکڑوں اور خیراتی روٹیوں میں کیسی برکت اور قوت تھی کہ آجکل کے مرغن اور لذیذ کھانوں میں نہیں، ہمارے آجکل کے طالب علموں کو ہر قسم کی آسانیاں میسر ہیں۔ اچھا کھانے کو ہے اور اچھا پہننے کو، لارڈ ایہ بیفکرے کہلاتے ہیں، لعلٰے سے اعلٰے سندیں اور ڈگریاں بھی حاصل کرتے ہیں لیکن مبلغ علم کو پرکھو تو کچھ بھی نہیں، سندوں کو دیکھو تو "الف سے ے کریے" تک۔ کُل حروف کے مالک، لیکن کوئی ایک حرف بھی شرمندۂ معنی نہیں ۔

فقیروں کی عظمت

ایک طرف یونان کی علمی گداگری نے ہمارے دلوں میں گداگروں کی عظمت کا بیج بویا ہے اس پر مشرق کی آب وہوا اور روحانی فضا قدرتاً روحانیت سے معمور ہے۔ اس لئے یہاں کے باشندے بھی روحانیت پسند واقعہ ہوئے ہیں۔ جس شخص میں روحانیت کا ذرا سا شائبہ نظر آتا ہے فوراً اس کی طرف جھک جاتے ہیں۔ اور روحانی پیشوا تسلیم کر لیتے ہیں۔ جب کسی کا روحانی پیشوا بن گیا تو سمجھ لینا چاہیئے اس کو اپنے مرید پر اختیارات کلی حاصل ہو گئے دنیا اور آخرت کا وہ مالک ہے۔ دل اور دماغ پر اس کا قبضہ ہے جان ومال پر اس کو اختیار ہے وہ جو چاہے کام لے سکتا ہے۔ جس طرح چاہے نچا سکتا ہے۔ اگر خوش ہو جائے بخشوا دے دولتمند

بنا دے۔ اور اگر کہیں بگڑ بیٹھے تو دُنیا اور عاقبت دونو خراب کر دے۔
نہ ادھر کا رکھے اور نہ ادھر کا رہنے دے ؎
اِس بات کو گداگروں اور فقیروں کی خوش قسمتی سمجھئے کہ آجتک
جس قدر رُوحانی پیشوا گزرے ہیں وہ دُنیا سے متنفر تھے۔ اور دُنیاوی
جاہ و دولت کو پائے استحقار سے ٹھکراتے تھے ؎

اے ہما پیشِ فقیری سلطنت کیا چیز ہے
بادشاہ آتے ہیں پابوس گدا کے واسطے

اب بھی جو شخص ترک دُنیا کر کے درویشی اور عسرت کی زندگی اختیار
کرے اس پر روحانی قوتوں کے مالک ہونے کا شُبہ گزرتا ہے۔
اس کے ساتھ ہی کہیں اگر دو چار ہوشیار مرید بھی مل جائیں تو سُبحان اللہ
اپنے گرو کی رُوحانی قوتوں کے ڈھونگ رچا کر اچھے اچھے ہوشیار
اور تعلیم یافتہ لوگوں کو اُلّو بنا سکتے ہیں۔ کتب ہائے تاریخی کے سینے
ان نام نہاد رُوحانی پیشواؤں کی سیہ کاریوں سے سیاہ اور سادہ لوح
انسانوں کے دل ان کے کارناموں سے چھلنی ہیں یہ رُوحانی پیشوا
ترک دُنیا کی تبلیغ کرتے ہیں لیکن خود شاہانہ زندگی کے لُطف اُڑاتے
ہیں۔ رُوحانیت کا سنہری پردہ ان کے بُرے اور قابل ملامت
افعال کی پردہ داری کرتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں دُنیا نے اُنیسویں
صدی میں بہت ترقی کی ہے۔ اور توہمات کا پردہ تار تار ہو گیا
ہے۔ بیشک اس تار تار اور زرتار پردے میں سے وہ چیزیں

نیم عُریاں نظر آتی ہیں۔ جن کی جھلکیاں افرادِ عالم کو مسحور کرتی تھیں اب ان کی نیم عُریانیاں ان کو یقین کا درجہ دیتی ہیں اور نفی سے اثبات کی طرف لاتی ہیں ؛

اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ فطری انسان طور پر نہایت کمزور واقع ہوا ہے۔ اور آئے دن کے انقلابات، عروج و زوال۔ رنج و شادمانی، امیری و مفلسی، عزّت و ذلّت اس کمزوری پر وہ اثر کرتے ہیں جو سونے پر سہاگہ، جب اسبابِ دُنیا کے اسباب بگڑتے ہیں۔ اور حادثات کی تیز و تند موجیں مقاومت اور اثباتِ نفس کی قوتوں کو متزلزل کر دیتی ہیں تو کمزور طبع انسان ہر طرف ہاتھ پاؤں مارتا ہے۔ بے بس اور بیکس تنکوں کا سہارا ڈھونڈھتا ہے ایسے ہی موقعوں پر فقیروں کی بن آتی ہے۔ اپنی بے سر و پا باتوں سے کبھی کامیابی اور نجات کی بشارت دیتے ہیں اور مُنہ مانگی مراد پاتے ہیں کبھی صبر کی تلقین سے آنے والی مصیبتوں کی پیشینگوئی کر کے تحفظ اور تدارک کے قیمتی نسخے تجویز فرماتے ہیں۔ تعویذ گنڈے، ٹُونے ٹوٹکے، وظیفے اور اوراد ایسے ہی تلخ اوقات میں دستگیری کرتے ہیں۔ انسان کی فطری کمزوری اور توہم پرستی اسوقت ان فقیروں کی امداد طلب کرتی ہے۔ اگر کسی کا بدرقہ تیر بہدف ثابت ہو گیا تو رُوحانی فوقیت اور طاقتوں پر شُبہ کرنے والا کافر ہے ورنہ یہ کہہ کر صبر کر لیا گیا کہ خدا کے کاموں میں کسی کو مداخلت کا یارا نہیں ؛

ظاہرا طور پر فقیروں اور درویشوں کی دکان گداگروں سے کچھ اونچی ہے۔ لیکن جو حقیقت میں درویش ہیں وہ خاک نشین ہیں اور اپنے آپ کو عام گداگروں کے پس پُشت چھپاتے ہیں تاکہ دُنیا والے ان کو کانٹوں میں نہ گھسیٹیں۔ اور وہ صبر و سکون کی زندگی بسر کریں۔ اس خاکساری اور خود پوشی کا فایدہ براہ راست عام گداگروں کو پہنچتا ہے۔ کوئی شخص ان کے سوال کو رد نہیں کرتا۔ سائل کے ساتھ نرمی سے پیش آتا ہے اور ان کی تعظیم و تکریم کو فرض انسانی سمجھتا ہے۔ گویا انسانی ہمدردی۔ مذہبی احکامات، گھر ہی میں سوار پیدا ہونے کا امکان، فطری کمزوری، توہم پرستی اور انقلابات ایام فقیروں اور گداگروں کی عظمت اور مکرمت کا باعث بنے ہوئے ہیں۔ ورنہ ان بچاروں کو کون پوچھتا"۔

ہماری ایک عزیزہ مدت سے بیمار ہیں۔ کمزوری اور بیماری نے انہیں کسی قدر توہم پرست بنا دیا ہے۔ کچھ فطرتاً اور کچھ واقعاً ان کو فقرا سے دلچسپی پیدا ہوگئی ہے اور وہ اس حد تک پہنچی ہے کہ اگر ان کے دروازے پر کوئی فقیر نہیں آتا تو وہ سمجھتی ہیں کہ برکات کا دروازہ بند ہوگیا، سُوء اتفاق سے ان کے شوہر کی تبدیلی ایک چھاؤنی میں ہوگئی۔ وہاں کئی دن تک کسی فقیر کی آواز کانوں میں نہ آئی ان کا دل آپ ہی آپ بیچین ہونے لگا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہُوا کہ چھاؤنی میں بھیک مانگنے کی اجازت

نہیں۔ انہوں نے اپنے شوہر سے کہا کہ میں ایسی جگہ پر نہیں رہ سکتی جہاں فقیر نہ ہوں۔ ان کے شوہر نے ان کو خیرات کرنے کے اَور اور طریقے بتلائے لیکن انہوں نے ایک نہ سُنی آخر قریب کے دیہاتوں میں سے فقرا کو آدمی بھیج کر بُلانا پڑا۔ اب ان کو راستہ معلوم ہوگیا ہے۔ اس لئے جب موقعہ پاتے ہیں چھپ چھپا کر آجاتے ہیں اور بجائے پیسوں کے اکثر روپے ہی لے جاتے ہیں۔ جو لوگ گداگری کا انسداد کرنا چاہتے ہیں وہ اس قسم کے خیالات کو کس طرح تبدیل کر سکتے ہیں جو باتیں ہماری فطرتِ ثانیہ بن چکی ہیں ان کو کیونکر ایک دم بدلا جا سکتا ہے ؞

درویشی جس طرح اور مذاہب میں فقیروں اور گداگروں کی سرپرستی اور ان کی امداد واجب سمجھی جاتی ہے اسی طرح اسلام میں بھی فقیروں کے حقوق عوام پر مسلم ہیں۔ اس مذہبی رعایت سے گداگروں میں ایک ایسی جماعت پیدا ہو گئی ہے جو گداگری پر فقر کا طُرّہ لگاتی ہے۔ اور اپنے آپ کو عام گداگروں سے درویش کے باعظمت نام سے امتیاز دیتی ہے۔ ان میں سے بعض کے فوق العادت کارنامے عالم و عامی کو مسحور کرتے ہیں۔ اور فقر و درویشی کی عظمت کا سکہ عوام کے دلوں پر بٹھاتے ہیں۔ ان بزرگوں کا روحانی فیض ابھی تک جاری ہے اور ہمیشہ رہیگا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ باکمال درویش تھے اور اپنی روحانی قوتوں اور بابرکت نظروں سے تقدیریں

بدل دیتے تھے افسوس کہ ان کے کارناموں سے عیاروں اور مکاروں
نے فایدہ اُٹھایا اور درویشی کے نام کو اُچھالا۔ ممکن ہو سکتا ہے
اب بھی ان لوگوں میں باکمال اور فیض رساں درویش موجود ہوں
لیکن جنس کاسد کی فراوانی نے زرعیار کو گمنامی اور رُسوائی کے
غبار میں چھپا دیا ہے جو لوگ درویشی کے دعویدار ہیں وہ خود بھی
اصل اور نقل میں کچھ تمیز نہیں کر سکتے ہمارا اور آپ کا تو کیا ذکر ہے۔
آجکل کے زمانے میں حالت یہ ہے کہ ہر موٹا مسٹنڈا گداگر
اپنے آپ کو درویش کہتا ہے اور صاحب کمال ہونے کا مدعی ہے
درویشوں کی بہتات سے درویشی اور گداگری میں فرق صرف
اتنا باقی رہ گیا ہے کہ گداگر ایک ٹکڑے پر اپنا حق سمجھتا ہے اور
درویش اپنے آپ کو دُنیا اور آخرت کی دولت کا مالک تصوّر کرتا
ہے۔ جو چاہتا ہے وصول کرتا ہے اور جس طرح چاہتا ہے اس کو
اپنی دولت سمجھ کر صرف کرتا ہے۔ درویشوں کی شان شاہانہ ہے
اور گداگر کی گدایانہ۔

اگر ہندوستان کے نام نہاد بڑے بڑے درویشوں کی ذاتی
جائداد اور آمدنی کا اندازہ کیا جائے تو بلا مبالغہ اکثر لاکھوں کے آدمی
نکلیں گے یہ گروہ اپنا سلسلۂ نسب اور رشتۂ مریدی حضرت
علی علیہ السلام سے ملاتا ہے اور اس بات کا مدعی ہے کہ فقیری
اور درویشی مذہب اسلام میں ان کی ذات فیض انتساب سے

شروع ہوئی ہے۔ لیکن اگر ان حضرات اور آنحضرت کی خصوصیات کا مقابلہ کیا جائے تو زمین آسمان کا فرق نظر آئیگا وہ عدیم المثال درویش کبھی جوتیاں گانٹھتا تھا کبھی پتھر ڈھوتا تھا، اور جو کی روٹی پر گزر اوقات کرتا تھا، وہ بھی کئی کئی وقت میسر نہ آتی تھی کھانے کو بیٹھے ہیں کسی گداگر نے دستک دیدی، جو کچھ دستر خوان پر حاضر تھا اس کی نذر کیا۔ پانی پی کر خدا کا شکر بجالائے اور عبادت میں مصروف ہوگئے۔ کئی کئی دن اس طرح گزر جاتے، لیکن دست سوال کسی کے سامنے دراز نہ ہوتا، اور درویشی سے تعزز انسانی میں فرق نہ آنے پاتا، برخلاف اس کے ہمارے درویشوں کی کچھ اور ہی حالت ہے میں نے بچشم خود دیکھا کہ ایک ایک درویش آٹھ آٹھ آدمیوں کی خوراک تنہا کھا جاتا ہے اور ڈکار تک نہیں لیتا، عبادت اور ریاضت کی گفتگوئیں بہت ہیں لیکن عمل کا نام و نشان نہیں، تن و توش کو دیکھو تو رستم زماں، تارک دنیا ہونے کے مدعی لیکن پورے دنیا دار۔ نام خاک نشین اور بے برگ و نوا گھر کا جائزہ لو تو امیرانہ ٹھاٹھ عیش پسند رئیسوں کی طرح عیش و عشرت کے کل سامان مہیا، چار چار بیویاں، بے شمار لونڈیاں، ان گنت مریدنیاں جن پر ہر قسم کا حق حاصل۔ غرض روحانیت اور فقر اصطلاحی لباس درویشی میں گدائے متکبر، یا بھیڑ کی کھال میں بھیڑیئے، راعی نام مگر رعیت کش، رہبری کے موید، افعال و اطوار گمراہ کن۔

گفتگو کو سنو تو بے مغز کے الفاظ بے سر و پا خیالات، سامعین کی یہ حالت کہ لفظ لفظ پر سر دھنیں، آنکھوں سے آنسوؤں کا تار نہ ٹوٹے جو حکم ہو جائے یا اگر کسی بات کا اشارہ پائیں تو یہ کہہ کر بجا لائیں سے

بہ مے سجادہ رنگیں کن گرت پیر مغاں گوید
کہ سالک بیخبر نہ بود ز راہ و رسم منزلہا

اگر سوء اتفاق سے اندرونی حالات کا پتہ چل جائے تو کوئی شکل دیکھنے کا روادار نہ ہو، اور بیساختہ زبان سے نکلے کہ تقدس کے لباس میں کیسی گندگی اور نجاست پوشیدہ تھی، اگر دماغ پر تقدس کا پردہ پڑا ہوا ہو تو یہ کہہ کر خوش ہو جائیں کہ اس میں بھی کوئی راز ہے +

ہم اس بات سے انکار نہیں کرتے کہ موجودہ درویشوں میں اہل اللہ اور خدا رسیدہ بزرگ نہیں ہو سکتے لیکن یہ کہے بغیر بھی نہیں رہ سکتے کہ جو لوگ حقیقتاً درویش ہیں وہ دنیا دار نہیں، وہ تو اپنی ذات باصفات سے خلق اللہ کو فایدہ پہنچاتے ہیں چہ جائیکہ ان کو دونو دونو ہاتھوں سے لوٹ کر کھا جائیں اور مریدوں کی عزت عصمت اور دولت غرض کچھ بھی ان کی دست برد سے محفوظ نہ رہنے دیں

گداگری بحیثیت فن

ہزارہا سال کی مشق اور امتداد نے گداگری کو فن کی حیثیت دیدی ہے۔ جس طرح اور پیشے ہیں اسی طرح گداگری بھی ایک باقاعدہ پیشہ بن گیا ہے۔ اگر کبھی فقیروں اور گداگروں کی منڈلی میں بیٹھنے کا اتفاق ہو جائے تو آپ کو معلوم ہو گا کہ ان

لوگوں میں بھی خاندانی فقیروں اور گداگروں کو بڑی عزت اور وقعت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ انسانی جذبات اور احساسات کو گداگری فنا نہیں کر سکتی، وہ بھی بالکل ہم جیسے انسان ہیں۔ عشق و محبت اور گناہ کا شوق ان لوگوں میں بھی عام انسانوں کی طرح موجود ہے بلکہ نام و ننگ کا خیال ہم لوگوں کو اکثر مانع آتا ہے لیکن یہ لوگ وہ ہیں جن سے لیلیٰ مجنوں کے افسانے زندہ اور شیریں و فرہاد کے کارنامے تازہ ہیں۔ اگر ان لوگوں کے لباس سے ہم لوگ بھی حضرت غالب کی طرح فائدہ اُٹھانا چاہیں تو کیا مضایقہ ہے ؎

گدا سمجھ کے وہ چُپ تھا میری جو شامت آئے
اُٹھا اور اُٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لئے

یہ تو فن گداگری کی برکات ہیں۔ سوال یہ ہے کہ گداگری کی اگر فنّی حیثیت تسلیم کر لی جائے تو اس کے تعلیمی ادارے کہاں واقعہ ہیں۔ جہاں تک ہماری معلومات مساعدت کرتی ہیں ہم بلا خوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ دُنیا میں کہیں بھی فن گداگری سکھانے کا منظور شدہ کالج یا مدرسہ نہیں ہے۔ اب تک یہ فن سینہ بہ سینہ اور پُشت در پُشت چلا آتا ہے لیکن مستقبل قریب میں گداگری کی باقاعدہ تعلیم گاہیں جاری ہو جانے کا قوی امکان ہے۔ کیونکہ ہر ملک میں کوشش ہو رہی ہے کہ فقیروں اور گداگروں کے لئے تربیت گاہیں کھول دی جائیں تاکہ ان لوگوں کو بھیک مانگنے کی ضرورت پیش نہ آئے۔ اس تحریک سے

بعض لوگ یہ خطرہ محسوس کر رہے ہیں کہ اس تجویز کو عمل میں لانے سے گداگری کے فن کو سخت نقصان پہنچیگا، لیکن ماہرین تعلیم کا خیال ہے کہ ایسا کرنے سے فن گداگری کی درس و تدریس خود بخود سائنٹفک اصول پر آجائیگی۔ اور گداگری کا مستقبل خوب چمک جائیگا، اسوقت تک گداگری کے مبتدی محض اتنا جانتے ہیں کہ کس شخص کی جیب سے پیسہ نکالا جاسکتا ہے۔ یا کتنا اخلاقی دباؤ ڈالنے سے دوسرے کو خیرات دینے پر مجبور کر سکتے ہیں، باقاعدہ درس و تدریس سے ایسے سائنٹفک طریقے دلوں سے ناخنوں میں آجائینگے کہ گداگروں کی فنی کامیابی مسلم ہو جائیگی +

بہر حال اگر رسمی اور منظور شدہ گداگری کیلئے ادارے موجود نہیں تو افسوس نہیں کرنا چاہیئے۔ غیر رسمی ادارے بکثرت موجود ہیں جو پبلک کی امداد سے چل رہے ہیں۔ دُنیا بہ امید قائم، سرکاری امداد بھی مل جائیگی۔ اب تک گداگری کے غیر رسمی ادارے مناروں مسجدوں اور مزاروں کی سرپرستی میں قائم ہیں۔ اُن اداروں میں گداگری کی تعلیم مفت دی جاتی ہے۔ اگر خوبیٔ قسمت سے وہاں کسی اہل کمال کی صحبت میسّر آجائے تو پھر نہ تو اپنی تقدیر پر آنسو بہانے اور افسوس کرنے کی ضرورت ہے اور نہ کسی اور پیشے پر رشک کھانے کی حاجت، بغیر ہاتھ پاؤں ہلائے اللہ اس بہتات سے دیتا ہے کہ سمیٹے نہیں سمٹتا +

سائنٹفک گداگری بعض بے خبروں کا خیال ہے کہ گداگری ہندوستان سے مخصوص ہے۔ انہیں معلوم ہونا چاہئے کہ یورپ میں بھی گداگری کی کثرت ہے۔ وہاں گداگری کی ایسی عدیم النظیر مثالیں ملتی ہیں۔ جو ہندوستان والوں کے خواب و خیال میں بھی نہیں آسکتیں۔ بات یہ ہے بڑے لوگوں کی بڑی باتیں۔ دانایان فرنگ کی عقل و دانش کی اطراف عالم میں دھوم ہے۔ ان کے ہاں ہر کام کو سائنٹفک اصولوں پر کرنے کی عام عادت ہے۔ اس لئے گداگری بھی سائنٹفک طریق پر ہوتی ہے۔ بلکہ ممالک یورپ میں گداگری کو تحفظ شاہ پسندی کا فخر بھی حاصل ہے۔ گویا ان کے ملک میں غیر ملکی شخص گداگری نہیں کر سکتا، یہ ہمارا ہی ملک ہے۔ جس میں صلائے عام کا ڈنکا بج رہا ہے۔ اور مادر وطن کا دامن بلا امتیاز رنگ و مذہب ہر ایک کو پناہ دیدیتا ہے، اور کسی کی چلتی گاڑی میں روڑا نہیں اٹکاتا، غالباً اسی لئے ہندوستان کو جنت نشان کہتے ہیں۔ ورنہ جس طرح اور ملک ہیں اسی طرح ہندوستان بھی ہے۔ آخر ہندوستان میں ایسا کونسا سُرخاب کا پر لگا ہے۔

حُسن اتفاق سے کسی رسالے میں پیرس کے ایک گداگر کا مقدمہ میری نظر سے گزرا۔ اس دلچسپ مقدمے کے دلچسپ واقعات کچھ اس طرح سے تھے جیسے کوئی فقیر مدت سے ایک مخصوص جگہ پر بیٹھتا تھا۔ اس کی آمدنی نہایت معقول تھی، ایک اور گداگر نے اس جگہ کو پسند کیا اور فقیر سے کہا بولو بھائی اس جگہ کا قبضہ

مجھے کتنے میں دو گے، سودا ہوتے ہوتے ایکسو پونڈ پر فیصلہ ہو گیا۔ قیمت ادا کر دی گئی اور گداگر کا اس پر قبضہ ہو گیا۔ یہ کتنی ہی مدت وہاں بیٹھے لیکن اتنی آمدنی نہ ہوئی جتنی پہلے فقیر کو ہوتی تھی، تنگ آکر اس نے فریب دہی کا مقدمہ عدالت میں دائر کر دیا کہ فلاں جگہ کا قبضہ میں نے فلاں فقیر سے ایکسو پونڈ دے کر لیا۔ جس قدر آمدنی کا یقین دلایا گیا تھا وہاں سے اس کی نصف بھی نہیں ہوتی، لہذا ملزم کو سزا دے کر میری رقم مجھے واپس دلوائی جائے، مجھے یاد نہیں ان دونوں میں کون جیتا اور کون ہارا۔ انصاف یقیناً ہوا ہو گا۔ اور کچھ تعجب نہیں کہ پہلا فقیر کامیاب ہُوا ہو کیونکہ اس مخصوص جگہ کی آمدنی میں اس کی ذاتی خصوصیات اور کمالات کو بھی دخل ہو گا،

اس مقدمہ کی کارروائی اس بات کی زندہ شہادت ہے کہ یورپ میں گداگری نہایت منظم اور باقاعدہ اصولوں کے ماتحت ہوتی ہے۔ خیر یہ تو وہاں کا عام قاعدہ ہے کہ کوئی شخص کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلاتا۔ چھوٹے موٹے گداگر عام ضرورت کی چیزیں خوانچوں میں لگائے چیلوں کی طرح منڈلاتے پھرتے ہیں۔ آپ ان سے ایک دیا سلائی لے کر سگرٹ سُلگا لیجئے اور پُوری ڈبیہ کی قیمت چُپ چپاتے ادا کر دیجئے۔ ظاہر ہے ان طریقوں سے گداگری کا انسداد نہیں ہوتا بلکہ گداگری کی طرف رغبت بڑھتی ہے میرے نزدیک تو یہ طریقہ زیادہ مہذّب اور سائنٹفک ہے کہ دوسرے پر

اپنی ضرورت اور حالت کا اظہار چند پُر اثر الفاظ یا صورت حال بنا کر کے حسب حیثیت کچھ وصول کر لیا جائے۔

گداگری کے عام طریقے

چونکہ ہمارے مُلک میں گداگری نے ابھی شاہ پسندی کا اعزاز اور باقاعدہ فن کی حیثیت اختیار نہیں کی۔ اس لئے یہاں گداگری بہت کس مپرسی کے عالم میں پڑی ہوئی ہے۔ اس ترقی کرنے والے فن کی سب سے بڑی بدبختی یہ ہے کہ گداگری اور ذلت کو ہم معنی سمجھا جاتا ہے۔ خیر چھوٹے موٹے گداگری کے طریقے قابل اعتنا نہیں لیکن باوجود اس بے اعتنائی کے ہمارے گداگر کافی ترقی کر چکے ہیں۔ اور اپنے فن میں اس قدر ہوشیار ہو گئے ہیں کہ مہذب ممالک کے گداگران کی گرد کو بھی نہیں پا سکتے۔ ہمارے ناخواندہ گداگروں کے یہ معمولی کارنامے ہیں کہ اپنے پاؤں پر تیزاب ڈال کر اسے جلا ڈالا۔ یا گوشت کا پارچہ کسی عضو پر پھٹی پُرانی دھجیوں سے باندھ لیا، اس میں سے خون بہ رہا ہے۔ پیپ رس رہی ہے۔ مکھیاں بھنک رہی ہیں۔ فقیر خوفناک اور درد بھری آواز سے کراہ رہے ہیں، منہ سے جھاگ جاری ہیں، پیٹ کمر سے لگا ہے۔ ایک ہاتھ مُنہ کی طرف ہے۔ دوسرے سے پیٹ کی جانب اشارہ کر رہے ہیں۔ آنکھوں سے مسلسل آنسو بہ رہے ہیں۔ بچّہ گود میں ہے اسے چٹکیاں لے لے کر رُلائے جاتے ہیں۔ اور ظاہر کرتے ہیں کہ بھوکا ہے۔ کسی حاملہ فقیرنی کی خدمات حاصل کر لیں۔ وہ ساتھ ساتھ ہے۔

رو رہی ہے۔ درد سے بیچین ہے۔ گویا بچہ ہونے کو ہے۔ لوگ ترس کھا کھا کر پیسے دیئے چلے جاتے ہیں۔ لیکن کوئی یہ نہیں کہتا کہ شہر میں بہت سے زنانے خیراتی ہسپتال ہیں بھیک کیوں مانگتے ہو۔ کیا فطرت کو عریاں کردگے، کانٹوں پر تڑپ رہے ہیں۔ شیشے بچھا کر ان پر لیٹے ہیں۔ اوپر کا دھڑ زمین میں دفن ہے۔ چادر بچھی ہوئی ہے۔ اس پر پیسوں کے ڈھیر لگے ہیں، اور کچھ نہیں تو مٹی کھائے جاتے ہیں۔ گھاس سے مُنہ بھر لیا ہے۔ جُگالی کر رہے ہیں۔ جمعرات اور منگل کو جوق در جوق دورہ کرکے بغیر مانگے پیسے ہی پیسے جمع کر لئے۔ کسی نوجوان کو خوبصورت دُلہن ملنے کی بشارت دی کسی کو اولاد کی دعائیں سُنائیں اور تھوڑی سی کوشش سے کچھ نہ کچھ وصول کر لیا ہمارے معمولی گداگروں کے اگرچہ یہ ادنےٰ کرشمے ہیں لیکن اس بات کی دلیل ہیں کہ وہ فلسفہ جذبات کے پُورے پُورے ماہر ہیں۔

ہوشیار گداگر عام گداگروں کے ہاتھوں فقیری اور گداگری کا پیشہ سخت نقصان اُٹھا رہا ہے۔ اور یہ خرابی اس پیشہ کی عام مقبولیت اور باقاعدہ تعلیم کے فقدان سے پیدا ہو رہی ہے۔ ہوشیار گداگر چند پیسوں کے لئے اپنی عزّت کبھی خطرے میں نہیں ڈالتا، وہ ایسے طریقے سے مانگتا ہے کہ فقر کی شان برقرار رہے اور اپنی عزّت میں کوئی فرق نہ آنے پائے، جس کی جیب خالی کی جائے وہ بہ نہ

سمجھے کہ اس سے بھیک مانگی گئی ہے بلکہ یہ خیال کرے کہ اس نے فرض انسانی ادا کیا ہے اور اپنا گھر جنت میں بنایا ہے نیز اس کار خیر سے وہ ثواب کمایا ہے کہ باقی عمر میں کسی کار خیر کی ضرورت نہیں رہی، بالفرض اگر کسی فریب خوردہ کو اپنی حماقت اور فقیر کی مکاری کا کسی طرح پتہ بھی چل جائے تو افسوس کرنے کی نوبت نہ آئے بلکہ بیساختہ کہہ اُٹھے کہ اس کا حق تھا جو اس نے نہایت خوبصورتی سے وصول کر لیا ۔

ہمارے ملک میں اس قسم کے ہوشیار گداگر بکثرت ہیں۔ اگر یورپ اپنی سائنٹفک گداگری پر ناز کر سکتا ہے تو ہم بھی بلا مبالغہ ہندوستان کے بے ضابطہ اور بے قاعدہ حاصل کیئے ہوئے فن گداگری پر فخر کرنے میں حق بجانب ہیں ۔

ہوشیار اور تجربہ کار گداگروں سے کم و بیش ہر شخص کو واسطہ پڑتا ہے۔ اگر بدقسمتی سے کوئی ان دلچسپیوں سے محروم رہ جاتا ہے تو اکثر یاروں دوستوں اور عزیزوں سے گداگروں کی نہایت مزیدار باتیں سُننے میں آجاتی ہیں۔ چنانچہ میں بھی گداگروں اور درویشوں کے فیضان سے بے بہرہ نہیں۔ اس لئے چند ذاتی تجربات پیش کرنے کی جسارت کرتا ہوں ۔

کوئی سولہ سترہ برس کا ذکر ہے۔ اسوقت میری عمر اس طویل مدت سے بہت کم تھی، والد مرحوم کا تازہ تازہ انتقال ہوا تھا،

یتیمی کے صدمے سے دل مجروح اور دماغ معطّل تھا، ایک دن ٹھیک دوپہر میں دروازے پر کسی نے دستک دی، میں نیچے اُترا۔ ایک خضر صورت درویش صفت بزرگ کھڑے تھے، انہوں نے نہایت تپاک سے سلام علیکم کہا۔ دونوں ہاتھوں سے ہاتھ ملایا، ڈیوڑھی میں تخت بچھا ہُوا تھا، اس پر بلا تکلف بیٹھ گئے۔ والد کے انتقال کا نہایت دردناک الفاظ میں ذکر کرتے ہوئے فاتحہ کے لئے ہاتھ اُٹھائے پھر میرے سر پر دستِ شفقت پھیرا اور دُعائیں دیتے ہوئے فرمایا کہ مَیں ملتان سے آیا ہوں، تمہارے والد سے میری مُلاقات تھی، خدا بخشے ہمیشہ مہربانی فرماتے تھے، اسوقت مَیں بہت مصیبت میں مبتلا ہوں، شرافت زبان ہلانے کی اجازت نہیں دیتی بس مَیں کچھ مُنہ سے نہیں کہہ سکتا۔ یہ کہتے کہتے آنکھوں سے آنسو اُمنڈ پڑے، جس طرح بھی ہو پانچ روپے دیدو، مَیں دعا کروں گا۔ خداوند کریم تمہاری پریشانی دُور کریگا، ان بزرگ کا جادُو مجھ پر اثر کر چکا تھا۔ میں اطمینان سے اوپر گیا۔ ان کی خضر جیسی بزرگانہ صورت، بڑے سے پگڑ، چھاج جیسی پُر نور ڈاڑھی، اور اعرابی لباس سے پُوری طرح مرعوب تھا، ہر چند سب نے منع کیا، لیکن میں نے پانچ روپے لاکر ان کے حوالے کئے۔ روپوں پر قبضہ کرتے ہی انہوں نے دُعائیں دیتے ہوئے اپنا راستہ لیا، مجھے ابھی تک یہ واقعہ اس طرح یاد ہے جیسے آج کا دن، لیکن کبھی

اس بات کا افسوس نہیں ہُوا، چاہے یہ میری ہٹ دھرمی ہی سمجھئے۔

اگر انسان ذرا بھی چلنے پھرنے والا ہو تو اس قسم کے دلچسپ واقعات بکثرت پیش آتے ہیں لیکن لطف اسوقت آتا ہے جب کوئی کسی ہوشیار گداگر کے جال میں پھنستا ہے۔ اور یہ لطف اور بھی دوچند ہو جاتا ہے جب انسان سمجھتا ہے کہ مجھے دھوکا اور فریب دیا جارہا ہے لیکن پھر بھی سائل کی درخواست رد کرنے کی جرأت نہیں کرتا۔ بلکہ عقلمندی اسی میں سمجھتا ہے کہ جانتے بوجھتے بیوقوف ہی بنا جائے، خاص کر بڑے بڑے شہروں میں اس قسم کے گداگروں سے اکثر سابقہ پڑتا ہے وہ شاید اس لئے کہ شہری لوگ دیہاتیوں کی نسبت اپنے آپ کو زیادہ ہوشیار سمجھتے ہیں، اس لئے یہ لوگ بھی شہریوں کو فریب دینا باعث فخر سمجھتے ہیں۔ بہرکیف تجربات نے ثابت کر دیا ہے کہ روپوں کی بلا چند پیسوں میں نہایت آسانی سے ٹل سکتی ہے۔ بشرطیکہ انسان تفکرات اور پریشانیوں میں مبتلا نہ ہو، اگر کسی وقت قلب پر رقت طاری ہو اور حسن اتفاق سے کوئی نبض شناس گداگر مل جائے پھر تو جیب خالی ہی کرنی پڑتی ہے۔ چاہے بعد میں آپ کچھ ہی کہا کریں۔

دلی میں ایک بہت ہوشیار گداگر ہیں۔ اب تو میں ان سے اچھی طرح واقف ہو گیا ہوں، پھر بھی مجھے ایک دو مرتبہ ان کے ساتھ ہمدردی کرنے کا فخر حاصل ہے۔ ان کا روزانہ کا کام یہ ہے کہ کسی نئی

اسامی کو دیکھا، گھر تک ان کا تعاقب کیا، دوسرے دن نہایت اطمینان سے جاکر دروازے پر دستک دیدی، نہایت مایوسانہ انداز میں مُنہ بسورتے ہوئے عرض کیا کہ مَیں کوئی بھکاری نہیں ہوں مصیبت زدہ ہوں، اتنے میں دو چار آنسو رُخساروں پر ڈھلک آئے۔ مَیں تار کشی کا کام کرتا تھا، معقول آمدنی تھی، میاں خدا تمہیں ہر مصیبت سے بچائے، شہزادوں میں سے ہوں، خدا کی قسم کبھی کسی کے سامنے دست سوال دراز نہیں کیا، لیکن آج حالات نے مجبور کر دیا ہے۔ مشین کے تاگے نے تار کشی کا کام تباہ کر دیا، گھر میں میت پڑی ہے۔ کفن کو ایک پیسہ نہیں، بچے بھوک کے مارے جاں بلب ہیں۔ بڑوں کی بُری حالت ہے مَیں کچھ نہیں کہتا، خدا کے لیے چل کر دیکھ لیجئے، عُمر بھر دُعائیں دونگا، میری عزّت کو بچا لیجئے، خدا آپ کو اجر دیگا +

اب کون جاتا ہے اور کون دیکھتا ہے۔ جو کچھ بن آیا خود دیدیا، اگر جادُو نے پُورا پُورا اثر کیا، تو محلّے میں سے دس پانچ اور جمع کر دیئے، ایک دفعہ ایک صاحب اس کی گفتگو سے ایسے اثر پذیر ہوئے کہ کفن دفن کے لئے روپے لے کر اس کے ساتھ ہو لئے، لیکن سائل راستے ہی میں غائب ہو گیا، ایک اور صاحب کے متعلّق سُنا ہے کہ وہ بُھجولے کے گھر تک پہنچے، اور وہاں سے بے نُقط سُناتے آئے +

آجکل مسافری کا چکمہ بہت عام ہو گیا ہے۔ اور ہر شخص اس سے واقف ہے۔ لیکن پھر بھی ہوشیار گداگروں کے لئے ابھی تک بہت

گنجائش ہے، گٹھ کتروں کی داستان سُنا کر شرافت اور عزت کا سہارا لیتے ہوئے کچھ نہ کچھ وصول کر ہی لیا جاتا ہے بڑے بڑے سٹیشنوں پر اکثر اوقات مایوسانہ شکل بنائے کوئی نہ کوئی گداگر مل جاتا ہے۔ روپیہ سوا روپیہ ہاتھ میں ہے۔ دو روپے کی اور ضرورت ہے۔ آپ جیسے فیّاض اور خدا ترس لوگوں کی مسافر نوازی سے اتنے جمع ہو گئے ہیں۔ مَیں کچھ نہیں کہتا میں نے آجتک کسی کے سامنے دست سوال دراز نہیں کیا "تین روپے میں فلاں جگہ کا ٹکٹ آتا ہے۔ آپ دریافت کریں، میں کچھ نہیں چاہتا، مجھے ٹکٹ خرید دیجئے" دو تین روپے بھلا ایک دم کون دیتا ہے۔ ہاں ایک آدھ روپے میں کیا کلام ہو سکتا ہے۔ اس طرح سے ایک دو گھنٹے میں دو چار روپے جمع ہو جانے معمولی سی بات ہے۔

مجھے ایک نصف ذاتی واقعہ ہمیشہ یاد رہیگا۔ گزشتہ سال ایک ہوشیار گداگر میری سُسرال پہنچے، بڑے تپاک سے میرے خُسر صاحب سے ملے، میرے سارے خاندان سے پوری پوری واقفیّت کا اظہار کیا، اور کہا کہ میں نے آپ کے داماد کو پالا پوسا ہے، اب میں دہلی جا رہا ہوں، بیوی اور بچے کو سٹیشن پر چھوڑ آیا ہوں، یہاں تک کا ٹکٹ میرے پاس تھا، وہ ختم ہو گیا، میرا خیال تھا۔ آپ کے داماد یہاں ہونگے وہ مجھے دہلی بھیجنے کا انتظام کر دینگے۔ آپ سے عرض کرتے ہوئے شرم آتی ہے۔ میں دہلی پہنچتے ہی انہیں روپے

دیدونگا اگر آپ کو یقین نہ آئے تو میں آپ کے ہاں ٹھہر جاتا ہوں آپ دہلی سے دریافت کر لیجئے، میں نے آپ کے سمدھیانے کی اور خاص کر آپ کے داماد کی مدتوں خدمت کی ہے۔ وہ ہوتے تو آپ کو معلوم ہو جاتا، نام اور پتہ صحیح بتانے اور ہر سوال کا معقول جواب دینے سے ہمارے جہاندیدہ خُسر صاحب کو پُورا یقین ہو گیا کہ یہ شخص جو کچھ کہتا ہے بالکل درست ہے۔ انہوں نے نہایت اطمینان سے دو آدمیوں کا دہلی کا کرایہ دے کر ان کو رخصت کیا، ان سے کھانا نوش فرمانے کے لئے کہا تو انہوں نے جواب دیا جو کچھ آپ نے مہربانی فرمائی ہے۔ وہ بہت کافی ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میری بیوی بھُوکی رہے اور مَیں کھاؤں، چنانچہ اس بات پر ایک روپیہ اور بھی وصول کیا، کہتے ہیں وہ تو یہ بھی کہتا تھا کہ کوئی چیز دہلی بھیجنی ہو تو بھیج دیجئے۔ لیکن ہمارے خُسر صاحب نے زبانی پیغام کو کافی سمجھا اور زیادہ محبّت کا اظہار نہ فرمایا ؛

کچھ مدت کے بعد جو میرا سُسرال جانا ہُوا تو باتوں باتوں میں یہ ذکر بھی آ گیا، جو نام وہ بتلاتے تھے، میں نے اپنی عمر میں پہلی مرتبہ سُنا تھا۔ آخر بہت لمبی چوڑی مضحکہ خیز بحث و تمحیص کے بعد یہ قرار پایا کہ سمدھیانے کا معاملہ تھا، اس لئے یقین کرنا اور روپے دیدینا ہی درست تھا ؛

اس قسم کے واقعات اکثر پیش آتے رہتے ہیں لیکن گزشتہ سال ایک نہایت دلچسپ حادثہ پیش آیا اگرچہ اس کا میری جیب پر کوئی

اثر نہیں پڑا لیکن اگر پڑتا بھی تو افسوس نہ ہوتا، ایک دن شام کا وقت تھا۔ میں ایک ڈاکٹر کی دکان پر بیٹھا تھا، اتفاق ایسا ہُوا کہ وہاں حضرت خواجہ حسن نظامی بھی تشریف لے آئے۔ ان کے آنے کے تھوڑی دیر بعد ایک اور نوجوان بھی آبیٹھے، معلوم ہوتا تھا کوئی مریض ہے۔ یا کوئی دوا لینے آیا ہے۔ یہی گفتگو کے دَوران میں خواجہ صاحب نے ڈاکٹر صاحب سے اس نوجوان کی طرف اشارہ کر کے پُوچھا کہ یہ کون صاحب ہیں، ہم نے عدم واقفیت کا اظہار کیا، خواجہ صاحب نے انہی سے دریافت فرمایا۔ عاقل را اشارہ کافی" وہ شخص ایک دم چیخیں مار مار کر رونے لگا، حاضرین پر سکتہ طاری ہو گیا روتے روتے ہچکیاں لے کر اس نے اپنی داستان یُوں سُنائی کہ میں کانپور سے آیا ہوں۔ کاروبیشن ہوٹل میں قیام ہے۔ ایک صاحب میرے ساتھ تھے، وہ میرا بٹوہ لے کر غائب ہو گئے ہوٹل والا مجھے تنگ کر رہا ہے۔ کہتا ہے پولیس کے حوالے کر دونگا۔ سامان ضبط کر لونگا، دو وقت سے کچھ نہیں کھایا۔ آج رات کو وہ مجھے نکال دیگا اور پتہ نہیں کیا سلوک کریگا۔ عجب مصیبت میں مبتلا ہوں۔ ہر چند ڈھونڈا ہے کوئی واقف نہیں ملا۔ خدارا مجھے اس مصیبت سے بچائیے۔ خواجہ صاحب نے مجھ سے کہا، آپ ان کی مدد کرینگے۔ میں نے کہا جو آپ فرمائیں۔ ادھر ڈاکٹر صاحب نے خود بخود اپنے بٹوے کا جایزہ لینا شروع کیا، اتنے میں وہ نوجوان قہقہہ مار کر ہنس دیا۔ ہم سب لوگ حیران رہ گئے۔

معلوم ہُوا کہ یہ صاحب تعلیم یافتہ نقال ہیں اور ریڈیو میں اپنے کمالات کو نشر کرنے آتے ہیں ۔

ہم لوگ ان کے کمالات کے معترف اور دل ہی دل میں شرمندہ ہوئے کہ اصل اور نقل میں تمیز نہ کر سکے، اگر گداگر میں اس قسم کے اوصاف ہوں تو آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ وہ کتنی آسانی سے لوگوں کی جیبیں خالی کرا سکتا ہے ۔ ہمارے ہوشیار گداگر اسی قسم کے کمالات سے متصف ہیں ۔ اسی لئے ان پر کیمیاگر ہونے کا شبہ ہوتا ہے ۔ اگر انکی جامہ تلاشی لی جائے تو ہزاروں روپے کی اشرفیاں ان کی گدڑی میں سے برآمد ہوتی ہیں ۔ میری نظروں میں کئی ایک ایسے ٹکڑ گدا ہیں جو اپنے ذاتی مکانوں میں رہتے ہیں شادی بیاہ کے موقعوں پر نہایت پُر تکلف دعوتیں کرتے ہیں اور رسوم عروسی کی ادائیگی میں اچھے اچھے امیروں سے پیچھے نہیں رہتے ۔ لیکن یاد رہے ان کا پیشہ گداگری ہے ۔ یہی وہ گدا ہیں جو اپنے پیشے میں کامیاب گدا کہلانے کے مستحق ہیں ۔ اور گداگری کا نام ان کی بدولت زندہ ہے ۔

ہمدردی

۹ خداوند تعالیٰ نے ہمارے جسم میں جس قدر اعضا اور قویٰ بنائے ہیں ان کا کوئی نہ کوئی مصرف ضرور رکھا ہے۔ گویا ہماری کوئی قوّت اور حصۂ جسم بیکار نہیں۔ ہمارے تمام اعضا کو دو قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک تو وہ اعضا ہیں جو ہمارے جسم میں حاکم کا کام کرتے ہیں اور اعضائے باطنی کہلاتے ہیں دوسرے وہ اعضا ہیں جو اعضائے باطنی کے احکامات کو ماتحتوں کی طرح بجالاتے ہیں۔ ان کو ماہرین نے اعضائے ظاہری کا نام دیا ہے۔ چنانچہ ہمدردی ایک ایسی تحریک ہے جو اعضائے باطنی سے حرکت میں آتی ہے اور اعضائے ظاہری اس سے اثر پذیر ہو کر مختلف حرکات شائستہ کا اظہار کرتے ہیں۔

ہمدردی کا جذبہ کم و بیش ہر انسان بلکہ حیوان میں بھی موجود ہے۔ اس کا اثر طبیعت یا تابع دماغ پر اس طرح سے ہوتا ہے کہ دوسرے کی تکلیف یا دکھ درد کو دیکھ کر دیکھنے والے کے دل و دماغ میں ایک قسم کی بےچینی یا ہیجان سا پیدا ہو جاتا ہے۔ اور خواہ مخواہ بغیر کسی تعلق یا معقول وجہ کے انسانی طبیعت ان اسباب تکلیف کو

دُور کرنے کے لئے آسانی ہے۔ یہ مسلّمہ امر ہے کہ ہمدردی ان لوگوں سے زیادہ ہوتی ہے جن سے رُوحانی اور جسمانی تعلّق زیادہ ہوتا ہے گویا ہمدردی کا دائرہ اثر تعلّقات کی وسعت اور گہرائی کے ساتھ ساتھ گھٹتا بڑھتا ہے لیکن ان لوگوں سے ہمدردی ہونا جن سے کسی قسم کا کوئی تعلّق نہیں اس بات کی بیّن دلیل ہے کہ ہمدردی ایک خدائی عطیّہ ہے۔

انسان کی انسان کے ساتھ ہمدردی ہونا ایک معمولی سی بات ہے کیونکہ سه

بنی آدم اعضائے یکدیگر اند — کہ در آفرینش ز یک جوہر اند

جذبۂ ہمدردی کی خصوصیّت یہ ہے کہ وہ اپنے پرائے کی قیوّد سے آزاد ہے انسانوں پر کیا منحصر ہے ہمیں حیوانات کے ساتھ بھی کافی ہمدردی ہے۔ ان کے دُکھ درد میں بھی ہم شریک ہوتے ہیں۔ اگر کوئی جانور مر جاتا ہے تو اس پر مدّتوں افسوس کرتے ہیں۔ پالتو جانوروں کے ضایع ہونے سے اکثر آنکھوں سے آنسو ڈھلکتے ہم نے اپنی آنکھ سے دیکھے ہیں اس کے علاوہ اگر سانپ جیسے موذی جانور کو ہم کچلتے ہوئے دیکھتے ہیں تو اسوقت بھی ہمارے دل میں ہمدردی کی تحریک کچھ نہ کچھ ضرور حرکت میں آتی ہے۔ اس انکشاف سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ حیوان جن سے کسی نہ کسی طرح ہماری ذات کو کچھ فایدہ پہنچتا ہے۔ ان سے ہم کو کس قدر

ہمدردی ہوسکتی ہے ۔

ہمارا ہمدردی کا جذبہ محض جانداروں تک ہی محدود نہیں بلکہ انسانوں کو بیجان چیزوں سے بھی ہمدردی ہوتی ہے مثلاً پُرانے زمانے کی تاریخی تباہ شدہ عمارتیں دیکھ کر انقلابات ایام کی تصویر ہماری آنکھوں کے سامنے کھنچ جاتی ہے۔ جس سے ہمارے دلوں میں ہمدردی کی تحریک پیدا ہوتی ہے۔ اور ہم ان لوگوں سے ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں جو کبھی ان کھنڈروں میں شاہانہ شان وشوکت سے رہا کرتے تھے اور اب یہی عمارتیں ان کی بے بسی اور بے کسی کی یاد کو تازہ کرتی اور دیکھنے والوں کو عبرت کے آنسوؤں سے رُلواتی ہیں۔ گویا ہمارے ہمدردی کے جذبات کو ٹھیس لگاتی ہیں۔

اس کے علاوہ اگر ہم کسی عمدہ کتاب، تصویر یا کسی اور قیمتی چیز کو کسی نااہل کے قبضے میں دیکھتے ہیں تو ہمیں اس چیز سے خواہ مخواہ ہمدردی ہو جاتی ہے۔ اور ہم اس چیز کی بے قدری پر اکثر افسوس کرتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس قسم کی ہمدردی بہت ہی خطرناک ہوتی ہے۔ کیونکہ اگر وہ زر اور زاری سے ہاتھ نہ آئے تو ہم خلاف قانون ذرایع بھی اختیار کر لیتے ہیں۔ ایسی ہی ہمدردی کی بدولت اکثر بڑے بڑے فسادات اور بغاوتیں برپا ہو جاتی ہیں۔ بہرحال ان مثالوں سے بیجان چیزوں کے ساتھ بھی حضرت انسان کی ہمدردی ثابت ہے ۔

ہمدردی کا جذباتی تجزیہ علم جذبات کے ماہروں نے ہمدردی کو محبت، دوستی اور قوم پرستی سے علیحدہ جذبہ قرار دیا ہے ان کا خیال ہے کہ ہمدردی اس تحریک کو کہتے ہیں جس کے ذریعے سے دوسروں کی خوشی سے خوشی اور رنج سے رنج ہوتا ہے اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اگر یہ لطیف رُوحانی تعلق مصیبت زدہ لوگوں سے ہو تو اس کو رحمدلی کہیں گے۔ اگر ہمدردی کسی ایک شخص پر محیط ہو جائے تو دوستی کہلائیگی۔ اگر یہ تعلق کسی مخصوص قوم کے ساتھ ہو گا تو اس کو قوم پرستی کے نام سے موسوم کیا جائیگا۔ اور اگر یہ تعلق اس قدر وسیع ہو کہ تمام بنی نوع انسان اس کے دائرے میں آجائیں تو اس کو ہمدردی کہینگے۔

بعض فلاسفہ کا نظریہ اس کے برعکس ہے وہ کہتے ہیں۔ ہمدردی اور دوستی ایک ہی جذبے کے دو مختلف نام ہیں۔ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ ہمدردی اور دوستی ایک دوسرے سے بہت ہی قریب ہیں۔ بلکہ بعض اوقات ان میں امتیاز کرنا اچھا خاصہ دشوار ہو جاتا ہے۔ بہرحال ہمدردی ایک نہایت ہی پاکیزہ۔ بے لوث اور شریفانہ رشتۂ محبت ہے جو بغیر کسی لالچ یا فائدہ کے خیال کے ایک انسان کو دوسرے انسان سے ہوتا ہے۔ جن لوگوں میں ہمدردی کا مادہ ہوتا ہے وہ دوسروں کے لئے بلاوجہ تکلیف اُٹھاتے ہیں۔ اس تکلیف یا انسانی فرض کی ادائیگی سے ان کو ایک قسم کی رُوحانی خوشی اور اطمینان قلب حاصل ہوتا ہے۔ نیز رُوح میں بالیدگی، طبعیت میں استقلال اور عزیمۂ

انسانیت میں کمال حاصل کرنے کی قوت پیدا ہوتی ہے +

ہمدردی قربانی سکھاتی ہے

وہ لوگ جن کے دلوں میں خدا نے ہمدردی کا بیج بویا ہے خودغرضی غرور اور تکبر سے کوسوں دُور ہیں۔ اولوالعزمی ہر وقت ان کو بےکسوں کی امداد کے لئے اُبھارتی ہیں۔ بنی نوع انسان کی محبت ان کو دوسروں کی مصیبتیں اپنے سر پر لیتے وقت سہارا دیتی ہے۔ وہ کبھی کسی کی دل آزاری نہیں کرتے بلکہ ہمیشہ اسی خیال میں مستغرق رہتے ہیں ع

دل بدست آور کہ حج اکبر است

ہمدرد انسان دوسروں کی مدد فی سبیل اللہ کرتے ہیں۔ اور کسی صلے کی تمنا نہیں رکھتے گویا نیکی اس لئے کرتے ہیں کہ نیکی ہے وہ یہ نہیں دیکھتے کہ وہ نیکی امیر کے ساتھ کر رہے ہیں یا غریب کے ساتھ۔ بلکہ ایسے لوگوں کی مدد کرنا جن کی مدد کرنے سے عام لوگ گریز کریں وہ باعث فخر و مباہات خیال کرتے ہیں۔ اپنی ذاتی خواہشوں اور آسائشوں کو وہ دوسرے کی بہبودی پر ترجیح نہیں دیتے۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کی نیک نیتی کی بدولت دُنیا میں ہمدردی اور انسانیت کا نام قائم ہے +

ہمدرد انسان کس قدر بےلوث اور عالی ہمت ہے۔ کہ وہ ہمدردی کو عمل میں لاتے وقت نہ تو یہ دیکھتا ہے کہ وہ دشمن کے ساتھ ہمدردی کر رہا ہے یا کسی دوست کے ساتھ۔ اپنے مذہب والا اس کی

ہمدردی سے فائدہ اُٹھا رہا ہے یا کوئی ایسا شخص جو اس کے مذہب یا ذات پر جا و بیجا نکتہ چینی کرنے والا ہے۔ غرض ادنیٰ۔ اعلیٰ۔ امیر غریب۔ فقیر محتاج اپنے پرائے مُلکی اور غیر ملکی ہمدرد انسان کی دولت۔ ہمت۔ قلم اور زبان سے یکساں فایدہ اُٹھاتے ہیں۔ اس کی نفس کُشی۔ بلند ہمتی۔ عالی حوصلگی اور تکمیل انسانیت کا اس سے بہتر اور کیا ثبوت ہوسکتا ہے ؟

ہمدردی مصنوعی بھی اچھی ہے

یہاں ان لوگوں کا تذکرہ بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا جن کے دلوں میں حقیقتاً ہمدردی کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ لیکن محض اس لئے کہ ہمدردی مطبوع خلایق ہے۔ وہ اپنی شہرت اور عزت میں اضافہ کرنے کی خاطر ہر موقعہ پر ہمدردی کا جا و بیجا اظہار کر کے عوام میں مقبولیت حاصل کر لیتے ہیں۔ ہمدردی چاہے بناوٹی طور پر کی جائے اور چاہے حقیقتاً کوئی اپنی طبیعت کی تحریک سے ہمدردی کرے۔ ہمدردی ہر حال میں قابل ستایش ہے۔ ہاں اس سے ان لوگوں کی رذالت ضرور ثابت ہو جاتی ہے جو نمایش کے لئے ہمدردی کرتے ہیں۔ ہمدردی دکھلاوے کی چیز نہیں بلکہ دوسروں کے ساتھ بھلائی کرنا اپنے ساتھ بھلائی کرنا ہے۔ کیونکہ بغیر صلہ یا ستایش کی تمنا کے نیکی کرنے سے جو رُوحانی لذت اور مسرت حاصل ہوتی ہے اس کو کچھ وہی لوگ جانتے ہیں۔

جو اس کے مزے سے آشنا ہیں۔ ورنہ تکلف ہیں تو سراسر تکلیف ہے۔ بہر حال ہمدردی پھر بھی اکارت نہیں جاتی۔ اگر کوئی شخص اس کے اشتہار سے اعلیٰ رتبہ یا بلند مرتبہ حاصل کرنا چاہتا ہے تو اس کو وہ بھی مل جاتا ہے۔ ہمدردی تو کتنی پیاری ہے کہ ہر لباس میں نو بھلی معلوم ہوتی ہے اور دوست دشمن سب کو مرغوب ہے۔

جیوانات بھی ہمدردی سے خالی نہیں

انسان تو انسان ہے اور اشرف المخلوقات بھی ہے وہ اگر ہمدردی کے جذبہ سے بیچین ہو جاتا ہے تو کوئی تعجب نہیں، کیسی عجیب بات ہے کہ جانور بھی اس شریف جذبہ سے محروم نہیں۔ یہ تو ایک بہت ہی مشہور کہانی ہے کہ ایک زخمی کتے کو ایک دوسرا کتا جو پہلے کبھی زخمی ہو کر کسی ہسپتال میں اچھا ہوا تھا۔ کان سے پکڑ کر کھینچتا ہوا اسی ہسپتال میں علاج کے لئے لے گیا۔ اس کے علاوہ رات دن سینکڑوں ہمدردی کے واقعات ہمارے سامنے آتے رہتے ہیں۔ جن سے ثابت ہوتا ہے کہ حیوانات میں بھی ہمدردی موجود ہے۔ اور وہ بھی ہمدردی طلب مواقع پر ہمیشہ ہمدردی ہی کا اظہار کرتے ہیں۔ بھڑ ایک چھوٹا سا کیڑا ہے ایک کو چھیڑو دس بارہ بھنبھناتی ہوئی آجاتی ہیں۔ ایک کتے کو مارو چاروں طرف سے کتے بھونکتے ہوئے نکل آئینگے۔ خیر یہ بات تو مسلمہ ہے کہ کتے میں اور جانوروں کی نسبت

کچھ زیادہ ہمدردی کا جذبہ ہے۔ اسی لئے ہمارے مشرقی شعرا بھی اس کو رقیب سے کم درجہ نہیں دیتے۔ محبوب کی گلی میں قدم رکھا اور اس سے بھونکنا شروع کیا۔ دُور سے دیکھا اور سارے محلّے کو آگاہ کر دیا کہ آپ خیر سے تشریف لے آئے ہیں۔ ہوشیار ہو جانا۔ کتّے کو چھوڑ کر اور جانور بھی اس جذبے سے متمتع ہیں۔ جن کا ذکر کرنا بیجا طوالت معلوم ہوتا ہے۔ بہرحال ایک سفرنامہ میں میری نظر سے ہمدردی کا ایک بالکل سچّا واقعہ گزرا جس کا بیان کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ کیونکہ اس سے یہ بات بہت اچھی طرح ثابت ہوتی ہے کہ حیوان میں بھی ہمدردی کا مادہ انسان سے کم نہیں ؛

حیوانی ہمدردی کا حیرت خیز مظاہرہ

۱۹۰۸ء میں ایک بہت بڑا قافلہ کوہ سیاہ کے قریب سے گزر رہا تھا۔ یہ لوگ خلیج فارس کی بندرگاہوں سے پوشیدہ طور پر بندوقیں اور ہتھیار وغیرہ خرید کر افغانستان لے جا رہے تھے۔ راستے میں ایرانی حکومت کے دو سپاہیوں نے جن میں سے ایک بلوچ اور دوسرا ایرانی تھا ان کو روکا۔ ان لوگوں نے ان دونوں سپاہیوں کو قید کر لیا اور اپنے ساتھ لے کر روانہ ہو گئے ارادہ یہ تھا کہ کہیں راستے میں ان کا کام تمام کر دیا جائے۔ تاکہ کسی اور مصیبت کا سامنا نہ ہو۔ ایرانی کو راستے میں بھوک لگی اس نے اپنی کمر سے روٹی کھولی اور کھانی شروع کی۔ اتفاق سے ایک افغان اس کے پاس سے گزرا اس نے افغان کو روٹی

کھانے کی دعوت دی۔ چلتے چلتے افغان نے ایک نوالہ توڑ لیا اور
پھر اپنے اونٹوں کو سنبھالنے میں مصروف ہو گیا۔ چونکہ دھوپ نکل
آئی تھی۔ اس لئے یہ قافلہ گودزرہ کے مقام پر ٹھہر گیا۔ ان بے آب و
گیاہ صحراؤں میں دن کو سفر کرنا ناممکن ہے۔ اس لئے ہمیشہ رات
کو سفر کرتے ہیں۔ قیام کے بعد ان دونوں قیدیوں کا سوال پیش ہوا
قرار یہ پایا کہ اب یہ دونوں اپنی منزل سے دور آ گئے ہیں کہ زندہ
واپس نہیں پہنچ سکتے اور ان کو افغانستان لے جانا بیکار ہے نیز
خطرے سے بھی خالی نہیں اسلئے ان کو گولی سے اُڑا دیا جائے۔ ان سے
کہا گیا کہ مرنے سے پہلے دُعا مانگ لو۔ غرض ایرانی کو گولی کے
نشانے پر کھڑا کر دیا گیا اور چند افغان بندوق داغنے کے لئے
بالکل تیار کھڑے ہو گئے۔ اتنے میں وہی افغان جس کو ایرانی نے
روٹی کا ٹکڑا دیا تھا بھاگا ہوا آیا اور ایرانی کے آگے کھڑا ہو گیا اور
کہا کہ میں نے اس کا نمک کھایا ہے۔ اگر اس کو مارنے کا ارادہ
ہے تو پہلے مجھ سے نبٹ لو۔ پھر اس سے بات کرنا۔ غرض لڑ جھگڑ کر
اس افغان نے ایرانی کی جان بچا لی، اور اپنے ساتھ لے گیا۔ جب
رات ہوئی اور قافلہ روانہ ہوا تو افغان نے ایرانی سے کہا پیارے
اگر تجھے جان پیاری ہے تو یہ ستارہ سامنے ہے اس کی سیدھ
میں روانہ ہو جا۔ رات رات میں سفر کر لینا ورنہ تمہیں معلوم ہی ہے
کہ اس بیابان میں دن کو زندہ رہنا ناممکن ہے۔ ایرانی نے

کہا میرے ہمراہی بلوچ کو بھی میرے ساتھ کر دو تو بہت مہربانی ہو گی بھلا میں اکیلا کیونکر جاؤنگا مہربان افغان نے اس کی یہ آرزو بھی پوری کی۔ اور پانی کا ایک مشکیزہ بھی ان کو دیدیا۔ یہ دونو تمام رات چلتے رہے۔ پانی ختم ہو گیا۔ ایرانی مسلسل سفر کی تھکان اور پیاس سے نیم جان ہو گیا تھا مگر بلوچ اسرا بہ سہارا دیتا اور ہمت بندھاتا لئے جاتا تھا۔ آخر ایرانی بیہوش ہو کر گر گیا جب ہوش آیا تو اس نے بلوچ سے کہا کہ تم جاؤ۔ اگر چوکی تک سلامت پہنچ جاؤ تو میرے لئے پانی لے آنا۔ ورنہ موت تو سامنے ہے ہی - بلوچ روانہ ہو گیا اور ایرانی ریت پر بیہوش پڑا رہا۔ جب سورج کی گرمی اور زیادہ بڑھی تو ایرانی کو ہوش آیا۔ گرتے پڑتے ایک خشک جھاڑی کے سایہ میں جا گرا۔ حالت یہ تھی کہ کبھی ہوش آجاتا تھا کبھی بیہوش ہو جاتا تھا۔ اور سوائے موت کے کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ بے بسی اور بیکسی کے عالم میں جب ہوش آتا تھا سر اُٹھا کر اِدھر اُدھر دیکھ لیتا اور پھر بیہوش ہو جاتا تھا۔ اس نے دیکھا جھاڑی سے دو گز کے فاصلے پر دو ہرن بیٹھے ہیں۔ اس کو فوراً خیال آیا کہ یہ ہرن کہیں نہ کہیں سے پانی ضرور پیتے ہونگے۔ وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ وہ دونو ہرن اپنی جگہ سے اُٹھے۔ یہ بھی ان کے پیچھے پیچھے گرتا گھسٹتا روانہ ہوا۔ ہر دو چار قدم کے بعد ایرانی بیہوش ہو ہو جاتا تھا۔ جب اس کو ہوش

آتا تھا تو ہرن اس سے دو گز کے فاصلے پر اس کے منتظر کھڑے نظر آتے تھے - یہ پھر ہمت کر کے دو چار قدم چل لیتا تھا - غرض اس طرح صبح کے دس سے دن کا ایک بج گیا - ایرانی کی حالت یہ تھی کہ دو تین گز سے زیادہ فاصلے کی کوئی چیز اسے نظر نہ آتی تھی اور ہر لحظہ ہمت جواب دے رہی تھی اور موت سامنے کھڑی ہوئی نظر آ رہی تھی - لیکن ہرن اس کو کسی خاص مقام کی طرف لئے جا رہے تھے کہ یکایک ہرن نے چوکڑی بھری اور ایرانی بیہوش ہو گیا - بہت دیر کے بعد اسے ہوش آیا تو کیا دیکھتا ہے کہ چوکی کا سوار اس کے منہ میں پانی ٹپکا رہا ہے - ہوش و حواس درست ہونے کے بعد معلوم ہوا کہ وہ ایک ایسے مقام کے قریب ہے جہاں جان بچانے کے لئے پانی موجود ہے ؂

یہ واقعہ حیوانی ہمدردی کی غیر فانی مثال ہے اور اس بات کو ثابت کرتا ہے کہ حیوان بھی انسان کی طرح ہمدردی کا مادہ رکھتے ہیں - پالتو جانوروں کی ہمدردی کی مثالیں تو ہر شخص کو سینکڑوں یاد ہونگی جن سے ثابت ہو گا کہ جانور بھی اپنے آقا کے ساتھ محبت اور ہمدردی رکھنے میں کسی انسان سے پیچھے نہیں ہٹتے - اکثر دیکھا گیا ہے کہ جب آقا کو تکلیف ہوتی ہے تو ان کے پالتو حیوانات بھی بیچین ہو جاتے ہیں - گویا ہمدردی کی برقی رو ان کے دلوں کو بھی اسی طرح متاثر کرتی ہے جس طرح انسان کے احساسات

لطیفہ کو اُکساتی ہے۔ اگر کسی جانور کے ہمجنس کو تکلیف پہنچے تو وہ بے
اس کی مدد کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایک کوّے کی کائیں کائیں
سینکڑوں کوّوں کو کائیں کائیں کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ ایک بندر
کو پکڑ لو لاتعداد بندر اس کو چھڑانے کے لئے حملہ کر دیتے ہیں آخر
یہ ہمدردی نہیں تو کیا ہے جو ان بے عقل بے زبانوں میں کارفرما
ہے۔ اور ایک دوسرے کی مدد پر مجبور کرتی ہے +

ہمدردی ایسا شریف اور پاکیزہ جذبہ ہے کہ اگر اس کو انسانیت
کا زیور کہیں تو سزاوار ہے۔ دُنیا کا نظام اسی پر قائم ہے اگر یہ نہ
ہو تو خود غرضی تمام عالم کے نظام کو درہم برہم کر دے۔ اور
افراد عالم جو مختلف گروہوں اور جتھوں کی صورت میں ایک دوسرے
کی اعانت سے زندگی بسر کرتے ہیں۔ عدم ہمدردی کے باعث
منتشر ہو جائیں اور زندگی کا خوشگوار اور دلکش نغمہ دلخراش
اور جانگزا بن جائے +

ہمدردی کیونکر پیدا ہو سکتی ہے یُوں تو ہمدردی کم و بیش ہر انسان
میں ہوتی ہے۔ لیکن ماحول اور واقعات بعض لوگوں کے دلوں سے
ہمدردی کو خود غرضی میں تبدیل کر دیتے ہیں۔ اس لئے یہاں ہمدردی
کے احساس کو بیدار کرنے کے طریقوں کا ذکر کرنا بھی ضروری معلوم
ہوتا ہے۔ اگر سُوء اتفاق سے ناہموار واقعات کسی کو بنی نوع
انسان کی ہمدردی سے محروم کر دیں تو اس کو اس بات پر غور

کرنا چاہیئے کہ اگر ہم کسی کی ہمدردی کے محتاج ہوتے اور کوئی ہم سے ظاہری یا حقیقی ہمدردی کا اظہار نہ کرتا تو ہماری کیا حالت ہوتی۔ پھر زمانہ کے انقلابات پر نظر کرنی چاہیئے کہ ہمیشہ کسی کے حالات ایکساں نہیں رہتے۔ کبھی مصیبت کے دن آتے ہیں کبھی آرام کے۔ تقدیر کسی کو بناتی اور کسی کو بگاڑتی ہے۔ زمانہ کبھی اُبھارتا اور کبھی گراتا ہے۔ غرض دُنیا میں کوئی چیز ایک حالت پر قائم نہیں رہتی۔ پھر اب جبکہ خدا نے ہمیں دوسروں کی مدد کرنے کی قابلیت دی ہے تو کیا وجہ ہے کہ ہم اپنے بُرے وقت کو یاد کرتے ہوئے ان کی اعانت نہ کریں۔ اس کے علاوہ ہمیشہ یہ فرض کرنا چاہیئے کہ اگر ہم پر یہ کیفیت گزرتی تو ہماری کیا حالت ہوتی اور بنی نوع انسان۔ عزیزوں رشتہ داروں، دوستوں اور ہمسایوں سے ہماری کیا توقعات وابستہ ہوتیں۔ بس ان خیالات کو دل و دماغ میں جگہ دینے سے ہمدردی کی برقی رو انسان کے دل میں آپ سے آپ پیدا ہونے لگتی ہے "

حیوانات بھی ہمدردی کے مستحق ہیں "

جس طرح انسان کے ساتھ ہمدردی کرنا دوسرے انسانوں کا فرض ہے اسی طرح حیوانوں سے بھی ہمدردی ضرور کرنی چاہیئے۔ بعض سنگ دل فلاسفروں نے جانوروں کو گھاس پھوس سے مثال دی ہے۔ جس کا مطلب دوسرے الفاظ میں یہ ہے کہ وہ کسی قسم کی ہمدردی

کے مستحق نہیں۔ ہمارے نزدیک جانوروں کو کوئی وقعت نہ دینا اوران کو گھاس پھوس کے برابر خیال کرنا نہ حد سنگدلی اورناانصافی ہے۔ جانور بے زبان ہیں۔ جب ان کو تکلیف پہنچتی ہے تو وہ کس طرح مایوسی سے دیکھتے ہیں۔ اورامداد کے طالب ہوتے ہیں۔ لیکن حضرت انسان کی خود غرضی کی یہ کیفیت ہے کہ اپنے فائدے کے لئے ان کی جان کی ذرہ بھر پروا نہیں کرتے۔ اگر کوئی لدو جانور ہے تواس پراس قدر بوجھ لادینگے کہ چیں بُلوا دینگے اگر کسی جانور کا گوشت لذیذ ہے تو اس کو اس کثرت سے ذبح کرینگے کہ اس کی نسل ہی ناپید کردینگے۔ جب تک کوئی جانور کام دے رہا ہے اس کا آقا خوش ہے جہاں بیکار ہُوا اس کو گولی سے اُڑا دیا یا قصائی کے حوالے کیا۔ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ انسان اشرف المخلوقات ہے اور اسے ہر چیز کو اپنے کام میں لانے کا زیادہ سے زیادہ حق حاصل ہے۔ لیکن پھر بھی وہ اپنے اعمال کا ذمّہ دار ہے۔ اور خدا نے اس کو اس لئے نہیں بنایا کہ وہ اپنے سے ادنیٰ مخلوق کو بلاوجہ آزار اور تکلیف پہنچائے۔ یہ جانور تو ہماری خدمت کرنے کے لئے پیدا ہوئے ہیں۔ ان کی قدر کرنے کے علاوہ ہمیں ان کی بے زبانی اور بے بسی کو ہمیشہ ملحوظ خاطر رکھنا چاہیئے اوران پر بیجا اور بے ضرورت ظلم و ستم کرکے خلعت انسانیت پر ایک تعفن خیز دھبّہ نہیں لگانا چاہیئے۔ کیونکہ وہ بھی آخر ہماری طرح خدا کی پیدا کی ہوئی مخلوق

ہیں ان میں بھی جان ہے۔ جس طرح تکلیف اور آرام کو ہم محسوس کرتے ہیں وہ بھی ان احساسات سے عاری نہیں ہیں۔ اس لئے کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ ان کو لامتناہی اذیت کے لئے وقف کر دیا جائے"

متمدّن ممالک میں جہاں انسانوں کے علاج معالجے کے لئے خیراتی شفا خانے تعمیر کئے جاتے ہیں اور غربا کو طبّی مشورہ اور ادویات مُفت تقسیم کی جاتی ہیں وہاں حیوانات کے معالجہ کے ادارے بھی کھولے جاتے ہیں۔ ہمارے ملک میں تقریباً ہر ضلعے اور تحصیل میں حیوانات کے ہسپتال موجود ہیں۔ ان میں حیوانات کے دُکھ درد کا باقاعدہ علاج ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ بڑے بڑے شہروں میں حکومت نے ہمدردئ حیوانات کے ادارے جاری کر رکھے ہیں ان کے ملازمین لدو جانوروں کی نگرانی کرتے رہتے ہیں اگر کوئی شخص کسی کمزور یا بیمار جانور سے کام لیتا ہے تو اس کو گرفتار کر لیا جاتا ہے۔ اور اگر کسی جانور کی بساط سے زیادہ اس پر بوجھ لادا جاتا ہے تو اس کا بھی چالان کر دیا جاتا ہے۔ ہر قسم کی سواری کے لئے سواریوں کی تعداد مقرر ہے تاکہ جانور پر اس کی ہمت سے زیادہ بار نہ پڑے۔ بہرکیف پھر بھی بہت سے ایسے شقی القلب انسان موجود ہیں جو جانوروں کو اپنی غرض کے لئے مار مار کر زخمی کر دیتے ہیں جن کو دیکھ کر ہمدردی کا جذبہ خود بخود

متاثر ہوتا اور حضرت انسان کی جہالت اور ظلم پر آنسو ٹپکاتا ہے۔

ہمدردی کی اہمیت ہمدردی ایک ایسی شریف اور طبعی خصلت ہے جس کا تقاضا ہے کہ ان انسانوں اور حیوانوں کی بغیر کسی لالچ کے مدد کی جائے۔ جن کو حادثات زمانہ نے ہماری مدد کا محتاج بنا دیا ہے۔ ہمدردی ایک ایسا دلکش نغمہ ہے جس سے غم زدہ دلوں کے رنج و غم میں تخفیف ہوتی ہے۔ اور دُنیا سے جہالت ظلم اور تعدّی دُور ہوتی ہے۔ ہمدردی ہی وہ زینہ ہے جس کے ذریعہ بنی نوع انسان افلاس اور نکبت کے قعر مذلّت سے نکل کر تہذیب و تمدّن کی معراج پر پہنچتے ہیں۔ ہمدردی افراد عالم میں یگانگت اور یک جہتی پیدا کرتی ہے۔ غرض ہمدردی شرط انسانیت ہے اور مہذّب اور متمدّن ہونے کی دلیل ہے۔

محبّت

محبت کیا ہے؟ محبّت وہ پاکیزہ جذبہ ہے جس سے دُنیا کا نظام قائم ہے۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے ع محبّت نہ ہوتی تو دُنیا نہ ہوتی۔ محبت ایک روحانی رشتہ ہے جس میں تمام دُنیا منسلک ہے وہ افراد جو محبّت کے سلسلہ بے زنجیر کے اسیر ہیں چاہے دُور رہوں یا نزدیک ایک دوسرے سے قریب ہیں۔ محبّت وہ حرارت ہے جو ہر قسم کی قربانی اور ایثار کے لئے آمادہ کرتی ہے۔ محبت وہ نظام ہے جس کی موجودگی میں باہمی نفاق اور فساد معدوم ہے۔

محبّت وہ تعاون ہے جس کی وجہ سے ایک انسان دوسرے انسان کی خوشی اور غمی میں شریک ہوتا ہے۔ ادنیٰ اعلیٰ، مہذب غیر مہذّب، امیر غریب انسان حیوان سب کے خمیر میں محبّت کی چاشنی ہے ہم آئے دن دیکھتے ہیں کہ قانونی بندشوں کا خیال دُل کو تکلیف دیتا ہے لیکن محبّت کی بندش دل میں خوشی اور مسرت پیدا کرتی ہے۔ محبّت کی وجہ سے بہت سی تکلیفیں انسان خوشدلی سے برداشت کرتا ہے لیکن وہ فرائض جن کی ادائیگی میں

محبّت کی کارفرمائی نہیں ہوتی اس پر شاق گزرتی ہیں۔ بغاوتیں فسادات اور لڑائی جھگڑے وہیں ہوتے ہیں جہاں محبّت کا عمل دآمد نہیں ہوتا۔ جہاں محبت کی عملداری ہے وہاں عدل و انصاف کی عدالتیں قائم کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ محبّت کا قیام ناانصافی اور ظلم و تعدّی کو رخنہ اندازی کا موقعہ ہی نہیں دیتا۔

محبّت کی کرشمہ سازیاں محبّت وہ دلکش اور رُوح افزا نغمہ ہے جس کی الاپیں زمین اور آسمان کے درمیان ہر وقت گونجتی ہیں محبّت وہ نشہ ہے جس سے افرادِ عالم سرشار اور بدمست ہیں اور شب و روز یگانگت کے رُوح پرور گیت گاتے ہیں اسی سے مُردہ دلوں میں زندگی کے آثار نمایاں ہیں۔ سچ پُوچھو تو اسی سے دُنیا کا نظام قائم ہے۔ جہاں محبت نہیں حقیقت یہ ہے کہ وہاں کچھ بھی نہیں۔ محبّت ہی دُنیا اور عاقبت کا حاصل ہے۔ اور محبّت ہی زندگی ہے۔ محبّت کے بغیر زندگی بے مزہ ہے۔ جس قوم میں محبّت کا فقدان ہے اس میں ترقی کے جوہر مفقود ہیں۔ جہاں محبّت نہیں وہاں آرام جان نہیں۔ محبّت کے بغیر دُنیا ایسی آرامگاہ ہے جس پر کانٹے بچھے ہوئے ہوں۔ بعض لوگ تو یہاں تک بڑھے ہیں کہ محبت کو اپنا مذہب کہتے ہیں۔ اور بعض محبّت کو خدا بتلاتے ہیں۔ اور اس کو انسان ہی نہیں سمجھتے جو محبّت سے بے بہرہ ہو۔ اس میں کوئی شک نہیں محبّت کا فقدان

انسان کو درندہ بناتا ہے۔ اور انسانیت کے درجہ سے گراتا ہے گویا محبت ہی انسانیت ہے اور محبت ہی تمام فضائل انسانی کی تحصیل و تکمیل کا سرچشمہ ہے

محبت کا بھیانک پہلو

محبت ایک نہایت لطیف اور شریف جذبہ ہے۔ اس کو ہوا و ہوس کا آلہ بنانا کسی طرح محمود نہیں۔ اس سے رُوح ترقی کرتی ہے۔ دماغ روشن اور دل کدورتوں سے پاک ہوتا ہے۔ انسان مجاز سے حقیقت کی طرف بڑھتا ہے لیکن بعض ہوس پرست اور خودغرض لوگ محبت کے کچھ اور ہی معنی لیتے ہیں جس سے محبّت جیسا پاکیزہ جذبہ نہایت بھیانک اور نفرت انگیز صورت اختیار کر لیتا ہے۔ غالب نے کیا خوب کہا ہے ؎

ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی
اب آبروئے شیوۂ اہل نظر گئی!

سوسائٹی میں جہاں کہیں محبت کا نام آتا ہے سُننے والوں کے کان کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اور چشم زدن میں ایک نہایت بھیانک منظر آنکھوں کے سامنے سے گزر جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ محبت کا دعویٰ کر کے بعض حضرات ایسے مذموم افعال کے مرتکب ہوئے ہیں جن کے اعادے سے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں اور ان کو بیان کرنے کی شائستگی اجازت نہیں دیتی۔ وہ نام نہاد محبت کے دعویدار تو یہ کہہ کر ع

بدنام اگر ہونگے تو کیا نام نہ ہوگا

جو کرنا تھا وہ کر گزرے۔ لیکن محبّت کے دامن پر ایک ایسا بدنما دھبہ لگا گئے جو رہتی دُنیا تک محبّت کے نام سے افرادِ عالم کو ہیزار رکھیگا اور شرم و حیا، عزّت آبرو ہمیشہ خون کے آنسوؤں سے روئینگی۔ لیکن وہ دھبہ دھوئے نہ دھلیگا۔ اور مٹائے نہ مٹے گا۔ ہماری مشرقی شاعری کی بنیاد بھی سوءِ اتفاق سے ایسی ہی محبّت پر قائم کی گئی ہے۔ اس لئے چند شعرا کو چھوڑ کر ہر شاعر کا کلام ہوس پرستی کے جذبات سے آلودہ ہے۔ اور سوسائیٹی کے اخلاق کو برابر بگاڑ رہا ہے۔ ان کے علاوہ مخرب الاخلاق ناولوں سے بھی ہزاروں خاندانوں کے دل داغدار ہیں اگر شعروں اور ناولوں کے ذریعہ سے محبّت کا صحیح درس دیا جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ محبّت کے ذریعہ سے اولوالعزمی اور ترقی کے خیالات پیدا نہ ہوں ؛

محبّت فطری عطیّہ ہے

محبّت ایک ایسا جذبہ ہے جس سے خداوند کریم نے انسان اور حیوان کا خمیر اُٹھایا ہے اس میں کوئی شک نہیں اگر محبّت فطری نہ ہوتی تو والدین چھوٹے چھوٹے بچّوں کو تکلیفیں اُٹھا کر نہ پالتے اور اولاد کی راحت کو اپنے آرام پر ترجیح نہ دیتے مثل مشہور ہے سارا جوبن گھالے تو ایک بچّہ پالے۔ عورتیں اگر محبّت مادری سے متمتع نہ ہوتیں تو اپنی اولاد کا گلا پیدا ہوتے ہی گھونٹ ڈالتیں نہ بچّوں میں اگر فطری محبّت نہ ہوتی تو اپنے

ماں باپ سے مانوس نہ ہوتے۔ اور اپنی زندگی ماں باپ کی خدمت کے لئے وقف نہ کر دیتے والدین اگر طبعی محبت سے محروم ہوتے تو اولاد کی بہبودی کا خیال نہ کرتے اور خود آرام کی زندگی بسر کرتے۔

محبت اگر طبعی نہ ہوتی تو سوسائٹی کا نظام درہم برہم ہو جاتا اور کوئی ضرورت کے وقت کسی کے کام نہ آتا۔ گویا محبت کا فقدان قیامت کا منظر پیش کرتا۔

حیوانوں میں بھی محبت ہے محبت سے محض مہذب اور غیر مہذب قومیں ہی بہرہ ور نہیں ہیں۔ درندچرند اور پرند بھی محبت کے پاکیزہ جذبے سے سرافراز ہیں۔ پرندے دن بھر لڑتے پھرتے ہیں۔ لیکن شام کو آشیانے کی کشش انہیں بسیرے کے لئے آشیانے ہی کی طرف کھینچتی ہے۔ ہنس اپنے شریک زندگی سے جدا ہونے کے بعد کھانا پینا ترک کر دیتا اور آخر کار محبت کی بدولت اپنی جان جان آفریں کے سپرد کر دیتا ہے۔ بے ضرر پرندے اپنے بچوں کو ناگہانی آفتوں سے بچانے کے لئے دشمن کا مقابلہ کرتے ہیں۔ اگر کسی جانور کا بچہ ضایع ہو جائے تو کئی کئی دن تک اس پر دیوانگی کا سا عالم طاری رہتا ہے۔ اسی بیچینی اور ہمدردی کا نام محبت ہے جو حیوانوں اور انسانوں کے دلوں میں یکساں کارفرما ہے۔

پالتو جانور اپنے آقا سے اپنی محبت کا اظہار

عجیب عجیب طریقوں سے کرتے ہیں۔ کُتّے کو دیکھو اپنے مالک کو دیکھ کر دُم ہلاتا ہے۔ اِدھر اُدھر بھاگتا ہے۔ اور پھر آکر آقا کے پاؤں پر سر رگڑتا ہے۔ محبّت کی حرارت اس کی آنکھوں میں خاص قسم کی چمک اور جسم میں عجیب قسم کی قوت پیدا کر دیتی ہے کیا مجال کہ مالک کو کوئی تکلیف پہنچے یا غیر شخص گھر کی چیز کو ہاتھ لگانے پائے۔ مالک کے اشاروں پر چلنا اور اسکی وفاداری میں جان تک قربان کر دینا اسی جانور کا کام ہے جو اسکی محبّت کی دلیل ہے۔ گھوڑے کی محبّت بھی ضرب المثل ہے۔ اسی طرح اور پالتو جانور بھی محبّت میں کسی سے کم نہیں ؛

خدا کی قدرت ہے کہ درندے بھی محبّت سے محروم نہیں وہ بھی اپنے آقا کے حکم کی تابعداری کرتے ہیں۔ شیر جیسا خونخوار درندہ انسان کا مطیع اور فرمانبردار بن جاتا ہے۔ یہ محبّت نہیں تو اور کیا ہے جو اس کی درندگی اور خونخواری کو اطاعت اور فرمانبرداری میں تبدیل کر دیتی ہے ؛

غرضمندی اور محبّت

محبّت ایک فطری عطیہ ہے جو آپ ہی آپ دلوں میں پیدا ہوتا ہے بعض لوگوں سے خواہ مخواہ محبّت ہو جاتی ہے اور بعضوں سے آپ ہی آپ دشمنی اور بغض ہو جاتا ہے لیکن پھر بھی گرد و پیش کے حالات محبّت کی تربیت اور پرورش میں بڑی مدد دیتے ہیں۔ فطری طور پر انسان ہر اُس چیز سے محبّت

کرنے پر مجبور ہے جو اس کی روحانی یا جسمانی ضرورتوں کو پورا کرتی ہے یا کسی ضرورت کی تکمیل میں معاون ثابت ہوتی ہے۔ انسان کی یہی خود غرضی ہر اس شخص سے مانوس کر دیتی ہے جو اس کی کسی غرض کو پورا کرتا ہے یا اس کی کسی غرض کو حاصل کرنے میں مدد دیتا ہے۔ برخلاف اس کے جو چیزیں انسان کی غرض پورا کرنے میں رکاوٹ پیدا کرتی ہیں ان سے قدرتی طور پر نفرت ہو جاتی ہے اور بعض اوقات یہی نفرت بڑھتے بڑھتے دشمنی کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ بعینہ یہی حالت حیوانوں کی ہے۔ وہ بھی اپنے دوست اور دشمن کو پہچانتے ہیں اس لئے اپنے دوستوں سے محبت اور دشمنوں سے نفرت کا اظہار کرتے ہیں ؛

غرض پرستی اگرچہ محبت کے بڑھنے اور گھٹنے میں بہت مدد دیتی ہے۔ لیکن ایسی محبت جو اغراض پر مبنی ہو اس کو بے لوث یا بے غرض محبت نہیں کہا جا سکتا۔ نیز محبت جیسے پاکیزہ جذبہ کو غرض سے آلودہ کرنا محبت کی وقعت کو کم کر دیتا ہے۔ اس لئے محبت وہی مستحسن ہے جو بے غرض ہو۔ پھر بھی اکثر دیکھا گیا ہے کہ محبت کسی غرض سے پیدا ہوئی اور غرض پوری ہونے کے بعد بھی باقی رہی بعض اوقات یہ محبت بھی وہی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ جو بے غرض محبت سے مختص ہے۔ بہتر تو یہ ہے کہ محبت کو غرض کی آلایش سے پاک رکھا جائے۔ اگر ایسا ممکن نہ ہو تو دوسرے

کی اغراض کا بھی اسی قدر خیال رکھنا چاہئے جس قدر ذاتی اغراض کا رکھا جاتا ہے۔ نیز محبت میں ایسی اغراض کی تکمیل سے ہمیشہ گریز کرنی چاہئے جس سے دوسرے کو نقصان پہنچے اور اپنا فایدہ ہو۔ اس قسم کی محبت کو محبت کہنا گناہ ہے۔ ایسا رویہ محبت کو اس طرح فنا کر دیتا ہے جس طرح دھوپ شبنم کو۔ اور محبت کے شعلہ کو اس طرح بجھا دیتا ہے جس طرح ہوا کا تیز جھونکا شمع کو ॥

صحبت کا اثر

بعض اوقات محبت ایک دم بھی پیدا ہو جاتی ہے لیکن اکثر محبت پاس رہنے سہنے اور اٹھنے بیٹھنے سے ہوتی ہے۔ کسی حکیم کا قول ہے کہ جو محبت جلدی پیدا ہوتی ہے وہ جلدی فنا ہو جاتی ہے اور جس محبت کو پرورش پانے میں دیر لگتی ہے وہ عام طور پر دیرپا ہوتی ہے ایسی محبت کا اثر اس قدر دیرپا ہوتا ہے اور اس طرح رگ وپے میں سرایت کر جاتا ہے کہ اس کی بیخ کنی آسانی سے نہیں ہو سکتی۔ جو محبت ایک دم پیدا ہوتی ہے معمولی معمولی باتیں اس کو توڑ ڈالتی ہیں لیکن جو محبت آہستہ آہستہ پرورش پاتی ہے اس میں بڑی بڑی ناگوار حرکات سے بھی انسان اس طرح درگزر کر جاتا ہے جس طرح کوئی معمولی سی بات ہوتی ہے۔ محبت کا رشتہ اگرچہ نہایت ناپائیدار کہلاتا ہے لیکن امتداد زمانہ اس کو بٹ دے دے کر اس قدر مضبوط بنا دیتا ہے کہ بڑی سے بڑی طاقت اس کو آسانی سے توڑ نہیں سکتی ॥

شادی بیاہ کا پُرانا طریقہ محبت بڑھاتا ہے	ہمارے اکثر نوجوانوں کو ہندوستان کے شادی بیاہ کے قدیمی طریقے ناپسند

ہیں۔ وہ عموماً مغرب کے آزادانہ ازدواجی طریقے کی تعریف کرتے ہیں۔ جس کے ماتحت اپنی مرضی کے مطابق اپنے نصف احسن کا انتخاب عمل میں لایا جاتا ہے۔ یورپ کی موجودہ حالت زبان حال سے کہہ رہی ہے کہ وہ شادیاں کبھی کامیاب نہیں ہوتیں جو فریقین ظاہری نمایش سے متاثر ہو کر کر لیتے ہیں اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ مراحل جو نئے جوڑے کو آہستہ آہستہ طے کرنے چاہئیں بہت جلد طے کر لئے جاتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ شادی ہونے کے بعد فریقین ان مسرتوں سے لطف اندوز نہیں ہو سکتے جو سنجوگ کا لوازمہ کہلاتے ہیں۔ برخلاف اس کے وہ جوڑے جو آہستہ آہستہ گرد و پیش کے حالات سے متاثر ہوتے ہوئے قدم قدم زندگی کے میدان میں بڑھتے ہیں ہمیشہ خوشدلی اور مسرت کی زندگی بسر کرتے ہیں امتداد ایام کے ساتھ ساتھ محبت ناہموار حالات کو ہموار کر دیتی ہے۔ ظاہر پرستی گھٹتی اور حقیقی محبت اس کی جگہ لیتی جاتی ہے آخرکار درگزر کرنے کی قوت اس درجہ پیدا ہو جاتی ہے کہ دو چقماق ٹکراتے ہیں۔ ان میں سے چنگاریاں نکلتی ہیں لیکن خرمن زندگی کے لئے وہ ضرر رساں ثابت نہیں ہوتیں ؛

ہندوستانی طریقہ ازدواج میں سب سے بڑی قباحت یہ نکالی جاتی ہے۔ کہ طرفین ایک دوسرے سے بالکل ناواقف ہوتے ہیں حقیقتاً ناواقف ہونا اتنی بُری بات نہیں، جتنی یہ بات قباحت کی ہے۔ کہ طرفین ایک مرتبہ بھی شادی سے پہلے ایک دوسرے کو دیکھ نہیں سکتے۔ اگر یہ رسم اُٹھادی جائے تو کوئی بُرائی نہیں۔ کیونکہ اسلامی شرع بھی اس کی اجازت دیتی ہے۔ لیکن ازدواج سے پہلے ایک دوسرے سے بے تکلفانہ ملنا یقیناً نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے۔ ممکن ہے بعض حالات میں اس سے کوئی خوشگوار نتیجہ برآمد ہو سکے لیکن تجربے سے ثابت ہو رہا ہے کہ یہ طریقہ خطرناک بھی ہے اور محمود بھی نہیں"

محبت میں اعتدال ضروری ہے

اِس بات کو ہر شخص تسلیم کرتا ہے کہ دُنیا کی ہر خوبی میں اعتدال کی حد سے آگے نہیں بڑھنا چاہیئے۔ جادۂ اعتدال سے متجاوز ہونے سے افراط اور تفریط پیدا ہوتی ہے۔ افراط اور تفریط چاہے اچھائی میں ہو یا بُرائی میں کبھی اچھی نہیں کہلائی جاتی۔ یہی حالت محبّت کی ہے۔ اگر محبت میں افراط پیدا ہو تو اس کو فلاسفہ عشق کہتے ہیں۔ عشق ایک قسم کا دیوانہ پن ہے۔ برخلاف اس کے اگر محبّت تفریط کی طرف بڑھے تو دشمنی کا جذبہ تربیت پاتا ہے۔ دشمنی بذات خود مذموم ہے اس لئے نہایت ضروری ہے کہ محبّت کو اعتدال کے راستے سے اِدھر اُدھر نہ ہونے

دیا جائے تاکہ ذم کا پہلو پیدا نہ ہو۔

جو لوگ از دیادِ محبت سے ایک دوسرے کے ساتھ بہت زیادہ بے تکلف ہو جاتے ہیں۔ اکثر ان میں بدمزگی پیدا ہو کر بہت جلد محبت نفرت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اسی لئے کسی حکیم نے کہا ہے بے تکلفی محبت کی دشمن ہے۔ مولانا حالی کا شعر ہے

بڑھاؤ نہ آپس میں اُلفت زیادہ   مبادا کہ ہو جائے نفرت زیادہ

ممکن ہو سکتا ہے کہ یہ شعر مخصوص حالات میں غلط ثابت ہو لیکن یہ بات مسلمہ ہے کہ زیادہ بے تکلفی اور زیادہ محبت انسان کو اندھا کر دیتی ہے اور وہ جوشِ محبت میں بہت سے ایسے افعال کر گزرتا ہے۔ جن پر بعد میں خود بخود ندامت ہوتی ہے۔ اور وہ محسوس کرتا ہے کہ اس نے واقعی غلطی کی۔ شارعِ اسلام کا قول ہے کہ آپس میں وقفہ سے ملو تاکہ محبت بڑھے۔ اس مقولہ کی تفسیر یہ ہے کہ زیادہ ملنے جلنے سے بے تکلفی بڑھتی ہے اور بے تکلفی میں بعض ایسی باتیں پیدا ہوتی ہیں جن پر سنجیدگی خود شرماتی ہے۔ بہر حال محبت کا رشتہ بہت نازک رشتہ ہے۔ اس کو قائم رکھنے کے لئے بہت زیادہ حزم و احتیاط کی ضرورت ہے تاکہ یہ نازک تعلق ہمیشہ قائم رہے اور اس کی بدولت پسندیدہ اور دل خوش کن نتائج برآمد ہوں۔

ورزش

ورزش کی اہمیت اور ضرورت

اعضائے رئیسہ اور جسم کو تندرست رکھنے کے لئے ورزش کی اتنی ہی ضرورت ہے جتنی زندگی کو برقرار رکھنے کے لئے غذا کی لیکن عام طور پر ہم لوگوں میں ورزش کی اہمیت کا پُورا پُورا احساس نہیں کیا جاتا۔ بچے یہ سمجھتے ہیں کہ کھیلنا کودنا ہی ورزش ہے۔ جوان خیال کرتے ہیں کہ روزانہ کا کام انجام دینا ورزش میں داخل ہے۔ اور بُوڑھے وہ تو ورزش کو اپنے وقار ہی کے منافی سمجھ بیٹھے ہیں۔ یہ درست ہے کہ بچوں کے لئے کھیلنا کُودنا ورزش ہے۔ لیکن یہ کھیلنا کودنا اتنا ہونا چاہیئے کہ جسم میں چُستی اور طبیعت میں پھُرتی پیدا ہو جائے جوانوں کا یہ کہنا کسی طرح صحیح نہیں کہ روزانہ کا کام کاج ہی ورزش ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ جوانی میں بغیر ورزش کے کھایا پیا آسانی سے ہضم ہو جاتا ہے اور طبیعت چُست و چالاک رہتی ہے ؎

ہم نے دیکھے ہیں نوجوانی میں
مئے رنگین کے لطف پانی میں

لیکن چند دن کے بعد خود بخود محسوس ہونے لگتا ہے کہ کام کرنے

سے تھکان پیدا ہوتی ہے۔ اور کھانے کو باقاعدہ ہضم کرنے کے لئے کسی ورزش کی ضرورت ہے۔ بُوڑھوں کا یہ خیال کتنا غلط ہے کہ ورزش ان کے وقار کے خلاف ہے۔ ورزش تو تندرستی کو قائم رکھنے کا ایک طریقہ ہے بچہ بُوڑھا جوان اس سے کوئی مستثنیٰ نہیں۔ جب تک انسان زندہ ہے وہ مجبور ہے کہ کوئی نہ کوئی ورزش کرتا رہے تاکہ اس کا جسم توانا اور طبیعت ہشاش بشاش رہے رنگ میں خون کی سُرخی جھلکے۔ کھانا ٹھیک طرح ہضم ہو۔ بڑھاپے میں بھی ہمت جوان رہے۔ اور جوانی میں جوانمردی کے جو ہر چمکتے رہیں۔ جو لوگ ورزش کرتے ہیں۔ وہ دوسروں سے الگ نظر آتے ہیں۔ رنگ کُندن کی طرح چمکتا ہُوا۔ جسم میں پھرتی۔ اعضا مضبوط سینہ کشادہ۔ بھرے بھرے ڈنڑ۔ ہمت اور شجاعت۔ قدم قدم پر غمازی کرتی ہوئی۔ بے فکری کے آثار پیشانی سے ہویدا۔ غرض ورزشی آدمی کسی طرح نہیں چھپتا۔ ہر کس و ناکس کی نظر اس پر پڑتی ہے۔ اور مُنہ سے بیساختہ تعریف نکلتی ہے۔ جو لوگ بچپن سے ورزش کرتے ہیں۔ اور جوانی کے زمانے میں بھی اس سے غافل نہیں رہتے ورزش بڑھاپے میں ان کو عصائے پیری کا کام دیتی ہے۔ وہ بیماریوں سے محفوظ رہتے اور نہایت آرام کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ ان کا بڑھاپا بیمار اور سست نوجوانوں سے اچھا گزرتا ہے۔ اگرچہ اعضا مضمحل ہو جاتے ہیں۔ لیکن وہ

"یک پیری و صد عیب" کے مصداق نہیں بنتے۔ برخلاف اس کے غیر کسرتی نوجوان عین جوانی میں بوڑھے۔ ڈھیلے ڈھالے سست اور کاہل نظر آتے ہیں۔ وہ ایسا محسوس کرتے ہیں گویا کبھی جوانی آئی ہی نہ تھی۔ اور اگر آئی تھی تو وہ خوش آیند زمانہ آنکھ جھپکتے میں ختم ہو گیا۔ جب تک صحت درست نہ ہو نہ تو روزی کمائی جاتی ہے اور نہ چار دن کی زندگی میں مزا آتا ہے، بیماری میں تو پیسے کی شکل دکھائی نہیں دیتی۔ اگر کچھ جمع ہے تو وہ حکیموں ڈاکٹروں کی فیسوں اور ان کے نسخوں پر صرف ہو رہا ہے۔ غرض پیسے بغیر ایک سانس لینا دوبھر ہو جاتا ہے اسی لئے کہتے ہیں تندرستی ہزار نعمت ہے۔ تندرستی ہو تو زندگی کا بھی مزہ ہے۔ کھانے پہننے میں بھی لطف ہے۔ ورنہ ہر چیز بُری معلوم ہوتی ہے۔ اور زندگی جیسی عزیز نعمت سے انسان اکتا جاتا ہے۔

رُوحانیت اور جسمانیت

زمانۂ حال کے بعض مفکرین کا خیال ہے کہ رُوحانی ترقی کے لئے جسمانی صحت کی از حد ضرورت ہے۔ کیونکہ رُوح جیسی لطیف اور پاکیزہ چیز نحیف اور نزار جسم میں خوش نہیں رہ سکتی۔ ایسا جسم جو طرح طرح کے آلام و امراض کی پرورش گاہ ہو یا جو اتنا کمزور ہو چکا ہو کہ اس پر ہر مرض آسانی سے غالب آ جائے۔ اس میں رُوح کس طرح ترقی کر سکتی ہے۔

متقدمین کا نظریہ اس کے بالکل برعکس ہے یہ لوگ روحانی ترقی حاصل کرنے کے لئے اپنے جسم کو طرح طرح کے آزار پہنچاتے ہیں۔ اور سمجھتے ہیں کہ جسم کو کمزور کئے بغیر روح کو طاقتور نہیں بنایا جا سکتا موجودہ زمانہ کی تحقیقات کا لب لباب یہ ہے کہ روح اور جسم میں بہت ہی زیادہ قریبی تعلق ہے اگر بدن کو ذرا بھی تکلیف پہنچتی ہے تو روح کو سب سے پہلے اذیت ہوتی ہے۔ بلکہ روح اس قدر حساس ہے کہ وہ دوسرے کی تکلیف سے بھی متاذی ہوتی ہے اس لئے روح کو اذیت پہنچانا کسی طرح درست نہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ روح کے ذریعے سے ہم مدارج کمال تک پہنچتے ہیں۔ مدارج کمال تک پہنچنے کے لئے عقل سالم کی ضرورت ہے اور عقل سالم جسم سالم میں ہوتی ہے۔ جب تک جسمانی صحت درست نہ ہو اسوقت تک روح اور عقل بھی ٹھیک طرح کام نہیں کرتی اس لئے ضروری ہے کہ انسان تندرستی کا خیال رکھے۔ تاکہ اعضائے رئیسہ اپنے فرایض کو صحیح طریقے سے انجام دیں گویا جسمانی فتور کے ساتھ عقل اور روح میں بھی فتور نہ آنے پائے۔

بعض لوگ ورزش پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اس سے عقل کند ہو جاتی ہے۔ ان کا اعتراض کچھ نہ کچھ وقعت ضرور رکھتا ہے لیکن اگر احتیاط سے ورزش کی جائے اور ورزش کے ساتھ قوائے عقلی کی بھی تربیت ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ خاطر خواہ نتائج مرتب نہ ہوں۔

جو لوگ محض جسم کی پرورش کرتے ہیں اور قوائے عقلی کو حرکت نہیں دیتے۔ ان کی عقل آپ سے آپ خراب ہو جاتی ہے۔ چنانچہ پہلوانوں کو دیکھ لو وہ عقل کے بدھو ہوتے ہیں لیکن جسمانی طاقت میں ہاتھی سے ٹکر کھاتے ہیں۔ اگر وہ اپنے قوائے عقلیہ سے کام لیں تو یقیناً وہ عام آدمیوں کی نسبت زیادہ دماغی کام کر سکتے ہیں۔

ورزش کی ایک حد چاہیئے

ورزش کی اہمیت اور ضرورت کو سمجھنے کے بعد نہایت ضروری ہے کہ اپنی قوت برداشت اور ضرورت کے مطابق ورزش کی جائے۔ جو لوگ ضرورت سے زیادہ ورزش کرتے ہیں ان کی صحت جسمانی پر ورزش کا اُلٹا اثر پڑتا ہے۔ اور بجائے فائدہ کے انہیں نقصان پہنچتا ہے۔ ورزش کا حقیقی مدعا یہ ہے کہ ہمارے تمام اعضا کو حرکت کرنے کا موقعہ ملے اور بیکار رہنے کے باعث کوئی عضو مسلوب یا شل نہ ہو جائے۔ انسان کا جسم ایک قدرتی مشین ہے اور تمام اعضا اور قویٰ اس کے کل پُرزے ہیں۔ اگر کسی مشین کو بے احتیاطی سے چلایا جائے تو اس کے پُرزے خراب ہو کر وہ بہت جلد بیکار ہو جاتی ہے۔ جن لوگوں کو مشینوں سے سابقہ پڑتا ہے۔ انہیں اندازہ ہے کہ بے احتیاطی سے مشین کتنی جلدی خراب ہو جاتی ہے۔ جو لوگ مشینوں کی پوری پوری نگہداشت کرتے ہیں وہ ان سے مدتوں کام لیتے ہیں۔ اور ان میں کوئی خرابی نمودار نہیں ہوتی۔ اس لئے

ہمارا فرض ہے کہ جسمانی مشین کو بھی نہایت احتیاط کے ساتھ استعمال کریں اور معمولی سے معمولی خرابی کو رخنہ اندازی کا موقعہ نہ دیں جس طرح مشین کو نہ چلانے سے پُرزے جم جاتے ہیں۔ اور پھر جب تک صفائی نہ ہو چل نہیں سکتے۔ یہی حالت جسمانی مشین کی بھی ہے۔ اگر اس کو بیکار چھوڑ دیا جائے تو اس کے پُرزے بھی کام کرنے سے جواب دیدیتے ہیں۔ اور اگر ان کی بساط سے زیادہ ان کو حرکت دی جائے تو وہ بہت جلد معطل ہو جاتے ہیں ۔

ورزش کی مقدار کا تعین کرنا نہایت مشکل کام ہے چونکہ ہر شخص کی قوت اور جسم کی ساخت علیحدہ علیحدہ ہوتی ہے۔ اس لئے سب کو ایک لاٹھی سے ہانکنا کسی طرح قرین عقل نہیں بعض لوگ ذراسی ورزش سے تھک جاتے ہیں۔ بعض کی جسمانی ساخت زیادہ ورزش طلب کرتی ہے اس لئے ہمیشہ ورزش اپنی قوت اور ہمت کے مطابق کرنی چاہئے۔ بس صحت کو بحال رکھنے کے لئے اتنی ورزش کافی ہے۔ جس سے تمام اعضاء کھُل جائیں۔ اور ہلکی سی تھکان بھی محسوس ہونے لگے۔ سانس جلدی جلدی آئے اور خون کا دورہ تیز ہو کر جسم کی رگ رگ میں حرارت پیدا ہو جائے۔ ورزش کی تھکان سے دل و دماغ تازہ ہوتا ہے بلغم جل جاتا ہے۔ اگر پسینہ لانے کی حد تک ورزش کی جائے تو اس سے مسامات بھی کھُل جاتے ہیں۔ بدن میں ہلکاپن اور طبیعت میں جولانی پیدا ہوتی

ہے پھر خود بخود کام کرنے کو جی چاہتا ہے ۔

ضرورت سے زیادہ ورزش کرنے سے انسان تھک جاتا ہے۔ تھکان تمام بدن کو سست کر دیتی ہے۔ اس طرح سے ورزش کا اصلی مقصد فوت ہو جاتا ہے۔ ورزش کا حقیقی منشاء تو یہ ہے کہ وہ اعضا جن کو روزانہ کام کرنے میں حرکت کرنے کا موقعہ عام طور پر نہیں ملتا۔ اور حرکت نہ کرنے سے ان میں خون کا دورہ پوری طرح جاری نہیں رہ سکتا۔ ورزش کی تحریک سے تازہ خون ان میں دورہ کرنے لگے اور وہ اپنی اصلی حالت پر آجائیں۔ یعنی خون کی کمی کے باعث جسم کا کوئی حصّہ سست نہ ہونے پائے یہی وجہ ہے کہ آجکل درسگاہوں میں تعلیم کے ساتھ ساتھ ورزش کرنے کا بھی انتظام کیا جاتا ہے تاکہ طالب علم بیٹھے بیٹھے سست نہ ہو جائیں ۔ . . . .

. . . .

ہلکی اور بھاری ورزشیں :۔

ورزش کو دو قسموں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ ایک ہلکی قسم کی ورزشیں، دوسرے سخت ورزشیں۔ ہلکی ورزشیں معمولی طاقت کے آدمیوں کے لئے جو دماغی کام کرتے ہیں مفید ہیں۔ ان ورزشوں کو جاری رکھنے سے عام صحت بحال رہ سکتی ہے بھاری قسم کی ورزشیں ایسے لوگوں کے لئے مفید ہیں جن کی جسمانی ساخت اور طاقت ان کو ہلکی ورزش سے اثر پذیر نہیں ہونے دیتی۔ آجکل

ہلکی ورزشوں کا زیادہ رواج ہے۔ اور سخت ورزشوں کو بہت کم پسند کیا جاتا ہے۔ جس زمانے میں لوگ فارغ البالی کی زندگی بسر کرتے تھے اور معاشی کشاکش سے نچنت تھے۔ اس زمانے میں بھاری ورزشوں کا عام طور پر چرچا تھا۔ اس زمانے میں ورزش کو ایک فن کی حیثیت حاصل تھی۔ پہلوانوں کی بڑی قدر تھی۔ رؤساء نامی گرامی پہلوانوں کو دُور دُور سے بلا کر ملازم رکھتے تھے۔ اب اوّل تو روپے کی فراوانی نہیں رہی دوسرے نئی سے نئی دلچسپیاں اور اخراجات کی مدّیں پیدا ہو گئی ہیں اس لئے ورزش کے فن کی سرپرستی کرنے والے امرا کی تعداد میں روز بروز کمی ہوتی جاتی ہے۔ اور بھاری بھاری ورزشیں کرنے والے لوگ بھی کم ہو رہے ہیں غرض بھاری ورزشوں کو اب فن کی حیثیت حاصل نہیں رہی ہاں سکولوں اور کالجوں میں ورزش کے ماہروں کی مانگ تعلیم کی وسعت کے ساتھ ساتھ ضرور بڑھ رہی ہے ؛

مختلف قسم کی ورزشیں موجودہ زمانہ میں جہاں اور علوم و فنون نے ترقی کی ہے۔ وہاں جسمانی ورزش کا فن بھی ترقی سے محروم نہیں رہا۔ ماہرین نے سائنس کے اصولوں کے مطابق ہر عضو کی ورزش الگ الگ مقرر کی ہے۔ اس سے یہ فائدہ ہے کہ انسان کا جو عضو کمزور ہو اس کی ورزش کی طرف خاص طور پر توجہ کی جا سکتی ہے۔ مثلاً ٹانگوں کی طاقت بڑھانے کے لئے دوڑنا بھاگنا مفید ہے۔

ڈنٹر پیلنے سے بازو مضبوط اور سینہ کشادہ ہوتا ہے۔ مُگدر ہلانے سے بھی یہی فایدہ ہے۔ گھوڑے کی سواری سے جسمانی اور دماغی دونو طاقتیں نشو و نما پاتی ہیں۔ غرض اس قسم کی سینکڑوں ورزشیں ہیں جو مختلف اعضا کی تیاری کے لئے مفید ہیں ؛

ہوا خوری :۔

سب ورزشوں سے عمدہ ورزش ہوا خوری ہے۔ ہوا خوری ہر سن و سال کا آدمی آسانی سے کر سکتا ہے۔ اور یہ نہایت ہلکی قسم کی اور خوشگوار ورزش ہے۔ وہ لوگ جو ورزش کو اپنے وقار کے منافی خیال کرتے ہیں۔ سیر کرنے سے اپنی صحت کو بآسانی بحال رکھ سکتے ہیں۔ بیمار اور کمزوروں کے لئے بھی ہوا خوری نہایت مفید ہے۔ اس سے پھیپھڑوں میں تازہ ہوا داخل ہوتی ہے۔ اعضا کھُلتے ہیں۔ کسالت دُور ہو کر طبیعت خوش ہوتی ہے اور جسم میں چستی آتی ہے۔ مناظر قدرت کے مطالعہ سے دل باغ باغ ہوتا ہے۔ طبعی مناظر سے دلچسپی پیدا ہوتی ہے۔ غرض عورتیں بچے بُوڑھے اور جوان سب سیر سے جسمانی صحت کو قائم رکھ سکتے ہیں اور قُدرت کے کرشموں کا مطالعہ کرنے کا شوق بھی پیدا کر سکتے ہیں ؛

نوجوان اگر ورزش کے ساتھ ہوا خوری کی عادت ڈالیں تو سیر سونے پر سہاگے کا کام کرتی ہے۔ سیر اگرچہ ہلکی قسم کی ورزش ہے

لیکن رفتار اور فاصلے کو بڑھا کر اس کو کسی حد تک سخت قسم کی ورزش بھی بنایا جا سکتا ہے ۔

کھیل :-

بہت سے ایسے کھیل بھی ہیں جو ورزش کے ہم پایہ خیال کئے جاتے ہیں ۔ مثلاً ہاکی ، فٹ بال ۔ کرکٹ ، والی بال ٹینس ۔ کبڈی پولو وغیرہ ۔ جو لوگ باقاعدہ کھیلنے کے عادی ہیں وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہ کھیل کھیل کے کھیل ہیں اور ورزش کی ورزش ۔ لیکن اس کے علاوہ بھی ان کو تھوڑی بہت ورزش ضرور کرنی پڑتی ہے ۔ کیونکہ یہ کھیل عام طور پر شام کو کھیلے جاتے ہیں ۔ اور ورزش اکثر صبح کی جاتی ہے تاکہ دن بھر طبیعت خوش رہے اور انسان مستعدی سے کام کر سکے ۔

ورزش کا وقت اور مقام

ورزش کرنے کے لئے بہترین وقت صبح کا ہے کیونکہ ہوا اسوقت صاف اور تازہ ہوتی ہے ۔ نیز رات بھر آرام کرنے کے بعد اعضا میں سستی سی پیدا ہو جاتی ہے ۔ جب تک تمام اعضا کو حرکت دے کر خون کے دوران کو تیز نہ کیا جائے اسوقت تک رات کی نیند کا خمار دور نہیں ہوتا ۔ اگر ورزش کے ذریعہ سے خون کے دورہ کو تیز کر دیا جائے تو بدن میں چستی آ جاتی ہے ۔ طبیعت میں امنگ پیدا ہوتی ہے ۔ اور آپ ہی آپ کام کرنے کو جی چاہتا ہے ۔

ورزش کے لئے ہمیشہ ایسا مقام مفید ہوتا ہے جہاں گرد وغبار نہ ہو اور ہوا بالکل صاف ہو۔ باغ جنگل یا دریا کا کنارہ ورزش کے لئے اچھے مقامات ہیں۔ صبح کے وقت پھیپھڑوں میں صاف ہوا لے جانی بہت مفید ہے اس سے زہریلی رطوبتیں اور گیسیں نکل جاتی ہیں۔ اگر کسی بند کمرے یا تنگ و تاریک مقام پر ورزش کی جائے تو طبیعت منغض ہو جاتی ہے۔ اس طرح سے بجائے فایدے کے نقصان پہنچتا ہے۔ اس لئے ورزش کرنے کے لئے نہایت کشادہ صاف ستھرا اور ہوادار مقام تجویز کرنا چاہیئے تاکہ ورزش سے خاطر خواہ فایدے حاصل ہوں ؞

دماغی اور جسمانی تربیت آجکل عام طور پر اقوام عالم جسمانی انحطاط کی طرف مائل ہیں۔ اس لئے ورزش کی اہمیت اور بھی زیادہ بڑھ رہی ہے۔ تمام مدرسوں اور کالجوں میں علمی اشغال کے ساتھ جسمانی صحت کو برقرار رکھنے کی طرف بھی باقاعدہ توجّہ کی جاتی ہے۔ عموماً ہر معقول درسگاہ ورزش کے معلّموں کی خدمات حاصل کرتی ہے۔ تاکہ طلبا جسمانی صحت سے غافل نہ ہونے پائیں اور وہ تحصیل علم کی دُھن میں اپنی صحت کو نہ کھو بیٹھیں۔ جو مدرسے اپنے طلبا کی جسمانی صحت کا خیال نہیں رکھتے وہ مُلک اور قوم کو سخت نقصان پہنچاتے ہیں۔ ایسے مدرسوں کے طالب علم سُست اور بھدّے ہوتے ہیں چاہے وہ ظاہرا طور پر کتنے ہی موٹے تازے نظر آئیں۔ لیکن طاقت

ان میں برائے نام ہوتی ہے۔ ورزش نہ کرنے اور لگاتار پڑھنے سے ان کی آنکھیں کمزور ہو جاتی ہیں ہر وقت کتاب پر جُھکے رہنے سے گردن اور سینہ آگے کو جُھک جاتا ہے یہ لوگ بُوڑھے ہو کر آنکھوں سے معذور ہو جاتے ہیں۔ کمر جُھک جاتی ہے۔ اور بہت جلد کُبڑے ہو جاتے ہیں۔ ورزش ایسے ہی لوگوں کے لئے اعادۂ شباب کا بیش قیمت نسخہ ہے جو لوگ باقاعدہ ورزش کرنے کے عادی ہیں ان لوگوں کی اولاد بھی تندرست رہتی اور عمر دراز پاتی ہے بلکہ ترقی کے میدان میں کاہل اور سُست لوگوں کی اولاد سے ہمیشہ بازی لیجاتی ہے۔

ورزش کی عورتوں کو بھی ضرورت ہے

ہمارے ملک میں عورتوں کے لئے بہت پابندیاں ہیں۔ اس لئے عورتوں کو ورزش کا نام سُن کر شرم آتی ہے۔ حالانکہ عورتوں کے لئے مردوں کی نسبت زیادہ ورزش کی ضرورت ہے کیونکہ وہ شب و روز گھروں کی چار دیواری میں نظر بند رہتی ہیں۔ باہر کی تازہ ہوا نہ کھانے سے ان کی صحت بہت جلد خراب ہو کر وہ اکثر سخت امراض میں مبتلا ہو جاتی ہیں۔ پردے کا رواج ترک کر دینے کے لئے سب سے بڑی یہی دلیل پیش کی جاتی ہے۔ بہر حال اگر پردہ ترک نہ بھی کیا جائے تب بھی عورتوں میں نہایت ہلکی ہلکی ورزشوں کا رواج دینے کی از حد ضرورت ہے۔ یورپ اور آزاد ممالک کی عورتیں ریاضت جسمانی کی دن بدن شوقین ہو رہی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ تندرست

و توانا اولاد کی مائیں بنتی ہیں برخلاف اس کے ہمارے ملک کی عورتیں نہایت، کمزور اور کم عمر کے بچے پیدا کرتی ہیں یہ اسی کوتاہی کا نتیجہ ہے کہ ماؤں کے دل اولاد کے صدموں سے ہمیشہ داغ داغ رہتے ہیں۔ اور کمزور اولاد طویل العمر نہ ہونے کے باعث لاتعداد بیوائیں اور یتیم چھوڑ کر عدم آباد کو آباد کرتی ہے۔ اگرچہ لڑکیوں کے مدرسوں میں جسمانی تربیت کا خیال رکھا جاتا ہے۔ لیکن ضرورت اس بات کی ہے کہ اس شوق کو مدت العمر باقی رکھا جائے تاکہ تمام زندگی عیش و آرام سے گزرے۔ اور تندرست اولاد پیدا ہو۔ جو دنیا پر نام و نمود کی زندگی بسر کرے ۔

ورزش زندگی ہے جو قومیں زندہ رہنا پسند کرتی ہیں اور اپنی زندگی سے دنیا کو فایدہ پہنچانا چاہتی ہیں ان کا فرض ہے کہ زندگی کے فرایض میں ریاضت جسمانی کو بھی شامل کریں۔ ورنہ جسمانی انحطاط آہستہ آہستہ ان کا نام و نشان صفحۂ ہستی سے مٹا دیگا۔ جو اقوام جسمانی طاقت کو کھو بیٹھتی ہیں وہ غلامی کی زندگی بسر کرتی ہیں۔ اور وہ قومیں جن میں جسمانی قوت ہوتی ہے کبھی کسی کی غلامی میں رہنا پسند نہیں کرتیں۔ وہ ہمیشہ حکومت کرتی ہیں اور زندگی کے ہر شعبہ میں اپنی زندگی کا ثبوت دیتی ہیں۔ اس لئے ورزش ہی زندگی ہے اور ورزش ہی عروج و ترقی کا زینہ۔ اگر ہمیں عزت آبرو کی زندگی بسر کرنی منظور ہے تو ہمارا فرض ہونا چاہئے کہ ہم ورزش کی اہمیت

اور ضرورت کو محسوس کریں تاکہ سستی اور کاہلی ہمارے قریب نہ پھٹکنے پائے۔ ہم بیماریوں سے ہمیشہ محفوظ رہیں۔ خود اپنی مدد کریں اپنی طاقت سے اوروں کو امداد دیں اور دوسروں کے محتاج ہو کر نہ بیٹھ رہیں۔ بس زندگی کا یہی ایک مقصد ہے۔ اور یہ مقصد محض ریاضت جسمانی ہی سے حاصل ہو سکتا ہے۔ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ اب رستم و اسفندیار کا زمانہ نہیں رہا۔ آجکل علم کی قدر ہے لیکن اگر جسمانی طاقتیں جواب دیدینگی تو علم کس طرح حاصل ہو گا۔ اگر بالفرض حاصل بھی کر لیا تو اس پر عمل کرنے کے لئے ہمت کہاں سے آئیگی۔ اس لئے ضروری ہے کہ ریاضت جسمانی کو تحصیل علم کے برابر کا درجہ دیا جائے تاکہ فرزندان ملک صاحب علم بھی بنیں اور صاحب قلم بھی۔ کشاکش حیات کا بھی مقابلہ کر سکیں اور قوی ترین دشمن کا بھی ؛

محنت

محنت زندگی کا ماحصل ہے

قدرت بھی عجیب کرشمہ ساز ہے۔ اس نے دنیا کو پیدا کیا اور اس میں انسان کے آرام اور آسایش کے تمام سامان مہیا کر دیئے۔ لیکن اس نے یہ بات انسان کی عقل و ہمت پر چھوڑ دی کہ وہ اس کی نعمتوں سے اپنی ہمت اور عقل کے مطابق استفادہ کرے۔ اور اس عمل کا نام جہد للبقا رکھ دیا۔ گویا اپنے انعامات کو استعمال میں لانیکا نام محنت قرار دیا۔ اب جتنی جس شخص میں ہمت یا محنت کی قابلیت ہے وہ اس کے مطابق دنیاوی نعمتوں کے دستر خوان سے جو چاہے اُٹھا لے۔ اس کو کوئی اعتراض نہیں۔ ہاں بے ہمت اور کام چور شخص کے لئے اس کا خوان نعمت سمٹا ہوا ہے۔ لیکن پھر بھی ان کے لئے اس کا دروازہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بند نہیں۔ اگر وہ ہمت کریں تو ان کے سامنے بھی ترقی کا وسیع میدان موجود ہے ؎

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

محنت اور دولت

یہ بات ہر شخص کو تسلیم کرنی پڑے گی کہ محنت کے بغیر کوئی شخص ترقی نہیں کر سکتا اگر کوئی محنت نہ کرے تو عقل د

ذہانت سب دھری رہ جاتی ہیں۔ ہاں وہ لوگ جو محنت کے عادی ہیں
ان نام نہاد عاقلوں سے ہمیشہ آگے بڑھ جاتے ہیں۔ جو محنت کی نسبت
عقل پر تکیہ کئے بیٹھے رہتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ عقل
اور ذہانت سے ترقی میں بہت مدد ملتی ہے لیکن جب تک ان پر
محنت جلا نہ کرے اسوقت تک یہ جوہرا جاگر نہیں ہوتے۔ اس لئے
جن لوگوں کو خداوند تعالٰے نے یہ خوبیاں دی ہیں انہیں ان خوبیوں
کو کام میں لاکر اس کے انعامات سے پورا پورا فائدہ اٹھانے
کے لئے کوشش کرنی چاہیئے ورنہ کیا عجب ہے کہ ذہین اور عقیل
اپنی عقل اور ذہن کے بھروسہ پر خواب غفلت میں پڑے رہیں اور
کُند ذہن مگر محنتی اپنی محنت اور استقلال کی بدولت ان سے بازی
لے جائیں۔ افسوس ہے کہ ہم لوگ محنت کی نسبت دولت پر زیادہ
بھروسہ کرتے ہیں۔ دولت تو ایک آنی جانی چیز ہے۔ اس پر اعتماد
کرنا سخت غلطی ہے یہ درست ہے کہ دولت سے دنیا
میں بہت کچھ حاصل ہو سکتا ہے لیکن دیکھنا یہ چاہیئے کہ دولت کیونکر
حاصل ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ دولت بغیر محنت کے حاصل نہیں ہو سکتی
اس لئے اگر خدا نے دولت دی ہے تو اس کی مدد سے کوئی اعلٰی ہنر
سیکھنے پر محنت صرف کرنی چاہیئے کیونکہ دولت کو زوال ہو سکتا ہے
لیکن ہنر اور علم زوال پذیر نہیں ہو سکتا۔ پس معلوم ہوا کہ اصل چیز
محنت ہے، اور دولت اس کا ثمرہ ॥

محنت امیر و غریب کے لئے یکساں ضروری ہے

ہم جتنے بڑے بڑے آدمیوں کی زندگی کا مطالعہ کرینگے ہمیں ان کی ترقی اور عروج کی عمارتیں ان کی محنت کی استوار بنیادوں پر متمکن نظر آئینگی۔ برخلاف اس کے دولتمند خاندانوں میں اکثر خاک ہی اُڑتی دکھائی دیگی۔ اسلاف کے مقابلے میں اولاد بے ہمت، عیش پرست۔ اور پست خیالات کی مالک ہوگی۔ کیونکہ دولت کی فراوانی ان کو بیکار اور بے ہمت بنا دیتی ہے اور ان کے قوائے عقلی کام نہ کرنے کی وجہ سے بیکار ہوجاتے ہیں۔ یہ اثر ان تک ہی محدود نہیں رہتا بلکہ آیندہ نسلیں بھی اس بیکاری سے اثر پذیر ہوتی ہیں اور نتیجے کے طور پر اسلاف کی فارغ البالی سے ترقی معکوس کی بنیاد پڑجاتی ہے۔ اسی طرح بہت سے ہنر پیشہ اور علمی ادبی دولت سے مالامال خاندان اکثر مزدور پیشہ خاندانوں میں تبدیل ہوجاتے ہیں۔ ان کو دوبارہ اپنے بزرگوں کے معیار پر پہنچنے کے لئے کئی صدیوں کی محنت اور جانفشانی درکار ہوتی ہے ان نتائج سے ظاہر ہے کہ محنت صرف غریب لوگوں ہی کے لئے ضروری نہیں بلکہ جو لوگ دولتمند ہیں ان کو اپنا خاندانی وقار اور موجودہ حالت برقرار رکھنے کے لئے زیادہ محنت کی ضرورت ہے تاکہ جو کچھ ان کو ورثہ میں ملا ہے وہ قائم رہے اور وہ اپنے زور بازو کی محنت سے مزید وقار اور اعتبار پیدا کریں ؂

ناکامی کامیابی کی نشانی ہے

بعض لوگ محنت کے بعد ناکام ہونے سے

محنت سے دل چراتے اور مایوس ہو جاتے ہیں۔ انہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ مایوسی بہت بڑا گناہ ہے۔ کیونکہ مایوسی انسان کی قوت عمل کو فنا کر دیتی ہے۔ ناکامی سے بددل ہونے کی بجائے اسباب ناکامی پر غور کر کے ان کو دور کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ اور پہلے سے زیادہ استقلال اور ہمت کے ساتھ مطلب کو حاصل کرنے کے لئے کوشاں ہونا چاہیئے۔ کسی کا کیسا اچھا قول ہے کہ ناکامی کامیابی کی نشانی ہے۔ ناکامیابی سے ہر مشکل مسئلے کو حل کرنے کی زیادہ استعداد پیدا ہوتی اور ہمت بڑھتی ہے۔ کیونکہ انسان مسلسل کوشش کرنے کا عادی ہو جاتا ہے اور اپنی مشکلات کے ہر پہلو پر پہلے سے زیادہ عمدگی کے ساتھ غور و فکر کر سکتا ہے۔ جس سے اسکی مشکلیں آپ ہی آپ حل ہو جاتی ہیں۔ برخلاف اس کے بے صبری اور جلد بازی سے اکثر کام خراب ہو جاتے ہیں ۔

محنت کے حدود محنت کی ضرورت اور اہمیت پر اس قدر بحث کرنے کے بعد خیال رکھنا بھی ضروری ہے کہ محنت اتنی کرنی چاہیئے جس کو انسان کا دماغ اور جسم برداشت کر سکے۔ اگر کسی کام پر اتنی زیادہ محنت صرف کی جائے کہ صحت اور دماغ جواب دیدیں تو ایسی محنت سے بجائے فایدہ کے نقصان ہوتا ہے۔ محنت کرنے میں ہمیشہ یہ خیال رکھنا لازم ہے کہ انسان اعتدال کی حد سے آگے نہ بڑھے۔ ورنہ محنت سے جو خوشی حاصل ہوگی اس سے انسان لطف اندوز نہیں ہوسکیگا

اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ کسی خاص مقصد کو حاصل کرنے کے لئے بعض لوگ انتہائی کوشش صرف کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ اپنا مدعا حاصل کر لیتے ہیں لیکن مسلسل اور غیر محدود محنت سے ان کی صحت خراب ہو جاتی ہے اس لئے وہ اس کے نتائج سے پورا پورا حظ نہیں اُٹھا سکتے۔

ایسی محنت جو انسان کے دل و دماغ اور جسم کو بیکار کر دے سخت مضر ہے۔ محنت کے یہ بُرے اثرات محنت کے بیجا صرف سے پیدا ہوتے ہیں۔ مثلاً بعض طالب علم امتحان کے آخری دنوں میں دن رات کام میں لگے رہتے ہیں اور کہا یہ جاتا ہے کہ وہ سخت محنت کر رہے ہیں۔ ایسی محنت نہ صرف صحت کے لئے بہت مضر ہے۔ بلکہ اکثر اس سے خاطر خواہ نتائج بھی برآمد نہیں ہوتے۔ محنت کا قاعدہ یہ ہے کہ انسان باقاعدہ شروع ہی سے ایک جیسی محنت کرے اور بیقاعدگی سے اپنا عزیز وقت بیکار ضایع نہ کرے۔ جو لوگ اس اصول کے ماتحت باقاعدہ محنت کرتے رہتے ہیں۔ ان کو اپنی کامیابی کا پورا یقین ہوتا ہے۔ اور امتحان کا قُرب ان کو پریشان نہیں کرتا۔ آخری وقت میں محنت کرنے والوں کی نسبت باقاعدہ محنت کرنے والے زیادہ مستقل مزاج اور بشاش نظر آتے ہیں اور ان کو امتحان اتنا مشکل معلوم نہیں آتا جتنا بیقاعدہ محنت کرنیوالے اور کام چور طلبا کو دکھائی دیتا ہے۔ یہی وہ طالب علم ہیں جن کی محنت سے علم و ہنر ترقی پاتے ہیں۔ انکی جدو جہد سے مُلک کا اعزاز

اور اقتدار بڑھتا ہے۔ اور وہ خود آسمان شہرت پر چاند اور ستاروں کی طرح چمکتے ہیں ان کی روشنی سے دُنیا میں علم و ہُنر کا اُجالا پھیلتا ہے۔ وہ اپنی محنت کا پھل خود بھی کھاتے ہیں اور دوسرے بھی اس سے مستفید ہوتے ہیں ×

بہتر صورت اور زیادہ محنت | محنت کی ضد کاہلی اور سستی ہے۔ جو لوگ سُست اور کاہل ہوتے ہیں وہ محنت نہیں کر سکتے۔ محنت نہ کر سکنا قوائے انسانی کی کمزوری کی دلیل ہے۔ جس شخص کا جسم کمزور ہوگا بدیہی امر ہے کہ اس کی عقل بھی کمزور ہوگی۔ اس لئے ہر وہ شخص جو محنت کر کے ترقی کرنی چاہتا ہے اس کو اپنے جسم کی نگہداشت کی بھی از حد ضرورت ہے۔ انسان کے واسطے کاہلی اور سُستی عیب ہو سکتی ہے لیکن محنت اس کے لئے ہمیشہ باعث فخر ہے۔ کاہلی انسان کی صحت اور عقل کو اس طرح کھا جاتی ہے جس طرح لوہے کو زنگ یا لکڑی کو گھُن۔ اس کے علاوہ کاہلی سے ترقی کے راستے مسدُود ہو جاتے ہیں۔ کاہل اور سُست انسان کے دماغ میں اعلیٰ خیالات کی جگہ ذلیل اور پست خیالات پیدا ہونے لگتے ہیں جو اس کی اعلیٰ صفات کو حرف غلط کی طرح مٹا دیتے ہیں۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ جو لوگ ہر وقت کسی کام میں مصروف رہتے ہیں ان کو شیطان بھی نہیں بہکاتا ×

محنت فطرت کا قانون ہے۔ | جو لوگ محنت سے گریز کرتے ہیں۔ آہستہ

آہستہ ان کے اعضا اس قدر سُست ہو جاتے ہیں۔ کہ معمولی سے معمولی محنت طلب کام بھی ان پر گراں گزرتا ہے۔ اور دُنیا کی زیادہ سے زیادہ نعمتیں بھی ان کو خوش نہیں کر سکتیں۔ ان کی زندگی باوجود فارغ البالی کے آرام سے نہیں گزرتی۔ بلکہ آئے دن وہ نئی نئی قسم کی رُوحانی اور جسمانی پریشانیوں اور مرضوں میں مبتلا رہتے ہیں۔ یہ ان کو اس بات کی سزا ملتی ہے کہ وہ فطرت کے قانون کے خلاف زندہ رہنا چاہتے ہیں۔ فطرت کا تقاضا تو یہ ہے کہ محنت کرو۔ محنت کر کے کھاؤ۔ محنت کر کے عزت اور آرام پاؤ۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ محنت خدا کو بھی مرغوب ہے۔ کیونکہ اول تو وہ بغیر محنت کے کسی کو کچھ دیتا نہیں۔ اگر انقلابات ایام اور حادثات زمانہ کسی کو بغیر محنت کے مالا مال کر دیتے ہیں۔ تو قدرت بغیر محنت کے حاصل کی ہوئی دولت کو چند ہی دنوں میں ختم کر ڈالتی ہے۔ اور اس قسم کے دولتمندوں کو دُنیا کے سامنے عبرت کا نمونہ بنا کر پیش کرتی ہے۔ وہ اقوام اور خاندان جو کبھی ہر قسم کی دولت سے مالا مال تھے۔ آج انکی حالت دیکھو۔ ان عبرت کے نمونوں کو دیکھ کر جسم پر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اگر غور کرو تو معلوم ہو گا کہ اس انحطاط کا موجب محض آرام طلبی اور سہل انگاری ہے۔ وہ لوگ جو قدرت کے گراں بہا عطیوں سے فائدہ اُٹھاتے اور محنت کے اصولوں کو مدنظر رکھ کر ہاتھ پاؤں بدستور مارتے رہتے ہیں۔ ان کی دولت میں افزونی ہوتی

ہے ۔ ہر مشکل مہم پر قدرت موافق اسباب پیدا کر کے ان کی مدد کرتی ہے ۔ ان کے بعد اگر ان کے جانشین محنت سے دل چراتے اور باپ دادا کی امارت پر بھروسہ کرتے ہیں ۔ تو موافق اسباب مخالف ہو جاتے ہیں ۔ اور دوسروں کی محنت کے نتائج ان کا ساتھ چھوڑ دیتے ہیں اسی لئے کہتے ہیں کہ دولت آنی جانی ہے اس کو ہاتھ کا میل سمجھنا اور اپنی قوتوں اور قابلیتوں پر بھروسہ کرنا چاہیئے کیونکہ فطرت اور قدرت اسی کا ساتھ دیتی ہے جو محنت کرتا اور اپنی محنت پر اعتماد رکھتا ہے ؞

جو لوگ اپنی ہمّت اور محنت پر تکیہ رکھتے ہیں ان کو کسی حال میں بھی تکلیف نہیں ہوتی ۔ انقلابات ایام ان کی دولت چھین لیں انہیں کوئی غم نہیں ۔ گردش زمانہ انہیں تخت سے تختہ کر دے انہیں کوئی فکر نہیں ۔ فکر تو جب ہو جب کوئی اُن کا علم و ہنر چھین لے ۔ جہاں بھی جائینگے ۔ جس حال میں بھی ہونگے ۔ ان کی ہمت اور ہُنر ان کے ساتھ ہے ۔ جب تک محنت پسند فطرت ان کی دستگیر ہے ۔ انہیں کیا غم ہے ۔ دولت اور عزّت ہر حال میں ان کے قدم لیگی اور ان کا وجود ہر جگہ تعظیم و تکریم کا مرجع ہو گا ؞

محنت کرو محنت کرو

غرض محنت انسان کی زندگی کا اصل اصول ہے ۔ محنت خدا کو مرغوب ہے ۔ محنت سے دُنیا کے ہر شعبے میں ترقی ہو سکتی ہے ۔ محنت سے اقوام بنتی اور اس کے فقدان سے

بگڑتی ہے۔ محنت سے قدرت کے مخفی خزانوں کا پتہ چلتا ہے۔ محنت ہی سے تحقیق و تفتیش ہو سکتی ہے۔ محنت ہی سے حکومت عزت اور دولت ملتی ہے۔ اور محنت ہی سے انسان کامل بنتا اور اشرف المخلوقات کہلانے کا حقدار ہوتا ہے۔ اس لئے جو لوگ محنت سے جی چراتے ہیں۔ وہ محض اپنے آپ ہی کو نقصان نہیں پہنچاتے بلکہ اپنی سُستی اور کاہلی سے تمام دُنیا کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا کر مقصد تخلیق عالم پر ضرب کاری لگاتے ہیں۔

استقلال

؟	کسی کام کے کرنے میں متواتر اور مسلسل کوشش کرنیکا نام استقلال

ہے۔ دنیا کا کوئی کام اچھا ہو یا بُرا بغیر کوشش کے نہیں ہوتا ہر کام کے لئے انسان کو ہاتھ پاؤں ہلانے اور کم وبیش کوشش کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر تاریخ انسانی پر نظر ڈالیں تو ہر جگہ ہمّت اور استقلال کی کامیاب مثالیں بکثرت ملیں گی۔ جس شخص میں استقلال نہیں ہوتا وہ کوئی ایک کام بھی کامیابی کے ساتھ نہیں کر سکتا مثل مشہور ہے کہ مشاہیر ماں کے پیٹ سے پیدا نہیں ہوتے ہماری طرح وہ بھی معمولی انسان ہیں۔ جس چیز نے ان کو دُنیا میں کامیاب بنایا وہ ان کی ہمت اور استقلال ہے۔ ان جیسا دل و دماغ ہمارے پاس بھی موجود ہے لیکن ہم اس سے فایدہ نہیں اُٹھاتے۔ ہمارے پست ارادے تذبذب اور بد دلی ہمیں کامیابی کی سعادت حاصل کرنے نہیں دیتی۔ ورنہ دُنیا میں کونسا ایسا کام ہے جو نہیں ہو سکتا مثل مشہور ہے ڈھونڈھنے سے خدا بھی مل جاتا ہے لیکن ہمت اور استقلال شرط ہے ؞

پاگل کسے کہتے ہیں ؟	عام طور پر کہا جاتا ہے کہ استقلال ایک خداداد نعمت

ہے۔ ممکن ہے ایسا ہی ہو کیونکہ استقلال کا ملکہ کم وبیش ہر شخص میں فطرتاً موجود ہے اور انسان کو یہ قوت حاصل ہے کہ وہ جس ملکہ کو چاہے اسے اپنی طبیعت میں راسخ کرلے اگر انسان میں استقلال نہ ہوتا تو دنیا میں ترقی کرنا اور کوئی سا ایک کام بھی سیکھنا یا کرنا بالکل محال ہو جاتا حقیقت امر یہ ہے کہ کوئی شخص اپنے ارادوں کی دل وجان سے پیروی کرتا ہے اور کوئی اپنے کسی ایک ارادے پر بھی قائم نہیں رہتا معمولی معمولی سے تغیرات اس کے ارادوں اور طبیعت کو متزلزل کر دیتے ہیں بس یہی وہ لوگ ہیں جو غیر مستقل مزاج ہیں اگر یہ غیر مستقل مزاجی زیادہ بڑھ جائے تو ان لوگوں کو ہم پاگل اور دیوانہ کہنے لگتے ہیں۔ یہ پاگل یا غیر مستقل مزاج لوگ ابھی ایک چیز کو پوری طرح حاصل نہیں کرنے پاتے کہ کوئی اور چیز ان کی توجہ کو جاذب کرلیتی ہے اسی طرح ان کے ارادے ہر لمحہ بدلتے رہتے ہیں۔ جو چیز ان کو نظر آتی ہے وہ اس کی طرف فوراً متوجہ ہو جاتے اور پہلی چیز کو بھول جاتے ہیں اس سے ثابت ہوتا ہے استقلال عاقل و بالغ ہونے کی نشانی اور غیر مستقل مزاج ہونا پاگل پن کی دلیل ہے ٭

دنیا بھی کچھ عجیب کارگاہ ہے۔ اس میں رہنے والوں کو کسی پہلو چین نہیں۔ اگر یہ لوگ ایک طرف اس شخص کو دیوانہ کہتے ہیں جس کے خیالات اور افعال میں استقلال نہیں ہوتا تو دوسری طرف ان لوگوں کو بھی پاگل اور سڑی کہنے میں دریغ نہیں کرتے جو اپنے

ارادوں میں سخت چٹانوں اور سنگین پہاڑوں سے لگا کھاتے ہیں۔ ان کی جان جاتی ہے مگر بات نہیں جاتی۔ قسم قسم کی مخالفتیں۔ بات بات پر آویزشیں جانی اور مالی نقصانات ان کو اپنے ارادوں کے پورا کرنے سے باز نہیں رکھتے۔ جب وقت گزر جاتا ہے اور استقلال ان کے سروں پر کامیابی کے سہرے باندھتا ہے تو یہی لوگ اُن کو پُر استقلال اور باعظمت شخصیت قرار دیتے ہیں"

ایسے لوگ جو اپنے استقلال کی وجہ سے دیوانے اور پاگل کہلاتے ہیں ہمارے ملک میں بکثرت ہیں کسی کو مذہبی دیوانہ کہا جاتا ہے کوئی سیاسی پاگل کہلاتا ہے۔ کسی پر سرکار پرست کا فقرہ کسا جاتا ہے اور کوئی بیوقوف کا لقب پاتا ہے۔ کسی پر غدّاری کا الزام اور کُفر کا فتویٰ لگتا ہے غرض جیتے جی ان مستقل مزاج لوگوں پر گالیوں کی بھرمار اور اعتراضات کی بوچھاڑ رہتی ہے۔ لیکن مرنے کے بعد جب ان کے کارناموں کی جانچ پرتال کی جاتی ہے۔ تو ان پر ارادت اور عقیدت کے پھول برسائے جاتے ہیں۔ اسی لئے کہتے ہیں ہندوستانی مُردہ پرست ہیں اور وہ مرے پیچھے اپنے قابل قدر افراد کی قدر کرتے ہیں۔

ناکامیاں استقلال سکھاتی ہیں

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ پے در پے ناکامیاں پیش آنے سے استقلال کا رشتہ انسان کے ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے۔ ہمت پست ہو جاتی ہے۔ مستقبل تاریک نظر آنے لگتا

ہے۔ اور ناکامیاں چاروں طرف سے گھیر لیتی ہیں۔ نامُرادیاں انسان کو زندگی سے مایوس کر دیتی ہیں۔ ہم کہتے ہیں یہ سب کچھ صحیح ہے لیکن ناکامیابی ہی کامیابی کی دلیل ہے۔ یہ کیونکر ممکن ہو سکتا ہے کہ انسان جو کام کرے اس میں پہلی مرتبہ ہی کامیاب ہو جائے۔ ممکن ہے کبھی کبھی ایسا بھی ہو۔ لیکن ہر مرتبہ جیسے کامیاب ہونے کی امید نہیں ہو سکتی اسی طرح ہر بار ناکامیاب ہونے کی توقع بھی نہیں ہونی چاہیئے۔ نپولین کہا کرتا تھا کہ دُنیا میں کوئی کام ناممکن نہیں۔ امرِ واقعہ بھی یہی ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ ناکامیابی ہماری ہمت شکنی کرے جس کام کو ہم کرتے ہیں اس میں ناکامیابی سب سے پہلے اور کامیابی سب سے پیچھے ہے۔ یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ اگر ہمیں قُطب مینار کی چوٹی پر پہنچنا ہے تو ہم بغیر بیچ کی منزلیں طے کئے سب سے اوپر کی منزل پر پہنچ جائیں۔ ہم کو بتدریج ایک ایک سیڑھی کر کے اوپر چڑھنا پڑیگا۔ آخری منزل پر پہنچنے تک کبھی ہمارا سانس پھُولیگا کبھی ہم تھک جائینگے کہیں ہمیں دم لینا پڑیگا۔ غرض ہم بہزار دقت منزلِ مقصود پر پہنچیں گے۔ بس یہی دقتیں ناکامیابیاں ہیں جو ہماری ترقی کے راستوں میں سدِ راہ ہیں۔ انہی کو عبور کرنے کے لئے ہمیں ہمت اور استقلال کی ضرورت ہے۔ اگر یہ کاوٹیں بیچ میں حائل نہ ہوتیں تو بامِ مراد تک پہنچنا کسی کے لئے بھی دشوار نہ ہوتا۔ اور دُنیا کے عیش و آرام انسان کے لئے دوزخ کے

عذاب سے کم نہ ہوتے۔ خالق مطلق نے دُنیا میں ہر چیز ممکن بنائی ہے۔ اور اس کے اسباب فراہم کرنے کا کام ہماری ہمت پر چھوڑا ہے۔ گویا ہمارے سامنے ایک بہت ہی وسیع دستر خوان بچھا دیا ہے۔ اب جس میں جتنی ہمت ہے اتنا اس میں سے اُٹھا لے اور اپنی ضرورتوں کو پُورا کرلے۔ جن لوگوں میں ہمت نہیں وہ بیٹھے منہ دیکھا کریں یا اپنے آپ کو ناکامیاب اور نامراد کہا کریں۔ اور اپنی ناکامیابی کو تقدیر اور منشائے خداوندی پر محمول کرتے رہیں "

استقلال کامیابی کی نشانی ہے

مستقل مزاج شخص اپنی ناکامی سے کبھی بددل نہیں ہوتا۔ بلکہ ناکامی سے اس کی واقفیت اور تجربے میں اور زیادہ اضافہ ہوتا ہے۔ ناگوار اور دقت طلب امور کو سُلجھا کر اس کے دل کو بہت زیادہ خوشی ہوتی ہے۔ جوں جوں مُشکلیں حل ہوتی ہیں اس کی ہمت بڑھتی جاتی ہے۔ وہ اپنے مقصد کی دُھن میں شب و روز منہمک رہتا ہے۔ دیوانی دُنیا اس کو دیوانہ کہتی ہے۔ لیکن وہ کسی کی پروا نہیں کرتا۔ ناامیدی کبھی اس کے پاس نہیں پھٹکنے پاتی۔ یہاں تک کہ ایک دن وہ اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کر لیتا ہے۔ دُنیا میں جس قدر بڑی بڑی ایجادیں اور حیرت انگیز اختراعیں ہوئی ہیں وہ محض استقلال کا نتیجہ ہیں۔ برسوں ناکامیاں ہمت شکنی کے درپے رہی ہیں۔ لیکن ان ہمت والوں نے کبھی اپنا ارادہ تبدیل نہیں کیا۔ جس کام کی لو انہیں لگ گئی تھی آخر

اسے ایک دن پُورا ہی کر کے چھوڑا ؏

غرض دُنیا کا کوئی کام ایسا نہیں جس میں استقلال کی ضرورت نہ ہو۔ جتنے پیشے اور کسب ہیں۔ سب میں ترقی استقلال سے اور تنزل بے ہمتی سے ہوتا ہے۔ آپ نے اکثر سُنا ہوگا کہ خدا کبھی کسی کی محنت رائیگاں نہیں جانے دیتا، ہاں جلد بازی سے اکثر کاموں کے نتیجے ضرور خراب ہو جاتے ہیں اس لئے ہر کام کا ارادہ کرنے سے پہلے نہایت ضروری ہے کہ اس کی اُونچ نیچ بھلائی بُرائی پر اچھی طرح غور کر لیا جائے اور مقصد کی تلاش میں صحیح راستہ پر نہایت استقلال سے چلا جائے۔ پھر کوئی وجہ نہیں کہ من مانی مراد نہ ملے۔ لیکن ہمیشہ یاد رکھنا چاہیئے کہ مستعدی اور استقلال کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹے اور انسان صراطِ مستقیم سے نہ بھٹکنے پائے۔ ورنہ "بھٹکا اور گیا۔ گیا اور مرا" ایسے ہی کٹھن راستوں کے متعلق مشہور ہے ؏

استقلال غریب کی جان ہے

غریبوں اور مفلسوں کے لئے استقلال عصا کا کام دیتا ہے۔ قدم قدم پر مشکلات کا سامنا ہونے سے ان کی ہمت ٹوٹنے کے نت نئے اسباب پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن استقلال کی بدولت وہ کشادہ پیشانی سے مصائب کا مقابلہ کرتے ہیں۔ اور مصیبتوں کے منجدھار سے ایک ہوشیار تیراک کی طرح بچ کر نکل جاتے ہیں۔ غریب میں اگر استقلال نہ ہو تو اس کو زندگی کا ایک سانس لینا دوبھر ہو جائے استقلال غریب اور مسکین مخلوق کی مخصوص دولت ہے۔ مصائب اور

رُکاوٹیں ہی اس کی ہمت بندھاتی ہیں نہیں! ان کی ہمت کو بلند کرتی ہیں استقلال کی بدولت مشکلات کو برداشت کرنے کی عادت پڑ جاتی ہے اور سخت سے سخت کام آسان معلوم ہوتا ہے۔ غالب نے کیا خوب کہا ہے ؎

رنج سے خوگر ہُوا انسان تو مٹ جاتا ہے رنج
مُشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

محنت، دیانتداری، خودداری اور قناعت کا نام ایسے ہی لوگوں کی ہمت سے باقی ہے۔ بلکہ یُوں کہنا بجا ہے۔ کہ استقلال ان کو بُری عادتوں سے بچاتا ہے۔ اور آزمایش کے وقت ان کے کیریکٹر اور چال چلن کو اور زیادہ چمکاتا ہے۔ کُندن کی طرح وہ جتنی زیادہ مرتبہ بھٹی میں تپتے ہیں اُتنے ہی زیادہ چمکتے دمکتے نکلتے ہیں وہ جوہر جو تن آسانی سے زنگ آلود ہو جاتے ہیں مصائب ان کو از سرِ نو چمکدار بنا دیتے ہیں۔ گویا مشکلات ہی انسان کو انسان کامل بناتی ہیں۔

استقلال کیونکر پیدا ہو سکتا ہے | استقلال پیدا کرنے کے لئے عزم بالجزم کی اشد ضرورت ہے۔ جو شخص ارادے کا مضبوط نہیں وہ استقلال سے معرّا ہوگا۔ جب تک ارادے مستقل نہ ہوں کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی ارادے میں پختگی پیدا کرنے کے لئے عقل سلیم کی ضرورت ہے۔ تاکہ بُرے اور بھلے میں تمیز ہو سکے۔ اگر بے عقل آدمی کسی غلط بات پر

اڑ جائے تو اس کو بیوقوف کہا جاتا ہے۔ چونکہ تعلیم عقل انسانی پر جلا کرتی ہے اس لئے صحیح النظر بننے کے لئے تعلیم و تجربہ کی ضرورت ہے تاکہ انسان ہر بات کا صحیح نتیجہ نکال سکے۔ اس کے بعد استقلال درکار ہے کہ اپنے نکالے ہوئے نتیجے اور قائم کئے ہوئے ارادے کی مستقل مزاجی سے پیروی کر سکے۔ جن لوگوں کا ارادہ ضعیف ہوتا ہے وہ واقعات اور حالات کی رو میں تنکوں کی طرح بہ جاتے ہیں۔ ہر وہ شخص جو ان کے سامنے ذراسی چرب زبانی اور استقلال سے تقریر کرتا ہے۔ ان کو اپنا ہم خیال بنا لیتا ہے۔ اگر کوئی اس سے زیادہ ہوشیار آدمی آجاتا ہے تو وہ اُسی کے پیچھے لگ جاتے ہیں۔ اس قسم کے غیر مستقل مزاج لوگ ہمیشہ دوسروں کی رائے کے تابع رہتے ہیں۔ ایسے ہی لوگوں کی بدولت ملک میں فسادات اور انقلابات رُونما ہوتے ہیں اس لئے نہایت ضروری ہے کہ شروع ہی سے اپنی عقل سے کام لینے کی عادت اور ارادوں میں استقامت پیدا کی جائے تاکہ ہر کس و ناکس ہماری کمزوری کی وجہ سے ہم پر حاوی نہ ہو سکے۔

استقلال ہندوستانی عورت سے سیکھو

غالباً یہ بات دلچسپی کا موجب ہوگی کہ دوسرے ملکوں کی نسبت ہمارے ملک کی عورتوں میں استقلال اور برداشت کی قوت زیادہ ہے۔ اس کے دو وجوہ ہیں اوّل تو لڑکیاں بُردباری اور استقلال میں اپنی ماؤں کا چربہ

ہوتی ہیں دوسرے والدین جب اپنی لڑکی کی شادی کرتے ہیں تو رخصت کرتے وقت لڑکی کو آخری نصیحت ان الفاظ میں کرتے ہیں کہ بیٹی ہم نے تجھے اپنی سمجھ کے مطابق اچھے آدمی کے ساتھ بیاہ دیا۔ اب تیری قسمت رہی اچھا نکلے یا بُرا ثابت ہو تیرا فرض ہے کہ تُو مرتے دم تک اس کا ساتھ دے۔ ہندوستانی عورت کے بھی کیا کہنے ہیں۔ مرے گی بھرے گی۔ دُکھ اُٹھائیگی تکلیفیں سہیگی۔ لیکن اپنے ماں باپ کے کہے کی لاج رکھے گی۔ جس گھر میں گئی ہے اس سے مر کر ہی نکلے گی۔ یہی سبب ہے کہ عورت کے استقلال سے بہتر مثال ہندوستانی سوسائٹی میں نہیں مل سکتی۔

پُر استقلال عورتوں کی تربیت بچّوں میں بھی استقلال کی قوّت پیدا کرتی ہے۔ اور اپنی بچّی کی زندگی سے عزم و استقلال کا سبق دیتی ہے۔ ماہرین تعلیم کا کا متفقّہ فیصلہ ہے کہ مردوں کی نسبت عورتوں کی تربیت کا اثر بچّوں کی طبیعت پر زیادہ بہتر ہوتا ہے۔ اس لئے اگر بچّوں کی ابتدائی تعلیم کلیتاً عورتوں کے سپرد کر دی جائے تو انکی تربیت اور پُر استقلال طبیعتوں سے نئی نسلوں پر نہایت خوشگوار اثر پڑ سکتا ہے۔

استقلال کا صحیح استعمال

استقلال کو ہمیشہ نیک ارادوں میں استعمال کرنا چاہیئے جن لوگوں میں استقلال ہوتا ہے اور ان کی صحیح تربیت نہیں ہوتی ان کا استقلال بجائے فائدے کے سوسائٹی کو نقصان پہنچاتا

پہنچاتا ہے۔ مثال کے طور پر چوروں اور بدمعاشوں کو دیکھو۔ انکے بُرے اور ضرر رساں ارادوں میں اس قدر استقلال اور استقامت ہوتی ہے کہ سخت سے سخت سزائیں۔ عرصہ ہائے دراز کی بامشقت قیدیں ان کو چوری چکاری اور ارتکاب جرائم سے نہیں روک سکتیں۔ ہر مرتبہ جب وہ جیل سے سزائیں بھگت کر نکلتے ہیں۔ اور زیادہ ہوشیاری کے ساتھ جرائم کے مرتکب ہوتے ہیں۔ پھر پکڑے جاتے ہیں اور پہلے سے بھی زیادہ سخت سزائیں پاتے ہیں لیکن پھر بھی ارتکاب جرائم سے باز نہیں آتے۔ یہ استقلال نہیں تو کیا ہے جو ان کو اپنے ارادوں پر ہمیشہ قائم رکھتا ہے لیکن افسوس کہ ان کے استقلال نے غلط راستہ اختیار کیا ہے اسی لئے کہتے ہیں کہ ہر ارادہ کو عمل میں لانے سے پہلے اس کے ہر پہلو پر اچھی طرح غور کر لینا چاہیئے تاکہ ہمت اور استقلال غلط اور مضر کام پر صرف نہ ہو۔

استقلال کیوں چاہیئے؟ استقلال ایک نہایت محمود صفت ہے جو ہر عاقل و بالغ انسان میں ہونی چاہیئے۔ کیونکہ دنیا میں کوئی کام بھی بغیر استقلال کے نہیں ہوسکتا پھر بڑے کام تو بڑے ہی ہیں ان کے لئے تو اور بھی زیادہ استقلال اور استقامت کی ضرورت ہے مستقل مزاج اور پُر استقلال لوگ ہی دنیا کے رہنما سوسائٹی کے مُصلح اور فخر ملک و ملت ہوتے ہیں۔ استقلال ہی سے مصائب کا مقابلہ ہوسکتا ہے۔ استقلال ہی سے نئی نئی ایجادیں ہوتی ہیں استقلال

ہی سے اپنے مُلک کو حملہ آوروں اور غنیموں کی دست برد سے بچایا جاسکتا ہے۔ اور استقلال ہی کی بدولت انسان کامیاب زندگی بسر کرسکتا ہے اس لئے ہمیں اپنی طبیعتوں میں استقلال پیدا کرنے کی پُوری پُوری کوشش کرنی چاہیئے تاکہ ہم اپنے ارادوں میں کامیاب ہوں اور ایسی بامُراد زندگی بسر کریں۔ جو آیندہ نسلوں کے سامنے مثال کے طور پر پیش کی جاسکے۔

خودداری

خودداری؟ خودداری ایک ایسی شریف صفت ہے جو بہت سی صفات حسنہ کا مجموعہ ہے۔ انگریزی میں اس کے مفہوم کو سیلف ریسپکٹ کے لفظ سے ادا کرتے ہیں جس کے لفظی معنی ہیں اپنی عزت کی آپ نگہداشت کرنا یعنی ایسے افعال سے گریز کرنا جن کے کرنے سے اپنی عزت میں فرق آتا ہو ؛

خودداری کا تجزیہ اگر ہم "خودداری" کا تجزیہ کریں تو اس کی وسعت کا اندازہ بخوبی ہو سکتا ہے۔ بلند نظری۔ شجاعت۔ سخاوت۔ رحم دلی۔ ہمدردی۔ دیانتداری۔ صبر استقلال۔ عدالت۔ پرہیزگاری وغیرہ تمام صفات حسنہ خودداری میں شامل ہیں بعض کا خیال ہے کہ یہ صفات خودداری کی نشو و نما کا باعث ہیں۔ اور بعض کہتے ہیں خودداری کی بدولت یہ صفات شاخ در شاخ پھیلی ہیں۔ اگر خودداری کو ایک تناور درخت تصور کر لیا جائے تو یہ صفات اس کے پھل پھول پتوں کی طرح نظر آتی ہیں۔ یہ ممکن ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص اپنی طبیعت اور پسند کے مطابق ان کا گلدستہ تیار کر لے یا کسی پھول یا غنچۂ ناشگفتہ کو طرّہ بنا کر اپنی شان و شوکت میں اضافہ کرے لیکن اس

عمل سے خودداری کے درخت کی قدرو وقعت میں کسی قسم کا نقصان واقعہ نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کی خوشبو اور مہک دُور دُور پھیلتی ہے۔ اور خودداری کا درخت بدستور اپنی جگہ پر اپنی صفات سمیت قائم رہتا ہے۔ جو لوگ اس خیال کے مدعی ہیں کہ خودداری بہت سے صفات حسنہ سے مل کر پیدا ہوتی ہے۔ وہ قانونِ فطرت کے خلاف دعویٰ کرتے ہیں۔ کیونکہ قدرت کا خاصہ یہ ہے کہ وہ ایک چیز سے بہت سی صفات کی مختلف چیزیں پیدا کرتی ہے۔ اور بہت سی چیزوں کو ملا کر ایک چیز پیدا نہیں کرتی۔ اس لئے یہ کہنا زیادہ انسب ہے کہ خودداری بذاتِ خود ایک نہایت شریف صفت ہے۔ اور مختلف صفات حسنہ جو انسانوں کو حیوانات سے ممیز کرتی ہیں۔ اس کی مختلف شاخیں اور پھول پھل پتّے وغیرہ ہیں۔ جن کی مہک اور شادابی سے سارا زمانہ معطر ہے ؞

خودداری کا پہلا سبق

خودداری کا سب سے پہلا سبق یہ ہے کہ اپنی عزت آپ کرو۔ جو لوگ اپنی عزت کی نگہداری نہیں کرتے ان سے متعلق اور غیر متعلق لوگ بھی ان کی عزت نہیں کرتے۔ اسی لئے وہ لوگ جو خودداری کی صفت سے موصوف ہوتے ہیں اپنے حلقۂ اثر میں عزت و احترام کی نگاہوں سے دیکھے جاتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جو ترقی کے مدارج نہایت آسانی اور عمدگی سے طے کرتے چلے جاتے ہیں۔ برخلاف اس کے جن لوگوں میں خودداری کا مادّہ نہیں ہوتا

نہ تو وہ خود ترقّی کرتے ہیں اور نہ ان لوگوں کو ترقی کرنے دیتے ہیں جن سے ان کا بالواسطہ یا بلا واسطہ کچھ تعلق ہوتا ہے ان کی بدولت سوسایٹی کی حالت دن بدن پست اور ذلیل ہوتی چلی جاتی ہے ؎

چو از قومے یکے بیدانشی کرد
نہ کہ را منزلت ماند نہ مہ را

خوددار انسان کا سب سے پہلا فرض یہ ہے کہ اپنی عزّت آپ کرے۔ بالفاظ دیگر اَوروں کو اس بات پر بلا واسطہ مجبور کرے کہ وہ بھی اس کی عزّت کا خیال رکھیں۔ پس خوددار انسان جہاں اپنے احترام کا خیال رکھ کر اَوروں کا احترام کرتا ہے اور اس کے بدلے میں اپنی عزّت کراتا ہے وہاں وہ یہ بھی سبق دیتا ہے کہ جو شخص اپنے آپ کو ذلیل و حقیر سمجھتا ہے وہ دوسروں سے اپنی عزّت کرانے کا طلبگار نہیں ہو سکتا گویا جتنا بُرا وہ اپنے آپ کو خیال کرتا ہے دوسرے اس کو اس سے بھی زیادہ بُرا سمجھنے لگتے ہیں ٭

عزّت آبرو کی زندگی بسر کرنے کے لئے نہایت ضروری ہے کہ پہلے اپنے مرتبہ کا خیال رکھا جائے۔ اس کے بعد دوسروں کا احترام کرنے میں تساہل نہ ہو۔ اور اس کے ساتھ ہی ہر ایسے فعل سے اجتناب کیا جائے جس سے دوسروں کی نظروں

میں ذلیل نہ ہونا پڑے - خود دار انسان ان احتیاطوں کے ساتھ ساتھ اس بات کا ہمیشہ خیال رکھتے ہیں کہ وہ کوئی ایسا کام نہ کریں جس سے ان کی عزّت و وقعت اپنی نگاہوں میں کم ہو جائے اور کسی نہ کسی طرح اس کا اثر سوسائٹی پر پڑے - سمجھنے کی بات ہے کہ اگر کوئی شخص کشتی میں ذرا سا سوراخ کر دے تو اس کی معمولی سی غلطی سے کشتی میں پانی بھر آئیگا - اور تمام سواریوں کی جان خطرے میں پڑ جائیگی - بعینہ یہی کیفیّت ان لوگوں کی ہے جو خود داری کی پاسداری نہیں کرتے اور اپنی معمولی معمولی سی بے احتیاطیوں سے اوروں کو بھی قعرِ مذلت میں گرا دیتے ہیں ؛

جھوٹی خود داری

آجکل ترقّی کا زمانہ ہے - ہر طرف مصنوعات کی بھرمار ہے - آج ایک چیز اصلی تیار ہوتی ہے - دوسرے دن اس قسم کی سینکڑوں چیزیں مصنوعی تیار ہو جاتی ہیں - اور اصل اور نقل میں کوئی تمیز باقی نہیں رہتی - چیزیں تو چیزیں آدمی بھی مصنوعی بن جاتے ہیں - اور ان میں مصنوعی صفات بھی پیدا کر دی جاتی ہیں جس طرح دُنیا کی کوئی چیز تصنع سے خالی نہیں رہی اسی طرح خود داری بھی مصنوعات کی دست برد سے نہیں بچی - ہم تسلیم کرتے ہیں کہ خود داری مصنوعی بھی اچھی ہے - لیکن اگر اس کے چہرے سے تصنّع کا پردہ اُٹھا دیا جائے تو ساری قلعی کُھل جاتی ہے - اور اصلی جوہر نظر آجاتے ہیں - موجودہ تہذیب کی

برکت سے آجکل ہر مقام پر بلکہ ہر قدم پہ لاتعداد نام نہاد خوددا نظر آتے ہیں۔ اگر ان کے اندرونی حالات کو دیکھنے کا موقعہ ملے تو معلوم ہوگا کہ ان کے وجود خودداری کے دامن پر بدنما دھبّوں سے کم نہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جو صفات حسنہ کی جڑیں نامعلوم طریقے سے کھوکھلی کر رہے ہیں مگر سوسائٹی میں بڑے خوددار کہلاتے ہیں بہت سے لوگ ظاہری خودداری سے عوام میں عزّت حاصل کر لیتے ہیں۔ لیکن ان کی عزّت کاغذکی ناؤ اور کاٹھ کی ہنڈیا سے زیادہ پائیدار نہیں ہوتی۔ جونہی ان کا بھرم کُھلتا ہے۔ سب بنی بنائی عزّت خاک میں مل جاتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ پردہ اُٹھ جانے کے بعد ایسے لوگوں کو حد درجہ ذلیل ہونا پڑتا ہے۔ ماننا پڑیگا کہ ایسی حرکات سے حقیقی خودداری کو سخت نقصان پہنچتا ہے۔ اور ہر خوددار انسان پر دھوکے بازی اور مکّاری کا گمان گزرتا ہے۔ اِس لئے نہایت ضروری ہے کہ خودداری سے متعلّقہ صفات کی تربیت میں بھی کوشش کی جائے اور اپنے آپ کو ہمہ صفت موصوف بنایا جائے تاکہ جس پہلو سے پردہ اُٹھے کوئی اچھی چیز ہی نظر آئے۔ اور یہ کہنے کا موقعہ نہ ملے کہ خوبصورت بُرقعے نے بدنمائی اور بدصورتی پر پردہ ڈال رکھا ہے۔

تکبّر اور خودداری	بعض لوگ بغیر سوچے سمجھے خوددار شخص کو متکبّر

کہہ دیتے ہیں۔ حالانکہ خودداری اور تکبر میں زمین آسمان کا فرق ہے
خودداری تو ایسی صفت ہے کہ اس کو شرط انسانیت کہنا بجا ہے۔
چہ جائے کہ اس کو تکبر کی سی مذموم رذیلت سے ملوث کیا جائے
ہاں تکبر خودپسندی خودبینی وغیرہ ایسی بُری صفات ہیں کہ ان کو
ننگ انسانیت کہنا درست ہے۔ حقیقت امر یہ ہے کہ ان کی سرحد
ایک دوسرے سے اتنی قریب ہے کہ ان میں امتیاز کرنا ہر کس و ناکس کا
کام نہیں۔ اس کو تو وہی شخص پہچان سکتا ہے۔ جس پر یہ کیفیتیں بذات خود
گزریں۔ دیکھا گیا ہے کہ ان قباحتوں کو جانچنے اور تمیز کرنے میں
عام طور پر غلطی ہو جاتی ہے۔ اور ہماری ذرا سی کج فہمی ایک عمدہ
فضیلت کو رذیلت میں تبدیل کر دیتی ہے۔ اس لئے ضروری
ہے کہ ایسے نتائج کے استنباط میں مکمل حزم و احتیاط سے کام لیا
جائے تاکہ غلطی ہونے کا امکان کم سے کم پیدا ہو۔

تکبر اور خودداری کا معمولی سا فرق یہ ہے کہ متکبر شخص انسانی
کمزوریوں اور خامیوں کو بھول جاتا ہے۔ اور یہ سمجھنے لگتا ہے کہ ہمچو ما
دیگرے نیست۔ معلوم ہونا چاہئے کہ اکملیت کا دعویٰ خدا ہی کو
سزاوار ہے۔ دُنیا کی ہر چیز فانی اور غیر مکمل ہے۔ جس چیز کو ہم
آج مکمل خیال کرتے ہیں۔ کل وہی چیز نامکمل ثابت ہو جاتی ہے۔
اس لئے کسی بات پر تکبر کرنا پوری پوری حماقت ہے کیونکہ خدا
نے ایک سے ایک بڑھ کر انسان پیدا کیا ہے۔ اسی لئے خوددار

شخص کسی بات پر غرور نہیں کرتا۔ ہاں وہ ایسی باتوں سے احتراز ضرور کرتا ہے جس سے اس کی عزت میں فرق آتا ہے اس حزم واحتیاط کی بنا پر اس کو مغرور اور متکبر کہنا سخت ناانصافی ہے۔ وہ تو غرور اور تکبر سے کوسوں دُور ہے۔ وہ اپنی عزت کی حفاظت کرتا ہے اور یہ اس کا پیدائشی حق ہے۔ اس سے اس کو کون باز رکھ سکتا ہے۔

اسی طرح خود پسندی کا الزام بھی خود دار شخص پر لگانا بڑا سخت اخلاقی جرم ہے۔ جو لوگ خود پسند ہوتے ہیں وہ اپنی خُوبیوں کے اظہار میں مبالغے سے کام لیتے ہیں۔ اس طرح سے ان کی خُوبیوں کے مقابلے میں دوسروں کی خُوبیاں ماند پڑ جاتی ہیں۔ خود دار شخص یہ اخلاقی ظلم کبھی روا نہیں رکھتا۔ وہ اپنے سے کم خُوبیوں والے شخص کی عزت میں بھی کمی نہیں کرتا۔ اور نہ اس کو حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے۔ کیونکہ اگر وہ ایسا کرے تو اس کی اپنی عزت کون کرے۔ اس کا مسلک تو یہ ہے کہ پہلے وہ دوسروں کی عزت کرے پھر اپنی عزت کرائے۔ اس لئے خود دار شخص پر خود پسندی کا الزام بھی ہرگز عاید نہیں ہوتا۔ کیونکہ اس کی ذات ان عیوب سے بہت بالا ہے۔

خودداری افعال رذیلہ سے روکتی ہے۔	جب کوئی شخص اپنے تعزز کی نگہداری کرتا ہے تو اس میں بڑی بڑی محمودہ صفات

پیدا ہو جاتی ہیں ۔ وہ مصیبتوں کو ہنسی خوشی سے برداشت کرتا چلا جاتا ہے ۔ لیکن اپنے وقار میں فرق نہیں آنے دیتا۔ جب اسکی عزت خطرے میں پڑ جاتی ہے تو جان پر کھیل جاتا ہے اور ذلت کی زندگی پر بہادری کی موت کو ترجیح دیتا ہے ۔ اس کی جان پر بن جاتی ہے لیکن وہ اپنی خودداری کو فروخت نہیں کرتا ۔ اگر وہ غلامی بھی کرتا ہے تو خودداری کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتا۔ انقلابات ایام اگر اس کو محتاج بھی کر دیں تو وہ اپنے جیسے انسان کے سامنے دست سوال نہیں پھیلاتا۔ نا کامیاں اور نامرادیاں اس کی ہمت کو نہیں توڑ سکتیں ۔ وہ مصیبتوں کے طوفانوں کا سخت چٹان کی طرح مقابلہ برابر کئے جاتا ہے اور اپنے پائے استقلال میں لغزش نہیں آنے دیتا ۔ نہایت نازک اور امتحان کے موقعوں پر خودداری ہی اس کا ساتھ دیتی ہے اور افعال رذیلہ کے ارتکاب سے روکتی ہے خودداری ـــــ اس کو انسانیت کے رتبے سے گرنے نہیں دیتی ورنہ مصیبتیں انسان سے وہ کچھ کروا دیتی ہیں جو عام حالات میں وہ کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھتا ۔ خودداری ـــــ ایسے ہی وقت میں اس کی دستگیری کرتی ہے اور اشرف المخلوقات کے لقب کی لاج کو قائم رکھنے کی ہمت پیدا کرتی ہے ؛

خودداری میں عروج و زوال مضمر ہے

جن اقوام و افراد میں خودداری نہیں ہوتی ۔ وہ دنیا میں کبھی ترقی نہیں کر سکتے حادثات اور انقلابات

ان کے وجود کو حرف غلط کی طرح صفحہ عالم سے مٹا دیتے ہیں خود داری قوموں کے عروج اور زوال کی نشانی ہے۔ خودداری تہذیب و تمدن اور مذہب کا نچوڑ ہے خودداری ایک فطرتی امر ہے۔ جس کی بجاآوری ہر فرد پر فرض ہے جن لوگوں میں خودداری کا جذبہ فنا ہُوا سمجھو کہ ان کا خاتمہ ہو گیا۔

خودداری ہی وہ صفت ہے جو ہم کو تعزز استقلال۔ پیش بینی شجاعت اور حزم و احتیاط سکھاتی ہے۔ خودداری غلامی کی زنجیریں کاٹنے والی اور ناانصافی کا خاتمہ کرنے والی ہے۔ خودداری ہر مذہب و ملت کا ماحصل ہے اور اقوام و افراد کو پرکھنے کا صحیح معیار ہے۔ خودداری اکتساب فضائل کی تائید اور ارتکاب رذائل کی تردید ہے۔ اور خودداری ہی انسانیت کی دلیل ہے۔

فرض

اگر فرض کو امر ربی کہا جائے تو بجا ہے کیونکہ جس قدر ہمارے قوائے عقلیہ پرورش پاتے ہیں اسی قدر احساس فرض ہمارے دل میں بڑھتا چلا جاتا ہے اور قدرتی طور پر ہمارا ضمیر ہر فرض پر ہمیں آگاہ کر کے ادائے فرض کی طرف متوجہ کرتا رہتا ہے۔ یہ خصوصیت اگرچہ حیوانوں میں بھی موجود ہے لیکن جتنی ان کی عقل ہوتی ہے اتنا ہی ان کو اپنے فرائض کا احساس ہوتا ہے۔

عام طور پر فرائض اپنی ذات سے شروع ہوتے اور ہماری وسعت نظر اور تعلقات کی گہرائی کے ساتھ ساتھ گھٹتے بڑھتے رہتے ہیں بعض اوقات محض انسان ہونے کی وجہ سے کچھ فرائض ہم پر عائد ہوتے ہیں اور ہم ان کو بہت کافی اہمیت دیتے ہیں۔

فرائض کی بجا آوری انسان کے مرتبہ کو بلند کرتی اور قلب و دماغ کو ایک مستقل اور غیر فانی تقویت اور مسرت بخشتی ہے، اس لئے ان کیفیتوں سے لطف اندوز ہونے کے واسطے انسان شدید ترین خطرات میں بھی ادائے فرض سے باز نہیں رہ سکتا، ہاں کبھی کبھی ایسا بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ انسان کی عقل خطا کھاتی ہے اور وہ کسی غلط کام کو

اپنا فرض خیال کر لیتا ہے، چنانچہ اس غلط مگر بزعم خود صحیح فرض کی بجا آوری میں بھی وہ پوری پوری قوّت صرف کرتا ہے۔ اور اسکے بجا لانے سے اسے ویسی ہی روحانی خوشی حاصل ہوتی ہے جیسی کسی صحیح فرض کو ادا کرنے سے ہو سکتی ہے۔ ماننا پڑیگا کہ ایسے معصوم لوگوں کی غلط فرض انگاریاں ضرور قابل عفو ہیں اور ان کی ہمّت و استقلال یقیناً قابل تعریف کہ وہ اپنے ضمیر کی آواز پر ادائے فرض میں کوتاہی نہیں کرتے اور اس رُوحانی خوشی کو حاصل کرنے میں ہر ممکن جد وجہد کرتے ہیں جو ادائے فرض کا نتیجہ ہے۔

پیدائشی آزادی فرض سے آزاد نہیں کرتی

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ انسان دُنیا میں مطلق العنان اور آزاد پیدا ہوا ہے اور وہ اپنے فرائض کے حدود خود مقرر کرتا ہے۔ گویا فطرت کی طرف سے اس پر کسی قسم کے فرائض عاید نہیں ہوتے، بلکہ جس ماحول اور فضا میں وہ تربیت پاتا ہے اس کے مخصوص اثرات سے وہ اپنے لئے مختلف قسم کی ذمہ داریاں اور فرائض اپنی خوشی سے پیدا کر لیتا ہے، لیکن اگر وہ چاہے تو اپنی پیدائشی آزادی اور مطلق العنانی کو برقرار رکھ سکتا ہے۔ ہمارے نزدیک یہ نظریہ بالکل غلط ہے۔ کیونکہ انسان علایق دُنیا اور فطرتی بندشوں سے کسی صورت آزاد نہیں ہو سکتا۔ اس لئے اس کے متعلق یہ رائے قائم کرنا کہ وہ مطلق العنان یا آزاد پیدا ہوتا ہے کسی طرح درست نہیں۔

اگر ہم سب انسان اپنے آپ کو مطلق العنان سمجھ کر یہ خیال کر لیں کہ ہم پر کوئی فرض عائد نہیں ہوتا اور ہم ہر معاملے میں بالکل آزاد ہیں تو دنیا کا امن وسکون غارت ہو جائے۔ اور تمام کاروبار زندگی بند ہو جائیں کیونکہ دُنیا کا کوئی کام انفرادی کوششوں سے انجام نہیں پاتا بلکہ ہر کام کی تکمیل کے لئے کسی نہ کسی قسم کی بیرونی امداد کی ضرورت ضرور پیش آتی ہے۔ اگر یہ تعاونی ضرورت پوری نہ ہو تو دُنیا کے کارخانہ کا نظام درہم برہم ہو جائے۔ ہمارے کام تو محض اس طرح چل سکتے ہیں کہ ہر شخص اپنی جگہ پر اپنے فرائض کو محسوس کرے اور نہ صرف محسوس کرے بلکہ ان کی ادائیگی میں بھی دیانتداری سے کام لے "

اداۓ فرض سعادت دارین ہے

اس میں شک نہیں کہ انسان آزادی کو پسند کرتا اور فرائض کے بوجھ سے گھبراتا ہے لیکن اس مصیبت کا علاج ہی کیا ہے کہ فطرت نے اس کو مجبور ومعذور بنایا ہے۔ اور اس پر لاتعداد فرائض کا بوجھ لاد دیا ہے۔ اس لئے اس پر لازم آتا ہے کہ وہ ان فرائض کو نہایت خوش اسلوبی اور کشادہ پیشانی سے ادا کرتا رہے جن کی ادائیگی کی وہ اہلیت رکھتا ہے۔ اگر وہ اپنے مخصوص فرائض کی بجاآوری میں تساہل سے کام لیتا ہے تو سمجھ لو کہ وہ اس گروہ انسانی کو شدید نقصان پہنچاتا ہے جس کے ساتھ قُدرت نے اس کو وابستہ کیا ہے۔ اگر کسی گروہ یا جماعت کا

ہر بشر یہ خیال کرے کہ میں مطلق العنان ہوں اور مجھ پر کوئی فرض نہیں تو گزر اوقات اور ترقی کے راستے مسدود ہو جائیں۔ اور تمام کاروبار زندگی چلتے چلتے یکدم تھم جائیں۔ نیز ہر فرد سکون قلب کی دولت سے محروم ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ لوگ جو اپنے فرائض کو عمدگی اور دیانتداری سے ادا کرتے ہیں ان لوگوں پر ہر حیثیت سے برتری رکھتے ہیں جو اپنے فرائض کا احساس نہیں رکھتے یا ان کی بجا آوری میں پوری کوشش نہیں کرتے ۔

ادائے فرض سے عہدہ برآ ہونے کے لئے ہر فرد بشر کو یہ جاننا ضروری ہے کہ اس کے فرائض کیا کیا ہیں۔ اور وہ کونسے وسائل ہیں جن کے ذریعے یا امداد سے وہ اپنے فرائض کو حُسن و خوبی کے ساتھ ادا کر سکتا ہے۔ اس قسم کی سوچ بچار سے فرائض کی ادائیگی میں آسانیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ فرائض کی انجام دہی سے انسان کی استعداد اور قابلیت بڑھتی ہے۔ اور اس کا مرتبہ حیوانوں سے بلند ہوتا ہے۔ احساس اور ادائے فرض ہی وہ خصوصیت ہے جو حیوانوں کو انسانیت کے درجے کے قریب تر لاتی ہے۔ اس کے علاوہ ادائے فرض سے ایک قسم کی رُوحانی خوشی حاصل ہوتی ہے۔ اور اطمینان قلب کی دولت میسر آتی ہے۔ اگر سوءِ اتفاق سے کوئی فرض صحیح وقت پر ادا نہیں ہو سکتا تو قدرتاً دماغی توازن اور سکون قلب میں فرق آجاتا ہے۔ بلکہ بسا اوقات غیر منتہی تفکرات اور

پریشانیاں قلب و دماغ پر مسلط ہو جاتی ہیں۔ جو لطف زندگی کو بے لطف کر دیتی ہیں ؛

فرض اور خود غرضی بعض فلاسفروں کا خیال ہے کہ انسان سرتا سر خود غرض واقعہ ہوا ہے اور وہ جتنے فرائض ادا کرتا یا اپنے ذمہ لیتا ہے ان سب کی تہ میں ہمیشہ خود غرضی پوشیدہ ہوتی ہے۔ ممکن ہے یہ خیال کسی حد تک درست ہو لیکن فرض کو سراسر خود غرضی سے وابستہ سمجھنا فرض کی روحانی عظمت کو بٹہ لگانا ہے ؛

خیال کرو ایک اجنبی شخص کسی سخت تکلیف میں مبتلا ہے تمہیں اس کی زار حالی کا پتہ چلتا ہے۔ باوجود اس کے کہ تمہاری اس سے کوئی سابقہ واقفیت اور راہ و رسم نہیں اور نہ تمہاری اس کے ساتھ کسی قسم کی ذاتی اغراض وابستہ ہیں۔ پھر تم کیوں اس کے دُکھ درد میں شریک ہو جاتے اور حتی الامکان اس کی اعانت کرتے ہو ؛

اس ہمدردی کا اصلی سبب یہ ہے کہ تمہارا ضمیر یعنی ادائے فرض کا احساس تمہیں ادائے فرض پر اکساتا ہے۔ اگر تم اس کے حکم کی تعمیل نہیں کرتے تو آپ ہی آپ تمہاری روح کو اذیت اور قلب کو تکلیف پہنچتی ہے۔ اور تم محسوس کرتے ہو کہ تمہارے ذمہ ایک فرض تھا جو تم نے ادا نہیں کیا ؛

ہم اس حقیقت سے انکار نہیں کرتے کہ انسان خود غرضی سے مبرا ہے۔ وہ خود غرض ہے اور ضرور ہے لیکن یہ کہدینا یقیناً بہت سخت

ظلم ہے کہ اس کے تمام افعال کی تہ میں خود غرضی کار فرما ہوتی ہے۔ اس الزام میں حقیقت صرف اتنی ہے کہ ہماری اکثر اغراض ایک دوسرے سے وابستہ ہیں۔ اس لئے ہمارے ہر کام میں خود غرضی کی جھلک نظر آتی ہے۔ لیکن جب بحیثیت انسان ہونے کے کوئی فرض ہم پر عائد ہوتا ہے تو خود غرضی اس سے کوسوں دُور رہتی ہے۔ ہم ایسے فرض کو مجبوراً ادا نہیں کرتے بلکہ خوشی خوشی بغیر کسی غرض کے بجا لاتے ہیں اور اُس کی ادائیگی عین انسانیت سمجھتے ہیں۔ ایسے مواقع پر ہمارا ضمیر ہمیں ادائے فرض کی طرف توجہ دلاتا ہے اگر ہم اس کی آواز پر لبیک نہیں کہتے تو سمجھ لو کہ کسی لالچ یا کمزوری نے ادائے فرض کے سچے جوش کو ہمارے دل میں ٹھنڈا کر دیا، ورنہ ہم ضرور اپنے فرض سے سبکدوش ہو کر لازوال رُوحانی مسرت حاصل کرتے، اور خود غرض ہونے کا الزام اپنے اوپر ہرگز نہ لیتے۔

ادائے فرض تکملۂ حیات ہے

ادائے فرض کی بیخ حضرت انسان کے ساتھ کچھ ایسی لگی ہے کہ اس سے کسی طرح چھٹکارا نہیں ہو سکتا، اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمارے جتنے فرائض ہیں وہ سب ہمارے ہی بنائے ہوئے ہیں اور ہم ہی ان میں وقتاً فوقتاً تبدیلیاں کرتے رہتے ہیں۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ یہ تبدیلیاں کیوں عمل میں آتی ہیں۔ اس کے متعلق ہمارا خیال یہ ہے کہ وہ فرائض جو فطرت کی منشا کے مطابق نہیں ہوتے۔ تجربہ ان کو بیکار ثابت

کر دیتا ہے۔ پھر انسان ان پر غور و فکر کرتا اور ان میں جزوی یا کلّی تبدیلیاں کر کے ان کو فطرت کی منشا کے مطابق بناتا ہے۔ اس قسم کی تبدیلیاں اسوقت تک جاری رہتی ہیں۔ جب تک فرائض انسانی منشائے فطرت کے ساتھ بالکل منطبق نہیں ہو جاتے۔

قدرتی طور پر ہر انسان کے دل میں ادائے فرض کا احساس ہوتا ہے۔ لیکن جب یہ احساس جاتا رہتا ہے تو خود غرضی اور نفسانفسی کے جذبات ان کی جگہ لے لیتے ہیں۔ اور ہر شخص کی نظر ذاتی مفاد و شخصی اغراض پر مرتکز ہو جاتی ہے۔ غرض پرستی اور خود غرضی کی بدولت شیرازہ سکون و اطمینان منتشر ہونا شروع ہوتا ہے اور آخر کار ایک زبردست انقلاب برپا ہو کر یہ غیر فطری جذبات خود بخود ختم ہو جاتے ہیں اور ایک دوسرا انظام قائم ہوتا ہے۔ جو منشائے فطرت کے مطابق ہوتا ہے۔

اسی طرح انقلابات اور تغیرات کا سلسلہ ہمیشہ جاری رہتا ہے، اور گردش ایام پرانی اور از کار رفتہ تہذیب و تمدّن کو تبدیل کرتی رہتی ہے۔ نئے نئے اصول اور قوانین پرانے اور فرسودہ قاعدوں اور رسموں کی جگہ لے لیتے ہیں لیکن نظام فطرت کے قوانین میں کوئی انقلاب یا تبدیلی واقعہ نہیں ہوتی، مگر حضرت انسان مرغ بادنما کی طرح حادثات کے طوفان خیز جھکڑوں سے چاروں طرف گھومتے رہتے ہیں اور کسی ایک جگہ قیام نہیں کرتے۔ ان انقلابات کو دیکھتے

ہوئے اکثر کہا جاتا ہے کہ فطرت انسان کو کبھی امن و اطمینان سے نہیں بیٹھنے دیتی۔ فطرت پرست فلاسفہ اس اعتراض کا یہ مسکت جواب دیتے ہیں کہ جب تک کوئی نظام فطرت کے فرایض ادا کرتا ہے وہ قائم رہتا ہے اور وہ نظام جو فطرت کے زیادہ فرایض ادا کرتا ہے نسبتاً تا بدیر جاری رہتا ہے۔ لیکن جب وہ فطرت کے اصولوں سے منحرف یا دُور ہو جاتا ہے تو فطرت کی طاقتیں اس کو منتشر اور درہم برہم کر دیتی ہیں اور اس کی جگہ ایک نیا نظام قائم ہوتا ہے وہ بھی اگر فطرت کے اصولوں کے مطابق ہوتا ہے تو چلتا ہے ورنہ اس کا خاتمہ بھی باعث عبرت بنتا ہے۔ یہی اسباب ہیں جن کی وجہ سے فطرت پرستی کی تحریک کو روز افزوں مقبولیت حاصل ہو رہی ہے۔ اور ہمارے حکماء ایسے نظام کی تلاش میں مصروف ہیں جو بالکل فطرت کے اصولوں کے مطابق ہو تاکہ وہ ہمیشہ قائم رہے اور بنی نوع انسان آئے دن کے انقلابات کی مصیبتوں سے محفوظ و مصئون ہو جائیں۔

فطرت نے فرایض کا سنہری جال کچھ اس طرح بچھایا ہے کہ ہماری ناقص عقل اس کے پھندوں کو سمجھنے سے قاصر ہے۔ اس جال کے پھندوں میں ہر انسان کو اس طرح جکڑ بند کیا گیا ہے کہ کسی تدبیر سے جیتے جی چھٹکارا نہیں ہو سکتا۔ لطف یہ ہے کہ جو شخص ان جنجال سے نکلنا چاہتا ہے وہ اور زیادہ اُلجھتا چلا جاتا ہے۔ وہ دُنیا کو چھوڑتا ہے مگر دُنیا اس کو نہیں چھوڑتی، گویا قطع علایق کا حربہ بھی کچھ کام

نہیں دیتا۔ ہاں اگر اس سے نجات مل سکتی ہے تو محض موت کے ذریعے، مگر موت ایسی بلا ہے کہ ہر انسان اس سے ڈرتا اور لرزتا ہے۔ کوئی لاکھ کہے کہ اس زندگی سے موت بہتر ہے لیکن جب موت سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ تو حضرت انسان کی قلعی کھل جاتی اور بل بوتا معلوم ہو جاتا ہے۔ اس نظریہ سے وہ لوگ مستثنےٰ ہیں جو کسی فرض کو ادا کرنے میں موت کی پروا نہیں کرتے، ایسے لوگوں کے لئے موت زندگی کا ماحصل ہے لیکن وہ لوگ جو فرائض انسانی سے بچنے کے لئے موت کو طلب کرتے ہیں اکثر حالت نزع یا سخت بیماری کے عالم میں اپنے گناہوں اور خطاؤں کی بار بار معافیاں مانگتے اور توبہ کرتے ہیں۔ بہ الفاظ دیگر وہ اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ فطرت نے ان کے ذمہ خالق و مخلوق کے کچھ فرائض عائد کئے تھے جن کو وہ ادا کرنے سے گریز کرتے رہے اور اگر ادا بھی کئے تو نہایت بد دلی اور مجبوری سے اسی قسم کے احساسات سے ثابت ہوتا ہے کہ قدرت نے ادائے فرض کو زندگی کا نصب العین قرار دیا ہے یہی وجہ ہے کہ ادائے فرض کی آواز ہر وقت ہمارے ضمیر سے نکلتی ہے۔ اور ہمیں اپنے فرائض سے آگاہ کرتی ہے یہ دوسری بات ہے کہ تن آسانی اور کاہلی کی وجہ سے ہم گم سُم ہو کر بیٹھے رہیں اور اس آواز پر لبیک نہ کہیں۔ بہر حال ادائے فرض بنی نوع انسان کی تخلیق کا حقیقی مقصد ہے اور اس کی تعمیل کے بغیر

تکملۂ حیات غیر ممکن ہے +

تقسیم فرائض بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اقوام عالم میں جس قدر انقلابات اور فسادات رُونما ہوتے ہیں ان کا اصلی سبب قُدرت کی غلط تقسیم فرائض ہے وہ کہتے ہیں فطرت تخلیق انسان میں معیار مساوات کو قائم نہیں رکھتی اور مختلف درجوں اور طبیعتوں کے انسان پیدا کر دیتی ہے اس لئے اس عدم مساوات سے بنی نوع انسان میں کبھی یک جہتی اور اتفاق پیدا نہیں ہو سکتا، اس نظریہ پر اعتراض یہ ہے کہ اگر فطرت ایک جیسی قابلیتوں اور ایک طرح کی خصوصیتوں کے انسان پیدا کر دیتی تو پھر نظام عالم میں اور بھی زیادہ انتشارات پیدا ہوتے رہتے۔ اس تخلیقی مساوات کا سب سے زیادہ نقصان یہ ہوتا کہ زندگی اجیرن ہو جاتی کیونکہ اس کے لطف کا راز کشمکش حیات میں مضمر ہے نیز دُنیاداری کے فرائض لاتعداد ہیں۔ کسی کے ذمہ کچھ کام ہیں اور کسی کے سپرد کسی اور قسم کے فرائض ہیں۔ ان کی تعمیل کے لئے مختلف قسم کی طبعیتوں اور قابلیتوں کے افراد کی ضرورت ہے اگر فطرت کار گاہ تخلیق سے سب کو ایک قسم کی قابلیت اور مزاج کا بنا کر نکالتی تو دُنیا کے اَن گنت اعلیٰ وادنیٰ فرائض کیونکر ادا ہو سکتے۔ بس اسی مقصد کو مد نظر رکھ کر کہ دُنیا کے کاروبار میں کسی قسم کی رکاوٹ اور انتشار پیدا نہ ہو قدرت نے مختلف قسم کے انسان پیدا کئے۔ چہ جائیکہ ان سے نظام قدرت

میں خلل پیدا ہو اور انسان صبر و سکون کی دولت سے محروم رہ جائے ٭
تقسیم فرائض اور ادائے فرض کے قضیہ کو یوں سمجھنا چاہیئے کہ دُنیا ایک بہت بڑی مشین ہے اور ہر انسان اس مشین کا ایک پُرزہ ہے۔ جو پُرزہ اپنا فرض پُوری طرح ادا نہیں کرتا یا تو اس کو ٹھیک کرتے ہیں یا بدل ڈالتے ہیں، اگر اس کی خرابی کو درست نہیں کیا جاتا تو تمام مشین پر اس کا اثر پڑتا ہے۔ یہاں تک کہ ایک پُرزے کی خرابی سے پوری مشین میں خلل واقعہ ہوتا ہے! ور ایک ایسا وقت آجاتا ہے، جب پوری مشین بیکار ہو جاتی ہے۔ پھر ضرورت لاحق ہوتی ہے کہ مشین کے تمام نظام کو از سر نو درست کیا جائے اور تغیّر تبدل کے عمل سے اس کی خرابیوں کو دُور کر کے اُسے چلنا کر دیا جائے ٭

بجنسہٖ یہی حالت نظام عالم کی ہے۔ اِس لئے تقسیم فرائض اور ادائیگی فرض کی طرف متوجہ ہونا نہایت ضروری ہے۔ جس حکومت یا ادارہ کے اراکین اپنے فرائض کو پوری طرح ادا نہیں کرتے وہ کبھی اپنے نظام کو قائم نہیں رکھ سکتا۔ اس کے کاروبار میں خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اور آخر کار ان کو دُور کرنے کے لئے مختلف قسم کے ردّ و بدل عمل میں لانے پڑتے ہیں ٭

قسام فرائض کا فرض ہے کہ وہ ہر شخص کی قابلیت اور ہمّت کے مطابق فرائض کی تقسیم کرے، گویا فطرت نے جس شخص کو جس

قابل بنایا ہے اس کے سپرد ویسا ہی کام کرے تا کہ ہر کام ضرورت کے مطابق نہایت خوش اسلوبی اور عمدگی سے انجام پذیر ہو، اور کسی قسم کا رخنہ یا خلل رُونما نہ ہونے پائے۔

ہر کام میں تقسیم فرائض کا مسئلہ بہت اہمیت رکھتا ہے۔ اس میں رو رعایت سے گریز کرنا ازبس ضروری ہے۔ ورنہ شدید نقصان اور خلل کے امکان پیدا ہو جاتے ہیں۔ انقلابات اور بغاوتیں اکثر اسی سقم سے رُونما ہوا کرتی ہیں۔ خاندان۔ ادارے۔ حکومت، تجارت، زراعت۔ صنعت و حرفت۔ علم و ادب۔ غرض کاروبار دُنیا کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جو فرائض کی غلط تقسیم سے تنزل پذیر اور نظام عالم میں خلل اندازی کا باعث نہیں ہوتا۔ اس لئے ہمارا فرض ہے کہ ہم فرائض کی تقسیم کے وقت ہر شخص کی مخصوص قابلیت کا پورا پورا خیال رکھیں اور کسی قسم کی رعایت اور جانبداری کے احساسات کو دل میں نہ آنے دیں۔

احساس فرض | بامُراد اور کامیاب زندگی بسر کرنے کے لئے ادائے فرض کی تعلیم انسان کے لئے ازحد ضروری ہے۔ کیونکہ جب انسان کو ادائے فرض کا احساس نہیں ہوتا وہ دُنیا میں کبھی ترقی نہیں کر سکتا۔ اور نہ کامیابی اور اطمینان کی زندگی بسر کر سکتا ہے۔ اس لئے احساس فرض کی تہذیب و تربیت کا شروع ہی سے خیال رکھنا چاہیئے۔ اور زندگی کے ابتدائی مراحل ہی میں اس بات کا

احساس پیدا کر لینا چاہیئے کہ خداوند تعالیٰ نے انسان کو بیکار پیدا نہیں کیا۔ بلکہ اس کے ذمہ بہت سے فرایض لگائے ہیں جن کو ادا کرنا دُنیا اور آخرت کی آسودگی کا سرمایہ بہم پہنچانا ہے۔ کسی نے کیسی بھلی بات کہی ہے کہ ہمارا ہر چھوٹے سے چھوٹا گھر ادائے فرض کی تعلیم کا مدرسہ ہے اور جس گھر کی تربیت میں ادائے فرض کی تعلیم شامل نہیں ہوتی وہ گھر فرایض تربیت کے ساتھ انصاف نہیں کرتا۔ اس مخصوص تعلیم کے فقدان سے اس کا اپنا نظام درہم برہم رہتا ہے۔ اس کے برعکس جن گھروں میں احساس فرض اور ادائے فرض کی پوری تعلیم دی جاتی ہے۔ ان گھروں کی عورتیں مرد اور لڑکے لڑکیاں بلکہ ملازمین تک سلیقہ شعار اور فرض شناس ہوتے ہیں۔ ایسے ہی خاندان پھولتے پھلتے اور ترقی کرتے ہیں۔ ان کا ہر فرد اپنے گھر کی چاردیواری سے باہر نکل کر سوسائٹی اور ملکی حکومت کے قوانین اور قواعد کی پابندی کرتا ہے۔ ایسے ہی افراد اچھے شہری اور امن پسند رعیّت کہلانے کے مستحق ہیں۔ اور حق یہ ہے کہ انہی کی بدولت تہذیب و تمدّن اور زندگی کے ہر شعبے میں ترقی ہوتی ہے۔

انسان کے فرایض لاتعداد ہیں۔ اور ان کی کلّی ادائیگی بہت مشکل کام ہے۔ لیکن ہمارا فرض ہے کہ جس قدر فرایض ادا کرنے کی ہم میں ہمّت موجود ہے ہم ان کو ادا کر کے سعادت دارین

حاصل کریں۔

سب سے پہلے ہم پر پروردگار کے فرائض ہیں کہ اس نے ہم کو پیدا کیا اور اشرف المخلوقات کا لقب دیا ہے۔ چونکہ انسان صنعت کردگار کا نقش نادر ہے اس لئے اسے اپنی ہستی کو خاک میں نہیں ملانا چاہیئے بلکہ اپنی مختصر سی زندگی میں اسے ایسے ایسے فرائض ادا کرنے چاہئیں جن کی ادائیگی سے انسانیت کو عروج حاصل ہو۔

حقوق خالق کو ادا کرنے کے بعد فرائض انسانی کا دائرہ وسیع ہوتا ہے اور اس میں ماں باپ بھائی بہن بیوی شوہر اور دور و نزدیک کے رشتے شامل ہو جاتے ہیں ان کے بعد حقوق ہمسایہ اور دیگر متعلقین کی باری آتی ہے۔ آہستہ آہستہ یہ دائرہ اس قدر بڑھتا ہے کہ اپنے وطن اور ملک پر محیط ہو کر تمام دنیا کا محاصرہ کر لیتا ہے۔ اور فرائض انسانی اس قدر لاتعداد اور غیر محدود ہو جاتے ہیں کہ ایک طویل العمر انسان بھی ان سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔ بہر حال کتنے خوش قسمت ہیں وہ لوگ جو اپنی مختصر سی زندگی میں اپنے گھر کے دائرے سے نکل کر ملک و قوم بلکہ ساری دنیا کو ادائیگی فرائض سے فایدہ پہنچاتے اور خداوند تعالیٰ کے اس مقصد عظیم کو پورا کرتے ہیں جس کی تکمیل کے لئے اس نے ان کو پیدا کیا ہے۔

"پابندیٔ وقت"

؟ کسی کا مقولہ ہے کہ "وقت ہی زندگی ہے۔ اس لئے اگر تمہیں زندگی پیاری ہے تو وقت ضایع نہ کرو"۔ جو لوگ وقت کو ضایع کرتے ہیں ان کو دوہرا دوہرا نقصان ہوتا ہے۔ ایک تو ان کی زندگی کا وہ قیمتی حصّہ ضایع ہوتا ہے جس میں وقت کی قدر نہیں کی گئی پھر وہ وقت تلف ہوتا ہے جس میں کھوئے ہوئے وقت پر افسوس کیا جاتا ہے

ایک اور صاحب کہتے ہیں اگر تمہیں اپنے مستقبل یعنی آیندہ زندگی کا خیال ہے تو وقت کی قدر کرو۔ کیونکہ گزرا ہوا وقت پھر ہاتھ نہیں آسکتا اور کل کا پتہ نہیں کہ کیا پردہ غیب سے رونما ہونے والا ہے۔ گویا جو کچھ ہے موجودہ وقت ہی ہے۔ اگر اسوقت سے فائدہ نہ اُٹھایا تو سمجھ لو کہ سراسر نقصان پایا کسی عقلمند کا قول ہے ہمیں ماضی کی پروا نہیں کرنی چاہیے مستقبل کے لئے پریشان ہونا عقلمندوں کا شیوہ نہیں۔ بس اتنا ہی سمجھنا کافی ہے کہ آج کا ایک اور کل کے دو برابر ہیں ؞

ایک وقت کے قدر دان کا نظریۂ وقت اس سے بھی زیادہ

پُر لطف ہے وہ کہتے ہیں "یہ تو ہر شخص تسلیم کرتا ہے کہ زندگی بہت تھوڑی ہے۔ لیکن اس بات پر بہت کم لوگ غور کرتے ہیں کہ اگر وقت کو ضایع کیا جائے تو وہ اور بھی تھوڑی رہ جاتی ہے"

اس سے بھی زیادہ زبردست ایک اور فلسفی کی رائے ہے وہ کہتا ہے اگر ہم وقت پر حاوی نہ ہوں تو وقت ہم پر غالب آجاتا ہے اور وہ اپنی رو میں ہم کو گھاس پھونس کی طرح بہائے جاتا ہے۔ یہ بات بالکل درست ہے۔ جو لوگ وقت کے ساتھ مرغ بادنما کی طرح اپنا رُخ بدلتے رہتے ہیں اور واقعات کے ہاتھوں کٹھ پُتلی کی طرح ناچتے ہیں۔ ان کی بے بسی اور بیکسی پر واقعی ہنسی آتی ہے اور ہر شخص ان پر لعن طعن کرتا ہے۔ ان کی اس کمزوری کا سبب یہی ہے کہ وہ وقت پر حاوی نہیں ہوتے بلکہ وقت ان پر حاوی ہو جاتا ہے۔ اِس لئے جدھر چاہتا ہے ان کو موڑ دیتا ہے۔ اور وہ اپنی بے بسی کے باعث سرمو جنبش نہیں کر سکتے ۔

وقت کی وقعت

حقیقت امر یہ ہے کہ حضرت انسان وقت کی قدر کبھی نہیں جانتے لیکن جب وقت گزر جاتا ہے تو اسوقت ضرور محسوس کرتے ہیں کہ ہم نے کیسی انمول اور بیش بہا چیز غفلت میں ضایع کر دی۔ مگر پھر پچھتانے سے کیا ہوتا ہے۔ کتنی عجیب بات ہے کہ ہم سب کچھ سمجھتے ہیں۔ دن رات اَن گنت عبرتناک مثالیں ہماری آنکھوں کے سامنے رہتی ہیں ہم دوسروں کو بڑے

بُوڑھوں کی طرح نصیحتیں کرتے ہیں لیکن اپنے گریبان میں مُنہ ڈال کر نہیں دیکھتے کہ ہم اپنے عزیز وقت یا پیاری زندگی پر کس بیدردی اور بیرحمی کے ساتھ کُند چُھری چلاتے ہیں ۰

پابندیٔ وقت تضیع اوقات سے بچاتی ہے ۰

عموماً ہم لوگ اپنی زندگی کا بیشتر حصّہ لغو اور بیہودہ باتوں میں بغیر محسوس کیئے ضایع کر دیتے ہیں۔ اور اس کے ساتھ ساتھ اپنے عزیزوں اور دوستوں کے اوقات بھی تلخ کرتے ہیں۔ اگر کوئی شخص یہ کوشش کرے کہ اپنے اوقات کو منضبط کرلے یا اپنی روزانہ کی مصروفیتوں کا ایک ٹائم ٹیبل بنا کر سامنے رکھ لے اور ان پر عمل کرنے کی کوشش کرے تو کہتے ہیں لیجیئے صاحب یہ تو مشین بن گئے۔ ہر کام کو مخصوص وقت پر انجام دیتے ہیں۔ کھانا پینا سونا جاگنا، پڑھنا لکھنا، ملنا جُلنا، کھیلنا کودنا غرض ہر کام مشین کی طرح منضبط ہے۔ ہم ان سے ملنے جُلنے سے بھی رہے۔ پہلے تو جب فرصت ہوتی تھی انکے پاس جا بیٹھتے تھے اور گھنٹوں باتیں رہتی تھیں۔ اب جس وقت جاؤ مصروف ہیں۔ کوئی نہ کوئی کام کر رہے ہیں۔ اچھا ٹائم ٹیبل بنا ہے کہ دوستوں سے ملنے کی بھی فرصت نہیں۔ نئی تعلیم نے مروّت ہی باقی نہیں رکھی۔ صاحب لوگ بن گئے ہیں۔ صاحب! صاف بات یہ ہے کہ ہمیں ملنے کے قابل نہیں سمجھتے۔ دو لفظ انگریزی کے بولنے کیا آتے ہیں کہ آپے سے باہر ہو گئے ہیں ۰

یہ خیالات ان لوگوں کے ہیں جو وقت کی قدر نہیں کرتے۔ نہ ان کو اپنا وقت عزیز ہے نہ دوسروں کا۔ اصل میں ان کا منشا یہ ہے کہ جس طرح وہ خود اپنے اوقات کی تضیع کرتے ہیں اسی طرح دوسرے بھی ان کا ساتھ دیں۔ ذرا غور کرو ایسے حضرات کہاں تک حق بجانب ہیں اور یہ کیونکر ممکن ہو سکتا ہے کہ کسی وقت میں تو اپنے کام میں مصروف ہوں اور میرے دوست صاحب کا دل گھبرایا وہ بے تکان اُٹھے اور سیدھے آکر انہوں نے میرا دروازہ کھٹکھٹایا۔ اب میں مجبور ہوں یا تو اپنا کام چھوڑ دوں یا ان کو کورا جواب دیدوں کہ اس وقت مجھے فرصت نہیں مہربانی فرماکر معاف فرمائیے اور کسی اور دوست کو تلاش کیجئے۔ یہ آسانیاں تو اسی وقت حاصل ہو سکتی ہیں۔ جب میرے اور میرے دوستوں کے اوقات بھی میری طرح منضبط ہوں۔ مجھے معلوم ہو کہ وہ کب فارغ ہونگے اور ان کو علم ہو کہ مجھے کس وقت فرصت ہوگی۔ ورنہ یقیناً ایک دوسرے کا وقت ضائع ہوگا۔ اور طرفین میں سے کوئی بھی دلجمعی سے کام نہ کرسکیگا کیونکہ کیا پتہ، کون صاحب کس وقت آن دھمکیں۔ اور ضروری سے ضروری کام کا سلسلہ ایک دم منقطع ہو جائے +

فطرت بھی پابند اوقات ہے

کتنا غلط خیال ہے کہ باقاعدگی اور انضباط سے انسان مشین بن جاتا ہے۔ تجربے سے ثابت ہے کہ باقاعدگی کام کے بوجھ کو ہلکا اور زندگی کو پُرلطف بناتی ہے۔ چونکہ قدرت کے

تمام کام وقت پر انجام پاتے اور اہل دُنیا کی راحت کا موجب ہوتے ہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ ہمارے اوقات بھی منضبط ہوں تاکہ ہم دوسرے لوگوں کی تکلیف کا باعث نہ بنیں۔ سوچنے کی بات ہے۔ اگر سورج ایک دن بجائے مشرق کے مغرب سے نکلے۔ دوسرے دن کسی اور طرف سے طلوع ہو یا کئی کئی دن تک دکھائی نہ دے تو دُنیا کی کیا حالت ہو۔ اگر موسم کی تبدیلی میں باقاعدگی نہ ہو تو ہم لوگوں کی زندگی پر اس کا کیا اثر پڑے۔ اگر بوئے ہوئے بیج ایک ساتھ نہ بڑھیں تو ہم لوگ کیا کریں۔ ان تمام باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ پابندیٔ وقت عین منشائے فطرت ہے۔ اس لئے ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنی زندگی کو اصول فطرت کے مطابق بسر کر کے اپنے اور اپنے متعلقین کے لئے باعث راحت بنیں۔ اور اس خیال کو اپنے پاس بھی نہ پھٹکنے دیں کہ پابندیٔ اوقات انسان کو مشین بنا دیتی ہے۔ اور اس سے زندگی بے مزہ ہو جاتی ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم فطرت کے قدم بقدم چلیں اور ہمیشہ فطرتی اصولوں کو سامنے رکھیں۔ نیز اپنی زندگی کو فطرتی زندگی بنانے کی کوشش کریں کیونکہ ہم فطرت کی فیاضیوں کے لطف فطرت کے ہمنوا اور ہم خیال ہو کر ہی اُٹھا سکتے ہیں جب فطرت کے تمام کاروبار مقررہ اوقات پر انجام پاتے ہیں تو پھر کیا وجہ ہے کہ ہم پابندیٔ وقت کو خلاف فطرت قرار دیں۔ اور ان لوگوں کو

بیوجہ مطعون کریں جو پابندئ وقت کو ہمیشہ ملحوظ رکھتے ہیں اور بعض مصروف اوقات ہیں ان حضرات سے ملنا گوارا نہیں کرتے جو وقت بے وقت ان کے اوقات پر بیجا تصرف کرنا چاہتے ہیں ۔

والدین کی تربیت کا اثر

اس بات کو ہر ذی عقل انسان تسلیم کرتا ہے کہ والدین کی عادتیں اور اخلاق اولاد پر پوری طرح اثر انداز ہوتے ہیں اور مرتے دم تک ان کے نقوش مٹائے نہیں مٹتے۔ ایک مشہور مقولہ ہے کہ اگر کوئی شخص تم سے یہ کہے کہ فلاں شخص نے اپنی کوئی عادت چھوڑ دی تو تم کبھی یقین نہ کرو اور برخلاف اس کے اگر تمہیں یہ تبلایا جائے کہ کوئی بہت بڑا پہاڑ اپنی جگہ سے ہٹا دیا گیا تو تم بلاتامل مان لو۔ بعینہ یہی حالت والدین کی تربیت کی ہے۔ جو باتیں بچوں کی گھٹی میں پڑ جاتی ہیں وہ فطرت ثانیہ بن جاتی ہیں اور کسی عنوان تبدیل نہیں ہوتیں۔ پابندئ وقت کی عادت اگر والدین میں موجود ہو اور اس پر وہ پوری طرح عامل ہوں تو اس کا عکس اولاد پر بھی ضرور پڑتا ہے۔ کتنے افسوس کی بات ہے جن لوگوں کی گود اور سائے میں بچے تربیت حاصل کرتے ہیں۔ ان کو خود وقت کی اہمیت اور پابندی کا احساس نہیں ہوتا۔ اس لئے بچوں کی زندگی شروع سے لے کر آخر تک غیر منضبط رہتی ہے۔ اگر بچہ کو پیدا ہوتے ہی پابندئ وقت کا عادی بنایا جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ مدت العمر پابندئ وقت کا خیال نہ رکھے اور اس طرح سے

نسل در نسل پابندئ وقت کی عادت مستحکم نہ ہوتی چلی جائے۔ اور ترقی کرتے کرتے وہ قومی امتیاز کا درجہ حاصل نہ کرلے۔

یہ تسلیم کرلینے کے بعد کہ پابند اوقات بنانا ماں اور باپ کے فرائض میں داخل ہے۔ یہ بھی ماننا پڑیگا کہ غیر تعلیم یافتہ ماں باپ وقت کی قدر کا احساس پیدا نہیں کرسکتے یا اگر کرسکتے ہیں تو کم از کم اتنا نہیں جتنا پڑھے لکھے والدین۔ جو گھرانے تعلیم و تربیت کے ابتدائی اصولوں سے ناواقف ہوتے ہیں ان کے بچے ہمیشہ رینگتے ہیں۔ آئے دن کے بیمار روز کسی نہ کسی بیماری کی مصیبت میں مبتلا۔ ایک بچہ سے سارے گھر کا انتظام درہم برہم اور والدین کی زندگی اجیرن۔ امور خانہ داری کی نگہداشت اور ہر روز کے فرائض کی انجام دہی مجبور کرتی ہے کہ کچھ دوسرے وسائل اختیار کیئے جائیں جن کی بدولت بچوں سے فرصت ملے۔ چنانچہ بعض ظالم مائیں اکثر ایسے مذموم طریقے اختیار کرتی ہیں جن سے بچوں کی عادتیں خراب اور صحت زیادہ کمزور ہوجاتی ہے۔ مثلاً جہاں بچہ رویا جھٹ سے دودھ اس کے منہ میں ٹھونسا۔ چاہے بچے کا رونا پیٹ کے درد ہی کی وجہ سے کیوں نہ ہو۔ لیکن اس کو دیا جاتا ہے دودھ ہی۔ ابھی دودھ کی مدت ختم نہیں ہونے پاتی کہ دودھ کی جگہ روٹی کا ٹکڑا لے لیتا ہے۔ بچے کے ہاتھ میں روٹی کا ٹکڑا ہے اور ماں مزے سے اپنے فرائض انجام دیتی پھرتی ہے یہ بھی سننے میں آیا ہے کہ جو بچے طبعاً کچھ زیادہ ضدی

ہوتے ہیں اور ان کی مائیں بے پڑھی لکھی۔ تو وہ اکثر ان کو افیون کی عادت ڈال دیتی ہیں۔ افیون جیسی خطرناک چیز کے تباہ کن اثرات کا اندازہ کئے بغیر کئی کئی سال تک افیون نوشی کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ جو بچوں کی دماغی اور جسمانی قوتوں کو بالکل فنا کر کے ان کو کُند ذہن غبی سُست اور کاہل بنا دیتا ہے۔ ایک پڑھی لکھی ماں بچوں کو خاموش کرنے کے لئے افیون جیسی خطرناک چیز کبھی استعمال نہیں کرتی بلکہ وہ ان کے انہماک کے لئے ایسے مشغلے مہیا کرتی ہے۔ جن میں بچے خوشی خوشی مصروف رہتے ہیں اور اس کو اپنے فرائض کی انجام دہی کے لئے کافی وقت مل جاتا ہے۔

خیر بچپن کا زمانہ جُوں تُوں کر کے ہزار دقتوں سے گزُر جاتا ہے۔ پھر پڑھنے لکھنے کا وقت آتا ہے۔ وہ بچے جو اپنے والدین سے پابندی وقت کی عادت نہیں سیکھتے۔ اکثر مدرسوں کی پابندی سے بیزار ہو جاتے ہیں۔ اور مدرسے کے خوف سے چھپتے پھرتے ہیں۔ اگر شروع ہی سے ان کے لئے ایک باقاعدہ پروگرام بنا دیا جاتا۔ نیز کھانے پینے اور کھیل کود کے اوقات مقرر ہوتے تو یہ دقتیں پیش نہ آتیں بلکہ ہر کام اپنے وقت پر باقاعدگی اور عمدگی سے انجام پاتا رہتا۔ لیکن ہمارے گھروں کی حالت تو یہ ہے کہ جب بچے مدرسے سے واپس آتے ہیں تو ان کو رنگروٹوں کی طرح چھوڑ دیا جاتا ہے اگر وہ خود کسی پروگرام پر باقاعدگی سے عمل کریں۔ تو بجائے اسکے

کہ اس پر خوشنودی کا اظہار اور ان کو کاربند رہنے کی تاکید کی جائے
اُلٹا ان کے پروگرام کو توڑنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اور کہا جاتا
ہے کہ اتنی محنت بھی ٹھیک نہیں صحت خراب ہو جائیگی آنکھیں کمزور
ہو جائینگی۔ بچے فطرتاً کھیل کود کے شوقین اور بے راہ روی کے دلدادہ
ہوتے ہیں۔ اس لئے پوری طرح ان جملوں کا فایدہ اُٹھاتے ہیں۔ اور
آگے چل کر کام چور اور کھلنڈرے بن جاتے ہیں۔ جب امتحان سر پر
آجاتا ہے تو ہوش آتا ہے۔ اب سر پکڑ کر بیٹھ جاتے ہیں۔ جو عقلمند
ہوتے ہیں کسی نہ کسی طرح اپنی کمی پوری کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔
دن رات ایک کر دیتے ہیں نہ صحت کا خیال رہتا ہے۔ اور نہ کھیل کود
کا۔ بس کتابیں ہیں اور وہ ہیں۔ اگر شروع ہی سے باقاعدہ پڑھا
جاتا تو امتحان کا خوف ان کے چہروں کو زرد۔ اعضا کو ڈھیلا اور
دل کو غیر مطمئن نہ کرتا۔ اور وہ ہنستے کھیلتے امتحان میں شریک ہوتے
اور کامیاب ہو کر نکلتے۔ یہی بچے جب بڑے ہو کر خود مختارانہ زندگی
میں قدم رکھتے ہیں تو اسوقت بھی وہ وقت کی قدر قیمت کو نہیں
پہچانتے اور اپنے فرائض کو آج سے کل۔ کل سے پرسوں اور پرسوں
سے برسوں پر ٹالتے چلے جاتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کی زندگی کا
بیشتر حصہ پریشانیوں میں گزرتا ہے اور ان کی کامیابیاں ان کے
ارادوں کی طرح ہمیشہ مشکوک رہتی ہیں برخلاف اس کے جو لوگ
آنے والے وقت اور مہموں کی شروع ہی سے باقاعدہ تیاری کرتے

ہیں۔ وہ ہمیشہ مطمئن رہتے ہیں اور ان کو اپنی کامیابی کا ایک اور ایک دو کی طرح یقین ہوتا ہے۔ زندگی کے امتحانات انکے دل کو کبھی بےچین اور پریشان نہیں کرتے، وہ نتائج کو خدا کے سپرد کرکے اپنی کوششیں متواتر اور مسلسل جاری رکھتے ہیں ٭

تعلیم کا اثر

خانگی تربیت کے بعد بچوں پر ان کے اساتذہ اور تعلیمی اداروں کا اثر پڑنا شروع ہوتا ہے۔ یہ بات ماننی پڑیگی کہ اساتذہ سے زیادہ والدین کی تربیت بچوں پر اثر انداز ہوتی ہے کیونکہ درسگاہوں میں اُستادوں کی زیر نگرانی بچے زیادہ سے زیادہ پانچ چھ گھنٹے رہتے ہیں اور باقی وقت والدین کی سرپرستی میں صرف کرتے ہیں اس لئے والدین ہی بچوں کی تربیت کے زیادہ تر ذمہ وار قرار دیئے جا سکتے ہیں اور حقیقت بھی یہی ہے کہ بچے اپنے والدین کا چربہ ہوتے ہیں۔ اگر والدین کی زندگی بااصول ہو تو بچے بےاصول ہرگز نہیں اُٹھتے۔ اگر والدین پابندیٔ اوقات کا خیال رکھنے والے ہوں تو ان کے بچے بھی پابند اوقات ہوتے ہیں پھر مدرسوں کی تعلیم ان پر ایسا ہی اثر کرتی ہے جس طرح سونے پر سوہاگہ ٭

جن مدارس میں تقسیم اوقات کے ساتھ انضباط اوقات کا خاص طور پر خیال رکھا جاتا ہے ان کے طلباء زیادہ پابند اوقات ہوتے ہیں اس پر اگر والدین اساتذہ کے ساتھ تعاون کریں تو کوئی وجہ نہیں کہ بچوں پر ان کی نگہداری کا خاطر خواہ اثر نہ پڑے

مگر فطرتاً بچے پابندی شکن ہوتے ہیں اور بے راہ روی ان کو مرغوب ہوتی ہے اس لئے والدین کی کمزوری اور ان کی بیجا شفقت کا وہ ہمیشہ ناجائز فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ والدین نے ذرا ڈھیل دی بس پھر ان کا کوئی ٹھکانہ نہیں۔ اگر کھیل میں لگ گئے تو کھیل ہی کے ہو رہے اگر سیر سپاٹے کی ٹھانی تو دن دن بھر غائب۔ نہ پڑھنے کا خیال نہ کھانے پینے کا ہوش۔ غرض ان کے تمام کام غیر منضبط رہتے ہیں اگر مدرسے کا سا نظم گھروں میں بھی قائم رہے تو انضباط طبیعتوں میں راسخ ہو جائے اور بچوں کی زندگی ایسی باقاعدگی اختیار کر لے کہ غیر منضبط ہونا طبیعتوں پر ناگوار گزرے اور انضباط کا سلسلہ مدت العمر قائم رہے۔

یورپ میں پابندئ اوقات کی شروع ہی سے عادت ڈالی جاتی ہے۔ گویا پیدائش کے بعد سے اسوقت تک جبکہ بچے تعلیم سے فارغ ہو کر خود مختار نہیں بن جاتے ان کو اس عادت سے منحرف نہیں ہونے دیا جاتا۔ اس قسم کی تربیت سے بچوں کی عادات اسقدر مستحکم اور باقاعدہ ہو جاتی ہیں کہ وہ عمر بھر باقاعدگی کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ یورپ میں ایسے مدرسے بکثرت موجود ہیں جن میں ہوش سنبھالتے ہی بچوں کو داخل کر دیا جاتا ہے۔ اور گھر کی زندگی سے ان کا کوئی تعلق باقی نہیں رہتا۔ دن رات وہیں رہتے ہیں۔ اور اپنے روزانہ کے پروگرام سے انچ بھر ادھر ادھر نہیں ہو سکتے۔ ہمارے

مُلک میں اوّل تو ایسے مدارس ہی نہیں ہیں۔ اور اگر ہیں تو بہت کم۔ دہلی میں ایک مدرسہ موجود ہے جس میں لڑکے صبح آٹھ بجے حاضر ہوتے ہیں۔ اور رات کے آٹھ بجے واپس آتے ہیں ظاہر ہے ایسے مدرسوں کے اخراجات ناقابل برداشت ہیں۔ اس لئے فقط دولتمند لوگوں کی اولاد ہی ان سے مستفید ہو سکتی ہے۔ اگر ایسے مدارس کے اخراجات کم کر دیئے جائیں اور اوسط درجے کے لوگوں کی اولاد کو ان سے فائدہ اُٹھانے کا موقعہ دیا جائے تو اس قسم کے مدارس سے ملک میں تعلیم کا صحیح مذاق اور پابند اوقات بننے کی عادات نہایت آسانی سے پیدا ہو سکتی ہیں۔

بچّوں کو پابندی وقت سکھانے کے لئے بعض ادارے خاص طور پر اچھا انتظام کرتے ہیں مثلاً یہ تو عام مدرسوں کا قاعدہ ہے کہ اگر کوئی طالب علم دیر میں آئے تو حاضری کے رجسٹر میں اسکی غیر حاضری لگا دی جاتی ہے۔ بعض سکولوں میں غیر حاضری کے جُرمانے کے علاوہ کچھ اور سزا بھی دی جاتی ہے۔ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ جُرمانے کا اثر والدین کی جیب پر پڑتا ہے۔ لیکن اس طریق کار سے ان کی توجہ اپنے بچّے کی بے ضابطگی اور بے قاعدگی کی طرف ضرور منعطف ہو جاتی ہے۔ بعض اچھے مدرسوں میں سَو فیصدی حاضریاں دکھانے والوں کو سال کے آخر میں کچھ انعام بھی ملتا ہے۔ اور ہر مہینے کے آخر میں جس جماعت کی حاضریاں سب جماعتوں سے زیادہ ہوتی

ہیں اسے ایک دن کی چھٹی دیدی جاتی ہے۔ اس قسم کی ترکیبوں سے عام طلبا پابندئ وقت کا خیال رکھنے لگتے ہیں۔ نیز جن طلبا کی غیر حاضری کی بدولت پوری جماعت چھٹی سے محروم رہ جاتی ہے۔ ان کے ہم جماعت ان پر ملامت کر کے ان کو زبردستی پابند اوقات بنانے کی کوشش کرتے ہیں ۔

ہوسٹل کی تربیت ہمارے ملک میں ہر معقول مدرسے کے ساتھ دار الاقامت بھی ہوتا ہے۔ لیکن اس کو پردیسیوں اور بے گھروں کی جائے قیام تصوّر کیا جاتا ہے۔ والدین پدری شفقت کے جوش میں اولاد کو اپنے سے علیحدہ کرنا گوارا نہیں کرتے۔ اور دار الاقامت کی باقاعدہ اور منظم تربیت سے اپنی اولاد کو محروم رکھتے ہیں۔ ہم لوگوں کو گھر کے ہوتے ہوئے بورڈنگ ہاؤس اور ہوسٹل میں رہنا ایک عجیب سی بات معلوم ہوتی ہے۔ عام طور پر لوگوں کا خیال ہے کہ ہوسٹل کی تربیت طلبا کو رنگروٹ اور بیفکرا بنا دیتی ہے۔ اس لئے ہم لوگ اسوقت بچّوں کو ہوسٹل میں داخل کرتے ہیں جب گھر میں رہنے کا کوئی خاطر خواہ یا تسلّی بخش انتظام نہ ہو سکے یا کوئی ایسی مجبوری آن پڑے جس کا کوئی اور علاج نہ ہو سکتا ہو۔ برخلاف ان خیالات کے ماہرین تعلیم کا متفقہ فیصلہ یہ ہے کہ تعلیم کا حقیقی مقصد اسی وقت پورا ہو سکتا ہے جب طالب علم خالص علمی ماحول میں رہے۔ ہوسٹل کی زندگی اس مقصد کو بطریق احسن پورا کرتی ہے۔ کیونکہ وہاں کی فضا میں ہر وقت

علمی کیفیت طاری رہتی ہے اور ہر کام بغیر قصور کے وقت پر انجام پاتا ہے۔ جو طلبا ہوسٹل کے قوانین کی پابندی نہیں کرتے تکلیف اٹھاتے ہیں آخر کار وہ خود بخود راہ راست پر آجاتے ہیں۔ اور مجبور ہو جاتے ہیں کہ ہوسٹل کی پُرنظم زندگی میں توازن کو قائم رکھیں۔ وقت پر کھانا وقت پر کھیلنا غرض پڑھنا لکھنا پھرنا چلنا اُٹھنا بیٹھنا گویا ہر کام اوقات کا پابند ہو جاتا ہے۔ یہ ایسی باتیں ہیں جو گھر پر میسّر نہیں۔ طلباء کے لئے گھروں کا ماحول زہر قاتل ہے۔ پڑھنے کو جی چاہتا ہے لیکن بچے شور مچا رہے ہیں۔ خیالات کو مجتمع کر کے مطالعہ کرنے بیٹھے کہ ادھر سے آواز آئی فلاں چیز نہیں ہے ذرا لپک کر بازار سے لانا۔ مدرسے کا کام دلجمعی اور انہماک سے کر رہے ہیں کہ کوئی بن بلائے مہمان آدھمکے۔ مروّت اور شرم نے مجبور کر دیا کہ ان سے باتیں کریں۔ بس ہوسٹل میں رہ کر یہی باتیں نہیں ہوتیں۔ جو والدین ان خصوصیات کو جانتے ہیں وہ ہوسٹل کی زندگی کو گھر کی زندگی پر ضرور ترجیح دیتے ہیں اور اپنے بچوں کی اصلاح اور ان کے اوقات کو منضبط کرنے کے لئے ہوسٹل میں داخل کر دیتے ہیں۔ دیکھنے میں آیا ہے اور تجربے سے ثابت ہے۔ کہ جو لوگ شروع میں باقاعدہ اور منظم زندگی بسر کرنے کے عادی ہو جاتے ہیں وہ مدت العمر اوقات کی پابندی کا خیال رکھتے ہیں اور حق یہ ہے کہ بڑے مزے کی زندگی بسر کرتے ہیں ۔۔

پابنداوقات نہ ہونے کے تلخ نتائج

پابنداوقات نہ ہونے کے تلخ نتائج

سے کم و بیش ہر شخص واقف ہے۔ مگر ان لوگوں کو اس کا کچھ زیادہ تجربہ ہے جو خود تو پابند اوقات ہیں لیکن ان کا ماحول بے ضابطہ اور بیقاعدہ ہے۔ جو لوگ اپنے اوقات کی قدر نہیں کرتے بھلا وہ دوسرے کے وقت کی کیا قدر کرینگے۔ ایسے لوگ خود بھی تکلیف اُٹھاتے ہیں اور دوسروں کو بھی تکلیف پہنچاتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ عدم تعلیم اور خاص طور پر تعلیم نسواں کے فقدان کی وجہ سے ہم لوگوں میں پابندی وقت کا احساس بہت ہی کم ہے۔ اکثر بیاہ شادیوں اور دعوتوں کے موقعہ پر جسقدر بے ضابطگی کا مظاہرہ ہوتا ہے وہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ ایک شخص کے انتظار میں سینکڑوں آدمی معطل بیٹھے رہتے ہیں۔ باوجود انتہائی تاکید کے سمجھا یہی جاتا ہے کہ مجوزہ پروگرام کئی گھنٹے دیر سے شروع ہوگا اس لئے جتنی دیر میں جائیں اچھا ہے۔ اگر ایسے مواقع پر شدت کے ساتھ وقت کی پابندی کی جائے اور دیر میں آنے والوں کا انتظار نہ کیا جائے تو ان کو اچھا خاصہ سبق دیا جا سکتا ہے۔

اس میں کلام نہیں اچھی بُری عادتیں سبھی میں ہوتی ہیں۔ لیکن ایسی بُری عادتیں تو بہت ہی بُری ہیں جن کا اثر دوسروں پر پڑتا ہے۔ چنانچہ پابندئ وقت کا خیال نہ رکھنے کی عادت بھی ان بہت ہی بُری عادتوں میں سے ہے۔ کیونکہ اس کا اثر اپنی ذات پر بھی

اچھا نہیں پڑتا اور دوسروں کو بھی اس سے خواہ مخواہ تکلیف پہنچتی ہے۔ ہم لوگوں میں یہ تو بہت ہی معمولی سی بات ہے کہ وعدہ بلا تامل کر لیتے ہیں لیکن اس کے ایفاء کا خیال تک نہیں کرتے، ہمیں شک نہیں کہ وعدہ خلافی سے ایک غیر حساس شخص کی اپنی ذات کو کوئی تکلیف نہیں پہنچتی لیکن جو شخص کسی کے الفاظ پر بھروسہ کرتا ہے اسکی کوفت کا اندازہ کچھ وہی کر سکتا ہے جس کو اس قسم کا کوئی مرد بیدار چرکا لگا ہو۔ ایسے موقعہ پر اگر شکایت کی جائے تو شرمندگی کا اظہار کر کے یہی کہا جاتا ہے یاد نہیں رہا یا ایک اور ضروری کام آپڑا ایسے معاف کر دیجئے" "بہت ہی افسوس ہے" زمانۂ حال میں یہ وفقرے اس کثرت سے مستعمل ہیں کہ ان میں کوئی معنی ہی باقی نہیں رہے۔ اور لطف یہ ہے کہ بڑے سے بڑے قصور کی تلافی سمجھے جاتے ہیں۔ اگر ہم لوگ ان الفاظ کی اہمیت پر غور کریں اور ان کے اصلی مفہوم کو سمجھتے ہوئے استعمال کریں تو ان فقروں کو استعمال کرنے کے مواقع کم سے کم پیش آئیں بہرحال اگر ہم اپنے وقت کی قدر نہیں کرتے اور سوء اتفاق سے پابندیٔ وقت کو کوئی اہمیت نہیں دیتے تو کچھ مضایقہ نہیں، لیکن کم از کم ہماری یہ کوشش تو ضرور ہونی چاہیئے کہ ہماری غیر پابندیٔ اوقات سے ہمارے عزیز ونکلے وقات تلخ نہ ہوں، گویا ہماری اس بُری عادت کے اثرات ہم تک ہی محدود رہیں۔ ممکن ہو سکتا ہے کہ اخلاقی کوشش ہی سے یہ بُری عادت دُور ہو جائے اور ہم اچھے خاصے پابند اوقات ہو جائیں۔

سینما

فلم سازی

مشکل سے انیس بیس سال کا عرصہ ہوُا کہ فلم سازی کی صنعت یورپ سے ہندوستان میں آئی، تھوڑی سی مدت میں اس صنعت نے اس سُرعت سے ترقی کی کہ لاتعداد فلم ساز کمپنیاں ہمارے ملک میں جاری ہو گئیں ان کمپنیوں نے نہ صرف بیکاروں اور بیروزگاروں کے لئے روزگار مہیا کیا بلکہ وہ ملکی سرمایہ کو اپنے ہی ملک میں استعمال کرنے کا مستقل ذریعہ بن گئیں۔ فلم سازی کی صنعت سے جہاں ملک کو فائدے پہنچے وہاں ناتجربہ کار اور نااہل کارکنوں کی بدولت شدید مالی نقصانات بھی اُٹھانے پڑے کیونکہ ہر کس وناکس ذراسے تجربہ کی بناء پر اپنے آپ کو فلم سازی کا ماہر سمجھ بیٹھا اور چند احباب کو جمع کر کے ایک فلم کمپنی کی بنیاد ڈال دی۔ فلم کمپنیونکے حالات کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بیشتر کمپنیاں کام شروع کرنے سے پہلے اور بعض پہلا فلم تیار کرنے کے دَوران میں دیوالیہ ہو جاتی ہیں، اکثر منتظمین بہت تیر مارتے ہیں تو ایک آدھ فلم تیار کر کے حصّے داروں کو ہاتھ جھاڑ کر دکھا دیتے ہیں، غرض ایسی کمپنیاں معدودے چند ہیں جن کو ایک سے

دوسرا فلم تیار کرنے کا موقعہ ملتا ہے۔ لیکن لطف یہ ہے کہ ان کوتاہیوں اور بے اعتدالیوں کے باوجود صنعت فلم سازی تابناک ماضی اور درخشندہ مستقبل کی مالک ہے اور امید کی جاتی ہے کہ یہ بیل ضرور منڈھے چڑھ کر رہے گی ؛

سینما کی مقبولیت کے اسباب عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ صنعت فلم سازی کی کامیابی کا راز اس کی تفریحی خصوصیات میں مضمر ہے اور اگر کسی سے دریافت کیا جائے کہ آپ سینما دیکھنا کیوں پسند کرتے ہیں تو بیساختہ یہی جواب ملیگا کہ سینما تفریح کا بہترین ذریعہ ہے۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ سینما دیکھنے سے یہ لطف اور تفریح کیوں حاصل ہوتی ہے، ایک مزدور جو دن بھر محنت کرتا ہے، یا وہ لوگ جو تمام دن دماغی کام کرنے کے عادی ہیں، شام کے وقت اپنی پریشانی اور خستگی کو دور کرنے کے لئے سینما ہالوں کی طرف جاتے ہوئے کیوں نظر آتے ہیں، اور زن و مرد بچے اور بوڑھے سینما کے اس قدر کیوں دلدادہ ہیں ؛

فلسفیانہ زاویۂ نظر سے اس عقدہ کی تشریح یہ ہے کہ انسان کو نقل و تقلید کرنے میں ایک خاص قسم کا لطف حاصل ہوتا ہے، اس لئے وہ جس چیز سے متاثر ہوتا ہے اس کی خود بخود نقل کرنے لگتا ہے۔ اور اگر کسی مجبوری کی وجہ سے وہ خود اس کی نقل نہیں کرسکتا، تو دوسروں کو نقالی کرتے ہوئے دیکھ کر خوش ہوجاتا ہے

سچ پوچھئے تو انسان کی ترقی کا دارومدار اسی تقلیدی مادہ پر ہے، اگر اس کی طبیعت میں سے اس قوت کو نکال ڈالا جائے تو انسان اور حیوان میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا، ڈرامہ نگار اور فلم کار انسان کی اسی خصوصیت سے فائدہ اُٹھا کر ان باتوں کو یکجا کرنے کی کوشش کرتے ہیں جن کی نقالی سے ہر انسان کا دل متاثر ہو سکتا ہے ؛

اس کے علاوہ انسان کی طبیعت میں ایک اور ایسا مادہ موجود ہے جس کی بدولت بعض مخصوص حالات میں اس پر خود فراموشی اور نیم بیہوشی کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ عام طور پر کسی افسانے کو پڑھنے یا فلم کو دیکھنے میں اکثر یہ کیفیت ہم پر طاری ہوا کرتی ہے، اس مخصوص کیفیت کے طاری ہونے کا سبب یہ ہے کہ ہم افسانے یا تصویر کے کسی خاص کردار کے ساتھ شخصی مطابقت یا ذاتی یکسانیت پیدا کر کے یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ ہم بذات خود اس کردار کے فرائض منصبی انجام دے رہے ہیں، اس لئے جب وہ ہنستا ہے تو ہم ہنستے ہیں۔ وہ روتا ہے تو ہم بھی رو دیتے ہیں، غرض اس کی ہر حرکت کے ساتھ ہماری رگ و پے میں بھی جنبش اور حرکت پیدا ہوتی ہے ؛

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ میں بندر بندریا کا تماشہ دیکھ رہا تھا، میرے برابر ایک لڑکا بھی کھڑا تھا، وہ بندر کے تماشے میں اس قدر محو ہوا کہ اپنے آپ کو بھول گیا اور اس محویت کے عالم میں اسنے بندر سے ذاتی مطابقت پیدا کر لی، اتفاق سے بندر نے بندریا کو

کاٹا اور اس لڑکے نے عالم محویت میں بے تکلف میرے بازو پر کاٹ لیا ''

ناولوں کو پڑھنے اور فلموں کو دیکھنے سے اور قسم کی خوشیاں بھی ہوتی ہیں، لیکن کسی کردار سے ذاتی یکسانیت اور شخصی مطابقت پیدا کر لینے میں جتنی زیادہ مسرت حاصل ہوتی ہے اس کے مقابلے میں اور قسم کی خوشیاں اور کیفیتیں کوئی وقعت نہیں رکھتیں، اکثر اوقات سُننے میں آتا ہے کہ فلاں فلم کو دیکھ کر یا اس افسانے کو شروع کر کے ہم ایسے محو ہوئے کہ اپنے آپ کو بھُول گئے، دیکھنا یہ ہے کہ آخر اس قسم کی محویت یا استغراق پیدا ہونے کا اصلی سبب کیا ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ ہماری بیشتر آرزوئیں اور خواہشیں عملی زندگی میں بعض مجبوریوں اور پابندیوں کی وجہ سے پوری نہیں ہو سکتیں، اور اگر پوری ہوتی ہیں تو اس طرح نہیں ہوتیں جس طرح ہمارا دل چاہتا ہے۔ اس لئے ان سے پوری خوشی نہیں ہوتی۔ جب ہمارے یہ دبے ہوئے ارمان اور نیم بسمل آرزوئیں کسی افسانے یا پردے پر پورے ہوتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں، تو ہم ان کو دیکھ کر بیحد مسرور ہوتے ہیں، اور سرور انبساط میں اس مخصوص کردار سے خیالی ہم آہنگی اور ذاتی مطابقت پیدا کر کے من و تو کے فرق کو بھُول جاتے ہیں، گویا ہم ایسا محسوس کرنے لگتے ہیں جیسے یہ ہماری ہی دیرینہ حسرتیں نکل رہی ہیں؛

اور ہم ہی فائز المرام ہو رہے ہیں ۔

حقیقتاً انسان کا دل لاتعداد حسرتوں اور بے قیاس آرزوؤں کا گہوارہ ہے اور عملی زندگی میں ان تمام دلی ارمانوں کا نکلنا امر محال ہے غالب ؂

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

تمام آرزوؤں کے پورا نہ ہونے کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ ہماری بیشتر آرزوئیں ایک دوسرے کی ضد ہوتی ہیں اگر ان میں سے ایک پوری ہوتی ہے تو دوسری کی حسرت لازماً اُٹھانی پڑتی ہے۔ فلاسفہ نے اس قسم کی متضاد آرزوؤں کو پورا کرنے کا حل یہ پیش کیا ہے کہ عملی زندگی میں ان آرزوؤں کو پورا کیا جائے جن کا حصول ممکنات سے ہے اور وہ آرزوئیں جن کی تکمیل عملی طور پر ممکن نہیں ان کے حصول کے لئے ایسے افسانوں اور ڈراموں سے مدد لی جائے جن میں فرضی کردار اس قسم کی مخصوص تمنائیں پوری کرتے ہیں ۔

فرض کیجئے ہم امن وسکون کے خواہشمند ہیں، اور اس کے ساتھ ہی ہمیں ولولہ خیز اور جوش انگیز زندگی کی بھی آرزو ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ دونوں حسرتیں متضاد ہیں، اس لئے عملی زندگی میں ان کا بیک وقت پورا ہونا محال ہے۔ فلاسفہ کی ترکیب کے مطابق ان دونوں حسرتوں کو نکالنے کا طریقہ یہ ہوگا کہ عملی زندگی میں ہم امن وسکون کی

آرزو کو پُورا کریں اور ناولوں اور فلموں کو دیکھ کر ہنگامہ خیزی کی بھڑاس نکالیں۔

مذاحیہ ڈراموں کی پسندیدگی کے اسباب پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ تعلیم و تربیت کا اثر، رائے عامہ کا دباؤ اور تہذیب و تمدن کی مجبوریاں ہمیں غیر فطری حد تک مودب اور مہذب بنا دیتی ہیں مگر ہماری فطری آزادی ان بندشوں کو پسند نہیں کرتی، اس لئے مجبور ہو کر ہمیں مذاحیہ ڈراموں کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔

اسی طرح جن لوگوں کے دلوں میں مہمات سر کرنے اور مشکل کام انجام دینے کی تمنّا ہوتی ہے۔ وہ روزانہ کی پُرسکون زندگی سے دلتنگ ہو کر مہماتی افسانوں کو بہت زیادہ دلچسپی اور شوق سے دیکھتے ہیں، بعض لوگ سماج میں چمکنے کے دلدادہ ہوتے ہیں لیکن حالات ان کو اپنی دلی آرزو پوری کرنے سے روکتے ہیں ایسے افراد ان فلموں اور ناولوں کو فخر انتخاب بخشتے ہیں جن میں سوسائٹی کے درخشندہ ستاروں کے کارنامے پیش کئے جاتے ہیں، اس کے علاوہ ہزاروں اور لاکھوں آدمی ایسے ہیں جن کو رومانی زندگی بسر کرنے کا شوق ہے مگر سماج کی پابندیاں اور تہذیب کی مجبوریاں ان کو عشق و محبت میں وارفتہ ہونے کی اجازت نہیں دیتیں، یہ لوگ ان فلموں سے دلبستگی رکھتے ہیں، جن میں حُسن و عشق کے ہنگامے دکھا کر نامرادی کی زندگی کو کامرانی اور شادمانی کی ابتدا پر ختم کیا جاتا

ہے۔ ڈراموں اور افسانوں وغیرہ کی پسندیدگی میں ایک نکتہ یہ بھی ہے کہ ہر شخص کی پسند اس کے دلی معاملات کی غمازی کرتی ہے۔ غالبؔ

کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

اخلاق وعادات پر اثر

چونکہ سینما دل و دماغ پر بہت گہرا اثر کرتا ہے اس لئے دیکھنے والوں کے اخلاق وعادات پر بھی اس کا عکس پڑنا ضروری ہے۔ اس کے علاوہ قدرت نے نقل و تقلید کا مادہ انسان کی طبیعت میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہے، وہ جس چیز کو پسند کرتا ہے خود بخود اس کی نقالی کرنے لگتا ہے۔ افسوس ہے کہ ہمارے فلم ساز انسان کی اس فطری خصوصیت سے پورا پورا فائدہ نہیں اٹھاتے بلکہ وہ عموماً سطحی دلچسپی اور ظاہری نظر فریبی ہی کو اپنا مقصد آخر سمجھ لیتے ہیں، اگر ہماری فلم کمپنیاں اصلاحی نقطۂ نظر سے فلم تیار کرنے کی کوشش کریں اور سنجیدہ مذاق اور برگزیدہ اخلاق کو نمایاں اہمیت دیں تو کوئی وجہ نہیں کہ فلموں سے اخلاقی فوائد مرتب نہ ہوں۔ اور ملک کی تہذیب کو اس سے حسب دلخواہ فائدہ نہ پہنچے۔

یورپ کی اکثر فلم ساز کمپنیاں ان عیوب سے پاک ہیں، وہ فلموں کی مدد سے اپنے ملک کی حالت کو بہتر بنانے کی کوششیں ہمیشہ جاری رکھتی ہیں، ان کے فلموں کو دیکھ کر نوجوانوں کے ارادے مضبوط اور ہمتیں بلند ہوتی ہیں، برخلاف اس کے ہماری

فلم کمپنیاں اخلاق کو پست اور جذبات رذیلہ کو بھڑکا کر شہرت حاصل کرنا چاہتی ہیں، ہمارے مُلک کے اکثر نوجوان جن سے مُلک و ملّت کی بڑی بڑی توقعات وابستہ ہیں مخرب الاخلاق تصاویر کی بدولت جرائم پیشہ اور اوباش بن گئے ہیں اور بہت سے باعزت خاندانوں کے دل اس صنعت کے فیض سے داغ داغ ہیں۔

سینما کے ان اثرات کو دیکھتے ہوئے پیشینگوئی کی جاسکتی ہے کہ ایک نہ ایک دن وہ زمانہ ضرور آئیگا۔ جب دُنیا کی طرز معاشرت اور اخلاق و عادات ایک جیسے ہو جائینگے۔ ممکن ہے قدامت پسند لوگ اس پیشینگوئی کو سُن کر کانپ اُٹھیں اور کہیں کہ ہائیں وہ دن قریب ہے جب پُرانی تہذیب بالکل فنا ہو جائیگی اور ننگ انسانیت کہلائیگی، انہیں یقین رکھنا چاہئے کہ اگر ان کی تہذیب واقعی قابل قدر ہے تو ہر نئی تہذیب سر جُھکا کر اس کے لئے جگہ خالی کر دے گی اور اگر وہ اس قابل نہیں تو ان کو اس کی ابھی سے فاتحہ پڑھ لینی چاہئے۔

بات یہ ہے پُرانی تہذیب کو سراہنا اور نئی تہذیب کو بُرا کہنا بڑے بُوڑھوں کی عادت میں شامل ہے، لیکن باوجود اس مخالفت کے دُنیا بہت تیز رفتاری سے آگے بڑھ رہی ہے، اور بڑھتی چلی جائیگی، آخر کار افراد عالم ایک تہذیب پر متفق ہو جائینگے اور سینما کے اس کارنمایاں کو بنظر استحسان دیکھیں گے۔

ہر شخص جانتا ہے کہ ہندوستان کے ہر ضلعے میں مختلف زبانیں

بولی جاتی ہیں، علیحدہ علیحدہ زبانوں اور گوناں گوں رسم و رواج کے باعث ہر خطے کے لوگ دوسرے خطوں کے باشندوں سے غیر مانوس اور بالکل بے خبر ہیں سینما کی مقبولیت سے ہمیں یہ بھی توقع ہے کہ ہمارے سارے ملک میں ایک زبان بولنے اور سمجھنے کی قابلیت بہت کم مدت میں پیدا ہو جائیگی۔ اور بیشتر اختلافات خود بخود دُور ہو جائینگے، ہمیں افسوس ہے کہ ہماری فلم ساز کمپنیاں اس اہم قومی مقصد کو بالکل بھول گئی ہیں اگر وہ اس طرف توجہ کریں تو ملک کی ایک بہت بڑی ضرورت نہایت آسانی سے پوری ہو سکتی ہے۔

سینما کے ذریعہ تعلیم

سینما کی اثر اندازی کی وجہ سے ماہرین تعلیم متفقہ طور پر اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ سینما کے ذریعہ سے تعلیم دینا بہت دلچسپ اور زود اثر ہے۔ اس لئے تعلیمی محکموں کو اس طرف بہت جلد متوجہ ہونا چاہئیے، بعض لوگ فلمی طریقۂ تعلیم پر اعتراض کرتے ہیں کہ یہ طریقۂ تعلیم بہت زیادہ صرف طلب ہے۔ نیز طلبا کے دلوں میں وہ شوق اور ولولہ پیدا نہیں کر سکتا، جو ایک معلم اپنی حرکات و سکنات، ذاتی اثر اور علمی قابلیت سے پیدا کرتا ہے۔ علاوہ ازیں اس خطرہ کا بھی اظہار کیا جاتا ہے کہ فلم استاد کی جگہ لے لیگا۔

پہلے اعتراض کا جواب یہ ہے کہ پبلک کا بہت سا روپیہ اکثر ایسے ملاحیہ پر صرف ہوتا ہے جن سے کوئی خاص نتیجہ برآمد نہیں ہوتا، اگر اس رقم خطیر کا عشر عشیر اس مفید کام پر صرف کیا جائے تو اس سے بہت

زیادہ فوائد حاصل ہو سکتے ہیں، نیز اُستاد کی جگہ چھین لینے کا خطرہ بھی بے بنیاد ہے، کیونکہ فلمی تعلیم محض کتابی تعلیم کی مرادف ہے گویا اُستاد کی ضرورت اس کے باوجود باقی رہتی ہے نہ پھر بھی اگر کوئی تعلیمی فلم اُستاد کی جگہ پر قبضہ کرنے کی جسارت کرتا ہے تو وہ اچھی قسم کا فلم کہلانے کا ہرگز سزاوار نہیں، اچھے علمی فلم کا مطلب یہ ہے کہ وہ معلّم کے لئے آسانیاں پیدا کرے، اور اس کی مشکلات کو حل کرتے ہوئے مزید علمی مواد بہم پہنچائے نہ کہ اسکی جگہ ہی پر قابض ہو جائے۔

فلمی تعلیم پر یہ اعتراض بھی کیا جاتا ہے کہ اس کے استعمال سے طلباء میں مجہولیت پیدا ہو جانے کا امکان ہے یہ خطرہ اسوقت پیدا ہو سکتا ہے جب علمی فلموں کی نمایش طلباء کو سُست اور مجہول بنادے چونکہ فلم کی نمایش ہمیشہ حیرت اور دلچسپی پیدا کرتی ہے اس لئے مجہولیت پیدا ہونے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔

سینما کا سب سے نمایاں تعلیمی پہلو یہ ہے کہ ہم دوسرے ملکوں کا طرز تمدّن اور بود و باش کے طریقے اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں اور وہ کیفیتیں جن کا نقشہ الفاظ کھینچنے سے عاجز اور ان کی خیالی تصاویر قوت بیانیہ پیش کرنے سے قاصر ہے سینما فلم ان کو ہمارے سامنے اس طرح پیش کرتا ہے جیسے ہم اسی ماحول میں چل پھر رہے ہیں، نیز ایک تعلیمیافتہ شخص کسی نہ کسی حد تک کتابیں وغیرہ پڑھ کر غیر ملکی تمدّن اور حالات سے واقف ہو سکتا ہے لیکن ایک اَن پڑھ جاہل اپنے گھر کی چاردیواری

ہیں کوئیں کے مینڈک کی طرح گرد و پیش کے حالات سے بالکل بے خبر رہتا ہے سینما فلم ایسے لوگوں کی واقفیت بڑھانے اور زاویۂ نظر کو وسیع کرنے میں نہایت قابل معلّم کا کام دیتا ہے۔ نیز وہ باتیں جو سمجھائے سمجھ میں نہیں آتیں سینما کے پردے پر دیکھ کر ہر قسم کی قابلیت کا انسان آسانی سے اخذ کر لیتا ہے ۔

آجکل ہمارے ملک کی بعض فلم کمپنیاں مفید علمی فلم تیار کر رہی ہیں جس کے لئے وہ ضرور شکریئے کی مستحق ہیں اس کے علاوہ محکمۂ تعلیم اور محکمہ دیہات سدھار نے بھی کچھ فلم تیار کرائے ہیں، جن کو دیکھ کر خاطر خواہ فوائد اور مفید ترین اطلاعات مہیا ہوتی ہیں ۔

فلم اور سائنس سائنس کی ترقی، ملکی حالات کی تبدیلی اور علم کی روز افزوں روشنی سے تعلیمی نظریوں میں انقلابات رونما ہو رہے ہیں، لیکن باوجود ان تبدیلیوں کے ہمارے اہلِ ملک سائنس کے فوائد اور اس کے کارناموں سے پوری طرح واقف نہیں، اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم وہ ذرائع اختیار کریں جن سے سائنس کی روشنی دُور دُور تک پھیلے اور ہر شخص اس کے عملی فوائد سے اچھی طرح واقف ہو جائے، ظاہر ہے یہ کام محض فلموں ہی سے لیا جا سکتا ہے کیونکہ قدرت نے ان کو دلچسپی اور اپنی کی صفات بخشی ہیں ۔

افسوس ہے ہمارے ماہرین تعلیم ابھی تک اس طرف متوجہ نہیں ہوئے، ورنہ فلموں کے ذریعہ سے وہ محیر العقول کرشمے اور دلچسپ

تجربات بہت آسانی سے دکھائے جا سکتے ہیں جن کو عملی طور پر دکھانے میں مختلف قسم کی دقتیں پیش آتی ہیں اور کتابی تفسیریں ان کو سمجھنے میں بمشکل کفایت کرتی ہیں

ریاضیات

ریاضیات اور سائنس کے ان شعبوں میں جن کا انحصار ریاضیات پر ہے۔ بعض اوقات بڑی دقتوں کا سامنا ہوتا ہے۔ اکثر مسئلوں کو فرضی اشکال سے ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اور جو کچھ کامیابی ہوتی ہے وہ محض فرضی کہلاتی ہے۔ سنیما اس فرضی خلا کو نہایت آسانی سے پُر کر کے ان لوگوں کی پوری پوری رہنمائی کر سکتا ہے جن کی بصارت متخیلہ نسبتاً کمزور واقع ہوئی ہے۔

ریاضیات کے بعض مسائل ایسے ہیں جنہیں نظر فریبی اور زیادہ پیچیدہ بنا کر طالب علم کے دماغ کو معطل کر دیتی ہے عموماً ان مسائل کو سمجھانے کے لئے اُستاد کو ماڈل تیار کرنا پڑتا ہے۔ اگر ماڈل بنانا ممکن نہ ہو تو پھر ہر بات فرض کر لی جاتی ہے! ورنہ نتائج بھی فرضی ہی برآمد ہوتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ طالب علم اقلیدس کے مشکل سے مشکل سوالات فرضی طور پر صحیح حل کر لیتا ہے لیکن جب کسی مسئلے سے عملاً سابقہ پڑتا ہے تو اس کا قیافہ اور عقل اس کی مدد کرنے سے انکار کر دیتے ہیں سینما فلم کی مدد سے اس سے بھی زیادہ دقتوں کو دُور کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح سے طلبا کو کسی چیز کے فرض کر لینے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

اس کے علاوہ ریاضیات سے متعلق بعض قدرتی مسائل ایسے ہیں۔ جن میں محض زبانی جمع خرچ سے کام لیا جاتا ہے۔ اور طالب علم کسی بات کی اصلیت سے واقف نہیں ہوتا ویسے وہ جانتا سب کچھ ہے۔ مثلاً رات اور دن کے برابر ہونے کا عمل، کسی سیارے کی ارضی اور سماوی ہم درجگی۔ اور اس کے متعلق نکلنے کے اسباب وغیرہ ایسے مبحث ہیں۔ جن کی محض نظری تعلیم دی جاتی ہے۔ اگر فلم کو اس مفید کام میں صرف کیا جائے تو یہ مسئلے ایک اور ایک دو کی طرح سمجھائے جا سکتے ہیں ؎

علم الحیات

جس طرح ریاضیات کے بہت سے ٹیڑھے مسئلے فلم کے ذریعہ بہت آسانی سے حل ہو سکتے ہیں۔ اسی طرح علم الحیات کی تعلیم میں بھی فلم سے استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ ہم علم الحیات کے متعلق فلموں میں ایسے مسائل کو محفوظ کر سکتے ہیں جن کو ہر شخص آلات کی مدد کے بغیر ہرگز دیکھ نہیں سکتا، علم الحیات کا مطالعہ کرنے کے لئے دُور دراز کے ممالک میں جانا ہر شخص کے بس کی بات نہیں، اور اگر پہنچ بھی جائے تو مطالعہ اور مشاہدہ کے لئے ایک طویل مدت تک بیحد سیر گردانی اور کاوش کرنی پڑتی ہے۔ اگر فلموں سے یہ کام لیا جائے تو گھر بیٹھے علم الحیات کی تکمیل ہو سکتی ہے، بیشک یہ بہت مشکل کام ہے لیکن ماہرین کی نگرانی میں منتشر اور بکھرے ہوئے حالات کو مرتب کر کے چلتی پھرتی تصویروں کی ایک مکمل کتاب تیار کر لینا

کوئی بڑی بات نہیں +

علم الحیات سے متعلق فلم طلباء کے علاوہ عوام کے لئے بھی دلچسپی کا باعث ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ کوئی شخص چاہے کتنی ہی کوشش کیوں نہ کرے وہ کسی حیوان کی زندگی سے پوری طرح پر واقف نہیں ہو سکتا یہ فلم عدم واقفیت کے خلاؤں کو پُر کر کے ان مقامات پر جہاں قوت بیان اظہار حقیقت کا ساتھ نہیں دیتی اصلیت کو دکھا سکتے ہیں +

علم الحیات کے تمام شعبوں میں نشو ونما کا مطالعہ بہت زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ لیکن انسان اس کو پوری طرح نہیں دیکھ سکتا۔ فلم ایسی مشکلات کا بہترین حل ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ کیمرہ ہر موقعہ پر کام نہیں دے سکتا۔ یہ بالکل ٹھیک ہے جہاں کیمرہ کام نہ دے وہاں ہاتھ کی تصویریں خلا کو پورا کر سکتی ہیں مثلاً آج سے چند سال پہلے کسی شخص کو یہ معلوم نہ تھا کہ ماں کے پیٹ میں بچے پر کیا گورتی ہے۔ اور اب بھی بچے کی مختلف کیفیتیں اکثر افراد کو معلوم نہیں۔ اگر بچے کی نشو ونما کے فلم تیار کر لئے جائیں تو ہر شخص انسانی زندگی کے ابتدائی مراحل سے بخوبی واقف ہو سکتا ہے +

بعض عملوں کو اصل کی نسبت فلم پر زیادہ وضاحت سے دکھایا جا سکتا ہے۔ کیونکہ زیادہ طاقت کے شیشے معملوں میں عام طور پر میسّر نہیں آ سکتے۔ معملوں میں تجربے کرتے ہیں یہ ہمیشہ کمی رہتی ہے کہ طلباء بہ ہیئت مجموعی کسی عمل کا مطالعہ نہیں کر سکتے سینما فلم اس کوتاہی کا

بہترین علاج ہے۔ عمل جراحی کے مشکل اور پیچیدہ عمل فلم کی استمداد سے بہت آسان ہو سکتے ہیں اور نہ صرف طلبا بلکہ عوام کی دلچسپی کا ذریعہ بھی بن سکتے ہیں ؛

علم طبیعیات | علم الطبیعیات کی تعلیم میں بھی سینما فلم کے استعمال سے بہت امداد مل سکتی ہے، مثلاً اگر طبیعیاتی فلم تیار کر لئے جائیں تو معملوں میں بہت سے قیمتی کمیاب اور مخصوص آلات اور ساز و سامان کی ضرورت باقی نہیں رہتی گویا اس قسم کے فلموں کے رواج سے معملوں کے اخراجات میں بہت کمی ہو سکتی ہے۔ علم طبیعیات کے بعض تجربات کی نمایش میں معلّمین اور طلبا کا بہت زیادہ وقت صرف ہوتا ہے اور پھر بھی وہ سَو فیصدی کامیاب نہیں ہوتے۔ بعض ایسے تجربات ہیں جن کو معملوں میں نہیں دکھایا جا سکتا۔ اس لئے کتابی معلومات پر اکتفا کرنا پڑتا ہے۔ اور یہ تو عام طور پر شکایت ہے کہ اکثر تجربات محض ایک ہی مرتبہ عملی طور پر دکھائے جاتے ہیں۔ طبیعیاتی تجربات کے فلم ایسی دقتوں کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دینگے۔ اور طلبا کو ضروری تجربات بار بار دیکھنے کا موقعہ مل سکیگا۔ اس کے علاوہ بہت سے تجربات ہر طالب علم کو فرداً فرداً دکھانے پڑتے ہیں سینما فلم اس دقت کا بہترین علاج ثابت ہونگے۔ ظاہر ہے فلمی طریقۂ تعلیم کو اختیار کرنے سے بہت کافی روپیہ۔ محنت اور وقت بچ سکتا ہے جو یقیناً کسی دوسرے مفید مقصد کے لئے

کام آسکتا ہے۔

یقین ہے کہ اس قسم کے فلم نہ صرف طلبا کے شوق تعلیم کو مشتعل کرینگے بلکہ ان کی یادداشت پر گہرے اور پائیدار نقوش قائم کر دینگے جو اکثر اوقات بعض تجربوں کو چھوٹے پیمانہ پر بار بار کرنے سے بھی دل و دماغ میں محفوظ نہیں رہ سکتے۔

فلم کے ذریعہ سے ارضیاتی طبیعیات کے تجربوں میں غیر مرئی مناظر کو بھی ایک اور ایک دو کی طرح دکھایا جاسکتا ہے۔ مثلاً وائرلیس کے عمل کو ہم اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتے لیکن فلم اس غیر مرئی عمل کو ہمیں اچھی طرح دکھا سکتا ہے۔ بعض اثرات کو ہم بدقت محسوس کرتے ہیں اور ان کا حقیقی عمل ہماری آنکھوں سے پوشیدہ رہتا ہے۔ سینما فلم کے ذریعہ اس سائنس کے متعلق حیرت انگیز انکشافات ہمارے روبرو پیش کیئے جاسکتے ہیں۔ اس کے علاوہ بعض ایسے قدرتی مناظر کو بھی دکھایا جاسکتا ہے۔ جو عام طور پر ہماری حد نظر سے پرے واقع ہوتے ہیں۔ اور ان کو دیکھنے کے لئے بڑے بڑے قیمتی آلات کی ضرورت پڑتی ہے۔ مثلاً بادلوں کا بننا۔ ان سے بجلی وغیرہ پیدا ہونا، کرۂ زمین کے شمالی اور جنوبی حصوں کی مخصوص حالتیں جن کو بہت ہی کم لوگ اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتے ہیں۔ سینما فلم کے ذریعے ہر کس و ناکس ان کو بچشم خود دیکھ کر صحیح نتائج اخذ کرسکتا ہے۔

زراعت ہر پڑھا لکھا شخص اچھی طرح جانتا ہے کہ فن زراعت میں بہت سے فنون اور سائنس کے مختلف شعبوں سے مدد لی جاتی ہے۔ ہمارے اَن پڑھ کاشتکار اگرچہ زراعت سے متعلق تمام عملوں کو جانتے ہیں لیکن ان کی حقیقت سے واقف نہیں۔ اس لئے طرح طرح کے توہمات ان کے دلوں میں پیدا ہو گئے ہیں۔ اگر زرعیات کی فلم کے ذریعہ تعلیم دی جائے تو بہت سے مفید مسئلوں کو کاشتکاروں کے ذہن نشین کرایا جاسکتا ہے۔ اس کے علاوہ ہندوستان کی زرعی پیداوار روزافزوں آبادی کی ضرورتیں پوری کرنے سے قاصر ہے اور ہماری صنعت و حرفت ابھی پوری طرح ترقی نہیں کر سکی۔ اس لئے ضرورت ہے کہ زمین کی طاقت کو بڑھایا جائے۔ اور کمزور زمین کی قوت کو بحال رکھنے کی کوشش کی جائے۔ ظاہر ہے یہ کام سائنس ہی کی مدد سے انجام پاسکتا ہے۔ اگر ہم زراعت کو فروغ دینے کے لئے ایسے فلم تیار کرلیں جو کاشتکاری کے نئے طریقے، پودوں کی نشوونما کی مخصوص اندرونی اور بیرونی کیفیتیں دکھائیں تو کاشتکاروں اور زمینداروں کو زرعی تعلیم بہت آسانی سے دی جاسکتی ہے۔

ٹیلی ویژن اور سینما ٹیلی ویژن ہندوستان والوں کے لئے ابھی ایک عجوبہ چیز ہے۔ لیکن انگلستان میں اس حیرت انگیز ایجاد کے متعلق تعجب اور حیرت کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ وہاں ٹیلی ویژن تقریباً

اسی طرح عمومیت اور مقبولیت اختیار کر رہا ہے جیسے ہمارے ملک میں ریڈیو۔ اہل یورپ کا خیال ہے کہ ترقی کی دوڑ میں ٹیلی ویژن سینما سے آگے نکل جائیگا۔ ہر سینما ہال میں فلموں کی بجائے ٹیلی ویژن کے پروگرام دکھائے جائینگے۔ اور بیسویں صدی کی یہ محیّر العقول ایجاد تفریحی دنیا میں ایک انقلاب عظیم برپا کر دیگی۔ یقین کیا جاتا ہے کہ اس کی ترقی سے سینما کی حیثیت بالکل ایسی رہ جائیگی جیسی ریڈیو کی مقبولیت سے گراموفون کی ہوگئی ہے بلکہ کوئی تعجب نہیں کہ فلم غیر دلچسپ قرار دیدیئے جائیں اور ٹیلی ویژن انکی نمائشگاہوں پر پوری طرح قبضہ کر لے۔

آجکل سینما ہالوں میں خبروں کے فلم۔ کارٹون فلم اور کوئی عشقیہ افسانہ دکھا کر شائقین کو خوش کیا جاتا ہے۔ ٹیلی ویژن کی ترویج سے یہ پرانی عادت بدل کر تفریحی شوق کہیں سے کہیں پہنچ جائیگا کیونکہ واقعات حاضرہ کو دکھانے میں فلم ٹیلی ویژن سے بہتر کام نہیں دے سکتا۔ اس کا صحیح اندازہ کچھ وہی لوگ کر سکتے ہیں جن کو گھر بیٹھے بعض اہم واقعات بچشم خود دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ یہ مسلمہ امر ہے کہ ریڈیو کے ذریعہ بعض واقعات کی رپورٹ سننے۔ سینما ہالوں میں فلم گزٹ دیکھنے اور اخباروں کے نمایندوں کی خیال آرائیوں سے لطف اندوز ہو کر وہ مزا ہرگز حاصل نہیں ہو سکتا جو ٹیلی ویژن سے بچشم خود دیکھنے اور بگوش خود سننے میں آسکتا ہے۔ نیز فلم کے

ذریعہ سے واقعات سابقہ معلومات کی روشنی میں ان اہم تفصیلات اور جزئیات کے ساتھ دکھائے جاتے ہیں جو احاطۂ تحریر میں نہیں آسکتیں لیکن ٹیلی ویژن کے ذریعہ ہم پورے واقعہ کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے اور کانوں سے سُنتے ہیں۔ اور ہمیں کسی رپورٹر کی رپورٹ دیکھنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی گویا ٹیلی ویژن شخصی بُعد اور عدم واقفیت کو کما حقہٗ دُور کرتا ہے۔

بعض لوگ یہ سمجھے ہوئے ہیں کہ سینما اور ٹیلی ویژن آپس میں حریف اور مدمقابل ہیں۔ حقیقت میں یہ دونو صنعتیں دَور حاضر کی تفریحات کے دو مختلف شعبے ہیں۔ جن کی ترقی اور دلچسپی کی مخصوص راہیں ایک دوسرے سے بالکل علیحدہ ہیں۔ اس لئے قوی امید ہے کہ ان میں سے ایک صنعت کی ترقی دوسری صنعت کو کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچائیگی۔ ہاں ٹیلی ویژن کی توسیع و ترقی سے تفریحی دنیا میں کچھ انقلابات ضرور رُونما ہونگے۔ مثلاً تھیٹروں اور سینما ہانوں میں محض ٹیلی ویژن پروگرام عوام کی تفریح اور دلچسپی کا ذریعہ بنجائینگے اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ فلم بالکل مسترد کر دیئے جائینگے۔ فلم والوں کو اپنے لئے دلچسپی اور تفریح طبع کے ایسے نئے سامان مہیا کرنے پڑینگے جو ٹیلی ویژن کی دسترس سے باہر ہونگے ماہرین کا اندازہ ہے کہ ٹیلی ویژن کی مقبولیت سے تھیئٹروں پر بھی کوئی بُرا اثر نہیں پڑیگا۔ اداکاروں کی شخصی کشش اور ان کی اداکاری کے کمالات شائقین کو

بدستور اپنی طرف متوجہ رکھیں گے۔ بلکہ امید ہے کہ مستقبل قریب میں تھیٹروں کی کھوئی ہوئی عظمت اور دلچسپی از سر نو واپس مل جائیگی۔

کتنا غلط خیال ہے کہ ٹیلی ویژن کا عروج فلم کی صنعت کا بالکل خاتمہ کر دیگا۔ انگلستان میں فلم کمپنیوں کے ذہین ڈائرکٹر، ڈرامہ نویس۔ اور اداکار ٹیلی ویژن کے پروگراموں کا بغور مطالعہ کرکے اپنی نظر کو وسعت اور فنی قابلیت کو ترقی دینے میں مشغول ہیں۔ اس طرح سے انہیں کوئی نہ کوئی صاحب جوہر اداکار، کسی عمدہ کہانی کا مواد اور دیگر مفید معلومات بغیر کسی صرف اور وقت کے حاصل ہوتی رہتی ہیں۔ ورنہ معمولی معمولی تجربے کرنے میں تضیع اوقات کے علاوہ بیحد وحساب روپیہ صرف ہو جاتا تھا۔

بعض بے بنیاد خطرات کے باعث لندن کے سینما والوں نے براڈ کاسٹنگ کارپوریشن کیساتھ تعاون کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ اس عدم تعاون سے ٹیلی ویژن کو کوئی نقصان پہنچتا ہے یا نہیں ظاہر ہے ٹیلی ویژن کیلئے سینما فلم لوازمات میں سے نہیں ہیں۔ فلموں کی امداد کے بغیر بھی ٹیلی ویژن پروگرام نہایت دلچسپ اور دلکش بنائے جا سکتے ہیں اس لئے ہمارا فرض ہے کہ فلم اور ٹیلی ویژن میں اتحاد اور تعاون پیدا کرنے کی کوشش کریں تاکہ یہ دونو مفید صنعتیں جو تفریحات کے دو علیحدہ علیحدہ شعبے ہونے کے باوجود آپس میں ایک دوسرے کے مدمقابل اور حریف نہ بن جائیں۔

ریڈیو

اُنیسویں صدی کے آخری اور بیسویں صدی کے ابتدائی سالوں میں جس قدر ترقیاں ہوئی ہیں۔ ان کو دیکھنے والے ابھی بکثرت موجود ہیں۔ سائنس کی ہر نئی ایجاد کے بعد یہی گمان گزرتا ہے کہ اس کے بعد کسی اور محیّر العقول ایجاد کا ہونا ناممکن ہے۔ لیکن چند دن گزرنے نہیں پاتے کہ اس سے بھی حیرت افزا ایجاد نظروں کو خیرہ اور دماغوں پر حیرت کا عالم طاری کر دیتی ہے ؎

وائرلیس۔ ٹیلی فون۔ ہوائی جہاز اور موٹر کاریں وغیرہ ہماری بیسویں صدی کی اسی قسم کی ایجادات ہیں۔ جن سے عقل انسانی دنگ ہے، ان سب ایجادات میں آجکل وائرلیس کو بہت زیادہ اہمیت اور مقبولیت حاصل ہے ؎

وائرلیس کا موجد:۔

وائرلیس کا موجد "مارکونی" اٹلی کا باشندہ تھا۔ اس کا انتقال تقریباً ۶۳ سال کی عمر میں جولائی ۱۹۳۷ء میں ہوا ہے، کہتے ہیں مارکونی کی ابتدائی تعلیم نہایت معمولی تھی، اس کو شروع ہی سے بجلی کے کام سے بہت دلچسپی تھی، یورپ کے بڑے بڑے سائنسدان

مدتوں سے تجربے اور کوششیں کر رہے تھے کہ برقی لہروں سے پیغام رسانی کا کام لیں اور اقلیم سائنس کے تاجدار کہلائیں، مگر قدرت نے یہ فخر مارکونی کے لئے محفوظ کیا تھا۔ چنانچہ وہ پہلا شخص ہے جس نے برقی لہروں کے ذریعے پیغام رسانی کی۔ شروع شروع میں مارکونی کو محض نو میل تک پیغام رسانی کرنے میں کامیابی ہوئی مگر آہستہ آہستہ اس فاصلے میں اضافہ ہوتا چلا گیا یہاں تک کہ دُور دراز فاصلوں کا تفرقہ بالکل مٹ گیا اور مشرق و مغرب اور شمال و جنوب کا بُعد محض عملی طور پر باقی رہ گیا۔

اٹلی کی حکومت نے مارکونی کی بہت زیادہ عزت افزائی کی۔ کیوں نہ ہو وہ سائنسدانوں کا تاجدار اور بیسویں صدی کے لئے باعث فخر تھا۔ ۱۹۰۹ء میں اس کو فزکس کا نوبل پرائیز دیا گیا۔

ریڈیو وائرلیس کی مزید ترقی ریڈیو کی تخلیق کا باعث ہوئی۔ ریڈیو کے ذریعہ سے ہم دُور دراز فاصلوں پر بیٹھ کر اسی طرح بات چیت کر سکتے ہیں جس طرح آمنے سامنے بیٹھے ہیں۔ اس ایجاد سے تمام دُنیا میں ایک تہلکہ مچ گیا۔ اور حیرانی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ جب ہم لوگ ریڈیو سے لُطف اندوز ہوتے ہیں تو معاً دل میں یہی خیال آتا ہے ہم بہت ہی خوش قسمت ہیں کہ ہمارے دَورِ زندگی میں ایک ایک ایسی انوکھی ایجاد ہوتی ہے جو کبھی انسان کے وہم و گمان میں بھی نہ آسکتی تھی، لیکن ہمیں کیا پتہ کہ سائنسدان اس سے بھی زیادہ

انوکھی اور حیرت افزا ایجاد کی فکر میں ہیں جو ریڈیو سے کہیں زیادہ بڑھ چڑھ کر ہوگی۔ خیال کیا جاتا ہے کہ ٹیلی ویژن وائرلیس کا آخری زمانہ ہوگا۔ لیکن کیا پتہ سائنس کی بے تھاہ سمندر سے کوئی اور ہیرا اس سے بھی زیادہ بے مثل موتی نکال لائے اور پھر اس میں ترقی اور توسیع کی مزید راہیں نکل آئیں۔

بہر حال یہ معلوم کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ سنہ ۱۹۲۰ء کے آغاز میں انگلستان سے موسیقی کا سب سے پہلا پروگرام نشر ہوا اور ۱۹۲۲ء میں باقاعدہ طور پر برٹش براڈ کاسٹنگ کارپوریشن کا قیام عمل میں آیا۔

ہندوستان میں سب سے پہلے کلکتہ، بمبئی، مدراس، رنگون اور کراچی میں ریڈیو کلب کھولے گئے۔ ان ہندوستانی سٹیشنوں کی قوت نشر بہت کم تھی۔ اس لئے دُور دراز شہروں کے باشندے ان کے پروگرام سے لُطف اندوز نہ ہوسکتے تھے۔ اس کے علاوہ ریڈیو سٹوں کی قیمتیں بھی بہت زیادہ تھیں۔ یعنی یہ تفریح اوسط درجے کے آدمیوں کے لئے نہ تھی محض اُمراء اور رؤساء ہی اس سے لُطف اُٹھاتے تھے ان کلبوں کو حکومت بطور امداد کچھ رقم سالانہ دیا کرتی تھی، بعض ریاستیں بھی ان کی مالی امداد کرتی تھیں۔ غرض ان کلبوں کا قیام اور نظام عام طور پر پبلک کے ہاتھ میں تھا۔

بمبئی ریڈیو سٹیشن سے اُردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں پروگرام نشر ہوتے تھے۔ اس کمپنی کی مالی حالت خراب ہونے کی

وجہ سے سنہ ۱۹۳۰ء میں اس کا خاتمہ ہو گیا۔ کمپنی کی ناکامیابی سے کسی اور کمپنی کا حوصلہ نہ پڑتا تھا کہ اس کام کو دوبارہ سنبھالنے کا بیڑا اُٹھائے آخر کار حکومت ہند نے یہ فرض اپنے ذمہ لیا، تھوڑی سی مدت کے بعد حکومت نے کئی مرتبہ ارادہ کیا کہ بمبئی سٹیشن بند کر دیا جائے کیونکہ مالی حالت بہت ہی ہمت شکن تھی، اور حکومت اپنے اندازے سے زیادہ روپیہ صرف کرنے کو تیار نہ تھی ؎

یہ ایک بالکل اتفاقی امر تھا کہ ریڈیو ہمارے ملک میں آپ ہی آپ مقبول ہونے لگا۔ ایک دم وائرلیس سیٹوں کی درآمد بڑھ گئی اور اس طرح سے حکومت ہند کے ہاتھ میں براڈ کاسٹنگ کی ترقی اور توسیع کے لئے ایک معقول رقم آ گئی، حکومت کے مُردہ ارادے پھر سے زندہ ہو گئے۔ آخر کار کافی غور و خوض کے بعد سنہ ۱۹۳۶ء جنوری میں تقریباً چالیس لاکھ کے سرمایہ سے دہلی میں ایک زیادہ طاقت کا سٹیشن قائم کیا گیا ؎

ہندوستان جیسے طویل و عریض ملک میں ریڈیو کو مقبول بنانے کے لئے یہ رقم بہت ہی کم تھی، لیکن حکومت نے اس ہمت شکن مہم کو نہایت ہی قلیل مدت میں بہت زیادہ کامیابی کے ساتھ سر کر لیا، چنانچہ اسوقت ریڈیو کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ دہلی کے علاوہ پشاور۔ لکھنؤ۔ لاہور۔ کلکتہ۔ مدراس۔ بمبئی وغیرہ بڑے بڑے شہروں میں ریڈیو سٹیشن جاری ہو چکے ہیں۔ اور دیگر

مشہور و معروف مقامات پر مزید سٹیشن جاری کرنے کی طیاریاں ہو رہی ہیں۔ امید کی جاتی ہے کہ آیندہ چند سال کے عرصے میں ہر صوبے میں ریڈیو سٹیشن قائم ہو جائینگے اور اس طرح سے تمام ہندوستان میں ریڈیو سٹیشنوں کا جال بچھ جائیگا ۔۔

ریڈیو کی زبان

ہمارے ملک میں ریڈیو کی فنی اور صنعتی مشکلات کو چھوڑ کر سب سے زیادہ ٹیڑھا مسئلہ ریڈیو کی زبان کا ہے۔ ہندوستان کے ہر صوبے میں کئی کئی زبانیں بولی جاتی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ زبان کا مسئلہ سب سے زیادہ ریڈیو کی ترقی میں حائل ہے، ماننا پڑیگا کہ اس میں حقیقت اور صداقت دونو شامل ہیں۔ اگر ہندوستان میں ایک زبان بولی اور سمجھی جاتی تو بہت کم ریڈیو سٹیشنوں اور قلیل سرمایہ سے کام لیا جا سکتا تھا۔ لیکن زبانوں کے اختلاف کی وجہ سے ہر صوبے میں ریڈیو سٹیشن قائم کرنا ضروری ہو گیا ہے کیونکہ یہ بات انصاف سے بعید ہے کہ ریڈیو سے ہر صوبے کو برابر کا فائدہ نہ پہنچے۔ سر دست ریڈیو کا محکمہ ان زبانوں کی طرف توجہ کر رہا ہے جو صوبائی حیثیت رکھتی ہیں اور ان کو آسانی سے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ۔۔

مدت دراز سے ہندوستان کے مفکرین اسی فکر میں ہیں کہ ہندوستان میں ایک ایسی زبان رائج ہو جائے جو ہر صوبے میں بولی اور سمجھی جا سکے۔ اور قومی زبان کہلائے۔ قومی زبان کی ترویج کے ساتھ ہمارے

ملک کی بڑی بڑی توقعات وابستہ ہیں۔ امید کی جاتی ہے کہ قومی زبان سے باہمی نااتفاقیاں اور آئے دن کے جھگڑے فساد دور ہو جائینگے تجارت اور صنعت و حرفت میں مزید ترقیاں ہونگی، اور ہندوستان کے دامن سے یہ دھبہ دور ہو جائیگا کہ یہاں کوئی قومی زبان نہیں ہے۔ ریڈیو اسی خواب شیریں کی تعبیر ہے۔ کہ اس کی مقبولیت سے ملکی زبان پیدا ہونے کے امکانات بڑھ گئے ہیں اور امید ہے کہ نہایت قلیل عرصے میں ریڈیو کی توسیع کے ساتھ ساتھ قومی زبان خود بخود پیدا ہوتی چلی جائیگی جو سارے ہندوستان میں بولی اور سمجھی جائیگی اور ہندوستانی کہلائیگی۔ مختلف مقامی زبانوں کے لئے ہر مرکزی مقام پر ریڈیو سٹیشن جاری کرنے سے یقیناً یہ مدعا ذرا دیر میں حاصل ہوگا کیونکہ مادری زبان کو دلچسپی اور شوق سے سُننے کا مادہ انسان کی طبیعت میں فطری طور پر موجود ہے۔ بہر حال مایوسی گناہ ہے امید کہتی ہے کہ ریڈیو کی امداد سے وہ دن قریب تر آ رہا ہے۔ جب سارے ہندوستان میں ایک قومی زبان ہوگی۔ ایک تمدن ہوگا نیز تفرقہ پردازی اور آویزشیں ہمیشہ کے لئے نیست و نابود ہو جائینگی؛

سیاسیات اور ریڈیو شروع شروع میں یہ خیال کیا جاتا تھا کہ حکومت ریڈیو کے ذریعہ اپنا پروپاگنڈہ کیا کرے گی۔ یا جو سیاسی پارٹی برسر اقتدار ہوگی وہ ریڈیو سے حسب دلخواہ فایدہ اُٹھائیگی۔ اس قسم کی چیرہ دستیوں اور ان کے نتائج بد کو محسوس کرتے ہوئے حکومت نے ا

یہ فیصلہ کرکے کمال دانشمندی کا ثبوت دیا کہ ریڈیو کسی حالت میں بھی سیاسی پروپگنڈے کے لئے استعمال نہیں کیا جائیگا بلکہ حکومت ہند بھی اس سے سرکاری پروپگنڈے کا کام نہیں لیگی، ظاہر ہے اگر ریڈیو سٹیشنوں کو سیاسیات کا اکھاڑا بنا دیا جاتا تو ہندوستان میں اب تک کئی مرتبہ سیاسی انقلابات رُونما ہو چکتے اور ریڈیو سے بجائے فائدہ پہنچنے کے مُلک کو اتنا شدید نقصان پہنچتا کہ صدیوں تک اس کی تلافی ممکن نہ ہوسکتی "

سردست سیاسیات میں ریڈیو کے محکمے کی پالیسی یہ ہے کہ ہر سیاسی اور اختلافی مسئلے کے متعلق مختلف پارٹیوں کے خیالات کا اظہار کر دیا جاتا ہے اور اپنی طرف سے کسی قسم کی رائے زنی اور نکتہ چینی نہیں کی جاتی، گویا سیاسی معاملات میں محکمہ ریڈیو کا مسلک بالکل غیر جانبدارانہ اور صُلح کُل ہے اور یہی اس کی ترقی اور مقبولیت کی دلیل ہے "

ریڈیو پروگرام جب سے ریڈیو کا محکمہ حکومت ہند کی سرپرستی میں جاری ہُوا ہے۔ اسوقت سے لے کر اب تک ریڈیو کے پروگرام پر مسلسل نکتہ چینی ہو رہی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس مسئلے نے بہت زیادہ اہمیت اختیار کر لی ہے۔ اور محکمۂ ریڈیو کے ذمہ دار کارکُن سخت مخمصے میں پڑ گئے ہیں اور حیران ہیں کہ کس طرح اس مشکل مسئلے کو حل کیا جائے تاکہ ان کے پروگرام پسندیدگی کے کانوں سے سُنے

جائیں۔ افسوس یہ ہے کہ باوجود انتہائی کوششوں کے اس بارے میں آجتک عشر عشیر کامیابی بھی نہیں ہوئی اور نہ ہونے کی توقع ہوسکتی ہے کیونکہ اوّل تو سب کو خوش کرنا ہی ناممکن ہے دوسرے کارکنوں کی ناتجربہ کاری سہل انگاری اور کسی حد تک خودغرضی بھی اعلےٰ معیار تک پہنچنے میں سدراہ ہے۔ بہرحال مسلسل اعتراضات سے بچنے کے لئے اب مختلف ریڈیو سٹیشنوں کے پروگراموں کو اس طرح مرتب کیا جاتا ہے کہ اگر کسی ایک سٹیشن کا پروگرام طبع سلیم پر ناگوار گزرے تو کسی دوسرے سٹیشن کا پروگرام سُن لیا جائے اور اگر وہ بھی ناپسند ہو تو اور سٹیشنوں کو ٹٹولا جائے۔ سخت افسوس ہے کہ اکثر اوقات کسی ایک سٹیشن سے بھی دلپذیر آواز نہیں سُنائی دیتی، اور آخر کار انتہادرجہ مایوس ہوکر ریڈیو سٹ کو بند کردینا پڑتا ہے، یہی وجہ ہے کہ اکثر لوگ صبح شام کے پروگرام کی نسبت دوپہر کے ریکارڈوں کا سُننا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ لیکن بسا اوقات وہ بھی مایوس کُن ہوتے ہیں۔ حقیقت امر یہ ہے کہ پروگرام کا مسئلہ بہت ٹیڑھا ہے اور ریڈیو والوں کا یہ جواب ماننا ہی پڑتا ہے کہ پروگرام مرتب کرتے وقت انہیں عمدہ گانے والوں کے ساتھ ساتھ ہر قسم کے مذاق اور مذہبی نمایندگی کا بھی خیال رکھنا پڑتا ہے۔ جس سے پروگرام باوجود انتہائی کوششوں کے خراب ہوجاتا ہے۔ ممکن ہے کہ مستقبل قریب میں عوام کی

نہ چیخ پکار کا خاطر خواہ نتیجہ برآمد ہوا اور ہندوستان کے ہر ریڈیو سٹیشن کے پروگرام اس قدر دلچسپ مرتب ہونے لگیں کہ کم از کم جائز شکایات دُور ہو جائیں ۔

ریڈیو اور موسیقی ہمارے مُلک کے تمام ریڈیو سٹیشن عام طور پر اپنی توجہ موسیقی پر مرکوز رکھتے ہیں تعلیم و تربیت اور اصلاح و فلاح کے مفید کاموں پر بہت کم وقت صرف کیا جاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ موسیقی رُوح کی غذا ہے بلکہ دُنیا خود ساز فطرت کا ایک دلکش نغمہ ہے لیکن عملی دنیا میں موسیقی کی اتنی ہی ضرورت ہے جتنی آٹے میں نمک کی، لیکن یہاں حال یہ ہے تین گھنٹے صبح کو دو گھنٹے دوپہر کو اور شام کو پانچ گھنٹے گانا ہی گانا ہوتا رہتا ہے۔ مفکرین کے نزدیک ریڈیو پروگرام کا یہ بدترین پہلو ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ریڈیو کو محض لہو و لعب کے لئے استعمال نہ کیا جائے۔ بلکہ اس سے تعلیم و تعلّم اور فلاح و بہبود کا کام بھی لیا جائے۔ جو لوگ تجارت اور زراعت پیشہ ہیں ان کے مفید مطلب پروگرام بنائے جائیں۔ تفریح طبع کے پروگرام الگ ہوں، عورتوں کی تہذیب و تربیت اور دلچسپی کے لئے ایک خاص وقت مقرر کیا جائے۔ بچوں کے ذہنی ارتقاء اور واقفیت عامہ بڑھانے کے علیحدہ پروگرام ہوں غرض ریڈیو پروگرام ہر حیثیت سے اس قدر مرغوب و دلچسپ اور کارآمد ہو کہ ہر شخص یہ محسوس کرنے لگے کہ ریڈیو کے بغیر وہ بہرہ ہے۔ اور

اس کے پیشے کے لئے ریڈیو اس کا حقیقی بہی خواہ اور سچا ہمدرد ہے۔ جب تک محکمہ ریڈیو انسانی زندگی کے کار آمد اور مفید شعبوں کی طرف توجہ منعطف نہیں کریگا ملک کو اس سے کوئی خاص فائدہ نہیں پہنچ سکتا، خدا کا شکر ہے کہ آہستہ آہستہ اس طرف توجہ منعطف ہو رہی ہے"

ٹیلی ویژن | بہت سے لوگوں کا خیال تھا کہ ریڈیو بیسویں صدی کی بہترین اور آخری ایجاد ہے لیکن ٹیلی ویژن نے ثابت کر دیا کہ ابھی ترقی کا بہت وسیع میدان ہمارے سامنے موجود ہے۔ یورپ اور امریکہ کے سائنسدان اس کوشش میں ہیں کہ ٹیلی ویژن کو بھی ریڈیو کی طرح مقبول بنائیں۔ اخبارات سے معلوم ہوا ہے کہ اسوقت تک سو میل تک ٹیلی ویژن کام دے سکتا ہے مسلسل اور ان تھک کوششیں جاری ہیں کہ کسی نہ کسی طرح ٹیلی ویژن تمام روئے زمین پر جاری اور ساری ہو جائے۔ اور ٹیلی ویژن کے سٹوڈیو میں کام کرنے والے ہزاروں میل کے فاصلے سے متحرک تصاویر کی طرح چلتے پھرتے نظر آئیں۔

ظاہر ہے یہ ایجاد بیسویں صدی کی بہترین ایجادوں میں سے ہوگی سائنس کی ترقی کو دیکھتے ہوئے ہم اس ایجاد کو آخری ایجاد کہتے ہوئے ڈرتے ہیں۔ کیونکہ بالکل ممکن ہے کہ اس سے بھی بہتر کوئی ایجاد ہو جائے جو بیسویں صدی کی سب سے بہتر ایجاد کہلائے

اور ہمارے خیالات کو غلط ثابت کر دے۔

ٹیلی ویژن کے رواج سے زندگی کا ایک نیا دور شروع ہونے کی قوی اُمید ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ دور زندگی گوناں گوں دلچسپیوں سے مملو ہوگا۔ بعض کا خیال ہے کہ ٹیلی ویژن سے صنعت فلم سازی کو سخت خطرات درپیش ہیں کیونکہ فلم سازی کی صنعت ہمارے مُلک میں ابھی اپنی زندگی کے ابتدائی مراحل طے کر رہی ہے اور مُلک کا بیشمار روپیہ اس میں لگا ہُوا ہے۔ اگر ٹیلی ویژن نے فلم کے میدان پر قبضہ کر لیا تو فلم سازی کا خاتمہ ہو جائیگا۔ اور مُلکی سرمایہ کو شدید نقصان پہنچیگا۔ فلم ساز کمپنیوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ قبل از وقت اپنے لئے نیا میدان عمل تلاش کر لیں تاکہ عین وقت پر بغلیں نہ جھانکنی پڑیں۔ کیونکہ اگر صنعت فلم سازی ٹیلی ویژن سے مرعوب ہو گئی تو ہزاروں آدمی بیکار ہو جائینگے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ٹیلی ویژن کی ترویج روزی پیدا کرنے کے نئے نئے راستے کھول دیگی۔ لیکن پھر بھی ایک دم اتنی زیادہ تعداد کو اس نئی صنعت سے مستفید ہونے کے لئے ایک مدت درکار ہے۔

بعض کا خیال ہے کہ اگر ٹیلی ویژن کا مقصد ریڈیو کی طرح گانا بجانا اور ڈرامے کرنا ہی رہا تو اس کی مقبولیت سینما کے لئے زہر قاتل کا کام کرے گی۔ اِس لئے جہاں اس بات کی ضرورت ہے

کہ ٹیلی ویژن سے محض تفریحی کام نہ لیا جائے وہاں یہ بھی لازم ہے کہ فلم کے لئے ایک نیا میدان عمل تلاش کیا جائے تاکہ دونو صنعتیں برابر برابر ترقی کر سکیں ۔

ریڈیو سازی ہمارے ملک میں ابھی تک ریڈیو سیٹ بنانے کی فیکٹریاں جاری نہیں کی گئیں۔ عام طور پر ریڈیو سیٹ یورپ اور امریکہ سے آکر بہت گراں قیمت پر فروخت ہوتے ہیں۔ سُنا ہے صوبۂ مدراس میں ایک فیکٹری جاری ہوئی ہے جو ریڈیو سیٹ کے پُرزے منگا کر اپنے کارخانے میں ریڈیو سیٹ تیار کرتی ہے اس طرح سے بہت ہی کم قیمت میں ریڈیو سیٹ تیار ہو جاتا ہے۔ ابتدائی حالات میں یہ بات بھی بہت غنیمت ہے۔ بالکل ممکن ہے کہ آیندہ سالوں میں پُرزے بھی اپنے مُلک میں تیار ہونے لگیں، اور ریڈیو کی صنعت پر ہمارا مُلک اس طرح قابض ہو جائے جس طرح گراموفون اور ہارمونیم وغیرہ کی صنعتوں پر ہے۔ اسوقت نہایت ضروری ہے کہ ریڈیو انجنیری سیکھنے کے لئے قابل اور ہوشیار طالب علموں کو یورپ اور امریکہ بھیجا جائے تاکہ وہ وہاں سے کام سیکھ کر آئیں اور اپنے مُلک میں ریڈیو سازی کے کارخانے اور فیکٹریاں کھولکر روزگار کے نئے راستے پیدا کریں۔ ریڈیو کی مقبولیت زبان حال سے کہہ رہی ہے کہ عنقریب ریڈیو ہر شخص کے لئے ناگزیر ہو جائیگا۔ اس لئے ریڈیو سازی کی طرف تعلیم یافتہ نوجوانوں اور سرمایہ داروں کو

بہت جلد متوجہ ہونا چاہیئے +

ریڈیو کے فوائد افسوس کا مقام ہے کہ ہمارے ملک میں ریڈیو کا تعارف بہت ہی غلط طریقے سے کرایا گیا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ عوام اس کو محض دفع الوقتی اور اوقات گزرانی کا آلہ سمجھنے لگے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ریڈیو کے ساتھ تمام دُنیا کی ترقی اور صلاح کی امیدیں وابستہ ہیں۔ اس کے ذریعے سے نہایت مفیدا وراہم اصلاحیں بہت قلیل مدت میں عمل میں آسکتی ہیں واقفیت عامہ بڑھانے کے لئے ریڈیو بہترین معلم ہے، ہندوستان جیسے کم تعلیم یافتہ ملک میں علمی نشرواشاعت اس کی وساطت سے بہت آسانی سے ہوسکتی ہے۔ ہر ضروری اطلاع کو آناً فاناً میں ملک کے گوشے گوشے میں پہنچایا جاسکتا ہے۔ غالباً یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ بمبئی کی حکومت نے ہندو مسلم فسادات کے مواقع پر ریڈیو کے ذریعے پولیس کو ہدایات دینے کا نہایت کامیاب تجربہ کیا اور ثابت کردیا کہ انتظامی معاملات میں بھی ریڈیو سے بہت کافی مدد لی جاسکتی ہے +

ریڈیو ایک ایسی ایجاد ہے جس سے نیم مُردہ لوگوں میں زندگی کی نئی رُوح پھونکی جاسکتی ہے یہی وجہ اس کی مقبولیت کی ہے ورنہ ہندوستان کے قدامت پرست لوگ ہر نئی چیز کو بڑی دیر اور دقت سے قبول کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ ریڈیو نے روزگار پیدا کرنے کے نئے شعبے کھول دیئے ہیں جو بیروزگاروں کیلئے

باعزت روزگار مہیا کر رہے ہیں۔

ریڈیو کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ دُور دراز ملکوں کے بڑے بڑے اہم واقعات اور حادثات کی اطلاع فوراً ہی تمام دنیا میں پہنچ جاتی ہے۔ چنانچہ شاہ ایڈورڈ ہشتم کی تخت سے دست برداری اور اس کے بعد جارج ششم کی تخت نشینی کے واقعات عین وقت پر کل دُنیا نے ریڈیو کے ذریعہ اپنے کانوں سے سُنے اور ایسا محسوس کیا جیسے یہ تمام کارروائی آنکھوں کے سامنے ہو رہی ہے اور ہر شخص بذات خود اس میں شریک ہے۔ وہ ضروری خبریں جو اخبارات کے ذریعے کئی کئی دن بعد معلوم ہوتی تھیں۔ اب واقعات رُونما ہونے کے چند گھنٹے بعد یا عین اسی وقت پر ہمارے کانوں تک بغیر کسی قسم کی رنگ آمیزی کے پہنچ جاتی ہیں۔

کلکتہ اور بمبئی جیسے تجارتی مرکزوں سے مختلف چیزوں اور کمپنیوں کے حصوں کے بھاؤ۔ گھڑ دوڑوں اور میچوں کے نتیجے ہم روزانہ عین وقت پر سُن سکتے ہیں۔ اس کی قدر اور اہمیت کا اندازہ کچھ وہی لوگ لگا سکتے ہیں جو ریڈیو کے رواج سے پہلے ٹیلی گرام کے انتظار میں دیوانہ وار پھرتے یا ٹیلیفون پر کان لگائے بیٹھے رہتے تھے، اور اگر یہ دونوں ذرائع ان کے مقدور سے باہر ہوتے تو صبح اُٹھ کر سب سے پہلے بیتابانہ اخبارات کا مطالعہ کرتے کہ کتنے ہزار کا خسارہ یا منافع ہوا۔ اس کے علاوہ بڑے

جلسوں جلوسوں اور ہنگاموں کی کارروائیوں سے ہم گھر بیٹھے محظوظ ہوتے ہیں اور ہزاروں میل کا فاصلہ ہمیں بالکل بے معنی معلوم ہوتا ہے۔ ریڈیو کے ذریعے سے ہمارے مذہبی سیاسی لیڈروں اور مشہور و معروف ادیبوں وغیرہ کی آوازیں اور ان کے گرانقدر خیالات ہمیں اس طرح سُنائی دیتے ہیں جیسے وہ ہمارے روبرو بیٹھے ہم ہی سے باتیں کر رہے ہیں۔ بس تصور شرط ہے۔ اب کوئی دن کی بات ہے کہ ٹیلی ویژن آتا ہے پھر تو دُوری اور فصل حقیقتاً وصل میں تبدیل ہو جائیگا۔ وہ لوگ جن کی صورتیں دیکھنے کو دل مشتاق اور دیدار کو آنکھیں ترستی ہیں ریڈیو کے سٹوڈیو میں اس طرح بات چیت کرتے نظر آئینگے گویا ہمارے ہی گھر میں مہمان ہیں سُبحان اللہ دیدہ و دل فرش راہ کیجئے اور وصل کے لُطف اُٹھائیے پھر محض یہی شکایت رہ جائیگی کہ وہ اپنی کہے جائینگے اور آپ کی ایک نہ سُنیں گے لیکن یہ بھی کیا کم ہے کہ ان کے دیدار سے آنکھیں روشن اور گفتگو سے کان لطف اندوز ہونگے ۔

دیہاتی طبقے پر ریڈیو والوں کی خاص مہربانی ہے۔ روزانہ تقریباً ایک گھنٹہ ان کی دلچسپی اور مطلب کی باتیں۔ نہایت پُرلطف انداز میں ان کو سُنائی جاتی ہیں۔ بڑے بڑے گاؤں میں سرکاری ریڈیو عین وقت پر کھول دیئے جاتے ہیں جن سے دیہاتی اور دیہات سے دلچسپی رکھنے والے روزانہ لطف اُٹھاتے ہیں۔ اس طرح سے

وہ وقت جو پہلے لڑائی جھگڑوں اور غیر مفید باتوں میں ضائع ہوتا تھا اب ریڈیو سننے میں صرف ہوتا ہے۔ ماننا پڑیگا کہ اس سے کچھ نہ کچھ فائدہ ضرور ہوتا ہوگا۔

اس کے علاوہ جن گھروں میں ریڈیو سٹ موجود ہیں۔ وہاں بوڑھوں اور بچوں میں زندگی کے نئے آثار پیدا ہوگئے ہیں جو آنے والے نئے دور کی بشارت دے رہے ہیں۔"

ٹیلی ویژن

سائنس کی ترقی

یہ بات دُنیا مانتی ہے کہ اُنیسویں صدی کے آخری اور بیسویں صدی کے ابتدائی ربع میں جس قدر ترقی سائنس کے مختلف شعبوں میں ہوئی ہے اتنی ترقی کسی اور صدی میں نہیں ہوئی۔ ہوائی جہاز۔ تحت البحر کشتیاں۔ ٹیلیفون۔ موٹر کاریں ٹیلیگرافی۔ وائرلیس وغیرہ انہی چند سالوں کے کارنامے ہیں جن کو دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ ان سب ایجادوں میں وائرلیس کو سب سے زیادہ اہمیت دی جاتی تھی۔ اور کہا جاتا تھا کہ اس سے بہتر اور کوئی ایجاد بیسویں صدی کے لئے باعث فخر نہیں ہو سکتی لیکن سائنسدانوں کے دماغوں میں یہ بات مدت سے گشت لگا رہی تھی کہ وائرلیس کی مدد سے عکس کیوں نہ نشر کئے جائیں۔ آواز کو نشر کرنے میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد یہی بات باقی رہ گئی تھی، شروع شروع میں یہ خیالات خواب کی باتوں کی حیثیت رکھتے تھے! ور لوگ ہنس ہنس کر ان کا ذکر مذاق کے طور پر کرتے تھے، مگر سائنسدان نہایت خاموشی اور سکون کے ساتھ اپنے اپنے معملوں میں شب و روز نئے سے نئے تجربے کر کے ترقی اور تحقیق کے قدم آگے بڑھا رہے

تھے ؎

ایک پیشینگوئی کہتے ہیں کوئی پچاس سال کا ذکر ہے۔ جب ٹیلیفون ایجاد ہوا تو سکاٹ لینڈ کے ایک بڈھے نے مذاق کے طور پر کہا کہ اب دُور دُور کی چیزیں بھی بجلی کی مدد سے دکھائی دینگی۔ اسوقت کیا پتہ تھا کہ یہ مذاق بھی کبھی صحیح ثابت ہو سکتا ہے۔ اتفاق کی بات ہے کہ وہ پیشینگوئی لفظ بہ لفظ پوری ہو گئی۔ اگر وہ سکاٹش زندہ ہوتا تو یقیناً اپنے آپ کو پیغمبر سمجھتا اور کیا تعجب ہے کہ اس حیرت انگیز ایجاد کو دیکھ کر شادی مرگ ہو جاتا۔ اب ہم اس مذاقیہ پیشینگوئی کو حرف بہ حرف پورا ہوتے ہوئے دیکھ کر اس کی دُور بین عقل پر عقیدت کے پھول چڑھا رہے ہیں اور خوش ہیں کہ ہم ایسے دَور میں پیدا ہوئے ہیں جس کی ایجادات انسان کے تصور میں بھی نہ آسکتی تھیں ؎

ٹیلی ویژن کا پہلا تجربہ چند سال ہوئے کہ سکاٹ لینڈ کے ایک نوجوان انجینئر مسٹر جون بیرڈ نے اپنے معمل میں ٹیلی ویژن کا ایک ابتدائی تجربہ دکھایا تھا اگرچہ یہ تجربہ کسی طرح بھی کامیاب تجربہ نہیں کہلایا جا سکتا لیکن ٹیلی ویژن کی دریافت میں پہلا اور کامیاب قدم ضرور تھا۔ اس کو دیکھ کر یہ امید قوی تر ہوتی تھی کہ عنقریب وہ دن آنے والا ہے جب آواز کی طرح چلتی پھرتی تصاویر بھی نشر ہوا کرینگی۔ مسٹر بیرڈ نے اپنی تحقیق کی وسعت دکھانے کیلئے کم و بیش

چالیس افراد کو مدعو کیا۔ انہوں نے یہ تجربہ ایسی تنگ و تاریک جگہ میں دکھلایا تھا کہ بیک وقت چھ آدمیوں سے زیادہ وہاں سما نہ سکتے تھے۔ اسوقت تک اس نوجوان کو صرف اتنی کامیابی ہوئی تھی کہ انسانی شکل ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں نشر ہو سکتی تھی مگر وہ بھی صاف صاف نظر نہ آتی تھی، اگرچہ یہ تجربہ ہمت شکن تھا لیکن امید اور کامیابی کے فرشتے برابر کھڑے کان میں کہہ رہے تھے کہ کامیابی انتظار میں ہے۔ کوئی دن میں ٹیلی ویژن تمام دنیا پر محیط ہو جائیگا۔ اور اس کی مقبولیت کی کوئی انتہا نہ رہیگی۔ خدا کی شان ہے وہ کسی کی محنت برباد نہیں کرتا۔ آج ہر ملک میں ٹیلی ویژن کا چرچا ہے۔ اور اس کے انتظار میں آنکھیں فرش راہ ہیں۔ چونکہ ابھی تک ٹیلی ویژن کے تجربے ہندوستان میں نہیں دکھائے گئے اس لئے ہم میں سے اکثر لوگ اس کی حقیقت کو نہیں سمجھتے۔ ہاں وہ لوگ جو یورپ اور امریکہ کے اخبار اور رسالے پڑھتے رہتے ہیں ان کو ٹیلی ویژن کا کچھ نہ کچھ صحیح اندازہ ضرور ہے۔

ٹیلی ویژن؟ عام طور پر لوگوں کا خیال ہے کہ بے تار برقی کے ذریعے دور افتادہ اجسام واشیاء کو دیکھنے کا نام ٹیلی ویژن ہے۔ یاد رہے وائرلیس یا بجلی کے تاروں کی مدد سے ساکن تصاویر تو کئی سال سے نشر ہو رہی ہیں۔ اور یہ تجربے ہندوستان اور یورپ کے درمیان بھی ہو چکے ہیں لیکن ٹیلی ویژن اس سے کچھ

مختلف چیز ہے۔ اس کی مدد سے ان اجسام کو متحرک حالت میں پردے پر دیکھا جا سکتا ہے جو آلۂ نشر کے سامنے مختلف حرکات کرتے ہیں۔ اخبارات کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اس وقت تقریباً سو میل تک آلۂ نشر صورت ہائے انسانی کو نشر کر سکتا ہے۔ اور کیا مجال کہ سلسلہ منقطع ہو جائے۔ ابھی تک کالا اور سفید رنگ ہی نشر کیا جا سکتا ہے باقی رنگ پردے پر نہیں آتے۔ ممکن ہے آگے چل کر تمام رنگ نشر ہونے لگیں۔ اور ہر چیز اپنے اصلی رنگ میں نظر آئے، بہرحال ٹیلی ویژن کو فوٹو ٹیلی گرافی سے علیحدہ چیز سمجھنا چاہئے۔ فوٹو ٹیلی گرافی میں تار برقی یا بے تار برقی کے ذریعہ غیر متحرک تصاویر نشر کی جاتی ہیں۔ اور ٹیلی ویژن سینما فلم کی طرح متحرک تصاویر پیش کرتا ہے۔

بعض لوگ خطرہ محسوس کر رہے تھے کہ ٹیلی ویژن کی ایجاد انسان سے تخلیہ کی دولت چھین لیگی گویا جس مقام پر آلات ٹیلی ویژن کو منطبق کر دیا جائیگا وہاں کی ہر چیز باوجود در و دیوار کی موجودگی کے ٹیلی ویژن کے پردے پر نظر آ جائیگی۔ ممکن ہے ایک زمانہ ایسا آئے کہ یہ خیال بھی پورا ہو جائے لیکن ابھی تک ریڈیو کی طرح ٹیلی ویژن بھی انہی چیزوں کو نشر کر سکتا ہے جو آلۂ نشر کے حلقہ اثر کے اندر ہوتی ہیں۔

براڈکاسٹنگ سے محض ہمارے کان لطف اندوز ہوتے ہیں

گویا براڈ کاسٹنگ، حواس خمسہ میں سے محض ایک حس کو محظوظ کرتا ہے۔ اگرچہ براڈ کاسٹنگ میں ہم آواز کے مد و جزر اور اُتار چڑھاؤ کو پوری طرح سُنتے ہیں لیکن ہماری آنکھوں کو کچھ نظر نہیں آتا کہ سٹوڈیو میں کیا ہو رہا ہے۔ بولنے والے فلموں کے رواج سے پہلے معاملہ اس کے بالکل برعکس تھا ہم پردے پر اداکاروں کی اداکاری کا پورا پورا حظ اُٹھاتے تھے لیکن ان کی آواز نہ سُن سکتے تھے۔ اِدھر بولنے والی تصاویر نے اس کمی کو پورا کر دیا ادھر ریڈیو میں جو کمی باقی رہ گئی ہے اس کو ٹیلی ویژن پُورا کر رہا ہے۔ اب ہمیں سٹوڈیو کی ہر چیز، بولنے والے فلم کی طرح دکھائی اور سُنائی دیتی ہے۔ اس بات کو ہر شخص بلا تامل تسلیم کرتا ہے کہ ٹیلی ویژن کے رواج کے ساتھ ہم بالکل نئے دورِ زندگی میں گامزن ہونگے۔ جو اپنی حیثیت سے گزشتہ صدیوں کا سرتاج کہلائیگا۔

آجکل ہم اپنے کمرے میں بیٹھ کر ریڈیو کے ڈرامے محض کانوں سے سُنتے ہیں اور اپنی قوتِ متخیلہ کی مدد سے ان خلاؤں کو پُر کرنے کی کوشش کرتے ہیں جو مناظر کی عدم موجودگی سے پیدا ہوتے ہیں۔ کوئی دن کی بات ہے کہ ٹیلی ویژن کا رواج قوتِ متخیلہ کو آزاد کر دیگا اور ہمیں مناظر اور آواز فلموں کی طرح محظوظ کیا کرینگے۔

چار پانچ سال کا ذکر ہے کہ مارکونی نے جو وائرلیس کا موجد تھا یہ مژدہ سنایا تھا کہ عنقریب ٹیلی ویژن میں عملی کامیابی حاصل

ہو گی اور ہم دُور دراز کے فاصلوں سے آواز اور اشکال کو نشر کر سکیں گے۔ اس سکاٹش بڈھے کی آواز بھی ابھی تک ہمارے کانوں میں گونج رہی ہے جس نے آج سے پچاس سال پہلے ٹیلیفون کی ایجاد کو دیکھ کر مذاق کے طور پر کہا تھا کہ وہ دن دُور نہیں جب بجلی کی مدد سے دُور دُور کی چیزیں بھی دکھائی دینگی۔ اسوقت یہ باتیں محض مذاق اور ناممکن معلوم ہوتی تھیں لیکن اب بے تار برقی کے ذریعہ ہزاروں میل کی بات چیت سُننا ہمارے لئے معمولی بات ہے۔ ہمارے ملک میں ٹیلی ویژن ابھی ایک عجوبہ چیز ہے۔ اور جادو سے کم وقعت نہیں رکھتا لیکن اس کا رواج اس طلسم حیرت کو توڑ دیگا اور وہ باتیں جو اب اخبارات اور رسائل میں پڑھ پڑھ کر ہم حیران ہوتے ہیں اپنی آنکھوں سے دیکھیں اور کانوں سے سُنیں گے۔ اور اپنے دماغوں کو اس سے بھی زیادہ حیرت افزا ایجاد کی طرف منطبق کر دینگے "

ہم میں سے اکثر لوگ ٹیلیفونی سے کسی نہ کسی حد تک ضرور واقف ہونگے۔ ٹیلیفون میں آواز کو بجلی میں تبدیل کر دیا جاتا ہے۔ اور برقی تار یا بے تار برقی کے ذریعہ اس کو نشر کیا جاتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مخصوص آلات اس برقی تحرک کو جذب کرکے دوبارہ اُسے آواز میں تبدیل کر دیتے ہیں۔ ٹیلی ویژن میں بھی تقریباً اسی اصول کو کام میں لایا گیا ہے۔ جب کوئی چیز آلۂ نشر کے حلقۂ اثر

ہیں آتی ہے تو اس کا عکس آلہ نشر پر اثر کرتا ہے اور بجلی کی مخصوص رو پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ رو جب تار برقی یا بے تار برقی کے ذریعے زیادہ طاقت حاصل کر کے ریسیور تک پہنچتی ہے تو دوبارہ روشنی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اور پھر دوبارہ عکس بن کر پردے پر نمودار ہوتی ہے۔ گویا ٹیلیفونی اور ٹیلی ویژن میں بجلی کی رو کا تحرک ہی اصلی چیز ہے جو آواز اور شکل کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔

معلوم ہونا چاہیئے کہ ٹیلی ویژن میں تیزئ رفتار کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ کیونکہ اگر صوری تسلسل تھوڑی سی دیر کے لئے موقوف ہو جائے تو اصل مقصد فوراً فوت ہو جائیگا۔ ٹیلی ویژن کی کامیابی اس بات میں مضمر ہے کہ سینما فلم کی طرح ہر شے اصلی حالت میں پردے پر برابر نظر آتی رہے۔ کہا جاتا ہے کہ اگر ٹیلی ویژن آلات کے سامنے فی سیکنڈ دس یا اس سے زیادہ عکس مرتب کئے جائیں تو پردے پر اشکال میں تسلسل قائم ہو سکتا ہے۔

ٹیلی ویژن کے رواج کے ساتھ ساتھ ہمارے اداکاروں کو بھی فن اداکاری میں مخصوص تبدیلیاں کرنی پڑینگی۔ اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں۔ جب اداکاری سٹیج تک محدود تھی تو اسوقت اداکاروں کی حالت کچھ اور تھی جب خاموش فلم آئے تو اداکاری میں بعض اہم تبدیلیاں پیدا ہوئیں۔ اور بولنے والے فلموں نے تو بالکل کایا ہی پلٹ دی، بجنسہ یہی حالت ریڈیو کے رواج سے

ہوئی۔ ماہرین کا خیال ہے کہ ٹیلی ویژن کے آلات کے سامنے جلدی جلدی حرکت کرنے سے عمدہ نتائج برآمد نہیں ہوتے، یہی وجہ ہے کہ اکثر اداکار آلات ٹیلی ویژن کے سامنے وہ خوبیاں پیدا نہیں کر سکتے جو وہ فلم کیمرہ کے سامنے دکھاتے ہیں۔ اس لئے امید کی جاتی ہے کہ ٹیلی ویژن کی ترقی کے ساتھ ساتھ فن اداکاری میں بھی نمایاں تبدیلیاں واقعہ ہونگی۔ اور بہت سے لوگ ٹیلی ویژن سٹار کہلانے کا فخر حاصل کرینگے۔

فی الحال ٹیلی ویژن کے آلات کے سامنے بہت ہی کم لوگوں کی گنجایش ہے۔ سائنسدان برابر کوشش کر رہے ہیں کہ زیادہ سے زیادہ آدمیوں کی گنجایش نکالیں۔ جس طرح ٹیلی ویژن کے فاصلے میں دن بدن ترقی ہو رہی ہے اس طرح امید ہے کہ عنقریب گنجایش کا میدان بھی وسیع ہوتا جائیگا۔ اور ہم عنقریب باقاعدہ ڈرامے اور بڑے بڑے اجتماعوں کا نظارہ کر سکیں گے۔

تعلیمی انقلابات فلم اور ریڈیو کے ذریعے سے جس طرح تعلیمی آسانیاں حاصل ہوئی ہیں۔ اس طرح ٹیلی ویژن سے بھی تعلیم کے ماحول میں بہت زبردست انقلابات رونما ہونے کی توقعات پیدا ہو رہی ہیں۔ ماہرین تعلیم کا متفقہ فیصلہ ہے کہ ۸۳ فیصدی علم قوت بصارت سے حاصل ہوتا ہے۔ اور ۱۷ فیصدی قوت سماعت کے ذریعے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ٹیلی ویژن تعلیم و تربیت میں بہت

زیادہ مدد دیگا۔ کیونکہ اس کا تعلق براہ راست آنکھ اور کان دونو سے ہے۔ سینما کے متعلق ماہرین تعلیم فیصلہ کر چکے ہیں کہ اگر اس سے تعلیمی کام لیا جائے تو تعلیم کی روشنی بہت آسانی اور کامیابی سے تمام دُنیا میں پھیل سکتی ہے۔ اور وہ مسائل جو معلّمین آسانی سے اپنے طلبا کو نہیں سمجھا سکتے" سینما فلم ان کو نہایت خوبی سے ذہن نشین کرا سکتا ہے اگر ٹیلی ویژن کے ذریعے سے تعلیمی کام لیا گیا تو امید کی جاتی ہے کہ تعلیم و تعلّم میں اور بھی زیادہ آسانیاں پیدا ہو جائینگی۔ آجکل تقریباً ہر ملک تعلیمی فلم تیار کر رہا ہے اگر ان فلموں کو ٹیلی ویژن سٹوڈیو سے نشر کیا جائیگا تو دُنیا کا ہر حصّہ اس سے فائدہ اُٹھائیگا۔ اور ایک ہی قسم کے فلم بار بار تیار کرنے کی ضرورت نہ رہیگی۔ اس بات سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ سینما کی تعلیمی حیثیت بالکل جاتی رہے گی اگر سینما والے اس میدان پر اپنا قبضہ قائم رکھیں گے تو ٹیلی ویژن ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ کیونکہ ٹیلی ویژن میں وہ صفائی اور خوبیاں قائم رہنی بہت مشکل ہیں جو سینما کے پردوں سے مخصوص ہیں ؎

امید ہے کہ ٹیلی ویژن کی ترقی ہماری زندگی میں نئی نئی دلچسپیاں پیدا کر دیگی۔ اگرچہ ٹیلی ویژن کا مستقبل ابھی تاریکی میں ہے لیکن مسلسل کوششیں جاری ہیں کہ اس دلچسپ ایجاد کو ریڈیو کی طرح عمومی مقبولیت دی جائے۔ بہرحال خانگی اور دیہاتی زندگی میں ٹیلی ویژن ایک نئی رُوح پھونک دیگا۔ اور وہ باتیں جو اب ہم

گھر بیٹھے کانوں سے سُنتے ہیں آنکھوں سے بھی دیکھا کرینگے گویا وہ وقت کچھ دُور نہیں ہے جب اپنے کمرے میں آرام سے بیٹھے دُنیا کی حالت اور بڑے بڑے واقعات عین وقت پر دکھائی دینگے۔ اِس لئے ہمیں ٹیلی ویژن کا خیر مقدم نہایت شاندار طریقے سے کرنا چاہیئے اور اس سے خاطر خواہ فائدہ اُٹھانے کے لئے ابھی سے تیار ہو جانا چاہیئے ؂

ٹیلی ویژن اور سینما

ٹیلی ویژن کے کارناموں کو پردے پر دیکھے بغیر ہم کوئی صحیح رائے قائم نہیں کر سکتے۔ اہل یورپ کی رائے ہے کہ ترقی کی دوڑ میں ٹیلی ویژن سینما سے بہت آگے نکل جائیگا وہ دن قریب ہے جب ہر سینما میں بجائے فلموں کے ٹیلی ویژن کے پروگرام دکھائے جائینگے۔ اور تفریحی دُنیا کے متوالے ان کو زیادہ دلچسپی سے دیکھیں گے۔ خیال ہے کہ بیسویں صدی کی اس بہترین ایجاد کی مقبولیت تفریحی دُنیا میں ایک انقلاب رُونما کر دیگی۔ یہ دلچسپ انقلاب بعض شعبوں میں روزی پیدا کرنے کی نئی نئی شاہراہیں وسیع کر دیگا۔ ٹیلی ویژن کی درآمد سے ایسے انجینروں کی مانگ بہت زیادہ بڑھ جائیگی جو سینما اور ٹیلی ویژن کی انجینری سے کما حقہ واقف ہونگے اس ترقی کا ایک پہلو یہ بھی ہوگا کہ فلموں کی حیثیت بالکل ایسی ہی ہو جائیگی جیسی ریڈیو کی مقبولیت سے گراموفون کی ہو گئی ہے انگلستان میں آجکل اکثر سینما ہالوں میں ٹیلی ویژن کے پروگرام

دکھائے جاتے ہیں اور عوام ان کو بڑی دلچسپی اور جوش و خروش سے دیکھتے ہیں۔ کوئی دن میں سُن لینا کہ فلم غیر دلچسپ اور دقیانوسی کہلانے لگے۔ اور ان کا تفریحی ماحول بہت ہی محدود رہ گیا۔

انگلستان میں ٹیلی ویژن کے کارناموں کو پردے پر دیکھ کر اکثر لوگ ورطۂ حیرت میں غرق ہو جاتے ہیں اور اپنے آپ کو ایک نئے دَور زندگی میں پاتے ہیں۔ یورپ میں عموماً لوگ ہفتے میں دو بار سینما دیکھنے کے عادی ہیں۔ وہاں سینما ہالوں میں عام طور پر کارٹون فلم۔ کوئی عشقیہ افسانہ اور خبروں کے فلم وغیرہ دکھا کر تفریح کا سامان مہیا کیا جاتا ہے۔ خیال ہے کہ ٹیلی ویژن کا شوق اس قدیمی عادت کو تبدیل کر دیگا۔ اس نئی تفریح سے شوق تفریح میں بھی یقیناً غیر معمولی اضافہ ہونے کی قوی امید ہو سکتی ہے۔ سردست اس قسم کے اندازے ضرور دلچسپ ہیں۔ دیکھنا چاہیئے کہ ٹیلی ویژن کی تکمیل شوق تفریح کو کس حد تک بڑھاتی ہے۔

یہ بات ماننی پڑے گی کہ واقعات حاضرہ کو دکھانے کے لئے ٹیلی ویژن سے بہتر اور کوئی ایجاد نہیں ہو سکتی۔ اس کا اندازہ صحیح طور پر کچھ وہی لوگ کر سکتے ہیں جنہوں نے ٹیلی ویژن کی مدد سے بعض اہم واقعات گھر بیٹھے بچشم خود دیکھے ہیں۔ خبروں کے فلم دیکھنے اور ریڈیو کی زبانی بعض اہم واقعات کی کارروائی

سُننے میں یقیناً وہ لُطف ہرگز پیدا نہیں ہوسکتا جو ٹیلی ویژن سے بچشم خود دیکھنے اور بگوش خود سُننے میں آسکتا ہے۔ بات یہ ہے فلموں کے ذریعے خبریں اور واقعات معلومات سابقہ کی روشنی میں دکھائے جاتے ہیں گویا ہمیں پہلے سے معلوم ہوتا ہے کہ فلاں واقعہ اس طرح رُونما ہُوا اور اس کا فلاں نتیجہ نکلا۔ فلم کے ذریعہ انکی وہ تفصیلات پیش کی جاتی ہیں جو احاطۂ تحریر میں نہیں آسکتیں یا اگر کوئی قابل واقعہ نگار ان پر اظہار خیالات کرتا ہے تو یہ فلم اس کی صداقت کی شہادت دیتے ہیں۔ ٹیلی ویژن کی بڑی خوبی یہی ہے کہ ہم ہر چیز کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے اور اپنے کانوں سے سُنتے ہیں۔ اس کے بعد اول تو ہمیں کسی رپورٹر کی رپورٹ پڑھنے کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی۔ اور اگر ہم دلچسپی کے طور پر کسی رپورٹ کو پڑھیں بھی تو ہمیں اس پر اسی طرح رائے زنی کرنیکا حق ہوتا ہے جس طرح کسی رپورٹر کو ہوسکتا ہے۔ میری نظر سے ایک اخبار میں یہ خبر گزری کہ حکومت ریاستہائے متحدہ امریکہ ٹیلی ویژن کو آیندہ جنگوں میں استعمال کریگی۔ اس طریق کار سے جرنیلوں کو ٹیلیفون کی ضرورت نہ رہیگی گویا ٹیلی ویژن کی مدد سے ہر ضروری کمک اور امداد عین وقت پر مہیا ہو سکے گی۔ اس کے علاوہ ہوائی جہازوں میں ٹیلی ویژن کے آلات لگانے سے دشمن کی فوج کے پُورے پورے حالات بغیر کسی دقت کے معلوم ہو جائینگے۔

دوسرے الفاظ میں اس بحث سے ہمارا مدعا یہ ہے کہ ٹیلی ویژن شخصی بُعد اور عدم واقفیت کو دُور کرتا ہے اور جو کچھ ہمیں دکھاتا ہے اس میں اصلیت سو فیصدی برقرار رہتی ہے ۔

ٹیلی ویژن سے دلچسپی رکھنے والے جانتے ہیں کہ اگرچہ ٹیلی ویژن کی عمر بولنے والے فلموں سے تقریباً تین سال کم ہے لیکن باوجود اس خورد سالی کے ترقی کی دوڑ میں وہ بڑی تیز رفتاری سے آگے بڑھ رہا ہے۔ پانچ سال ہوئے کہ بولنے والے فلم ترقی کے تمام مدارج طے کر چکے تھے، اسوقت ٹیلی ویژن کی تصاویر بالکل ابتدائی حالت میں تھیں۔ یہ تصاویر پوسٹ کارڈ کے برابر پردے پر نہایت مدھم نظر آتی تھیں۔ اداکاروں کو اپنے نقش ونگار اور بناؤ سنگار کو بہت شوخ رنگوں سے نمایاں کرنا پڑتا تھا۔ مگر پھر بھی ان کا عکس پردے پر مبہم اور مدھم نظر آتا تھا۔ گویا ٹیلی ویژن کے اداکاروں کو وہی دقتیں پیش آتی تھیں جو شروع شروع میں فلمی اداکاروں کے راستے میں حائل تھیں۔ اس کے علاوہ کبھی پردے پر سے عکس بالکل غائب ہو جاتا تھا کبھی مدھم پڑ جاتا تھا اور کبھی کچھ کا کچھ دکھائی دیتا تھا۔ ایک سال کی بات ہے کہ یہ شکایت لندن میں ہر شخص کی زبان پر تھی لیکن آج باوجود موسمی خرابیوں اور طرح طرح کی رکاوٹوں کے ٹیلی ویژن سیٹ ایسا ہی کام دیتا ہے جس طرح ایک عمدہ فلم واقعات کی جزئیات اور تفصیلات بغیر

کسی خرابی کے نہایت دیانتداری سے دکھلائے چلا جاتا ہے۔
ہر روز اخباروں میں خبریں آتی رہتی ہیں کہ ٹیلی ویژن کے فاصلے اور خوبیوں میں ترقی برابر جاری ہے۔ اس سلسلہ کی آخری خبر یہ ہے کہ ٹیلی ویژن کے پروگرام تقریباً سو میل کے فاصلے تک نہایت خوش اسلوبی اور عمدگی سے پہنچ رہے ہیں۔

ٹیلی ویژن اور فلم تفریحات کے دو مختلف شعبے ہیں۔

جس تیز رفتاری سے ٹیلی ویژن ترقی کر رہا ہے اس سے صنعت فلم سازی کو اندیشہ ہونا ناگزیر ہے۔ اس مخصوص صنعت سے روزی پیدا کرنے والے لوگ ٹیلی ویژن کی ترقی دیکھ کر بہت پریشان ہیں انکی پریشانی کا وہی عالم ہے جو سینما فلموں کے رواج سے پہلے تھیئٹر والوں سے متعلق لوگوں کا تھا۔ اسوقت ٹیلی ویژن ان کو اپنی صنعت اور روزگار کا خطرناک دشمن نظر آرہا ہے۔ ان خطرات کی سب سے پہلی پیش بندی یہ ہوئی کہ سینما والوں نے براڈکاسٹنگ کارپوریشن کے ٹیلی ویژن پروگرام اپنے سینما ہالوں میں دکھانے سے انکار کر دیا۔ کارپوریشن نے بھی اس تنگدلی کا ترکی بہ ترکی جواب دیتے ہوئے اس طرح انتقام لیا کہ فلم تھیئٹروں کو ٹیلی ویژن پروگرام جزوی طور پر بھی دکھانے سے قانوناً روک دیا۔ جب اس طریق کار پر اعتراضات ہوئے تو یہ جواب دیا گیا کہ ابھی تک ٹیلی ویژن کے پروگرام تھیئٹروں میں دکھانے کے قابل نہیں

ہوئے۔ فی الحال ان سے محض گھروں کی چار دیواری ہی میں محظوظ ہوا جا سکتا ہے۔ اور یہی ان کا اصلی مقصد ہے۔

حالات بتا رہے ہیں کہ یہ پابندی ہمیشہ قائم نہیں رہ سکتی اور وہ دن دُور نہیں جب سینما ہالوں میں ٹیلی ویژن کے پروگرام باقاعدہ دکھائے جائینگے۔ انگلستان میں اسوقت اعتدال پسند طبقے کا یہ خیال ہے کہ سینما اور ٹیلی ویژن آپس میں حریف نہیں ہیں بلکہ دورِ حاضر کی تفریحات کے دو مختلف شعبے ہیں جن کی دلچسپی اور ترقی کی راہیں ایک دوسرے سے بالکل علیحدہ ہیں۔ اس لئے ان میں سے ایک صنعت کی ترقی دوسری صنعت کے لئے نقصان کا باعث نہیں ہو سکتی۔ ہاں یہ امر مسلمہ ہے کہ ٹیلی ویژن کی ترقی کے ساتھ ساتھ تفریحی دُنیا میں کچھ انقلابات ضرور رُونما ہونگے۔ لیکن اس سے صنعت فلم سازی کو کسی قسم کا خطرہ لاحق نہ ہوگا۔ خیال ہے کہ آیندہ زمانے میں فلم محض گھروں اور مدرسوں میں دلچسپی سے دیکھے جائینگے۔ گویا فلموں کی وہی حالت ہوجائیگی جو آجکل انگلستان میں ٹیلی ویژن کی ہے۔ تھیئٹروں اور سینما ہالوں پر ٹیلی ویژن کا قبضہ ہوجائیگا۔ ہر صوبے کا ٹیلی ویژن سٹیشن اپنے علاقے کے تھیئٹروں اور گھروں میں نت نئی تصاویر پیش کرکے دلچسپی کی نئی شاہراہیں کھول دیگا۔ امید ہے کہ تھیئٹروں میں اداکاروں کی موجودگی اور ان کی اداکاری کے کمالات شائقین کو اپنی طرف

مقناطیسی کشش سے کھینچ لیگے بالکل ممکن ہے کہ اس طرح سے تھیٹروں کی کھوئی ہوئی عظمت اور دلچسپی از سر نو واپس آجائے۔

اگرچہ صنعت فلم کے پشت پناہ عام طور پر ٹیلی ویژن کی بڑی شد و مد سے مخالفت کر رہے ہیں۔ لیکن ذہین اور ہوشیار فلم کار اس نئی صنعت کو باعث نقصان ہونے کی بجائے اپنے فن کی ترقی اور توسیع کا باعث سمجھتے ہیں کہ اس سے ترقی کے امکانات بہت زیادہ بڑھ گئے ہیں۔ بعض پیش بیں فلم کمپنیوں نے اپنے فلم براڈ کاسٹنگ کارپوریشن کو کرایہ پر بھی دینے شروع کر دیئے ہیں۔ اور وہ اس طرح سے اپنے فلموں کا معقول کرایہ وصول کر رہی ہیں۔ اکثر فلم کمپنیوں کے ذہین اور ہوشیار کارکن ٹیلی ویژن پروگرام کو دیکھ کر اپنی نظر کو وسعت اور فنی قابلیت کو ترقی دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ بھی خیال رکھتے ہیں کہ شائد انہیں کوئی صاحب جوہر اداکار۔ کسی عمدہ کہانی کا مواد یا اپنی صنعت سے متعلق کوئی اور مفید مطلب بات ہاتھ آجائے۔ یہ آسانیاں ٹیلی ویژن کے ذریعے بغیر کسی صرف کے حاصل ہیں۔ ورنہ بعض معمولی معمولی باتوں کا تجربہ کرنے میں اکثر کمپنیوں کے ہزاروں پونڈ یونہی ضایع ہو جاتے تھے۔

ان حالات کے پیش نظر امید ہے کہ اگر صنعت فلم ٹیلی ویژن سے تعاون کرے گی تو بیشتر فلموں کو کامیاب ہونے کے بہت

عمدہ مواقع ہاتھ آئینگے۔ اکثر ماہرین کی رائے ہے کہ ٹیلی ویژن کو ترقی دینے میں سینما فلموں سے غیر معمولی مدد لینے کی ضرورت پڑیگی۔ بعض کا اندازہ ہے کہ یہ بات کچھ لوازمات میں سے نہیں۔ بہرحال اگر فلم ساز کمپنیاں یہ متفقہ فیصلہ کرلیں کہ ہم ٹیلی ویژن سے قطعی کوئی تعاون نہیں کرینگے تو اس سے ٹیلی ویژن کو کوئی خاص نقصان پہنچنے کا اندیشہ نہیں ہوسکتا۔ ٹیلی ویژن ایسی انوکھی اور دلچسپ ایجاد ہے کہ اس کی مقبولیت میں کوئی رکاوٹ حائل نہیں ہوسکتی باوجود ہزار مخالفتوں کے اس کی ترقی کو روکا نہیں جاسکتا اس لئے آنے والے دور کو روک کر کوئی خاص فائدہ مرتب نہیں ہوسکتا۔ آخر کار وہ زمانہ ضرور آئیگا جب ٹیلی فلم مقبولیت کی نظروں سے دیکھے جائیں گے۔ اس لئے بہتر یہی ہے کہ صنعت فلم اور ٹیلی ویژن میں ابھی سے تعاون اور اتحاد پیدا کیا جائے تاکہ یہ دونوں صنعتیں جو تفریحات کے دو علیحدہ علیحدہ شعبے ہونے کے باوجود ایک ہی ہیں۔ اس مخالفت سے ایک دوسرے کی حریف نہ بن جائیں ؎

حُبّ وطن

حُبّ وطن کیا ہے؟ حُبّ وطن ایک نہایت مقدّس جذبہ ہے۔ قدرت اس کو پیدا کرتی ہے۔ حالات اس کو اُبھارتے ہیں۔ اور ماحول اسکی تربیت کرتا ہے۔ ہر انسان کا دل اس جذبہ سے معمور ہے اور انسان ہی سے کیا مخصوص ہے حیوانات بھی اس نعمت سے محروم نہیں ہیں۔ "حبّ وطن" کا مفہوم اگرچہ دو لفظوں میں مضمر ہے۔ مگر اس کی وسعت سارے عالم پر محیط ہے۔ اس جذبے کا اظہار مختلف ملکوں میں مختلف طریقوں سے ہوتا ہے۔ آزاد ممالک کسی اور نقطۂ نظر سے حُبّ وطن کا اظہار کرتے ہیں۔ غُلام مُلک کے باشندے اپنے وطن عزیز کو بالکل مختلف زاویۂ نگاہ سے دیکھتے ہیں مگر اس رُوح پرور راگ کی الاپیں اور تانیں بوسیدہ اور درست سازوں سے نکل کر یکساں دلکشی اور سرخوشی پیدا کرتی ہیں۔

وہ کونسا بدقسمت انسان ہے جس کا دل وطن کی محبّت سے خالی ہے اور وہ پھر بھی اپنے آپ کو انسان کہلانے کا دعویدار ہے وہ کونسا دل ہے جس میں وطن کی محبّت اور کشش نہیں۔ بچپنے کے ساتھی۔ دوست، دشمن، عزیز، رشتے دار، اپنا گھر، شہر کی

گلیاں۔ غرض وطن عزیز اور اس سے تعلق رکھنے والی ہر ایک چیز دل کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ پرائے دیس کے زیادہ سے زیادہ آرام وطن سے بے تعلق نہیں کر سکتے۔ اپنے وطن میں جو تکلیفیں پہنچتی ہیں وطن سے دُور رہ کر وہ بھی راحتیں معلوم ہوتی ہیں۔ کوئی لاکھ کوشش کرے کہ تکلیفیں اور مصیبتیں یاد کر کے ہی وطن کو بھول جائے لیکن پھر بھی حُبّ وطن کا جذبہ دل سے نکل نہیں سکتا ہے

حُبّ وطن از مُلک سلیماں خوشتر
خارِ وطن از سُنبل و ریحاں خوشتر

یہ وہ حلال نشہ ہے جس سے عالم اور عامی، شہری اور دیہاتی۔ امیر اور غریب غرض سبھی قسم کے انسان سرشار ہیں۔ یہ وہ مقدس جوش ہے جس کے ماتحت محب وطن اپنے پیارے وطن کی خاطر جان تک کی بازی لگا دیتا ہے۔ طرح طرح کی تکلیفیں اُٹھاتا ہے۔ لیکن وطن کی محبت کسی طرح دل سے نہیں نکلتی۔ جلا وطن اپنے وطن کو یاد کر کر کے اس طرح روتا ہے جس طرح کوئی بے ماں کا بچہ شام کے وقت اپنی ماں کے لئے ہڑکتا ہے۔ وطن کی قدر کچھ وہی لوگ جانتے ہیں جو وطن سے دُور ہیں۔ شام کے وقت جب پرندے بسیرا لینے کے لئے اپنے گھونسلے کی طرف پرواز کرتے ہیں تو پردیسی کے دل میں "شام غریباں" کا سماں بندھ جاتا ہے۔ وطن کی یاد دل میں چٹکیاں لینے لگتی ہے اور وہ بے اختیار پکار اُٹھتا ہے ہے

غربت میں ہوں اگر ہم رہتا ہے دل وطن میں
سمجھو وہیں ہمیں بھی دل ہو جہاں ہمارا (اقبال)

ہر شخص کے دل میں وطن کی محبت نامعلوم طریقے سے گھر کرتی رہتی ہے جب حالات ترک وطن پر مجبور کرتے ہیں تو یہ بجھی ہوئی چنگاریاں شرارے بن جاتی ہیں۔ وطن اور یاران وطن رہ رہ کر یاد آتے ہیں۔ دل آپ ہی آپ بےچین ہوئے جاتا ہے۔ پردیس کے خوبصورت اور دلکشا مقامات۔ چہل پہل۔ روپیہ پیسہ، عزت اور وقعت سب ہیچ مگر اپنے وطن کے پُرخار باغات اور ویران مقامات غیر معمولی طور پر بھلے معلوم ہوتے ہیں۔ اپنے جھونپڑے میں بادشاہوں کے محلّوں کا مزا آتا ہے۔ اپنے شہر کے کوچوں کی گداگری پردیس کی حکومت سے بھلی لگتی ہے اور سہ
بہار غم بہار جانفزا معلوم ہوتی ہے

اعلیٰ حُبّ وطن حُبّ وطن کی ادنیٰ مثالیں تو سینکڑوں ملیں گی۔ لیکن حقیقی حبّ وطن کا اقتضا یہ ہے کہ انسان کو وطن کے گارے اور مٹی سے محبت نہ ہو بلکہ وطن سے حقیقی معنوں میں اُلفت ہو۔ حُبّ وطن کسی شہر یا شہر کے خاص محلّے یا گھر سے خصوصیت نہیں رکھتی۔ اسکا دائرہ بہت ہی زیادہ وسیع ہے۔ حقیقی حُبّ وطنی تمام مُلک اور اہالیان مُلک سے تعلق رکھتی ہے اس کو کسی خاص قوم یا جماعت سے واسطہ نہیں اس کے نزدیک وطن کی خاک پاک کا ہر ذرہ محبت کا مرجع اور کشش کا مرکز ہے ع خاک وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے

اپنے وطن کے لئے رونا۔ یاران وطن کو یاد کر کے بیقرار ہونا۔ گھر کے آرام یاد کرنا ایسی باتیں ہیں جن سے حیوانات بھی متاثر ہوتے ہیں ظاہر ہے اس قسم کے جذبات ادنےٰ قسم کے جذبات ہیں۔ چونکہ حیوان اور انسان میں قدرت نے بہت بڑا فرق رکھا ہے اس لئے انسانی حُبّ وطن کو حیوانی حُبّ وطن سے ضرور بالاتر ہونا چاہیئے۔ جو لوگ اس حقیقت کو سمجھتے ہیں وہ حُبّ وطنی کے جذبے کو تخصیص کی آلودگی سے بچاتے ہیں۔ ان کی نظر کسی خاص مقام پر مرتکز نہیں ہونے پاتی وہ تمام مُلک پر نظر رکھتے ہیں۔ مذہب و ملّت کا اختلاف ان کے نزدیک بے حقیقت ہے۔ وہ حُبّ وطن کے مقدّس جذبہ کو "من و مائی" کی آلائش سے آلودہ نہیں کرتے۔ بلکہ اپنی مالی جسمانی اور دماغی قوتوں سے اپنے مُلک کی ہر قوم کو برابر کا فائدہ پہنچاتے ہیں۔ وہ مُلک جس کے محبّان وطن ایسی اعلےٰ صفات سے موصوف ہوں ترقی کی دوڑ میں ہمیشہ پیش پیش رہتا ہے۔ بلکہ ان کی برکات سے اور ممالک کو بھی فائدہ پہنچتا ہے ۔

حُبّ وطن کی تربیت

حُبّ وطن کا بیج قُدرت نے ہر انسان کے دل میں امانت رکھا ہے ہمیں اس کی دیکھ بھال ماؤں کی گود سے کرنی چاہیئے تاکہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ماحولی اثرات اس کی نشوونما میں رُکاوٹ کا باعث ہوں۔ یا غلط تربیت اس کے تقدّس کو ضایع کر دے۔ اگر اس پودے کی نگہداشت شروع ہی سے رکھی جائے تو درخت

بنتے تک اس کا پھیلاؤ کبھی محدود اور اس کی چھاؤں کسی خاص جماعت کے لئے مخصوص نہ ہونے پائے بلکہ بلا تخصیص ہر مذہب و ملت کا شخص اس سے فائدہ اُٹھائے ؛

اس مقدّس جذبے کی نشو ونما کے لئے ضروری ہے کہ بچّوں کو ایسی لوریاں سُنائی جائیں جو حُبّ وطنی کے جذبات کو اُبھاریں اور وطن کی خدمت کا شوق پیدا کریں۔ جب بچّوں کو کہانیاں سُنانے کا زمانہ آئے تو ان کے سامنے اس قسم کی کہانیاں کہی جائیں جن میں محبان وطن کی قربانیوں کے پُرجوش ذکر اذکار ہوں تاکہ حُبّ وطن کا جذبہ ان کے دلوں میں حرارت پیدا کر دے۔ بچّوں کے نصاب میں بھی حقیقی حُبّ وطنی کو تربیت دینے کے لئے ایسا مواد شامل کرنا چاہئے جو اس پاک اور مقدّس جذبے کو تنگ نظری کے آسیب سے محفوظ رکھے۔ اور خدمت وطن کا شوق دل میں چٹکیاں اور گدگدیاں لینے لگے ؛

اپنے مُلک کے قابل ترین نوجوانوں کو اعلیٰ تعلیم سیاحت اور تجارت وغیرہ کے لئے غیر ممالک میں بھیجنا بھی مفید ثابت ہو سکتا ہے کیونکہ وطن سے دُور رہ کر وطن کی محبّت کے جذبات آپ ہی آپ بھڑک اُٹھتے ہیں اور دوریٔ وطن دوست دشمن اور اپنے پرائے کو یکساں عزیز بنا دیتی ہے۔ اس کے علاوہ غیر ممالک کی وطن پروری اور دوسرے ممالک کے باشندوں سے غیریت کا سلوک اپنے

وطن و اہل وطن کی قدر و وقعت کو بڑھاتا ہے نیز خدمت وطن کے لئے آمادہ کرتا ہے ؎

ہندو مسلمانوں میں وطن پرستی کا شوق

ہمارے مُلک کے باشندے اپنے وطن کو بڑی عظمت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ہندو وطن کو بھارت ماتا اور مادر وطن کے معزز لقب سے یاد کرتے ہیں۔ بھارت ماتا کی پرستش ان کا ایمان ہے۔ اور اس کے لئے ہر قسم کی قُربانی کرنا ان کا شعار۔ مُسلمان بھی ہندوؤں سے کسی طرح پیچھے نہیں۔ ان کا مذہب بھی حُبّ وطن کو ایمان کا جزو قرار دیتا ہے ؎

گزشتہ صدی کے ہنگاموں نے وطن پرستی کے جذبات کو کسی قدر ٹھنڈا کر دیا تھا۔ لیکن بیسویں صدی میں یہ دبی ہوئی خاموش اور سرد چنگاریاں ایک دم چمک اُٹھیں۔ اور ہندو مسلمانوں میں وطن کی محبّت کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہو گئی۔ سب سے زیادہ خوشی کی بات یہ ہے کہ حُبّ وطنی کا جذبہ پُورے ہندوستان کی بہبودی اور بہتری سے تعلّق رکھتا ہے۔ کسی خاص حصّۂ ملک کو کوئی اہمیت حاصل نہیں۔ آجکل وطنیت کو اس قدر مقبولیت حاصل ہے۔ کہ زن و مرد کمر بستہ مُلک کی خدمت کر رہے ہیں۔ دامے درمے قدمے جو جس سے بن پڑتا ہے۔ وہ مُلک پر سے قُربان کرتا ہے بلکہ مُلک کی خدمت میں ہتھکڑیاں، بیڑیاں پہننا۔ قیدیں بُھگتنا بھی باعث فخر خیال کیا جاتا ہے ؎

امید ہے کہ وطن پرستی کا جوش اور حُبّ وطنی کی صداقت آپس کے اختلافات کو دُور کر دے گی۔ اور مُلک کی بہبودی اور ترقّی کا خیال ہر قوم و مذہب کے لوگوں کو متحد و متفق کر دیگا۔

غلام اور آزاد ممالک کا مطمح نظر

آزاد ملکوں کی وطنیت کا مطمح نظر غلام ممالک کے باشندوں سے کسی قدر مختلف ہے کیونکہ غلام مُلکوں کو بالکل مختلف مسائل سے سابقہ پڑتا ہے۔ سب سے پہلے غیر آزاد ممالک کو جنگ آزادی کے لئے تیار ہونا لازم ہے۔ آپس کے اختلاف مٹا کر اور مختلف الخیال جماعتوں کو ہم خیال بنا کر متفق و متحد کرنے میں بہت زیادہ دقّت اور کشمکش ہوتی ہے۔ جب تمام مُلک ایک مرکز پر جمع ہو جاتا ہے تو حکومت سے مقابلہ کرنے میں بڑی بڑی جانی اور مالی قُربانیاں کرنی پڑتی ہیں۔ پھر ایسے مُلک کے لئے مقابلہ اور بھی زیادہ مشکل ہو جاتا ہے جس کے پاس سامان جنگ نہیں ہوتا اور عام لوگ فن سپاہگری سے ناواقف ہوتے ہیں ؎

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

ہندوستان کی جنگ آزادی بالکل اسی قسم کی ہے۔ بغیر ہتھیاروں کے جنگ کرنا ہندوستانیوں ہی کا حصّہ ہے۔ خاموشی سے ہر مصیبت کا مقابلہ بڑی ہمّت اور صبر کا کام ہے۔ لیکن ہمارے مُلک نے دُنیا کے سامنے ایک ایسی بے نظیر مثال پیش کی ہے جو

آجتک کوئی مُلک پیش نہیں کر سکا ،،

یہ مسلّمہ امر ہے کہ جب تک کوئی ملک آزاد نہ ہو اس کی مالی اور معاشی حالت کبھی سُدھر نہیں سکتی ۔ کیونکہ معاشی کشمکش آزادی کے نام اور خیالات کی دشمن ہے ۔ اس لئے جب تک معاشی چین نصیب نہیں ہوتا آزادی کی تحریک میں شامل ہونے کا خیال بھی کسی شخص کے پاس پھٹکنے نہیں پاتا ۔ اس زمانہ میں حکومت نہایت آرام سے محکوم ملک کے قدرتی خزانوں کو خالی کر کرکے اپنے ذاتی اغراض و مقاصد پر صرف کئے جاتی ہے ۔ اس قسم کی حکومت کو اپنے محکوموں سے ہمدردی نہیں ہوتی ۔ اپنے طرز حکومت سے وہ اپنی بُنیادوں کو خود کمزور کرتی رہتی ہے اور آخر کار اسے مجبوراً ملک کو خالی ہی کرنا پڑتا ہے لیکن وہ محکوم ملک کو ایسا تباہ حال بنا دیتی ہے کہ صدیوں تک اس میں صحیح معیار زندگی قائم نہیں ہو سکتا ،،

سچ پوچھئے تو آزاد ممالک وطنیت اور وطن پرستی کے سچے معنوں میں علمبردار ہیں ۔ وہ آزادانہ اپنے اہل مُلک کی بہبودی اور بہتری کی تجویزوں کو عملی جامہ پہناتے ہیں ۔ صنعت و حرفت کو فروغ دے کر اپنے ملک کے بیکار باشندوں کو کام میں لگاتے ہیں ۔ اعلےٰ دماغ کے مالکوں سے بہترین کام لیتے ہیں ۔ رفاہِ عام کے کاموں میں ہر ذی استطاعت شخص بغیر کسی منظم تحریک کے خود بخود آگے بڑھتا ہے ۔ بچوں اور عورتوں کو ایسی تعلیم دی جاتی ہے جس کی حقیقت

میں ان کے مُلک کو ضرورت ہوتی ہے۔ ہر نوجوان کو فن سپاہگری کے اصول سکھا کر اپنے مُلک کو بیرونی حملوں سے محفوظ رکھنے کے لئے تیار کیا جاتا ہے۔ برخلاف اس کے محکوم مُلک کو ہر رفاہ عام کے کام کے لئے حکومت کی سرپرستی اور رہنمائی کی ضرورت رہتی ہے۔ آزادی کھودینے سے ہر قسم کے جوہر ضایع ہوجاتے ہیں تمام قوتیں سلب ہوجاتی ہیں۔ اور خاص طور پر قوّتِ عمل مفقود ہوجاتی ہے۔ کہ ترقی اور عروج کا زینہ ہے ؎

حُبِ وطن کا اقتضاء حُبِ وطن کا حقیقی اقتضا یہ ہے کہ محبّ وطن اپنے مُلک کو اپنا مطمحِ نظر بنائے۔ نیز ذاتیات اور تخصیصات کی دلچسپی سے بالاتر رہے۔ مُلک کے فائدے اور بہبودی کے لئے انفرادی فائدے کو قُربان کرے۔ اور ایسے مضر اسباب کو دُور کرے جو مُلک کی ترقی میں حائل ہوں۔ ظاہر ہے یہ کام ایک شخص کا نہیں۔ بلکہ ہر شخص کا فرض ہے کہ وہ زندگی کے جس شعبے سے بھی تعلق رکھتا ہے۔ اسکی ترقی اور توسیع سے تمام مُلک کو فائدہ پہنچانے کی کوشش کرے ؎

خدمتِ خدا و خلق ہے نشاطِ زندگی اسمیں اپنا جان و مال شوق سے لگائے جا

قومی عظمت قائم رکھنے کے لئے محبانِ وطن کے دل ہمیشہ بیقرار رہتے ہیں۔ اور وہ ایسے مواقع کے دل و جان سے منتظر نظر آتے ہیں جن کی بدولت ان کو تمام مُلک کی خدمت انجام دینے کا موقعہ ملے۔ یہی وہ لوگ ہیں جو سچے محبانِ وطن ہیں۔ اور ان کے نام اور کارنامے

تاریخوں میں جلی حروف میں لکھے جاتے ہیں اگرچہ انکا وجود دست برُد سے محفوظ نہیں رہتا۔ لیکن ان کا نام رہتی دُنیا تک قائم رہتا ہے۔

محبّانِ وطن قومی عظمت کا باعث ہیں۔	قاعدہ ہے کہ کسی قوم کو قومی عظمت اور وقار ایک دم حاصل نہیں ہُوا کرتا۔ بلکہ بعد میں

آنے والی نسلیں اپنی بلند ہمّتی اور قوّتِ عمل سے اس عظمت کو بڑھاتی ہیں جو ان کو وراثتاً حاصل ہوتی ہے۔ برخلاف اس کے جو اقوام آرام طلبی اور خود غرضی میں مبتلا ہوجاتی ہیں۔ اخلاف کے ہاتھوں ان کا رہا سہا وقار بھی ضایع ہوجاتا ہے۔

قوموں کی ترقی اور عروج کا انحصار قوموں کی قوّتِ عمل اور بلندیٔ نظر پر ہے۔ حکومتیں کسی قوم میں بھی قوّتِ عمل کی رُوح نہیں پھُونک سکتیں اگر وہ ایسا کریں تو ان کی حکومت قائم نہیں رہتی اس لئے قومی عظمت ہمیشہ انفرادی کوشش سے حاصل ہوتی ہے۔ وطن کی سچّی محبّت کے یہی معنی ہیں کہ قومی عظمت کو بڑھانے کی کوشش کی جائے۔ اور کوئی ایسا کام نہ کیا جائے جس سے ملک و قوم کی تذلیل ہو۔ اور آزادی کا جذبہ سلب ہوجائے یا محکوم ہوکر ملکی تنزّل کے اسباب پیدا ہوجائیں۔

جو لوگ وطنیت کے جذبے سے سرشار ہیں وہ کبھی کوئی ایسا کام نہیں کرتے جس سے مُلک کے وقار اور عظمت کو نقصان پہنچے وہ ہمیشہ اپنے عیش و آرام کو مُلک کی بہبودی پر قربان کرکے خوش

ہوتے ہیں یہ لوگ مُلک کی سچّی خدمت کرتے ہیں مگر کسی صلے یا انعام کی توقع نہیں رکھتے۔ قومی خدمات ان کو مفلس بنا دیتی ہیں۔ لیکن روپیہ نہ ہونے سے ان کے شخصی اور قومی وقار میں فرق نہیں آتا۔ جیل خانوں میں مدتوں محنت اور مشقت کرتے ہیں۔ حکومت کے جا و بیجا ظلم اُٹھاتے ہیں۔ لیکن مُلک کی محبت کا نشہ ان کے دماغ سے نہیں اُترتا۔ جب قید و بند سے چھوٹتے ہیں قومی خدمت کا جذبہ ان کے دلوں میں اور زیادہ بھڑکتا ہے۔ ان کی مثالیں سینکڑوں نہیں ہزاروں ہیں جو مُلکی خدمت کا شوق پیدا کرتی اور قربانی دینا سکھاتی ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کی مثالیں قومی ترقی اور مُلکی عروج کے لئے مشعلِ ہدایت کا کام دے سکتی ہیں۔

حُبِ وطن میں ہندوستان کی نجات ہے۔

حُبِ وطن کا فقدان یُوں تو ہر ملک کو نقصان پہنچاتا ہے لیکن ہمارا ہندوستان خاص طور پر حقیقی حُبِ وطن نہ ہونے سے تنزّل اور ادبار کا نشانہ بنا ہُوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں امن قائم رکھنے کے لئے بیرونی طاقت کی ضرورت ہے۔ اگر روک تھام کے لئے ایک تیسری طاقت نہ ہو تو نااتفاقی کا یہ عالم ہے کہ ہر طاقتور انسان کمزور کو نیست و نابود کر دے۔ ہماری تجارت، زراعت اور صنعت و حرفت کو خود غرضی اور خود پرستی کی وجہ سے عروج حاصل نہیں ہو سکتا۔ ہماری قوتِ عمل ایک دوسرے کی مخالفت اور تذلیل میں صرف ہوتی ہے۔ کہیں مذہب کا جھگڑا ہے

کہیں سیاسیات کی بحث ہے۔ کہیں مجلسی اور معاشی معاملات پہ خونریزی کے منظر دیکھنے میں آتے ہیں۔ غرض قدم قدم پر اختلاف ہے۔ چپے چپے پر جھگڑا فساد ہے۔ غداری، فساد انگیزی ہمارے ملک کی ہر قوم کا شعار بن گیا ہے۔ ظاہر ہے ایسے حالات میں ترقی کرنا تو درکنار ہمارا قدیمی وقار بھی قائم نہیں رہ سکتا۔ ضرورت اِس بات کی ہے۔ کہ آپس میں اتحاد یگانگت پیدا کی جائے اور وطن کی محبت اور ملک کی بہبودی کو ذاتی مفاد پر قربان نہ کیا جائے۔ نیز مذہب کو نجات کا ذریعہ سمجھا جائے نہ کہ فساد انگیزی کا آلۂ کار۔ غرض تمام اختلافات کو مٹا کر وطن اور اہل وطن کو پیش نظر رکھا جائے۔ پھر دیکھیں کیسے ہمارا ملک اپنا کھویا ہوا وقار اور قدیمی عظمت حاصل نہیں کرتا۔

کیریکٹر

اُردو میں کیریکٹر کا مفہوم چال چلن اور رویہ کے الفاظ سے ادا کیا جاتا ہے لیکن درحقیقت جن معانی پر لفظ کیریکٹر حاوی ہے ان کو یہ الفاظ پوری طرح ادا نہیں کر سکتے۔ اس لئے ہم نے اس مضمون میں جا بجا کیریکٹر کا لفظ ہی استعمال کیا ہے۔

کیریکٹر

کیریکٹر مختلف صفات کا مجموعہ ہے اگر اس کو تخلیق انسان کا مقصد اور زندگی کا ماحصل قرار دیا جائے تو بجا ہے کیریکٹر والے لوگ اپنی اس صفت پر جس قدر بھی ناز کریں کم ہے بلکہ جس گروہ سے وہ تعلق رکھتے ہیں اگر وہ بھی ان کی ذات پر فخر کرے تو زیبا ہے حقیقت یہ ہے کہ کیریکٹر قابل فخر اور لازوال سرمایہ ہے، یہ انسان کے مرتبہ کو عام انسانوں سے بلند کرتا ہے، جس شخص کا کیریکٹر دلپذیر ہو اس کو ہر سوسائٹی میں معزز اور محترم سمجھا جاتا ہے۔ کیریکٹر کا اثر اور رُعب دولت وحشمت سے کہیں زیادہ ہے حتیٰ یہ ہے کہ اقبال و اعزاز کیریکٹر والوں کے قدم لیتا ہے۔

کیریکٹر انسان کی قلبی کیفیتوں کا آئینہ دار ہے۔ کیریکٹر والے لوگ سماج کی رُوح رواں ہیں وہ اپنی اخلاقی قوتوں کے زور سے

ہر زمانے میں بادشاہوں کی طرح حکومت کرتے ہیں، نپولین اعظم کہا کرتا تھا کہ جنگ وجدل میں اخلاقی قوت جسمانی طاقت سے دس حصے زیادہ کام آتی ہے۔ حقیقتاً ترقی یافتہ اقوام کے زرین کارنامے تمام وکمال انفرادی کیریکٹر کے ممنون احسان ہیں، ملکی تحفظ اور وقار کی بنیادیں اسی پر قائم ہیں اور قوانین و احکام اسی کا عمدہ نتیجہ ہیں۔

کیریکٹر دولت مندوں اور سرمایہ داروں سے مختص نہیں، ایک مفلوک الحال اور بے زر شخص بھی کیریکٹر کی دولت سے مالا مال ہو سکتا ہے۔ تہذیب و تمدن کے افسانے کیریکٹر کے کارناموں کے مقابلے میں ہیچ ہیں، ایک معمولی مزدور پیشہ کیریکٹر کی بدولت نام نہاد مہذب، متمدن، عالم اور عاقل شخص سے کہیں زیادہ بہتر ہے، جو لوگ کہ زیرک اور دانا کہلاتے ہیں وہ یقیناً قابل تعریف ہیں لیکن ان پر اعتماد اور بھروسہ کرنے کے لئے کسی اور چیز کی ضرورت ہے اور وہ چیز کیریکٹر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وقت ضرورت عقلا کی عقل اور جہاندیدہ اشخاص کے تجربوں سے فائدہ ضرور اٹھایا جاتا ہے لیکن رہنمائی اُن لوگوں کی قبول کی جاتی ہے جو کیریکٹر رکھتے ہیں۔

کیریکٹر ایک ایسی مسلمہ طاقت ہے کہ وہ کسی اور طاقت سے مغلوب نہیں ہو سکتی، بیشک دل بغیر دماغ کے، علم بغیر عمل کے اور چالاکی بغیر نیکی کے بھی ایک قسم کی طاقت ہے لیکن کیریکٹر کی قوت ان سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہے اور کیریکٹر کے مقابلے میں ان صفات

کی تعریف کرنی اتنی ہی دشوار ہے جتنی کسی گٹھ کترے کے ہاتھ کی صفائی یا کسی ڈاکو کی شہسواری کو سراہنا مشکل ہے ۔

شجاعت، صداقت، راستبازی، نیکوکاری کیریکٹر کی جان ہیں۔ جو شخص ان صفات سے متصف ہو۔ کوئی بہادر سے بہادر اور چالاک سے چالاک شخص بھی اس کا حریف نہیں ہو سکتا۔ کیریکٹر میں بدی کو روکنے کی طاقت ہے۔ وہ مصائب و آلام کو ہنسی خوشی برداشت کرنے کی ہمت پیدا کرتا ہے۔ سخت سے سخت امتحان کے موقع پر بھی آڑے آتا ہے۔ ناگہانی آفات سے بڑے بڑے بہادر گھبرا جاتے ہیں لیکن کیریکٹر والا شخص خندہ پیشانی سے ان کا خیر مقدم کرتا ہے، ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک بہادر سپہ سالار دشمنوں کے ہاتھوں میں پھنس گیا۔ انہوں نے اس سے کہا کیوں جی اب وہ تمہارا قلعہ کہاں گیا۔ اس نے نہایت بہادری سے اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ یہ ہے، مصیبت کے وقت ایک بہادر اور راستکار آدمی کا کیریکٹر زیادہ چمکتا ہے۔ اور اسوقت جبکہ تمام سہارے ٹوٹ جاتے ہیں وہ اپنی راستبازی کا سہارا لے کر اپنی اصلیت کو دکھاتا ہے سکندر اعظم اور راجہ پورس کی آخری گفتگو عمدہ کیریکٹر کی زندہ مثال ہے، راجہ پورس نے سکندر کا سخت مقابلہ کیا۔ تقدیر کی خوبی کہ وہ گرفتار ہوا جب اس کو سکندر کے سامنے پیش کیا گیا تو سکندر نے کہا راجہ پورس بتاؤ اب تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا جائے اس نے بیباکی

سے جواب دیا جو راجاؤں کی شان کے شایان ہے، اس مصیبت کے عالم میں جب کہ موت کا فرشتہ راجہ پورس کے سامنے دانت نکوسے کھڑا تھا اور وہ قیدی کی حیثیت رکھتا تھا اس نے کیسی جرأت سے جواب دیا، سکندرِ اعظم اس کے دلیرانہ جواب سے حد درجہ مسرور ہُوا اس نے راجہ کی ہمت اور دلیری کو دیکھ کر اس کی حکومت اسی کو واپس کر دی ۔

دنیا میں مراد مندی کی زندگی بسر کرنے کے لئے ضروری ہے کہ کیریکٹر کو شاندار بنایا جائے۔ اس میں بھی ایک نکتہ ہے، جب کوئی شخص کیریکٹر کو شاندار بنانے کی طرف متوجہ ہوگا، تو اسکو جدوجہد کرنی لازم ہوگی، یہی جد و جہد اس کے دل میں مقابلے اور برداشت کی قوت پیدا کر دیگی، اور آخر کار قوت عمل کے ساتھ اس میں استقلال بھی پیدا ہو جائیگا۔ کسی کا قول ہے اگر تمہاری زندگی کا معیار بلند نہ ہو تو کچھ مضایقہ نہیں، تم ایک بلند معیار زندگی قائم کر لو، اور اس کے قائم رہنے کی کوششیں مسلسل اور متواتر جاری رکھو، اس مقولے کی تشریح یہ ہے کہ جو شخص بلندی پر نظر نہیں رکھتا وہ لازماً پستی کی طرف مائل ہوتا ہے۔ اور نتیجہ کے طور پر اس کے خیالات پست ہو کر ہمت بھی پست ہو جاتی ہے

آدمیت سے ہے بالا آدمی کا مرتبہ
پست ہمت یہ نہ ہووے پست قامت ہو تو ہو

جو شخص بلند مقاصد پیش نظر رکھتا ہے، اگر اس کو اپنے مقصد میں کامیابی حاصل نہ بھی ہو تو بھی وہ بلند نظری سے محروم نہیں رہتا۔ اس کے علاوہ وہ شخص بلند نظر شخص اس شخص کی نسبت بدرجہا بہتر ہے جو اپنی پست حالی پر قانع رہتا ہے ۔

قول و فعل میں یکسانیت کیریکٹر کا اصل اصول ہے

کیریکٹر کا اصلی اصول یہ ہے کہ جو شخص جیسا ہو وہ اپنے آپ کو ویسا ہی ظاہر کرے، اور یہ نہ ہو کہ ظاہرا طور پر تو سب کچھ ہیں لیکن اگر ٹٹول کر دیکھو تو کچھ بھی نہیں۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک آدمی نے اپنے نوزائیدہ لڑکے کا نام ایک ایسے شخص کے نام پر رکھا جو اپنی راستبازی اور کیریکٹر کی مضبوطی کی وجہ سے شہرہ آفاق تھا، اس نے اس واقعہ کی اطلاع اس شخص کو بھی دی، اس نے جواب میں لکھا کہ کسی خاص آدمی کا نام رکھ لینا کوئی معنی نہیں رکھتا، میری درخواست یہ ہے کہ اپنے اس بچے میں جس کا نام تم نے میرے نام پر رکھا ہے وہ خوبیاں بھی پیدا کرنے کی کوشش کرو، جن کی وجہ سے تم نے اس نام کو انتخاب کا شرف بخشا ہے۔ تاکہ اس نام کی لاج باقی رہے، میرے والد مجھے ہمیشہ نصیحت کیا کرتے تھے کہ جس قسم کے تم انسان ہو ویسا ہی اپنے آپ کو ظاہر کرو تاکہ کسی ایک شخص کو بھی تمہارے متعلق کوئی غلط فہمی نہ ہو، میرے آباؤ اجداد بھی اسی اصول پر کاربند تھے، اور یہی خصوصیت ان کی شہرت اور عزت کا باعث تھی، ہم لوگوں نے اس نام نیک کی

ہمیشہ قدر کی، یہاں تک کہ یہ صفات ہمارے خاندان سے مخصوص ہوگئیں، اور یہی سبب ہیں میری شہرت اور عظمت کا، کاش کے تمہارا بچہ بھی اسم بامسمیٰ ہو"۔

جن لوگوں کے قول و عمل میں یکسانیت نہیں ہوتی ان کی کوئی شخص بھی عزت نہیں کرتا، جو کچھ ان کی زبان سے نکلتا ہے وہ صدا بصحرا سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا، ایسے لوگ اگر سچ بات بھی کہیں تو اس پر یقین نہیں کیا جاتا، کیریکٹر اسی اعتماد کو پیدا کرتا ہے، کیریکٹر کی راستبازی انسان کو ہمیشہ راہ راست پر گامزن رکھتی ہے،، نیز حرف گیری اور عیب چینی کرنے والوں کی موجودگی اور غیر حاضری کا کبھی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، وہ لڑکا کس قدر مضبوط کیریکٹر کا مالک تھا، جس سے کسی نے کہا کہ میاں لڑکے جب باغ میں کوئی نہ تھا تو تم نے دو چار سیب توڑ کر اپنی جیب میں کیوں نہ ڈال لئے، اس نے جواب دیا، جناب بیشک وہاں کوئی نہ تھا، جو مجھے روکتا یا ٹوکتا، لیکن میں خود تو وہاں موجود تھا، اور اپنے آپ کو دیکھ رہا تھا، معاف کیجئے میں اپنے تئیں بد دیانتی کرتے ہوئے کبھی نہیں دیکھ سکتا۔

یہ ادنیٰ مثال ضمیر کی صداقت اور کیریکٹر کی استقامت کی ایک معمولی سی جھلک ہے، کیریکٹر ضمیر کو کبھی مُردہ نہیں ہونے دیتا، اس کا عمل ہر وقت جاری و ساری رہتا ہے اس کی موجودگی میں

ہر قسم کے خطرات لایعنی ہیں۔ یاد رہے آزمائش چاہے وہ کتنی ہی خفیف کیوں نہ ہو اگر انسان اس میں پُورا نہ اُترے تو وہ اپنی نظروں میں خود ذلیل و حقیر ہو جاتا ہے۔ بُرے افعال اور خلاف اخلاق و قانون حرکات مجرم کی طبیعت کو ایک دم تبدیل کر دیتی ہیں، یہ اور بات ہے کہ وہ گرفت میں نہ آئیں۔ مگر ان کے ارتکاب کا خیال دل میں ایک قسم کی بےچینی پیدا کر دیتا ہے، یہی مجرم کی ناگزیر سزا ہے جس کے عذاب میں وہ ہمیشہ مبتلا رہتا ہے،

کیریکٹر عادات و اطوار کا دوسرا نام ہے

اچھی عادات سلک مروارید کی مانند ہیں۔ اگر موتیوں کی لڑی کی گرہ کھول دی جائے تو تمام موتی منتشر ہو جاتے ہیں۔ بجنسہ یہی حالت انسان کی ہے اگر اس کی عادات کو علیحدہ علیحدہ کر دیا جائے تو اس میں کچھ بھی باقی نہیں رہتا، لیکن اگر اس کی عادات کو مجموعی طور پر دیکھا جائے تو وہ اشرف المخلوقات اور فخر بنی نوع انسان ہے۔ عمدہ عادات اور برگزیدہ اخلاق ہی سے کیریکٹر میں حُسن اور پائیداری پیدا ہوتی ہے، جو اس کو عام انسانوں سے بلند کرتی ہے،

چونکہ عادات طبیعت ثانیہ ہیں۔ اور ان کا ترک محال ہے اس لئے عادات اختیار کرنے میں بڑی احتیاط سے کام لینا چاہئے۔ عادات کے متعلق یہ مقولہ بہت مشہور رہے کہ اگر تم سے کوئی شخص کہے کہ فلاں پہاڑ اپنی جگہ سے ٹل گیا تو تم بلا تامل یقین کر لو، لیکن اگر تم سے

کہا جائے کہ کسی شخص نے اپنی عادت کو تبدیل کر لیا تو تم اس بات پر یقین کرنے میں تامل کرو ۔"

کسی عقلمند نے اپنے بیٹے کو نصیحت کی تھی کہ بیٹا سن تمیز کو پہنچنے سے پہلے اپنا کیریکٹر بنا لو، وہ ساری عمر تمہارے کام آئیگا چونکہ کیریکٹر عادات سے بنتا ہے اور عادات امتداد عمر کے ساتھ ساتھ پختگی حاصل کرتی ہیں اس لئے جب عادات راسخ ہو کر کیریکٹر کا جُزو بن جاتی ہیں، تو پھر ان کو تبدیل کرنا یا ترک کرنا محال ہو جاتا ہے، اسی طرح کسی فن یا عِلم کا حاصل کرنا آسان ہے لیکن اسے حاصل کرنے کے بعد ترک کر دینا یا بھول جانا دُشوار تر ہے، اسی اصول کو مدنظر رکھتے ہوئے ایک معلم موسیقی ان شاگردوں سے دوگنی فیس لیا کرتا تھا جو پہلے کسی گھٹیا قسم کے اُستاد سے علم موسیقی کی تعلیم حاصل کر کے اس کے پاس آتے تھے ۔"

عام طور پر عادات بچپن میں راسخ ہوتی ہیں اور راسخ ہونے کے بعد وہ طبعیت ثانیہ بن کر کیریکٹر کا جزو بن جاتی ہیں گویا بچوں کی حالت اس نوخیز درخت کی مانند ہے، جس کے تنے پر کچھ حروف کندہ کر دیئے جائیں، جُوں جُوں درخت بڑھتا ہے یہ حروف بھی اسکے ساتھ نشو و نما پاتے ہیں۔ اور جب تک یہ درخت سلامت رہتا ہے وہ بجلسہ قائم رہتے ہیں۔ اسی طرح جو بات بھی بچپن میں دل پر نقش ہو جائے وہ کبھی محو نہیں ہوتی، اس لئے اگر شروع ہی سے

بچوں کو نیک عادات اور عمدہ خصائل کا عادی بنایا جائے تو وہ ہمیشہ ان پر کاربند رہتے ہیں ÷

عادات اچھی ہوں یا بُری ان میں راسخ ہونے کی قوّت موجود ہے، جن بچوں کو خوش رہنے کی عادت پڑجاتی ہے وہ ہمیشہ خوش رہتے ہیں۔ اور ہر چیز کے مسرّت بخش پہلو کو دیکھنے کے عادی ہوجاتے ہیں ایسے لوگ بد سے بدتر حالات میں بھی اس عادت سے مستفیض ہوتے ہیں۔ ہر چیز کے مسرّت بخش پہلو کو دیکھنے کی عادت ہزاروں اور لاکھوں روپے سالانہ کی آمدنی سے بہتر ہے جن لوگوں کو ایسے جلیس مل جائیں جو ہر چیز کو مسرّت خیز نقطۂ نظر سے دیکھنے کے عادی ہوں انکی زندگی یقیناً قابل رشک ہے ÷

یہ معلوم کرنا دلچسپی سے خالی نہیں کہ انسان کا کیریکٹر بالکل غیر محسوس طریقے سے ان افعال و حرکات سے مرتب ہوتا ہے جن سے اس کو کسی قسم کا فائدہ پہنچتا ہے، یہ ضروری نہیں کہ یہ فائدہ مالی منافع ہی ہو، بچپن میں محض تسلّی اور تسکین قلبی کو فائدہ سمجھا جاتا ہے۔ جُوں جُوں انسان کی عمر بڑھتی ہے اس فائدہ کی حدود بھی بڑھتی چلی جاتی ہیں اس سلسلہ میں یہ بھی یاد رکھنا ضروری ہے کہ اگر ابتدائے زندگی میں صداقت دیانتداری اور دیگر اچھی عادات سے انسان کو کسی قسم کا نقصان پہنچ جائے تو پھر اس کی طبیعت اس طرف راغب نہیں ہوتی اور اگر حُسن اتفاق سے ان عادات کا معقول صلہ حاصل ہو تو

جب کبھی اس قسم کے حالات پیش آئینگے انسان عادتاً وہی کریگا جو شروع میں کرتا رہا ہے۔ یہانتک کہ یہ عمل بار بار ہونے سے طبیعت میں راسخ ہوجائیگا اور پھر چاہے ان کا صلہ ملے یا نہ ملے اسی طرح ظہور کرتا رہیگا، بلکہ اگر سخت سے سخت نقصان پہنچنے کا بھی امکان ہوگا یا واقعی کوئی نقصان پہنچیگا تو پھر بھی وہ صداقت اور دیانتداری وغیرہ کے جوہر دکھائے بغیر باز نہ آئیگا؛

جن لوگوں کو تربیت اطفال سے شغف ہے وہ ہمیشہ اس اصول کو مدنظر رکھ کر بچّوں کو افعال حسنہ اور اطوار نیک کی طرف رغبت دلاتے اور ان کا دل بڑھاتے ہیں، جب بچّے نیکوکاری اور راستبازی کے فائدہ کو اخذ کر لیتے ہیں تو آہستہ آہستہ خودبخود ان کے عادی ہوجاتے ہیں۔ آخرکار یہ عادات ان کی طبیعتوں میں راسخ ہو کر طبیعت ثانیہ بن جاتی ہیں۔ اور پھر کسی حالت میں بھی وہ ان عادات سے دستبردار نہیں ہوتے، جب کوئی عادت راسخ ہوجاتی ہے تو اس کو تبدیل کرنا تقریباً ناممکن ہے؛

ہم بتا چکے ہیں کہ عادات کسی استفادہ کی وجہ سے مضبوط ہوتی ہیں، لیکن جب کوئی عادت قائم ہوجاتی ہے تو استفادہ کا نظریہ غائب ہوجاتا ہے۔ اور یہ عادت ہماری فطرت کا جزو بن جاتی ہے۔ کسی عادت کو اسوقت چھوڑنا اور ترک کرنا آسان ہے جبکہ وہ بالکل ابتدائی حالت میں ہو اور طبیعت میں پوری طرح راسخ نہ ہوئی ہو،

لیکن جب وہ راسخ ہو جائے تو پھر چھوڑے نہیں چھوٹتی، عام طور پر کسی عادت کے ترک کرنے کا کامیاب طریقہ یہ ہے کہ جس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے کوئی بُری عادت پڑی ہو اس کے لئے کوئی اور بہتر طریقہ اختیار کیا جائے تاکہ پہلی بُری عادت جاتی رہے اور دُوسری بہتر عادت اس کی جگہ لیلے۔

اگر کوئی بُری عادت پختہ ہو جاتی ہے تو پھر یہ طریقہ کام نہیں آتا، ایسی صورت میں کسی قدر سختی سے کام لے کر یہ بات بار بار جتانی پڑتی ہے کہ اس کا انجام بُرا ہو گا، گویا اس کو روکنے کے لئے ہم براہ راست رُکاوٹیں پیدا کر کے بچّوں کے دل کو اس کی طرف سے متنفر کرتے ہیں، اگر ان کے دل میں یہ بات بیٹھ جائے کہ کوئی خاص عادت قابل نفرت یا نقصان دہ ہے تو وہ خود بخود اس عادت کو ترک کرنے کی کوشش کرنے لگتے ہیں لیکن پھر بھی اکثر یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ اگر کوئی بُری عادت طبیعت میں راسخ ہو جائے تو اس کو اسوقت تک روکا جا سکتا ہے جب تک کہ طبیعت کو اس کی بُرائی کا احساس رہے، جونہی انسان اس سے غافل ہوتا ہے غفلت کے عالم میں پھر وہی حرکت سرزد ہو جاتی ہے، لیکن یہ بات کیا کم ہے کہ انسان اپنے دل ہی دل میں شرمندہ ہو کر اپنی طبیعت کو پھر مضبوط کرتا ہے کہ یہ حرکت اس سے دوبارہ سرزد نہ ہو۔

مختلف الطبع ہونے کے اسباب	ہر ایک بچّہ اپنی مختصر سی ضرورتیں

ماں کے پیٹ سے اپنے ساتھ لاتا ہے، وہ پیدا ہوتے ہی رو کر خوراک اور جسمانی آرام طلب کرتا ہے، اس کے بعد اس میں اپنی طرف متوجہ کرنے اور بات منوانے کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ جن افراد سے اس کی یہ خواہشیں پوری ہوتی ہیں وہ طبعاً ان سے مانوس ہوجاتا ہے۔ اور لطف یہ ہے کہ وہ اپنی معصومانہ حرکات وسکنات سے اپنی دلی خوشی اور قلبی تسلی کو ظاہر کرتا ہے، آہستہ آہستہ وہ ان حرکات کا عادی ہوجاتا ہے جن کے ذریعہ اس کی ضرورتیں پوری ہوتی ہیں گویا بچہ وہی رویہ اختیار کرتا ہے جس سے اس کو فائدہ حاصل ہوتا ہے، ان حالات کو دیکھتے ہوئے ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ بچہ کی ابتدائی زندگی کے تجربات غیر معمولی اہمیت رکھتے ہیں کیونکہ انہی کے اثر سے آیندہ زندگی کا راستہ تیار ہوتا ہے"

ابتدائی زندگی کے تجربات ہی سے مختلف قسم کے انسان تیار ہوتے ہیں۔ ورنہ پیدائش کے وقت بچوں میں کوئی نمایاں فرق نہیں ہوتا اس اجمال کی تفصیل کے لئے فرض کیجئے دو مسافر ایک راستے پر چلے جاتے ہیں۔ کچھ فاصلے پر یہ راستہ دو راستوں میں منقسم ہوجاتا ہے ایک شمال مغرب کو جاتا ہے اور دوسرا شمال مشرق کو، جب وہ دونو ایک دوسرے سے جدا ہوتے ہیں تو شروع شروع میں ان میں بہت کم فاصلہ ہوتا ہے وہ جوں جوں آگے بڑھتے ہیں درمیانی فاصلہ وسیع ہوتا چلا جاتا ہے یہانتک کہ

ان کو ایک دوسرے کے حال کی بھی خبر نہیں رہتی، مختلف قسم کے تجربات اور آزمائشیں انہیں بالکل مختلف قسم کا انسان بنا دیتے ہیں۔

اپنے تجربات کی بنا پر ایک بچّہ اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ رونے سے اس کو گود میں اُٹھا لیا جاتا ہے۔ برخلاف اس کے کوئی دوسرا بچّہ اگر روتا بھی ہے تو اس کی پروا نہیں کی جاتی، ایسی صورت میں پہلا بچّہ گود میں جانے کے لئے ہمیشہ رو کر اپنی خواہش کا اظہار کریگا اور دوسرا بچّہ اپنے تجربے کی بنا پر رونے کو فعل عبث سمجھیگا، کیونکہ اس کے معصومانہ تجربے کے مطابق رونے سے اس کی حاجت پُوری نہیں ہوتی، اگر بچّوں کا یہ رویہ بچپن ہی میں ختم ہو جاتا تو کچھ مضایقہ نہ تھا، لیکن مصیبت یہ ہے کہ یہ فرق ہمیشہ رہتا ہے۔ اور دو بچّوں کو دو مسافروں کی طرح دو مختلف راستوں پر ڈال کر ان کے عادات واطوار میں نمایاں فرق پیدا کر دیتا ہے۔ جن بچّوں کی تربیت پہلے بچّہ کی طرح ہوتی ہے وہ بچپن کی عادت کے مطابق اپنی ہر خواہش کو رو دھو کر پُورا کراتے ہیں اور طبعاً شاکی اور رونکھے بن جاتے ہیں۔ سن تمیز کو پہنچنے کے بعد بھی ان کی ہمیشہ یہی آرزو رہتی ہے کہ کوئی اُن کی شکائتیں سُنے اور اظہار ہمدردی کرے، غرض وہ ذرا سی تکلیف بھی برداشت نہیں کر سکتے اور ہارے ہوئے انسان کی طرح زندگی بسر کرتے ہیں ؂

اس اصول تربیت کے ماتحت وہ بچے جو اظہار مسرت سے اپنی

خواہشیں پوری کرانے کے عادی ہو جاتے ہیں ان کی تمام زندگی ہنسی خوشی گزرتی ہے اور وہ بچہ جس کی گریہ وزاری کی کوئی پروا نہیں کرتا بڑا صابر و شاکر انسان ہوتا ہے۔ اگر کسی بچے کو منت سماجت سے اپنی بات منوانے کی عادت ہو جائے تو وہ تمام زندگی اپنے ہر مقصد کو اسی طرح سے حاصل کرتا ہے، بعض بچے شور و شر سے اپنی بات منواتے ہیں۔ ماننا پڑیگا کہ اس کی ذمہ داری بھی ان کی تربیت کرنے والوں پر عائد ہوتی ہے۔ ایسے بچے آگے چل کر نہایت ضدی، تندمزاج، آزاد منش اور قانون شکن اشخاص بنتے ہیں"

بعض عقلمند والدین اپنے بچوں کو ہمیشہ ترغیب دیتے ہیں کہ وہ اپنے لئے خود راستہ بنائیں اور اپنا ہر کام حتی الامکان خود انجام دیں اس ترغیب و تحریص سے ان کے دل میں یہ بات پیدا ہو جاتی ہے کہ جو کچھ کرنا ہے ہمیں خود ہی کرنا ہے، گویا وہ ہر کام میں اپنی ذات پر بھروسہ کرنے کے عادی ہو جاتے ہیں اور کسی دوسرے شخص کی رہنمائی اور امداد کے محتاج نہیں رہتے، اس کے برعکس جن بچوں کے والدین ہر قدم پر ان کو سہارا دے کر چلاتے ہیں وہ ہمیشہ دوسروں کی مدد کے طالب رہتے ہیں، حاصل یہ ہے کہ ان میں بغیر امداد کے کسی معمولی کام کو شروع کرنے کی بھی ہمت نہیں رہتی۔ شخصی ذمہ داری اور خود اعتمادی کا مادہ انکی طبعیت میں سے فنا ہو جاتا ہے +

بعض مستقل ارادہ والدین کے بچوں کو دیکھ کر اکثر تعجب ہوتا ہے کہ وہ کمزور طبیعت اور غیر مستقل مزاج کے کیوں ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ والدین کے مستقل ارادوں کی سختی سے بچوں کی قوت ارادی کمزور ہو جاتی ہے۔ اور وہ اپنے والدین کے حاکمانہ اشاروں کے غلام بن کر رہ جاتے ہیں، اگر وہ کسی کام کو اپنے خیال کے مطابق کرنا بھی چاہیں تو والدین کا رُعب اور اثر ان کو اپنا ارادہ پُورا کرنے کی اجازت نہیں دیتا، یہانتک کہ ان میں کسی مسئلہ پر غور و فکر کرنے کی صلاحیت ہی باقی نہیں رہتی ؏

تُندمزاج والدین کے بچے اپنے ماں باپ سے ہمیشہ خائف رہتے ہیں، اور ہمیشہ ان کی نظروں سے دُور رہنے کی کوشش کرتے ہیں کیونکہ ایسا کرنے سے ان کو آزادی کا موقعہ ملتا ہے۔ اس قسم کے بچے بڑے ہو کر طبعاً شرمیلے، جلد ہی گھبرا جانے والے اور گوشہ نشین ہوا کرتے ہیں ؏

بعض بچوں کو شیخیاں مارنے کی بہت عادت ہوتی ہے۔ اس عادت کے ذمہ دار بھی والدین ہیں کیونکہ وہ چھوٹے مُنہ سے بڑی باتیں سُن کر ان کی تعریف کرتے ہیں۔ اور یہ تعریف ان کو ہمیشہ کے لئے شیخی خور ابنا دیتی ہے۔ غرض اس طرح سے طرزِ تربیت ایک جیسے بچوں کو مختلف قسم کا انسان بنا دیتی ہے ؏

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر بچوں کے ماحول کو تبدیل کر دیا

جائے تو ان کا رویہ تبدیل ہو گا یا نہیں، اس سوال کا جواب یہ ہے کہ اگر ابتدائی عادات طبیعت ثانیہ کی صورت اختیار کر چکیں تو کیریکٹر تبدیل ہونا مشکل ہے، بلکہ مختلف قسم کا ماحول پیدا کرنے سے ایک شخص کا کیریکٹر دو قسم کا ہو جائیگا، اور ہمارے ملک میں یہ اکثر ہوتا ہے۔ پہلے بچوں کی تربیت اپنے گھر کے اصولوں کے مطابق ہوتی ہے اس کے بعد ان کو مدرسہ میں داخل کر دیا جاتا ہے وہاں جاکر بچہ بالکل نئے ماحول میں پہنچ جاتا ہے۔ اور اس کو عجب کشمکش کا سامنا ہوتا ہے آخرکار وہ مدرسے کے ماحول کا بھی عادی ہو جاتا ہے اور گھر کے ماحول کا بھی۔ اس طرح سے یک رُخہ انسان نہیں رہتا، بلکہ اس کی شخصیت متبائن اور مختلف کیریکٹروں کا مجموعہ بن جاتی ہے۔

ایک جیسی تربیت

تعلیم و تربیت کا اثر معلوم کرنے کے بعد یہ بھی جاننا ضروری ہے کہ ایک گھرانے میں مختلف قسم کے اوضاع واطوار کے بچے ہونے کا کیا سبب ہے؟ جب ان کا ماحول ایک طرح کا ہے تو ان کے کیریکٹر علیحدہ علیحدہ کیوں ہیں، معلوم ہونا چاہیئے کہ دو بچوں کو ایک جیسی تربیت دینا قطعی ناممکن ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ سب سے پہلے والدین کے مزاج میں امتداد ایام کے ساتھ ساتھ مختلف قسم کی تبدیلیاں پیدا ہو جاتی ہیں، جس شوق اور محبت سے وہ پلوٹھی کے بچے کو پالتے ہیں دوسرے کے ساتھ

ویسا سلوک کبھی نہیں کرتے، ناتجربہ کاری کی وجہ سے پہلے بچّہ کی زیادہ دیکھ بھال ہوتی ہے۔ پھر پہلے بچّہ کا تجربہ دوسرے کے ساتھ کام آتا ہے اکثر اوقات حالات تبدیل ہو جاتے ہیں صحت میں فرق آجاتا ہے۔ میاں بیوی کے باہمی تعلّقات پہلے جیسے نہیں رہتے، عمریں بڑھ جاتی ہیں غرض سینکڑوں باتیں ایسی ہو جاتی ہیں جن کی بدولت ان کا رویہ اور نظریہ بدل جاتا ہے۔ اسکے علاوہ بچّے ایک دوسرے سے چھوٹے بڑے ہوتے ہیں اور چھوٹا بڑا ہونا بہت کچھ معنی رکھتا ہے پھر یہ ضروری نہیں کہ اوپر تلے کے بچّے بھائی بھائی ہوں، ممکن ہے دوسری اولاد لڑکی ہو، لڑکی کے مقابلے میں اولاد نرینہ کو بہت زیادہ اہمیت دی جاتی ہے اور لڑکیوں کو ہیچ سمجھا جاتا ہے۔ جو لڑکا لڑکیوں میں پاتا ہے اسکی طبعیت اور قسم کی ہوتی ہے۔ اسی طرح جو لڑکی لڑکوں میں پرورش پاتی ہے اس کی اُفتادِ طبع کسی اور ڈھنگ پر جاتی ہے، نیز دو بچّوں کے ہم عمر اور ہم عصر بچّے ایک مزاج کے نہیں ہوتے، مختلف العمر بچّوں کی جسمانی خصوصیات بھی ایک دوسرے سے الگ ہوتی ہیں۔ ایک گرمی میں پیدا ہوتا ہے دوسرا سردی میں غرض یہ معمولی سے ابتدائی حالات ایک ہی شخص کی اولاد میں بہت کچھ اختلافات پیدا کردیتے ہیں جن کے اثر سے وہ ایک دوسرے سے بالکل مختلف قسم کے انسان بن جاتے ہیں ؎

حُسن سلوک عمدہ کیریکٹر کی نشانی ہے ۔	حُسن سلوک بڑا بھاری احسان ہے، اور لُطف یہ ہے کہ اس کے لئے کسی سرمایہ کی

ضرورت نہیں، چاہے جیب میں پھوٹی کوڑی نہ ہو لیکن حُسن سلوک سے دوسرے کو بے دام غلام بنایا جاسکتا ہے، محبّت بھری نگاہیں اور نرم و ملائم الفاظ وہ کام کرتے ہیں جو سینکڑوں روپے دے کر بھی نہیں ہو سکتے، جو لوگ اپنے ہمجنسوں کے ساتھ محبّت اور مروّت سے پیش آتے ہیں وہ اپنے ماحول کو اس طرح منوّر کرتے ہیں جیسے آفتاب و مہتاب کی روشنی خاموشی کے ساتھ تمام فضا کو روشن کر دیتی ہے، اسی لئے کہا جاتا ہے کہ حُسن سلوک تمام طاقتوں سے زیادہ طاقتور ہے، اور وہ اپنا راستہ اس خاموشی اور کامیابی کے ساتھ بناتا ہے جس طرح خوشنما پھول شاخوں میں سے پھوٹ آتے ہیں کس قدر بدقسمت انسان ہیں وہ لوگ جو حقیقی مسرّت کو ان داموں بھی نہیں خرید سکتے ۔۔

خلق و مروّت کی کوئی قیمت نہیں لیکن پھر بھی ان کے بدلے میں ہم ہر چیز خرید سکتے ہیں۔ دُنیا میں سب سے سستی چیز مہربانی ہے مہربانی کرنے میں نہ تو کچھ خرچ ہوتا ہے اور نہ کسی قسم کی تکلیف ہوتی ہے لیکن پھر بھی بعض بدقسمت لوگ مہربانی کرنے میں تامل کرتے ہیں، ہمیشہ یاد رکھنا چاہئے کہ مہربانی ایسی قوّت ہے جس سے لوگوں کے دلوں اور سرمایہ پر نہایت آسانی سے قبضہ کیا جاسکتا ہے ۔

عمدہ عادات اور اچھے اخلاق انسانی زندگی کا زیور اور قوتِ عمل کا حسن ہیں، خوش کلامی سے قدر و منزلت میں چار چاند لگتے ہیں حقارت آمیز طرزِ گفتگو کو کوئی پسند نہیں کرتا لیکن پھر بھی ایسے لوگ بکثرت موجود ہیں جو اپنی درشت کلامی پر ناز کرتے ہیں، یہی وہ لوگ ہیں جن سے تعاون کرنا اخلاقی گناہ ہے، درشت کلام شخص ممکن ہے کہ کسی کو کوئی مالی نقصان نہ پہنچا سکے لیکن وہ اپنی بُری عادت سے ہر شخص کے دل کو صدمہ پہنچاتا اور اس کے جذبہ خودداری کے نازک شیشے کو چکنا چور کر دیتا ہے، برخلاف اس کے نیک اطوار اور خوش اخلاق لوگ ہر موقعہ پر جھک کر اپنی بزرگی اور بڑائی کا ثبوت دیتے ہیں ؎

لیتے ہیں ثمر شاخِ ثمر ور کو جھکا کر　　جھکتے ہیں سخی وقتِ کرم اور زیادہ

جنٹلمین | جنٹلمین اس شخص کو کہتے ہیں جس کی ذات میں تمام اوصاف حمیدہ مجتمع ہوں، راستبازی، دیانتداری، غریب نوازی، منکسر المزاجی۔ خودداری، متانت سنجیدگی وغیرہ وغیرہ اس کے عام فضائل ہیں، غرض انسان کامل کو جنٹلمین کا لقب دیا جاتا ہے اور حق یہ ہے کہ ایسا ہی شخص انسان کہلانے کا مستحق بھی ہے، یاد رہے ان لوگوں کے خواص فیشن اور وضعداری کے ممنون نہیں، جیسا کہ جنٹلمین کے متعلق عام طور پر خیال کیا جاتا ہے۔ بلکہ وہ سر تا پا اخلاق مجسّم ہیں۔

جنٹلمین اپنی صفات کی بدولت ہر جگہ الگ پہچانے جاتے ہیں ہر جنٹلمین اپنے کیرکٹر کی قدر کرتا ہے۔ وہ بھی اتنی زیادہ نہیں کہ

لوگ اس پر حرف گیری کریں، بلکہ اس قدر جسے وہ خود محسوس کر سکتا ہے۔ اس کو ہر دم اپنے ضمیر کا خیال لگا رہتا ہے کہ وہ اسے کیا ہدایت کرتا ہے، جس طرح وہ اپنی عزّت کا خیال رکھتا ہے اسی طرح دوسروں کے جذبات اور احساسات کا احترام بھی کرتا ہے، وہ ہمیشہ نرمی اور درگذر سے کام لیتا ہے، اور اپنی شیریں کلامی اور اخلاق حسنہ سے دوسروں کے دلوں میں اپنے لئے خاص جگہ پیدا کرتا ہے ؛

سچّا جنٹلمین ذلیل و رکیک حرکات سے پرہیز کرتا ہے، راستبازی اس کے قول و عمل سے منعکس ہوتی ہے، وہ حیلہ بازی اور ریاکاری سے کوسوں دُور ہے، دیانتداری اور راست کاری اسکا ایمان ہے، اس کا قانون درست کرداری ہے وہ ہمیشہ خود صحیح راستہ پر چلتا اور دوسروں کو اپنے قول و عمل سے صداقت کی ترغیب دیتا ہے، اگر وہ ہاں کہدیتا ہے تو یہی اس کا قانون ہے کیا مجال، جو اپنے لفظ سے پھر جائے اور ہمیشہ صحیح موقعہ پر اس کے منہ سے نکلتی ہے، جنٹلمین کی مخصوص صفت یہ ہے کہ رشوت اور لالچ دیکر اس کو صحیح راستے سے نہیں ہٹایا جا سکتا ؛

دولت اور مرتبے کا ان خصوصیات سے کوئی تعلق نہیں، جو ایک جنٹلمین سے مخصوص ہو سکتی ہیں۔ ایک بالکل غریب و نادار شخص بھی جنٹلمین ہو سکتا ہے بشرطیکہ اس میں وہ تمام صفات

موجود ہوں جو ایک جنٹلمین میں ہونی ضروری ہیں اکثر اوقات ایسی صفات جو جنٹلمین کی مابہ الامتیاز خصوصیات ہیں ہمیں بعض افراد میں نظر آتی ہیں۔ ان صفات کو دیکھ کر ہمیں یقین ہو جاتا ہے کہ آپ بھی جنٹلمین ہیں لیکن درحقیقت یہ لوگ جنٹلمین کہلانے کے مستحق نہیں ہوتے، موجودہ دور ترقی اور تہذیب کا دور ہے۔ اس میں اصل و نقل میں تمیز کرنا محال ہے۔ جو چیز آج ایجاد ہوتی ہے کل اسکی سینکڑوں نقلیں تیار ہو جاتی ہیں اور اصل اور نقل میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔ یہی حالت اصلی اور نقلی جنٹلمین کی بھی ہے، بہت سے لوگ جن کا کیریکٹر کچھ بھی نہیں ہوتا وہ اپنے آپ کو بہت بلند معیار کا انسان ظاہر کرتے ہیں اور نہایت آسانی سے ہم لوگ انکے دھوکے میں آجاتے ہیں۔ لیکن جب عمل کا موقعہ آتا ہے تو ان کی اصلیت بہت جلد بے نقاب ہو جاتی ہے۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ کسی دریا میں سخت طغیانی آئی، وہ مکان جو دریا کے قریب تھے تمام و کمال دریا بُرد ہو گئے، محض ایک مکان باقی رہ گیا۔ اس کے چاروں طرف دریا ٹھاٹھیں مار کر بہ رہا تھا۔ اور معلوم ہوتا تھا کہ وہ بھی بتاشے کی طرح بیٹھنے والا ہے وہ لوگ جو مکان کے اندر تھے، نہایت حسرت و یاس سے آنیوالے وقت کے منتظر تھے، بہت دُور کنارے پر سنگدل تماشائی ان کا تماشا دیکھ رہے تھے، ان تماشائیوں میں ایک دولتمند بھی تھا۔

وہ اس منظر سے حد درجہ متاثر ہُوا، اس نے کہا مَیں اس شخص کو اتنے ہزار روپے دونگا جو ان لوگوں کی جانیں بچائیگا۔ یہ سُن کر اس ہجوم میں سے ایک نوجوان جو پھٹے پُرانے کپڑے پہنے ہوئے تھا، چند قدم آگے بڑھا، اس نے کہا کشتی لاؤ، مَیں ان لوگوں کی مدد کرونگا جب اس نے کشتی دریا میں ڈالی تو دیکھنے والے دریائے حیرت میں غرق ہوگئے اور ہر طرف سے ایک غلغلہ اُٹھا، شاباش اور زندہ باد کے نعروں میں وہ نوجوان ان موجوں کو کاٹتا ہُوا جو خونخوار نہنگوں کی طرح مُنہ پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف سے حملے کر رہی تھیں اس مکان کے قریب پہنچ گیا مددِ خداوندی اور ہمت مردانہ سے وہ اپنے ارادے میں کامیاب ہُوا اور ان تمام لوگوں کو موت کے پنجے سے نکال کر کنارے پر لے آیا، تماشائیوں کے ہجوم نے اس کا استقبال نہایت جوش وخروش سے کیا، اور مردانگی کی داد دی، وہی دولتمند جس نے انعام دینے کا وعدہ کیا تھا، ہجوم کو چیرتا ہُوا اس نوجوان کے پاس آیا اور کہا "بہادر نوجوان لو یہ ہے تمہاری بہادری کا صلہ" نوجوان نے کمال سکون سے جواب دیا، جناب شکریہ، میں اپنی زندگی کو نہیں بیچتا، یہ روپیہ انہی لوگوں کو دیدیجئے ان کا کُل اثاثہ مکان کے ساتھ دریا بُرد ہو چکا ہے۔ اور ان کو حقیقتاً اس کی ضرورت ہے"۔

جنٹلمین جو ارادہ کرتا ہے اس کو سخت سے سخت حالات میں بھی پُورا کئے بغیر باز نہیں رہتا، وہ اپنی آن پر جان قُربان کر دیتا ہے"

اور ہمیشہ ذلت کی زندگی پر موت کو ترجیح دیتا ہے، وہ اپنے قول اور فعل کا صادق ہوتا ہے۔ اور سمجھتا ہے کہ صداقت ہی زندگی کا اوج وکمال ہے، قدم قدم پر اس کے افعال و اطوار سے راستبازی ٹپکتی ہے، شجاعت اور بُردباری اس کی مخصوص صفات ہیں، اسکا دل فراخ اور نقطۂ نظر وسیع ہوتا ہے۔ وہ کبھی ظلم نہیں کرتا اور نہ کسی ظالم کا ساتھ دیتا ہے، ہمیشہ مصیبت زدوں پر ترس کھاتا اور ان کی دامے درمے قدمے مدد کرتا ہے۔ نیز جُرم بخشی اور خطاپوشی اس کی عام عادات ہیں ٭

جنٹلمین کی شناخت

یُوں تو جنٹلمین کی شناخت کے بہت سے طریقے ہیں، لیکن ایک امتحان ایسا ہے جو کبھی ناکامیاب نہیں ہوتا جنٹلمین کو پہچاننے کے لئے سب سے پہلے ہمیں یہ دیکھنا چاہیئے کہ وہ اپنی قوت کو اپنے ماتحتوں پر کس طرح صرف کرتا ہے، بچّوں اور عورتوں کے ساتھ اس کا کیا سلوک ہے بحیثیت آقا کے اس کا نوکروں کے ساتھ کیسا برتاؤ ہے۔ اگر وہ معلّم ہے تو وہ اپنے شاگردوں کے ساتھ کیونکر پیش آتا ہے۔ غرض وہ ہر حیثیت میں اپنے سے کمزوروں کے ساتھ کس قسم کا رویہ روا رکھتا ہے ٭

جو شخص ان لوگوں پر سختی کرتا ہے جو اپنی کمزوری کی وجہ سے اس کا مقابلہ نہیں کرسکتے، وہ جنٹلمین نہیں کمینہ انسان ہے، جو شخص کمزوروں اور بیکسوں پر ظلم روا رکھتا ہے وہ کمینہ بھی ہے اور

بزدل بھی، اور انسان کہلانے کا مستحق نہیں، ظالم انسان غلامانہ
ذہنیت رکھتا ہے اور اس کے افعال اس کی دلی حقیقت کو
طشت از بام کرتے ہیں، طاقت اور قوت جنٹلمین کے کیریکٹر میں
عالی ہمتی کی صفت پیدا کرتی ہے۔ وہ اپنی طاقت کو کبھی بیجا صرف
نہیں کرتا، بلکہ اس کو استعمال کرنے میں حد درجہ احتیاط کرتا ہے،
وہ سمجھتا ہے دیو جیسی طاقت رکھنا بہت خوب ہے لیکن اس کو دیو
کی طرح استعمال کرنا سخت ظلم ہے ÷

ملائمت اور شرافت جنٹلمین ہونے کی بہترین نشانیاں ہیں،
دوسروں کے جذبات اور احساسات کا احترام، اپنے سے کم
درجہ لوگوں، برابر والوں اور ماتحتوں کا خیال رکھنا سچے جنٹلمین کا
عام خاصہ ہے، وہ خود تکلیف اُٹھاتا ہے لیکن کسی اور کو تکلیف
نہیں پہنچنے دیتا، وہ دُوسروں کی خامیوں اور کوتاہیوں کا خمیازہ
خود بھگت لیگا اور کبھی حرف شکایت زبان پر نہ لائیگا، یہانتک
کہ وہ جانوروں پر بھی مہربانی کریگا، وہ اپنی دولت پر کبھی غرور
اور رتبہ پر فخر نہیں کرتا، بڑی سے بڑی ناکامیابی اور سخت سے
سخت صدمہ اس کے دل کو کبھی غیر معمولی طور پر ملول نہیں کرتا
وہ اپنا ہمخیال بنانے کے لئے دوسروں کو مجبور نہیں کرتا، وہ
اپنا خیال ظاہر کرنے سے کبھی باز نہیں آتا۔ لیکن اس میں بھی
وہی اصول مدنظر رکھتا ہے کہ کسی کے دل کو رنج نہ پہنچے، وہ کبھی

اس نیت سے مہربانی نہیں کرتا کہ کوئی اس کا ممنون احسان ہو اور اس کے بدلے میں اس کے ساتھ نیکی کرے، غرض جنٹلمین نہایت عمدہ کیریکٹر کا مالک ہوتا ہے اور وہ ہر جگہ عزت و احترام کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔ جس طرح دن کی روشنی بہت ہی چھوٹے چھوٹے سوراخوں سے دکھائی دے جاتی ہے اسی طرح معمولی معمولی باتوں سے اس کے کیریکٹر کا پتہ چلتا ہے +

کیریکٹر کیوں ضروری ہے

ہر شخص کی قدر و قیمت کا اندازہ اس کے چال چلن سے ہوتا ہے برا کیریکٹر رتبہ کو گھٹاتا اور انسان کو اپنی اور دوسرے لوگوں کی نظروں میں ذلیل و حقیر بناتا ہے، زندگی کے تمام کاروبار میں عقل و حکمت سے زیادہ کیریکٹر کام آتا ہے۔ اچھا کیریکٹر مشکلات اور مصائب کے وقت انسان کے پائے استقلال کو متزلزل نہیں ہونے دیتا، کیریکٹر لالچ اور خودغرضی کے جذبات سے محفوظ رکھتا ہے۔ اچھے کیریکٹر والے لوگ اپنے اور دوسروں کے مدارج اور احساسات کا ہمیشہ احترام کرتے ہیں۔ وہ سوسائٹی کا آفتاب ہیں انکی شعاعیں تاریکی میں اُجالا پیدا کر کے لوگوں کو جس گروہ سے ان کا تعلق ہو وہ ان کی ظاہری اور باطنی کیفیات کی آئینہ داری کرتے ہیں۔ انہی کی بدولت ملک و قوم عزت اور عروج پاتی ہے۔ یاد رہے جس قوم میں اچھے کیریکٹر والے افراد کا قحط پڑ جائے وہ تنزل پذیر ہونے لگتی ہے اور کبھی ترقی کے مدارج پر فائز نہیں ہو سکتی +

اگلے وقتوں کی سواریاں

قدیمی سواریاں:۔

اگر ہم آج سے سو سوا سو سال پہلے کی سواریوں کو دیکھ لیں تو ہنستے ہنستے دوہرے ہو جائیں۔ اور تعجب کریں کہ ہمارے بزرگ ان میں کس طرح سیر و سفر کرتے تھے۔ اگرچہ زمانہ کافی ترقی کر چکا ہے۔ لیکن ایسے دور اُفتادہ علاقوں میں جہاں تہذیب حاضرہ کے اثرات نہیں پہنچے ہیں اب بھی پرانے زمانے کی سواریاں دکھائی دینگی۔ ہم قدیمی سواریوں پر جتنا چاہیں ہنس لیں۔ اور اعتراض کر لیں لیکن ان کے پُر وقار ہونے سے ہم انکار نہیں کر سکتے۔ بات یہ ہے جیسا زمانہ تھا، جس طرح کی ضرورتیں تھیں جیسی لوگوں کی مالی حالت تھی اسی طرح کی سواریاں تھیں۔ اب زمانہ بدل گیا۔ زمانے کی رفتار تبدیل ہو گئی۔ ہر چیز میں پھرتی اور تیزی کی ضرورت ہے۔ اسی طرح سواریاں بھی ضرورت کے مطابق آہستہ آہستہ تبدیل ہوتی چلی گئیں۔ کوئی دن آئیگا جب آنے والی نسلیں ہمارے زمانے کی سواریوں کو تعجب کی نظر سے دیکھیں گی اور جس طرح ہم اگلے لوگوں کی سواریوں پر اعتراض

کرتے ہیں، اسی طرح وہ ہماری سواریوں پر نکتہ چینی کرینگی ۔

مختلف ذرائع نقل و حرکت | اگر آجکل کے زمانے میں کوئی پینس یا پالکی میں بیٹھ کر نکلے تو دیکھنے والے حیران ہو جائیں اور کھلکھلا کر ہنس دیں لیکن پُرانے زمانے کے لوگ پینس، پالکی ہوادار اور تام جھام ہی میں بیٹھنا اپنی شان سمجھتے تھے۔ نوجوان گھوڑوں پر سوار ہوتے اور غریب لوگ ڈولی ہی میں بیٹھ لیتے تھے۔ لمبے سفروں میں عام طور پر بیل گاڑیاں اور رتھیں کام آتی تھیں۔ ہاتھی کی سواری رؤساء کے لئے مخصوص تھی۔ خبر رسانی کے لئے اُونٹوں اور گھوڑوں سے کام لیا جاتا تھا۔ یا پاؤں پیدل ہرکارے دوڑتے تھے۔ عام طور پر ان کی کمر میں گھونگرو بندھے رہتے تھے کہ ان کی آمد کی خبر دُور دُور تک پہنچ جائے، وہ چھم چھم کرتے ہوا کی رفتار سے بھاگتے اور پیغام رسانی کی خدمات انجام دیتے تھے ۔

پینس یا پالکی | پینس بہت پُرانے زمانے کی سواری ہے شاید یہ چین والوں کی ایجاد ہے اور وہیں سے یہاں آئی ہے سلطنت مُغلیہ کے اختتام تک اس کا خوب رواج رہا ہے۔ آجکل مردوں کا پالکی میں سواری کرنا بہت معیوب خیال کیا جاتا ہے۔ یہ سواری اکثر شادی بیاہ کے موقعہ پر دُلھنوں کو وداع کرنے کا کام دیتی ہے اب مرد اگر خواب میں بھی اپنے آپ کو پالکی میں بیٹھا ہُوا دیکھ لیں

تو شاید بُرا شگون لیں۔ کوئی زمانہ تھا کہ پالکی میں بیٹھنا فخر خیال کیا جاتا تھا۔ اور اس سواری کے لئے مرد عورت کی کوئی تخصیص نہ تھی۔ اگلے زمانے میں پالکیاں بھی حسبِ حیثیت ہُوا کرتی تھیں اب وہ باتیں کہاں رہیں۔ اُمرا کی پالکیوں پر زربفت کمخواب اور مخمل جیسے قیمتی کپڑوں کے غلاف چڑھائے جاتے جس میں جا بجا ریشم کے پھندنے لٹکتے تھے۔ بیرونی سطح پر نہایت خوشنما نقش بناتے۔ بعض پالکیاں سونے چاندی سے منڈھ دی جاتیں۔ کہتے ہیں یہ پالکیاں کئی کئی ہزار روپے میں تیار ہوتی تھیں۔ بیچ میں قیمتی قالینیں بچھتیں گاؤ تکیے لگتے کہ بیٹھنے والا جھکولوں سے محفوظ رہے پانی کی چھاگل بیچ میں رکھی جاتی یا ایک ملازم ساتھ لے کر چلتا تھا۔ کہ پیاس لگتے ہی پانی کا کٹورا پیش کر سکے۔ پینس کو نہایت سبک رفتار کہار اُٹھا کر چلتے تھے۔ عام طور پر ان کی رفتار دو تین میل فی گھنٹہ ہُوا کرتی تھی۔ رؤسا کی پینسوں کے کہاروں کی نہایت زرق برق وردیاں ہوتی تھیں۔ انکے پاؤں اس پھرتی اور توازن سے پڑتے تھے کہ دیکھ کر لطف آتا تھا۔ کہاروں کے ایک ہاتھ میں سُنہری اور روپہلی ڈنڈے ہوتے تھے۔ جہاں تھک جاتے اور کندھا تبدیل کرتے وہاں پالکی کو ان پر سہارا دیتے۔ عموماً تین چار کہار آگے اور تین چار پیچھے لگتے تھے اور ایک چھتر لئے ساتھ رہتا تھا۔ پہلو کے جس دروازے سے سواری پر دھوپ آتی چتر بردار فوراً چھتری لئے ادھر آجاتا تاکہ سواری کو تکلیف نہ ہو۔

چھتر بھی سواری کی شان کے مطابق استعمال ہوتا۔ غرض سواری کی شان کے موافق پالکی بھی ہوتی۔ اُمرا اپنی پالکی اور اپنے کہار رکھتے اوسط درجے کے لوگ پینس کے تمام لوازمات اپنے گھر میں رکھتے جب کہیں آنا جانا ہوتا پالکی کرایہ پر منگالی۔ کہاروں کو زردوز وردیاں پہنادیں۔ اور پالکی کو حسب منشاء سجا لیا ؎

عہدے دار رؤساء کی پالکیوں کے آگے گُرزبردار چلتے۔ بادشاہوں کی سواریوں کے آگے نقیب آواز لگاتا تھا۔ اور کہاروں کی بھڑک دار وردیاں اور سنہری روپہلی گرزوں کی چمک آنکھوں کو خیرہ کرتی تھی ؎

شروع میں پالکی کے دروازوں میں قیمتی پردے بھی لٹکائے جاتے تھے۔ جب یورپ کی سواریاں ہندوستان میں آئیں تو پہلوؤں میں غائب ہو جانے والے دروازوں کا رواج مقبول ہو گیا۔

تام جھام | تاریخوں میں تام جھام کا پتہ ۱۷۷۵ء کے بعد ملتا ہے۔ ممکن ہے اس کا رواج کچھ مدت پہلے سے ہو۔ بہرحال پینس اور پالکی کے بعد تام جھام بہت مقبول ہوا۔ تام جھام اور پالکی میں یہ فرق تھا کہ پالکی چھت دار اور چاروں طرف سے بند سواری تھی اور اس قدر بڑی کہ سواری اگر چاہے تو لیٹ بھی سکتی تھی۔ لیکن تام جھام ایک چھوٹی سی چھت والی کرسی کی وضع کی سواری تھی۔ اسکی چھت میں سواری کے سر پر ایک طشتری سنہری یا

رو پہلی حسب حیثیت لٹکائی جاتی تھی۔ انسان اس طرح بیٹھ جاتا تھا جس طرح کرسی پر بیٹھتے ہیں۔ اسے اُٹھانے کے لئے چھ کہاروں کی ضرورت تھی۔ چار تام جھام اُٹھاتے اور دو عصا یا نیزے لے کر ساتھ چلتے۔ اگر کسی رئیس کی سواری ہوتی تو گُرز بردار آگے آگے چلتا۔ ہندوستانی عورتیں اس کا استعمال بالکل نہیں کرتی تھیں لیکن یہ سواری یورپین لیڈیوں کو بہت پسند تھی کیونکہ خوب ہوادار اور کھلی تھی۔ دھوپ کے وقت تام جھام کی چھتری بالکل کام نہ آتی تھی۔ اس لئے ایک چتر بردار ساتھ رہتا اور سواری کو دھوپ کی تکلیف سے بچاتا۔ اس میں فائدہ یہ تھا کہ جس طرف سے دھوپ آتی چتر بردار اُس طرف ہو جاتا اور اس طرح سواری کو کسی قسم کی تکلیف نہ ہونے پاتی"۔

ڈولی پالکی اور تام جھام کی سواریاں روساء کے لئے مخصوص تھیں اوسط درجے کے آدمی خاص خاص مواقع پر ان سواریوں میں بیٹھتے تھے۔ عوام کے لئے ڈولیاں تھیں کیونکہ ڈولی بہت ہی سستی سواری تھی اس کو دو کہار اُٹھاتے تھے جہاں ڈولی کا رواج ہے وہاں اب بھی ڈولی کا کرایہ بہت سستا ہے۔ روساء زنانی سواریوں کے لئے ڈولیاں رکھتے تھے۔ لیکن ان کی ڈولیوں کے پردے عام ڈولیوں سے زیادہ قیمتی اور بھڑک دار ہوتے۔ اوسط درجے کے لوگ کرایہ کی ڈولیوں پر اپنے قیمتی اور صاف غلاف چڑھا لیتے

غرض ڈولی کی سواری ہر طبقے میں بہت زیادہ مقبول تھی۔ دہلی اور یوپی میں اب بھی اس کا رواج بہت زیادہ ہے۔ دس بارہ سال کی بات ہے کہ پردے دار قدامت پرست بیبیاں ڈولی کے سوا کسی اور سواری میں بیٹھنا معیوب خیال کرتی تھیں۔ جو عورتیں ٹانگوں میں بیٹھتیں اُن پر اعتراض کئے جاتے اب وہ باتیں خواب و خیال ہوتی جاتی ہیں۔ آہستہ آہستہ ٹانگے مقبول ہو رہے ہیں۔ پہلے ٹانگوں پر چاروں طرف پردہ باندھنا اشد ضروری سمجھا جاتا تھا۔ لیکن اب محض بُرقعہ پہن کر بیٹھ جانا ہی کافی ہے۔ آج سے دس پندرہ برس پہلے دہلی میں عورتیں گلیوں میں بُرقعہ پہن کر نکلنا از حد بُرا خیال کرتی تھیں۔ رات کے وقت تنہا راستوں میں چادر یا بُرقعہ اوڑھ کر دس پانچ قدم چل لیں تو چل لیں، ورنہ سامنے کے مکان میں بھی بغیر ڈولی میں بیٹھے جانے کو معیوب جانتے تھے۔ جُوں جُوں آزادی بڑھتی جاتی ہے ڈولی اور پردے کا رواج کم ہوتا جاتا ہے۔ کوئی دن جاتا ہے جو ڈولی تام جھام اور پالکی کی طرح معدوم ہو جائیگی ؛

بیل گاڑی:۔

جس طرح آجکل گھوڑا گاڑیاں مقبول ہیں۔ اگلے وقتوں میں یہی مقبولیت بیل گاڑیوں کو حاصل تھی۔ لمبے سفر رملیوں اور بیل گاڑیوں ہی میں ہُوا کرتے تھے۔ اگر کہیں دُور جانا ہوتا تو سر شام دروازے پر گاڑیاں آجاتیں۔ کئی کئی دن پہلے تیاریاں شروع ہو جاتیں۔ گاڑیبانوں

کو سائیاں دیدی جاتیں، ناشتے اور کھانے کا سامان ساتھ لیا جاتا اور تاروں کی چھاؤں روانہ ہو جاتے تاکہ ٹھنڈے ٹھنڈے پڑاؤ پر پہنچ جائیں۔ پندرہ بیس میل پر جاکر منزل ہوتی۔ دوپہر کا کھانا کھاکر آرام کرتے۔ دوپہر ڈھلنے کے بعد پھر سفر شروع کرتے۔ اسی طرح منزل منزل پر قیام کرتے منزل مقصود پر پہنچ جاتے۔

امیر لوگ بہلیوں کی جگہ رتھوں میں بیٹھتے۔ رتھوں میں بہلیوں کی نسبت اچھی قسم کے بیل جوڑے جاتے تھے۔ اگلے وقتوں میں ناگوری بیلوں کی بہت قدر تھی۔ جیسی جوڑی ہوتی ویسی ہی قیمت پاتی اور ان کی اس طرح دیکھ بھال کی جاتی جس طرح اعلےٰ قسم کے گھوڑوں کی کرتے تھے اور یہ بیل چلائی میں گھوڑوں سے کسی طرح کم نہ ہوتے تھے، ان کے سینگوں پر سنگوٹیاں سونے چاندی کی چڑھاتے۔ اور انہیں بنا سنوار کر رتھ میں جوڑتے تھے۔ رتھوں کو بھی حسب حیثیت سجایا جاتا تھا۔ رتھ کی چھت گنبد نما ہوتی تھی۔ اس پر بھی نہایت خوبصورت سُنہری کام کیا جاتا تھا۔ اگر کسی امیر کی سواری کہیں سے گزُرتی۔ تو بیلوں کے گھونگروؤں کی آواز سے دُور دُور خبر ہو جاتی۔ لوگ باگ اپنے کام چھوڑ کر بھاگتے کہ دیکھیں کس کی سواری ہے۔

دھکا گاڑی

۱۸۷۰ء میں ایک نئی قسم کی سواری وجود میں آئی۔ انگریز اس کو "پش پش" کہا کرتے تھے۔ ہم لوگ اس کو دھکا گاڑی

کہ سکتے ہیں کیونکہ اس کو آدمی کھینچتے تھے۔ شروع میں اس کی ہیئت ٹھیلے کی سی تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ ٹھیلے پر چھت نہیں ہوتی اس پر چھت بھی ڈالی جاتی تھی۔ اس کا دروازہ پیچھے رکھا جاتا تھا۔ جوں جوں زمانہ ترقی کرتا گیا یہ گاڑی بھی اس کے ساتھ ساتھ رہی اور ضرورتوں کے مطابق اپنے آپ کو تبدیل کرتی رہی یہاں تک کہ "پش پش" کے نام کو خیرباد کہہ کر رکھشا کہلوانے لگی ۔

اس گاڑی میں خوبی یہ تھی کہ یہ چھوٹے اور تنگ بازاروں میں آسانی سے جا سکتی تھی۔ چونکہ ہلکی پھلکی تھی اس لئے اس کو ایک دو آدمی آسانی سے کھینچ سکتے تھے۔ یورپین خواتین اس کو بہت شوق سے استعمال کرتی تھیں۔ اس کی مقبولیت کی وجہ یہ تھی کہ گھوڑا گاڑی کی نسبت اس پر خرچ بہت کم ہوتا تھا۔ اس لئے ہر متوسط الحال شخص اس کو رکھ سکتا تھا۔ پھر بھی یہ گاڑی ہندوستانیوں میں بہت کم مقبول تھی ۔

رکھشا

بعض شہروں میں اب بھی یہ گاڑی خال خال نظر آتی ہے۔ وہ بھی معدودے چند یورپین خواتین کی بدولت اس کی ہستی قائم ہے۔ ورنہ حقیقتاً اس کا عدم و وجود برابر ہے۔ ہاں صحت افزا کوہستانی مقامات پر یہ گاڑیاں رکھشا کے نام سے بہت زیادہ مقبول ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پہاڑی شہروں میں سڑکیں بہت تنگ ہیں اور چڑھائی اُترائی اس قدر ہے کہ گھوڑا گاڑی یا کوئی اور سواری

وہاں کام نہیں دے سکتی۔ اس لئے نقل و حرکت میں رکھشا ہی کام دیتی ہے۔ پانچ پانچ چھ چھ آدمی اس کو کھینچتے ہیں۔ ہموار سڑکوں پر آٹھ دس میل فی گھنٹے کی رفتار سے بھاگتے ہیں۔ اُترائی پر بھی ہوا سے باتیں کرتے ہیں لیکن جُوں جُوں چڑھائی آتی ہے رفتار ہلکی ہوتی جاتی ہے مسلسل چڑھائی میں رکھشا قُلیوں کا بُرا حال ہوتا ہے۔ ہانپتے ہیں۔ کانپتے ہیں اور پیٹ کی خاطر خُون پسینا ایک کر دیتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ رقیق القلب انسان ان کی حالت کو دیکھ کر رکھشا میں بیٹھنا گوارا نہیں کرتا۔ لیکن جہاں کوئی اور سواری نہ ہو اور سواری کے بغیر کام بھی نہ چلتا ہو وہاں رکھشا کو کیسے نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ پھر ان لوگوں کی روزی اسی رکھشا کشی پر منحصر ہے۔ اس لئے طوعاً و کرہاً رکھشا کو استعمال کرنا ہی پڑتا ہے ؎

گھوڑا گاڑی تقریباً ۱۸۷۰ء میں بیل گاڑیوں کی جگہ گھوڑا گاڑیوں نے لے لی۔ گھوڑا گاڑی کی مقبولیت کی دو وجہیں ہوئیں۔ ایک تو بیل گاڑی کی نسبت ان کی رفتار تیز تھی۔ دوسرے ان میں آرام بھی کسی قدر زیادہ ملتا تھا۔ پھر بھی اب سے دس پندرہ سال پہلے رتھوں اور بیل گاڑیوں کا عام رواج تھا۔ جہاں گھوڑا گاڑی کام نہیں دیتی تھی وہاں بیل گاڑیاں ہی چلتی تھیں ؎

ہندوستان کی بندرگاہوں میں چونکہ یورپین آبادی زیادہ تھی۔ اس لئے گھوڑا گاڑیاں سب سے پہلے وہیں وجود میں آئیں۔ چنانچہ

۱۸۷۰ء میں گِگ کا رواج ہُوا۔ گِگ کو ایک گھوڑا کھینچتا تھا۔ یورپین لیڈیز اس کو بہت پسند کرتی تھیں کیونکہ وہ خود گاڑی چلا سکتی تھیں۔ ہمارے اُمراء سائیسوں کے پاس بیٹھنا یا خود گاڑی چلانا اپنی شان کے خلاف خیال کرتے تھے۔ اس لئے یہ گاڑی ان کو مرغوب نہ تھی۔ ان گاڑیوں کے مقبول نہ ہونے کی وجہ یہ تھی کہ سڑکیں اچھی نہ تھیں۔ اور گاڑی کو خود چلانا بُرا سمجھا جاتا تھا۔

بہرحال چند سال بعد گاڑیوں کی بناوٹ میں تبدیلی واقع ہوئی۔ اب گاڑیبان کی جگہ سواریوں سے علیحدہ بنی اور نئی قسم کی گاڑی وجود میں آئی۔ یہ نئی گاڑی بالکل ایسی ہی تھی جس طرح آجکل عیسائیوں کے جنازے لے جانے کی گاڑی ہوتی ہے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ جنازہ گاڑی کو انسان کھینچتے ہیں اور اس گاڑی کو گھوڑے چلاتے تھے۔

ٹمٹم

ٹمٹم بھی پُرانی سواری ہے اسے ایک گھوڑا کھینچتا تھا۔ عام طور پر لمبے سفروں میں دس دس پندرہ میل کے بعد گھوڑے بدلے جاتے تھے۔ چونکہ ٹمٹم بیل گاڑیوں کی نسبت تیز رفتار سے چلتی تھی۔ اس لئے ڈاک لانے لیجانے کا کام بھی اسی سے لیا گیا۔ بعد میں اس کی رفتار تیز کرنے کے لئے ایک گھوڑے کی بجائے دو دو گھوڑے لگاتے تھے اور وہ بھی منزل بمنزل تبدیل ہوتے جاتے تھے۔ تاکہ جلدی سے جلدی ڈاک اور سواریوں کو منزل مقصود پر پہنچا دیا جائے۔

ٹمٹم میں کوچوان کے علاوہ چار، پانچ سواریاں اور بھی بیٹھ سکتی تھیں۔ پہلے ٹمٹم میں بیٹھنے کی جگہ کرسی دار نہیں تھی۔ ٹمٹم کو آرام دہ سواری بنانے کے لئے دو تختے پہلوؤں میں لگائے گئے تاکہ سواری آرام سے اس طرح بیٹھ سکے جس طرح کرسی پہ پیٹھ لگاکر بیٹھتے ہیں۔ تھوڑی مدت بعد ان بیٹھنے کے تختوں پر گدیلے نصب کئے گئے دھوپ اور بارش سے بچنے کے لئے چھت اور پردوں کا بھی اضافہ ہوا امیروں کی سواریوں کی دیکھا دیکھی ان میں سپرنگ دار گدیلے لگ گئے۔ اور پہیوں پر ربڑ کے ٹائر چڑھ گئے غرض یہ سواری اچھی خاصی آرام دہ بن گئی۔ شہروں میں آجکل ٹمٹم کا رواج بالکل نہیں رہا۔ ہاں ترقی یافتہ دیہاتوں اور قصبوں میں یہ سواری ابھی تک پائی جاتی ہے۔ اور لوگ اس کو بلا تکلف استعمال کرتے ہیں۔ شہروں میں اس سواری کی قدر نہیں رہی۔ اب لوگ تانگوں میں بیٹھنا پسند کرتے ہیں۔ اور ٹمٹم کی سواری کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے۔

اکہ قدیمی سواریوں میں اکہ بھی نہایت دلچسپ سواری تھی صوبجات متحدہ اور اودھ میں اس کو بہت مقبولیت حاصل تھی۔ پنجاب میں اسکی جگہ ٹمٹمیں چلتی تھیں۔ حق یہ ہے کہ ٹمٹم اس کے مقابلے میں نہایت آرام دہ سواری تھی۔ اس میں سب سے پہلی خرابی تو یہی تھی کہ تین سواریاں اور ایک کوچوان مشکل سے بیٹھ سکتا تھا۔ ٹمٹم کی طرح اس میں بیٹھنے کی سیٹیں پاؤں رکھنے کی سطح سے اونچی نہ تھیں۔ اس لئے

سواری کو بہت تکلیف ہوتی تھی۔ عام طور پر لوگ پاؤں لٹکا کر بیٹھتے تھے۔ جو کبھی کبھی پہیوں میں پھنس جاتے۔ ایسے میں بیٹھنے کا ایک خاص طریقہ تھا۔ جس سواری کو اس کی مشق ہوتی تھی وہ بہت مزے سے بیٹھتا اور جو شخص اس سے ناواقف ہوتا وہ اس سواری میں بیچین ہی رہتا کیونکہ دیر تک پاؤں سکیڑ کر بیٹھنے سے اچھی خاصی کوفت ہوتی تھی۔

ترقی کی دوڑ میں اکہ بھی اور سواریوں سے پیچھے نہیں رہا۔ ربڑ ٹائروں نے اسے کافی آرام دہ بنایا۔ لیکن سواری کے آرام سے بیٹھنے کی کوئی نئی تدبیر نہ نکالی گئی۔ فیشن کی دلدادگی نے اس کو کنڈم کر دیا۔ ورنہ ممکن تھا کہ قدیمی سواریوں کی یاد کو یہ تادیر تازہ رکھتا۔ دہلی میں تو اکہ دیکھنے کو بھی نہیں ملتا۔ یو۔ پی میں ابھی اسکا تھوڑا بہت رواج باقی ہے اور وہ بھی دن بدن کم ہو رہا ہے۔ اس کی جگہ تانگے لے رہے ہیں۔ کرایہ کم ہونے کی وجہ سے غریب طبقہ اس کا قدردان ہے۔ ورنہ کب سے خاتمہ ہو چکا ہوتا۔ بہرحال اپنی نوعیت کے لحاظ سے اکہ بھی خوب پرلطف اور مختصر سی سواری ہے۔ اس کے سفید سفید گدیلے۔ دھوپ اور مینہ سے بچنے کے لئے چھوٹی سی ناکافی چھتری قدیم زمانے کی یاد کو ضرور تازہ کرتی ہے۔

شکرم | شکرم قدیمی سواری نہیں۔ اس کو قدیم اور جدید سواریوں کے

پیچ کی کڑی سمجھنا چاہیئے۔ ابھی چند دن کی بات ہے کہ شکرم کو عام مقبولیت حاصل تھی۔ پردہ دار سواری ہونے کی وجہ سے اس کو اسوقت تک چلنا چاہیئے تھا جب تک ہندوستان میں سختی سے پردے کا رواج ہے۔ لیکن پتہ نہیں کیا وجوہ ہوئے جو چند سالوں میں اسکا نام تک باقی نہیں رہا۔ نئی پود کے سامنے اگر شکرم کا ذکر کیا جائے تو شاید ان کی سمجھ میں بھی کچھ نہیں آئیگا۔ بند گاڑی کے نام سے ممکن ہے وہ کوئی تصویر اپنے دماغ میں بنا سکیں ؂

بند گاڑی یا شکرم بڑے آرام کی سواری تھی۔ اس کو عام طور پر دو گھوڑے کھینچتے تھے۔ اس کے دونو پہلوؤں پر دو دروازے اور چاروں طرف کھڑکیاں ہوتی تھیں۔ جو ریل گاڑی کی کھڑکیوں کی طرح بستے دار بنائی جاتی تھیں۔ زنانی اور پردہ دار سواریوں کو اس میں بہت آرام ملتا تھا۔ غالباً ان کا کرایہ بہت زیادہ تھا۔ اس لیئے وہ تانگوں اور ٹمٹموں کا مقابلہ نہیں کر سکیں اور روپوش ہو گئیں ؂

فٹن | فٹن بہت پرانی سواری ہے۔ یہ سواری ۱۷۹۰ئ سے ہندوستان میں چل رہی ہے۔ ہمارا دیس اس کو دیسی خیال کرتا ہے۔ لیکن یہ بدیشی اصل ہے۔ سب سے پہلے اس کا رواج کلکتہ میں ہوا تھا۔ وہاں صاحب لوگوں کی تجارتی کوٹھیاں تھیں۔ وہ ہندوستانی سواریوں کو اپنے ملک کی سواریوں جیسا سبک رفتار اور آرام دہ نہ

پاتے تھے۔ اس لئے انہوں نے انگلستانی وضع کی گاڑیاں طیار کرائیں کہتے ہیں نمونے کے لئے ولایت سے گاڑی منگائی گئی تھی لیکن سوء اتفاق سے جہاز راستے میں ڈوب گیا۔ اس لئے ہندوستانی مستریوں کو ہدایات دے کر فٹن تیار کرائی گئی۔ ناتجربہ کاری اور ناواقفیت کی وجہ سے اس پر بہت زیادہ روپیہ صرف ہوا۔ جب انگلستان سے نمونے کی گاڑی آئی تو نئی قسم کی گاڑیاں طیار ہوئیں۔ آرام کی دھن میں اس پر طرح طرح کے انقلابات گزرے۔ یہ سواری جب سے اب تک نہایت عزت اور احترام کی نظر سے دیکھی جاتی ہے"

موٹر کے رواج سے پہلے روساء فٹن ہی رکھا کرتے تھے۔ عام طور پر فٹن میں دو گھوڑے جوتے جاتے تھے۔ ہلکی فٹنوں میں ایک گھوڑا بھی کام دے جاتا تھا۔ روساء اپنی شان بڑھانے کے لئے پانچ چھ گھوڑے تک جوت لیا کرتے تھے۔ کوچوان کو نہایت زرق برق لباس پہناتے۔ ایک یا دو آدمی چوبری لے کر پیچھے کھڑے ہوتے۔ دو سائیس پہلوؤں میں پائیدان پر تعینات رہتے۔ جہاں کہیں راستے میں بھیڑ زیادہ ہوتی وہ پائیدان سے اُتر کر ہٹو بچو کا شور مچاتے ہوئے گھوڑوں کے آگے آگے یا پہلو میں آٹھ دس میل کی رفتار سے دوڑتے۔ گھوڑوں کے طلائی اور نقرئی ساز سواریوں کی امارت کی شہادت دیتے تھے"

فٹن کا رواج بڑے بڑے شہروں میں اب بھی ہے۔

کراچی۔ کلکتہ اور بمبئی میں فٹنیں عام طور پر کرایہ پر چلتی ہیں رؤسائ بھی اس شوق سے کلیتاً مستغنی نہیں ہوئے۔ چھوٹے چھوٹے شہروں میں فٹنیں کم دکھائی دیتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تانگوں کی نسبت ان کا کرایہ قدرے زیادہ ہوتا ہے۔ اس لئے عوام تانگوں کی طرف زیادہ راغب ہیں۔

ٹرام گزشتہ صدی کے آخری ربع میں بڑے بڑے شہروں میں ٹرام کا رواج ہوا۔ شائد آپ کو یہ معلوم کرکے تعجب ہوگا کہ پہلے ٹراموں کو گھوڑے کھینچتے تھے۔ کیونکہ اسوقت تک ہندوستان میں بھاپ اور بجلی کی طاقت کو استعمال کرنے کا رواج نہیں ہوا تھا۔ ایک ٹرام کار کو پانچ سات گھوڑے چلاتے تھے۔ لاہور میں گھوڑا ٹرام شہر کے باہر چلتی تھی۔ کلکتہ کے بازار چونکہ کشادہ تھے اس لئے ٹرام کی لائن شہر میں بھی بچھا دی گئی تھی۔

بعض مقامات پر "مانو گاڑی" کے نام سے خاص قسم کی ٹرام کا رواج تھا۔ یہ مانو گاڑی بہت دلچسپ قسم کی سواری تھی۔ اس کا ایک پہیہ آہنی لائن پر چلتا تھا۔ دوسری جانب کے دو پہیئے سڑک پر رہتے تھے۔ غالباً اسی وجہ سے اس کو مانو کہتے تھے۔ اس کو بھی چار پانچ گھوڑے کھینچتے تھے۔ جب کبھی گھوڑے بدک جاتے یا چلتے چلتے مقررہ راستے سے اِدھر اُدھر ہو جاتے تو مانو گاڑی قلابازی کھا جاتی۔ اکثر توازن بگڑنے سے بھی حادثے

پیش آ جاتے۔ یہ ٹرام لمبے سفروں کے لئے استعمال ہوتی تھی۔ آج سے بیس پچیس سال پہلے۔ مہرہنداور رہ پڑکے درمیان مانو گاڑی پندرہ بیس میل تک چلا کرتی تھی۔ اب ہندوستان میں نہ تو کہیں گھوڑا ٹرام نظر آتی ہے اور نہ مانو گاڑی گھوڑا ٹرام کی جگہ ۱۸۸۳ء میں دخانی ٹرام۔ اور ۱۹۰۳ء میں برقی ٹراموں نے لیلی۔ اور مانو گاڑی اور گھوڑا ٹرام کا نام محض ان لوگوں کے دماغ میں باقی رہ گیا جنہوں نے ان کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔

برقی ٹرام ہندوستان کے بعض بڑے بڑے شہروں میں برقی ٹرامیں جاری ہیں۔ ٹرام کی سواری نہایت سستی اور آرام دہ سواری ہے لیکن اس سے وہی لوگ فائدہ اُٹھا سکتے ہیں جن کے شہر اور سڑکیں وسیع ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ لاہور اور لکھنؤ جیسے گنجان شہر او مقامات ٹرام کی خدمات سے محروم ہیں۔ ٹرام کا رواج کلکتہ بمبئی۔ دہلی اور کراچی میں بہت زیادہ ہے۔ حق یہ ہے کہ وہاں کی ٹرام کاریں دہلی کی ٹراموں کی نسبت بہت زیادہ آرام دہ ہیں۔ دہلی کی ٹرام سے ہر ایک کو شکایت ہے۔ اس لئے آئے دن اخبارات میں لے دے ہوتی رہتی ہے۔ کہ بہتر قسم کی ٹرامیں تیار کرائی جائیں جن کے چلنے میں شور کم پیدا ہو۔ موجودہ ٹرامیں اس قدر بھدی اور شور خیز ہیں۔ کہ جہاں سے گزرتی ہیں۔ مکانوں کی بنیادیں ہلا دیتی ہیں۔ اور کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔

جو لوگ اس کی سمع خراش آواز سے مانوس نہیں ہوتے انہیں اس سے سخت دماغی کوفت ہوتی ہے ؛

ریل گاڑی

۱۸۵۳ء سے پہلے ہندوستان میں کوئی شخص ریل گاڑی کے نام سے بھی واقف نہ تھا۔ لمبے لمبے سفر بھی بیل گاڑیوں اور گھوڑا گاڑیوں میں ہوا کرتے تھے۔ حکومت ہند کی طرف سے ۱۸۴۵ء میں بیل گاڑی سروس کو باقاعدہ کیا گیا۔ ۱۸۵۰ء میں یہ سروس بنارس سے لاہور تک جاری ہوئی۔ اسی سال بنارس سے لے کر دہلی تک بیل گاڑیوں کی جگہ گھوڑا گاڑیوں کو رواج دیا گیا۔ مسافروں سے ایک آنہ فی میل کے حساب سے کرایہ لیا جاتا تھا۔ اس حساب سے بنارس سے دہلی کا کرایہ ۴۸ روپے ۱۰ آنے ہوتا تھا۔ اس زمانے کے لوگ اس گھوڑا ڈاک کو نہایت آرام دہ خیال کرتے تھے۔ ذرا آجکل کے زمانے سے اُس وقت کا مقابلہ کرکے دیکھو۔ ریل چالیس پچاس میل فی گھنٹے کی رفتار سے مسافروں کو کہیں سے کہیں پہنچا دیتی ہے ایک وہ بھی زمانہ تھا جب گھوڑا ڈاک آٹھ نو میل فی گھنٹے کی رفتار سے چلتی تھی۔ اور لوگ اس کو آرام دہ سواری کہتے تھے ؛

۱۸۵۳ء میں پہلی مرتبہ ریل گاڑی ہندوستان میں چلی۔ یہ ریل جی۔ آئی۔ پی ریلوے کمپنی نے جاری کی تھی۔ جو بمبئی سے تھانہ تک جاتی تھی۔ اس کے کچھ مدت بعد بہت سی ریلوے کمپنیاں جو

ہیں آگئیں۔ اور ہندوستان کی سرزمین پر ریلوے لائنوں کا جال بچھتا چلا گیا +

۱۵ اگست ۱۸۵۴ء کا دن کلکتہ والوں کے لئے نہایت جوش وخروش اور دلچسپی کا دن تھا۔ کیونکہ اُس دن ہاوڑا سے پہلی ریل گاڑی ہگلی کو روانہ ہونے والی تھی۔ کہتے ہیں کہ تین ہزار سے زیادہ آدمیوں نے ٹکٹ خریدنے کے لئے درخواست دی تھی۔ لیکن سوائے تین سو اشخاص کے سب کو مایوس ہونا پڑا۔ کیونکہ ریل میں اس سے زیادہ گنجائش نہیں تھی۔ اس ٹرین میں تین فرسٹ کلاس کے ڈبے تھے۔ دو سیکنڈ کلاس کے۔ اور تیسرے درجے کے مسافروں کے لئے تین ٹرک تھے۔ آخر میں ایک گاڑی جناب گارڈ کے لئے تھی۔ جو بریک دان کے ساتھ ملحق تھی۔ کمپنی کا کُل اثاثہ فقط یہی گاڑیاں تھیں جو ہندوستان میں تیار ہوئی تھیں +

آپ کو یہ سُن کر تعجب ہوگا کہ اُس ابتدائی زمانے میں رات کے وقت کوئی گاڑی نہیں چلتی تھی اور اتوار کو محکمہ ریل میں چھٹی ہُوا کرتی تھی۔ ایک آجکل کا زمانہ ہے کہ کوئی دن ایسا نہیں جس دن ریل کو چھٹی ہو۔ بلکہ جس دن تمام دفاتر بند ہوتے ہیں۔ اُس دن ریلوے کے کام اور زیادہ بڑھ جاتے ہیں۔ اور ہر ایک ریلوے ملازم کو زیادہ مستعدی اور تن دہی سے کام کرنا پڑتا ہے +

کیسی پُروقار سواریاں تھیں۔ سہج سہج چلتی تھیں۔ ان میں سوار ہونے کے لئے کس قدر استقلال اور مستعدی کی ضرورت تھی۔ فرراسی دُور جانا ہوتا تھا تو کتنی زبردست تیاریاں کرنی پڑتی تھیں۔ ایک وہ زمانہ تھا کہ ہر کام نہایت آہستگی اور سوچ سمجھ کر کیا جاتا تھا ایک یہ زمانہ ہے کہ وقت کی پروانہ بجلی کی رفتار سے لگّا کھاتی ہے۔ ہر کام کو اگر وقت پر نہ کیا جائے تو سمجھ لو موقع ہاتھ سے نکل گیا ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ جیسی جیسی ضرورتیں ہیں ویسی ویسی سواریاں ایجاد ہوئی ہیں۔ جہاں ریل کام نہیں دیتی وہاں موٹر کار سے مدد لی جاتی ہے۔ جہاں موٹر کار کام نہیں آتی۔ وہاں ہوائی جہازوں پر اُڑا جاتا ہے۔ اگلے زمانے کی سواریوں کا اگر آجکل کے زمانے کی سواریوں سے مقابلہ کریں تو ہم اپنے زمانے کی سواریوں کو بہت زیادہ ترقی یافتہ پاتے ہیں اور اگلے زمانے کی سواریوں کی ہنسی اُڑاتے ہیں۔ ترقی کی رفتار بتا رہی ہے کہ آنے والے زمانے میں نقل وحرکت کے ذرایع میں اور بھی زیادہ ترقی ہوگی اور ہماری سواریوں کو اُس خوش قسمت زمانے کے لوگ بھدّا سُست رفتار اور مضحکہ خیز بتائینگے ۰

سیر و سفر

زمیں جنبد نہ جنبد گُل محمد۔ ترقّی یافتہ ممالک میں سفر کو بڑی اہمیت حاصل ہے جس شخص نے بہت سے سفر نہ کئے ہوں اس کو ناتجربہ کار اور ناواقف کہتے ہیں اس کی تعلیم چاہے کتنی ہی اعلیٰ کیوں نہ ہو۔ مگر ادھوری سمجھتے ہیں۔ نیز ایسے لوگ جو سیر و سفر سے دلچسپی نہیں رکھتے ان کا مضحکہ اُڑایا جاتا ہے۔ ہمارے مُلک کی حالت اس کے بالکل برعکس ہے۔ آجکل اگرچہ ذرائع آمد و رفت کی ترقی اور توسیع سے سفر میں پہلے جیسی تکلیفیں نہیں ہوتیں لیکن پھر بھی عام طور پر لوگ سفر کے نام سے گھبراتے ہیں۔ گھر سے نکلنا ان کے لئے بہت کٹھن کام ہے۔ کوئی حُبّ وطنی کا عُذر کر کے باہر نہیں جاتا۔ کوئی یہ بہانا تراشتا ہے کہ پیچھے گھر کی دیکھ بھال کون کریگا۔ غرض ہزار مُنہ اور ہزار عُذر۔ ہمارے مُلکی بھائی "گُل محمد" سے کم نہیں جن کے متعلق "زمیں جنبد نہ جنبد" کا لطیفہ مشہور ہے۔ ہم لوگوں میں کثرت ایسے لوگوں کی ہے جو اپنے وطن مالوف میں جاگیر ہونا اپنا ایمان اور اپنے شہر کو چھوڑنا گناہ عظیم خیال کرتے ہیں۔ یہ نہیں سمجھتے وطن کو ان کی ضرورت بھی ہے یا نہیں۔ وہ نام نہاد حُبّ وطنی کی بدولت

ذلیل و خوار ہو رہے ہیں یا وطن کی عزت ان کے وجود سے خطرے میں پڑ گئی ہے۔ بہرحال آجکل کے زمانے میں ایسے لوگوں کا وجود یقیناً دلچسپی سے خالی نہیں جو سیر و سفر کے فوائد سے بیخبر ہیں ؎

سفر کیوں تھا

گزشتہ صدی کے لوگ سفر کو سقر سے تعبیر کرتے تھے، حق یہ ہے کہ ان کا یہ کہنا ایک حد تک بالکل درست تھا۔ کیونکہ ان کے زمانے میں سفر میں بڑی دقتیں اور صعوبتیں اُٹھانی پڑتی تھیں۔ نہ سڑکیں تھیں نہ ریل گاڑیاں۔ نہ موٹر کاریں تھیں نہ ہوائی جہاز۔ لمبے سفر بیل گاڑیوں اور رتھوں میں طے کئے جاتے تھے۔ اور سفر کے لئے ایسا موسم انتخاب کیا جاتا تھا کہ جس میں بارش اور گرمی سے محفوظ رہیں۔ سردیوں میں دن کو اور گرمیوں میں سورج نکلنے سے پہلے اور ڈھلنے کے بعد سفر کرتے تھے۔ رات کو سفر کرنا جان جوکھوں کا کام تھا۔ لوٹ مار کے ڈر سے لمبا سفر کرنا ایک آدمی کے بس کا نہ تھا۔ قافلے تیار ہوتے تھے۔ اپنی مرضی کے مطابق ہم سفر تلاش کئے جاتے تھے کہ سفر آرام اور لطف سے کٹے، غرض اگلے زمانے میں سفر کے لوازمات مہیا کرنا اور سفر کرنا اچھا خاصا مشکل کام تھا۔ اسی لئے وہ لوگ سفر کو سقر کہتے تھے ؎

اب تو دُنیا ہی بدل گئی ہے۔ ذرائع آمد و رفت میں ایسی ترقیاں ہوئی ہیں۔ کہ نہ سمجھنے والے حیران ہوتے ہیں۔ اور سمجھتے ہیں کہ ہم

نہایت ہی خوش قسمت ہیں جو ایسے زمانے میں پیدا ہوئے ہیں یہ ریلوں موٹروں اور ہوائی جہازوں کے ذریعے مہینوں کے سفر ہفتوں میں، ہفتوں کے دنوں میں اور دنوں کے راستے گھنٹوں میں طے ہو جاتے ہیں پھر کیا مجال کہ پہلے جیسی تکلیفیں یا دقتیں پیش آئیں۔ اسی لئے اب "سفر کو حضر" کہتے ہیں۔ شام کو ریل میں پڑکر سو جاؤ، صبح جو آنکھ کھلے تو اپنے آپ کو تین چار سو میل کے فاصلے پر پاؤ۔ ہندوستان کی مشرقی سرحد سے چلو اور چوتھے دن سارے صوبوں میں سے گزرتے ہوئے شمال مغربی سرحد پر پہنچ جاؤ۔ پھر کرایہ بھی کچھ زیادہ نہیں۔ نہ کسی ہم سفر کو تلاش کرنے کی ضرورت نہ دنیا زمانے کے ساز وسامان ساتھ لے جانے کی حاجت، جہاں جاؤ ہر چیز موجود ہے۔ جو چاہو اشاروں پر حاضر ہے۔ غرض آجکل سفر نہایت آسان ہوگیا ہے مگر اتنی آسانیاں اور آرام مہیا ہونے کے باوجود ہماری قدامت پرستی کا یہ عالم ہے کہ اب بھی ہم لوگ سفر کو اچھا نہیں سمجھتے سفر سے گھبرانا ہماری گھٹی میں پڑا ہے۔ اور سفر کے شوقینوں کو سیلانی چھوکرے اور آوارہ کہدینا ہم لوگوں کے لئے ایک معمولی سی بات ہے"۔

سفر بعض امراض کا علاج ہے اگلے زمانے کے لوگ اگرچہ سفر کو پسند نہ کرتے تھے اور اکثر سفر اسوقت اختیار کرتے تھے جب کوئی چارۂ کار نہ رہتا تھا۔ لیکن وہ سفر کی خوبیوں سے ناواقف نہ تھے۔ ہمارے

قدیمی اطبّا سفر سے مریضوں کے علاج بھی کیا کرتے تھے۔ جب کسی شخص پر انتہا درجے کی گردش اور پریشانی آجاتی تو حکماء مشورہ دیتے کہ سیر وسفر کرو۔ جب کسی کا دماغ اپنے توازن کو چھوڑ دیتا اُسوقت بھی سفر تجویز کیا جاتا۔ وہ اس حقیقت سے اچھی طرح واقف تھے کہ سفر پریشانیوں کو دُور کر کے منتشر خیالات کو ایک طرف منعطف کر دیتا ہے۔ سفر سے دماغی کلفتیں دُور ہو جاتی ہیں۔ اور خیالات میں یکسوئی۔ طبیعت میں اطمینان اور سکون پیدا ہوتا ہے ،،

گردش ایّام کا اُتار سیر وسفر سے بہتر اور کوئی نہیں ہو سکتا وہ انسانی جوہر جو اپنے وطن میں چمک نہیں سکتے۔ غیر ممالک میں جگمگا اُٹھتے ہیں۔ نئی آب وہوا جسم وجاں میں نئی زندگی کی لہر دوڑا دیتی ہے۔ وہ لوگ جو اپنے وطن میں گمنام ہیں۔ دوسرے ممالک میں آفتاب اور مہتاب ہو کر چمک سکتے ہیں۔ ہمارے مُلک میں ایسی اَن گنت مثالیں موجود ہیں جن کے اعادے کی چنداں ضرورت نہیں ؛

سفر کی علامات ہم لوگوں میں سفر پیش آنے کی خاص خاص علامات ہیں۔ جن پر ہمارا پُورا پُورا اعتقاد ہے۔ جب کسی کے تلوے میں کھجلی ہوتی ہے تو سمجھ لیا جاتا ہے کہ سفر در پیش ہے۔ جس شخص پر یہ علامات ظاہر ہوتی ہیں اس کی حرکات وسکنات سے پریشانی کے آثار نمایاں ہونے لگتے ہیں اور یہ فکر دامنگیر ہو جاتا ہے کہ

دیکھئے کہاں کا سفر کرنا پڑتا ہے۔ سفر کے خیال سے رات دن دماغ پریشان رہتا ہے۔ ہر آنے والے خط کو دیکھتے ہی یہ گمان گزرتا ہے کہ سفر کا پیام آگیا۔ اس دوران میں اگر سوءِ اتفاق سے کہیں کا سفر کرنا پڑ جائے تو یہ اعتقاد اور بھی زیادہ مضبوط ہو جاتا ہے۔ اور کہا جاتا ہے کہ ہمارے تلوے میں کئی دن سے کھجلی ہو رہی تھی "۔

"تلوے میں کھجلی ہونے سے سفر کا پیش آنا بہت قدیمی اعتقاد ہے چنانچہ اُستاد ذوق نے بھی اس کی تائید فرمائی ہے ع

مُژدہ اے ذوق جنوں تلوا مرا کھُجلائے ہے

سفر کا بھُوت

ہندوستانی مسافر کی بدحواسی اور پریشانی ضرب المثل کی طرح مشہور ہے۔ اور سو فیصدی بولتی چالتی متحرک تصاویر سے کم دلچسپ نہیں۔ شرط یہ ہے کہ کوئی اس سے لطف اُٹھائے۔ شاید خود مسافر ہونے کی حیثیت میں ان مناظر سے لطف اندوز ہونے کا موقع نہ ملے لیکن تفریحاً اگر سفر کیا جائے تو ممکن ہے کہ ہر شخص حظ اُٹھا سکے۔ بہر حال مسافر پر سفر کا بھُوت سفر سے کئی دن پہلے سوار ہو جاتا ہے۔ اور "مسافرانہ گھبراہٹ" شروع ہو جاتی ہے۔ مسافر کے ہر فعل اور ہر بات سے گھبراہٹ اور پریشانی ظاہر ہوتی ہے۔ اوّل تو رختِ سفر باندھتے وقت کئی ایک چیزیں یا رہ جاتی ہیں۔ جو ریل میں بیٹھ کر یاد آتی ہیں۔ اگر گھر اور سٹیشن کے

درمیان وہ یاد آجائیں۔ تو واپس لوٹ آنا یا کسی ساتھی کو دوڑا دینا بھی ممکن ہے۔ اگر گھر والوں کی نظر چڑھ جائیں تو پیچھے پیچھے آدمی بھاگتا نظر آتا ہے۔ گھر سے نکلنا، گاڑی میں سوار ہونا اور ریل گاڑی میں بیٹھنا دار و گیر کا نظارہ پیش کرتا ہے۔ گھر والوں سے رخصت ہونا بھی کسی طرح دلچسپی سے خالی نہیں ہوتا۔ کسی سے بغلگیر ہو رہے ہیں۔ کسی کو پیار کر رہے ہیں۔ کسی سے پیار کرا رہے ہیں۔ کسی سے دعائیں لے رہے ہیں کسی کو دعائیں دے رہے ہیں۔ امام ضامن کا پیسہ بازو پر بندھ رہا ہے۔ کسی کو دیکھ کر خود آبدیدہ ہیں کوئی ان کو دیکھ کر چشم پُرنم ہے۔ چلتے وقت کسی کی زبان پر شگونی کلمات ہیں۔ کوئی راستے میں پانی پھینک رہا ہے۔ کوئی آگے آگے بھاگ رہا ہے کہ راستے میں کوئی عورت نہ آجائے۔ کسی بڑی بوڑھی نے چلتے وقت کچھ پیسے دیئے ہیں کہ فقیروں کو دیتے جانا۔ کسی نے بازو پکڑ کر کوئی دعا پڑھی ہے۔ کوئی ساتھ ساتھ گاڑی تک سوار کرنے آیا ہے۔ کوئی سٹیشن پر پہلے سے پہنچا انتظار کر رہا ہے۔ کوئی ساتھ ہی آرہا ہے غرض گھر سے نکلنا قیامت کا منظر ہے۔ سب خاموش ہیں۔ ایک فرد کی کمی سے سارے گھر پر خاموشی چھا گئی ہے۔ صبح شام جانے والے کا ذکر ہے۔ اور بات بات پر دعائیں منہ سے نکل رہی ہیں ٭

ادھر میاں مسافر جن پر سفر کا بھوت سوار ہے گھر سے نکلے سفر کی پریشانی میں کچھ بھولے کچھ یاد رہا۔ جو کچھ ہو سکا ساتھ لیا خدا خدا کر کے سٹیشن پر پہنچے۔ سامان اُتارا۔ بار بار گنا پھر بھی ایک آدھ چیز تانگے میں رہ گئی اور پتہ نہ چلا کہ کونسی چیز رہتی۔ ٹکٹ خریدنے پہنچے۔ کہیں کا ٹکٹ مانگ رہے۔ کہیں اور جانا چاہتے ہیں۔ بابو نے بھی جانچ لیا بہت گھبرائے ہوئے ہیں۔ انہوں نے دام لئے ٹکٹ دیا۔ لیکن بقایا میں سے کم دام واپس کئے۔ بچارے مسافر کو گھبراہٹ میں اتنی فرصت کہاں کہ حساب کرے۔ اور اگر حساب کرے بھی تو وہ درست کیونکر ہو سکتا ہے۔ ایسے موقعہ سے بابو لوگ خوب فائدہ اُٹھاتے ہیں اور کچھ نہیں تو یاروں دوستوں کے کھوٹے روپے ہی دھانس دیتے ہیں۔ مسافر گھبراہٹ میں کچھ نہیں دیکھتا جو کچھ ملا وہ جیب میں ڈالا اور سیدھا پلیٹ فارم کا رُخ کیا۔ قُلی کے آگے پیچھے گرتے پڑتے اندھا دُھند چلے جاتے ہیں۔ گاڑی میں سامان رکھا۔ قُلی کو پیسے دیئے اگر قُلی نے جھگڑا نہ کیا تو ذرا آرام کا سانس آیا۔ ورنہ قُلی کی جھک جھک سے پریشانی اور بڑھ گئی۔ جُوں جُوں مسافر کی پریشانی بڑھتی جاتی ہے قُلی کو اپنی کامیابی کا یقین ہوتا جاتا ہے یہاں تک کہ جو چاہتا ہے وہی لے کر ٹلتا ہے اور مسافر کو اسقدر پریشان کر جاتا ہے کہ گھنٹوں اس کے حواس ٹھکانے نہیں

آتے۔ ہوش و حواس درست ہونے پر اب جو سامان کا جایزہ لیتے ہیں تو کوئی نہ کوئی چیز کم ہے۔ مگر پتہ نہیں چلتا کیا چیز کم ہے۔ اور یاد نہیں آتا کہ گھر رہ گئی یا راستے میں خورد بُرد ہوئی قُلی اور تانگے والے کو بلے نُقط سُنا رہے ہیں۔ لیکن حقیقت میں وہ چیز گھر ہی بھُول آئے ہیں۔ اب جو ٹکٹ دیکھتے ہیں تو وہ بھی غائب ہے۔ اکثر ایک ایک جیب کو دس دس بار دیکھنے کے بعد ٹکٹ نکل ہی آتا ہے۔ کبھی ٹکٹ گھر سے ریل گاڑی تک آنے میں ضایع بھی ہو جاتا ہے۔ بقایا کا جایزہ لیتے ہی تو گم ہے۔ یا بالکل ہی غائب ہے۔ کسی جیب کترے نے ہاتھ صاف کیا یا خود نہیں پھینک آئے۔ روپوں کو پرکھتے ہیں تو کھوٹے ہیں۔ حیران ہیں کیا کریں کیا نہ کریں "نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن" سامان چھوڑ کر کہاں جائیں۔ گھڑی ہاتھ پر ہے۔ گاڑی جانے کا وقت معلوم ہے لیکن خطرہ ہے گاڑی نہ چلی جائے اور رہا سہا سامان بھی غائب ہو جائے کچھ نہیں تو بیٹھنے کی جگہ ہی پر کوئی دوسرا قبضہ کر لے۔ غرض سفر زدہ مسافر کے ہوش و حواس ریل چلنے کے بہت دیر بعد تازہ ہوا لگ کر درست ہوتے ہیں۔ پھر بھی منزل مقصود تک پہنچنے کی بے چینی۔ نئے نئے مسافروں کی درآمد و برآمد آرام نہیں لینے دیتی۔ خُدا خُدا کر کے منزل مقصود پر پہنچتے ہیں پھر اسی بدحواسی اور پریشانی سے سابقہ پڑتا ہے۔ وہی قُلی ہیں۔ وہی گاڑی بان ہیں۔

اُترتے وقت لاکھ دیکھ بھال اور احتیاط کرنے کے باوجود ریل میں کچھ نہ کچھ بھول جانا معمولی سی بات ہے۔ اگر سوءِ اتفاق سے قُلی غائب ہو جائے تو اس کا نمبر دیکھ لینے کے باوجود بھول گئے۔ قُلی بیچارا کہاں جائیگا۔ یہ اُس کو ڈھونڈھتے ہیں وہ اِن کو ڈھونڈھتا پھرتا ہے۔ آخر وہ ان کی پریشانی اور بدحواسی ہی سے ان کو پہچانتا ہے۔ اب تانگے میں سامان رکھا۔ قُلی کے جھگڑے سے نپٹے۔ چُنگی خانے کے داروغہ کو سامان کا جایزہ دیا۔ نئی چیزوں پر جھگڑا شروع ہُوا یہ کہتے ہیں۔ استعمال کی ہوئی چیز ہے۔ وہ کہتا ہے نئی ہے۔ بمشکل تمام گھر پہنچے یا ہوٹل میں اُترے۔ اور غضب یہ ہُوا کہ اُترتے وقت تانگے میں ٹرنک چھوڑ گئے۔ پولیس سٹیشن پر پہنچے۔ دن رات اِدھر اُدھر مارے مارے پھر رہے ہیں۔ جس کام کے لئے آئے تھے اس کا ہوش نہیں۔ سامان ریل میں رہا کہ تانگے میں اِس بات کا بھی پوری طرح یقین نہیں۔ ایک ٹانگ سٹیشن پر ہے دوسری تھانے میں۔ تانگے والوں کی شناخت ہو رہی ہے۔ غرض اس پریشانی کا سلسلہ کئی مہینوں تک جاری رہتا ہے۔ پھر مال مِل گیا تو خدا کا شکر کیا ورنہ قسمت پر شاکر ہونا پڑا ۔

ہمارے مسافروں کی انہی بدحواسیوں کو دیکھتے ہوئے ریل کے ساتھ پولیس کے سپاہی چلتے ہیں جو مسافروں کو ہوشیار کرتے رہتے ہیں۔ گُم شدہ سامان کے دفاتر قائم ہیں۔ جن میں ہزاروں روپے کا

مال دن رات آتا رہتا ہے۔ کمیٹیوں نے تانگوں کی دیکھ بھال کے لئے انسپکٹر مقرر کر رکھے ہیں تاکہ گم شدہ مال برآمد کرانے میں مسافروں کو مدد دیں ؎

قصہ کوتاہ ہم لوگ سفر سے بہت ہی پریشان ہوتے ہیں۔ اس لئے سفر کو سقر کہتے ہیں۔ اور ہم لوگوں پر سفر کا بھوت جب سوار ہوتا ہے تو بہت ہی پریشان کرتا ہے۔ بہرحال آہستہ آہستہ ہم لوگوں کو سفر کرنے کا طریقہ آرہا ہے۔ اس لئے سفری آسیب کے اثرات بھی دن بدن کم ہو رہے ہیں ؎

مسافر نوازی مشرقی ممالک کے باشندے جن کو نام نہاد تہذیب یافتہ اور متمدن اقوام غیر متمدن اور غیر مہذب کہتے ہیں، مہمان نوازی اور اور مسافر نوازی میں تمام اقوام عالم سے آگے ہیں۔ قدم قدم پر مسافر خانوں اور سراؤں کا ہونا اس بات کی روشن دلیل ہے کہ مسافر نوازی ہمارے بزرگوں کا ایمان تھا۔ وہ مسافروں کی ایسی خاطر مدارات کرتے تھے کہ مسافر اپنے گھروں کے آرام و آسایش بھول جاتے۔ ان کی مہمان نوازی میں برسوں فرق نہ آتا آخر مہمان ہی کا دل ان کی مہمانداری سے تنگ آ جاتا۔ شمال مغربی سرحدی صوبے کی بعض اقوام جن سے بربریت اور جہالت کے الفاظ بامعنی سمجھے جاتے ہیں۔ وہ بھی مہمان نوازی میں کسی سے پیچھے نہیں۔ کہتے ہیں مہمانوں پر آپس میں قتل و خون ہو جانا

ان کے ہاں معمولی سی بات ہے۔ کیا مجال جو کسی کے مہمان پر دوسرا قبضہ کر لے۔ سیدوں کی خاطر مدارات اور تعظیم و تکریم ان کا عام شیوہ ہے۔ اگر سوء اتفاق سے کوئی سید مہمان آجائے تو اس کو کسی طرح جانے نہیں دیتے۔ جب دیکھتے ہیں کہ یہ ہاتھوں سے چلا تو جان سے مار کر اس کی قبر اپنے گھر میں بنا لیتے ہیں۔ اس کی قبر کا احترام ہمیشہ قائم رہتا ہے۔ اس پر قوالیاں ہوتی ہیں۔ منتیں مرادیں مانی جاتی ہیں لوگوں کو کھانا کھلایا جاتا ہے۔ غرض مہمانی اور مہمان نوازی کا ایک لا انتہا سلسلہ قائم ہو جاتا ہے۔

اگلے زمانے کے حالات اور واقعات کا جایزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ مسافروں کی خاطر مدارات مذہبی احکام کی وجہ سے بھی کی جاتی تھی اور اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ اس زمانے میں سفر کرنا بڑی جان جوکھوں کا کام تھا۔ اسی لئے مسافروں کے ساتھ ہر ایک کو ہمدردی ہوتی تھی۔ پیغام رسانی کا صحیح انتظام نہ ہونے کی وجہ سے مہینوں اور بعض اوقات برسوں خیریت معلوم نہ ہوتی تھی۔ پھر سفر کی صعوبتوں اور تکلیفوں سے کم و بیش ہر شخص واقف تھا اس لئے انسانی ہمدردی مجبور کرتی تھی کہ مسافر کی زیادہ سے زیادہ خاطر مدارات کی جائے۔ ہم لوگوں میں مسافر کو کھانا کھلانا اس کی ہر ممکن خدمت کرنا ثواب خیال کیا جاتا تھا۔ امیر اور رئیس لوگ مسافروں کے قیام کے لئے سرائیں اور مسافر خانے بنواتے تھے مسجدوں اور مندروں کے

ساتھ حجرے اور کوٹھریاں بنوانے کا عام رواج تھا۔ تاکہ مسافر ان میں ٹھہر سکیں۔ مسافروں کو کھانا بھی مُفت مل جاتا تھا۔ مسافر نواز سرائوں سے مسافروں کو اپنے مہمان خانوں میں لاکر رکھتے اور ان کی مہمانداری میں کوئی دقیقہ باقی نہ چھوڑتے تھے۔ جہاں کوئی ایک آدمی انتظام نہ کرسکتا وہاں محلوں میں ہر گھر سے باری باری کھانا مسجدوں میں پہنچ جاتا غرض مسافروں کو سفر میں کوئی تکلیف نہ ہونے پاتی تھی ٭

ع ابھی اگلی شرافت کے نمونے پائے جاتے ہیں

اب ہندوستان کی تباہ حالی سے یہ باتیں خواب وخیال ہوگئی ہیں۔ مسافر خانے اور سرائیں ویران پڑی ہیں مسجدیں بے چراغ ہیں۔ خود کھانے کے لالے پڑے ہوئے ہیں۔ مسافر کو کیا کھلائیں۔ دوسرے مغربی تہذیب نے ان قدیمی روایات کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کردیا ہے۔ مسافر خانے ہوٹل بن گئے ہیں اور کشاکش حیات نے ان کو آمدنی اور روزگار کا ذریعہ بنا دیا ہے۔ پھر بھی کہیں کہیں ایسے بزرگ موجود ہیں۔ جن کی فیاضی اور مہمان نوازی سے پُرانی تہذیب اور مہمانداری کا نام زندہ ہے ٭

ایک دفعہ مجھے چند احباب کی معیت میں صوبۂ متحدہ کے دیہات میں شکار کے لئے جانے کا اتفاق ہوا تقریباً ایک ہفتہ ہم لوگ جنگلوں میں شکار کھیلتے پھرے۔ ایک دن جنگل میں

ہماری مُلاقات وہاں کے ایک زمیندار سے ہوگئی۔ انہوں نے ہمیں اپنے ہاں آنے کی دعوت دی۔ اور بہت اصرار کیا۔ آخر ہم نے بھی وعدہ کر لیا۔ کئی دن بعد شکار کھیلتے کھیلتے رات گئے ان کے قصبے میں پہنچے۔ پُرانی وضع کا چھوٹا سا شہر تھا۔ بارش ہو رہی تھی۔ مسلسل سفر اور بارش نے ہم لوگوں کا حُلیہ بگاڑ رکھا تھا۔ ایسی حالت میں ہم نے ان کے ہاں جانا مناسب نہ سمجھا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہُوا کہ وہاں ایک بھٹیاری "نبل سر" کی سرائے ہے۔ پتہ پُوچھتے پوچھتے وہاں پہنچے۔ صحن میں پانی بھرا تھا۔ چھتیں ٹپک رہی تھیں۔ خیر اسی کو غنیمت جانا ارادہ تھا کہ صبح کو انسانی صورت بنا کر اپنے داعی سے ملیں گے۔ ہم پڑے سو رہے تھے کہ علی الصبح وہ حضرت بہ نفس نفیس خود تشریف لے آئے۔ ہم حیران تھے کہ راتوں رات ہماری آمد کا انہیں کیسے علم ہو گیا۔ وہ سرائے میں ٹھہرنے پر بہت ناراض ہوئے۔ اور ہمارا کوئی عُذر نہ سُنا اپنے ملازمین سے ہمارا سامان اُٹھوا کر اپنے گھر لے گئے۔ دوسرے دن ہم بڑی مشکل سے ان سے اجازت لے کر رُخصت ہوئے۔ اور وعدہ کر گئے آئے کہ آئندہ براہ راست انکے ہاں سیر و شکار کے لئے آئینگے۔ مدتوں تک ان سے خط و کتابت کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ اور ہمارے بعض احباب نے ان کی مہمانداری کا کئی بار لُطف اُٹھایا۔ ان کا نام اگرچہ یاد نہیں رہا

لیکن ان کی مہمان نوازی ابھی تک دل پر نقش ہے ؎

یہ پُرانے لوگوں کی باتیں ہیں۔ شرافت کے ان قدیمی نمونوں کا بھی دن بدن خاتمہ ہو رہا ہے۔ ہم میں اور آپ میں یہ جذبہ نہیں کہ ایک ناواقف شخص کو سرائے سے لا کر اپنے گھر میں مہمان رکھ لیں اور ہمہ تن اس کی مہمانداری میں مصروف ہو جائیں۔ مغربی تہذیب نے شہر والوں کے دل سے اس صفت کو بالکل محو کر دیا ہے۔ جو لوگ شہری تکلفات سے بچے ہوئے ہیں۔ ان میں یہ جذبہ بقدر رمق باقی ہے۔ شہری لوگ تو مہمان نوازی اور مہمانداری سے اسقدر گھبراتے ہیں کہ ایسے مکان بھی بنوانا پسند نہیں کرتے جن میں مہمان ٹھہر سکے انقلاب زمانہ ہے۔ ایک وہ وقت تھا جب مکان بنانے سے پہلے آئے گئے کے آرام کا خیال رکھا جاتا تھا۔ یہ حال تو متوسط درجے کے لوگوں کا تھا۔ امیر اپنے مکانوں کے ساتھ مہمان خانے الگ بنواتے تھے اب تو ایسا وقت آگیا ہے کہ مہمان کے نام سے بھی دم خشک ہوتا ہے ؎

بحری سفر ہمارے ملک میں عام لوگوں کو گھر سے نکلنے کے نام پر تھر تھری چڑھتی ہے۔ بیرونی ممالک کی سیر و سیاحت تو بڑی بات ہے ایسے لوگ بھی بہت کم ہیں جنہوں نے سارے ہندوستان کا سفر کیا ہوگا۔ سیر و سیاحت کے معاملے میں ہمارا ملک دوسرے ملکوں کی نسبت بہت ہی زیادہ پیچھے ہے۔ ہمارے ہندو بھائیوں کے

مذہبی قوانین بحری سفر کی اجازت نہیں دیتے سمندر کا سفر کرنے سے ان کا دھرم بھرشٹ ہو جاتا ہے۔ اس لئے شروع شروع میں اوّل تو مذہبی تعصب کی وجہ سے کوئی ہندو کمر ہمت ہی نہیں باندھتا تھا۔ اگر مجبوراً جانا ہی پڑتا تھا تو واپس آن کر وہ بارہ شدھ ہوتا تھا ورنہ برادری سے باہر سمجھا جاتا تھا۔ موجودہ زمانے کی ترقیوں نے ان مذہبی قیود کو بالائے طاق رکھ دیا ہے۔ بلکہ ہنود بحری سفر کو اور قوموں کی نسبت زیادہ شوق اور دلچسپی سے اختیار کرتے ہیں صفحہ عالم پر کوئی ایسا مقام نہیں جہاں ہنود نہ پہنچ چکے ہوں۔ پھر بھی جو لوگ کٹڑ ہندو ہیں اور قدیمی اصولوں سے ایک سُوت اِدھر اُدھر نہیں ہونا چاہتے وہ سمندری سفر سے حتیّ الامکان احتراز ہی کرتے ہیں ٭

ابھی چند سال کا عرصہ گزرا کہ ہندوستان کے مشہور قومی لیڈر پنڈت مدن موہن مالویہ جی کو راونڈ ٹیبل کانفرنس میں شریک ہونے کے لئے انگلستان جانا پڑا۔ وہ اپنے ساتھ گنگا جلی کے کنستر کے کنستر بھر کر لے گئے تاکہ سمندر پار جانے کا ان کے دھرم پر کوئی اثر نہ ہو اس کے باوجود بھی ان کو واپس آن کر شدھ ہونا پڑا۔ چونکہ یہ اپنی قسم کی پہلی مثال تھی اس لئے اُن دنوں اخباروں میں بہت چہ میگوئیاں ہوتی رہیں۔ اور مدتوں یہ واقعہ اخباری دُنیا میں دلچسپ مباحث کا موجب بنا رہا ٭

مسلمانوں میں بحری سفر کرنے میں کسی قسم کی رکاوٹ نہیں بلکہ حج کا فریضہ ادا کرنے کے لئے عام مسلمانوں کو بحری سفر کرنیکا موقعہ حاصل ہے۔ عموماً اس اصول پر تاسف کا اظہار کیا جاتا ہے کہ اس سفر کا فائدہ عمر کے آخری حصے میں اُٹھایا جاسکتا ہے کیونکہ حج اُسی وقت واجب ہوتا ہے جب انسان اپنے تمام دُنیاوی اور دُنیوی فرائض کو ادا کر چکتا ہے۔ بعض لوگ جوانی کے زمانے میں بھی حج کر لیتے ہیں لیکن ان کے حج کو ادائیگی فرض خیال نہیں کیا جاتا۔

زندگی کے آخری سالوں میں سفر حج یقیناً وہ دلچسپیاں پیدا نہیں کرسکتا جو سیاحت سے مختص ہیں۔ لیکن پھر بھی فرض مذہبی کی ادائیگی تن ہائے مُردہ میں ایک نئی زندگی پیدا کر دیتی ہے۔ حاجیوں کا دل چونکہ مذہبیات پر مرتکز ہوتا ہے اس لئے وہ کسی چیز کو سیاح کی نا قدرانہ نظر سے نہیں دیکھ سکتے۔ دوسرے وہ ایسے مُلک میں سفر کرتے ہیں جس کا ذرہ ذرہ ان کے لئے باعث احترام ہے۔

بحری سفر کی آسائشیں اب وہ زمانہ افسانہ ہوگیا ہے۔ جب سمندر کا سفر کرنا جان جوکھوں کا کام تھا۔ ہاں کہانیوں اور افسانوں میں اکثر سُننے میں آتا ہے کہ بادبانی جہاز مسافروں کو کہیں سے کہیں لے جاتے تھے۔ بحری طوفان سے جہاز عام طور پر مسافروں سمیت غرق ہوجاتے تھے۔ اب تو ایسے ایسے جہاز بن گئے ہیں۔

جن میں بلا مبالغہ ہزاروں آدمی سفر کر سکتے ہیں بڑے سے بڑا طوفان ان کو جنبش نہیں دے سکتا۔ لمبے لمبے سفر ہنستے کھیلتے طے ہو جاتے ہیں۔ بلکہ سمندر کا سفر خشکی کے سفر سے زیادہ آرام دہ اور پُر لطف خیال کیا جاتا ہے +

پہلے زمانے میں سمندر کا سفر بڑی ہمت اور جانبازی کا کام سمجھا جاتا تھا لیکن اب جس کے دل میں شوق ہے اور جیب میں پیسے ہیں وہ بغیر کسی رُکاوٹ کے ساری دُنیا کا سفر آسانی سے کر سکتا ہے +

تعلیم کی برکتیں

مغربی تعلیم نے سفر کرنے کا جذبہ عام لوگوں میں پیدا کر دیا ہے۔ ہر شخص کسی نہ کسی مقصد سے سمندر کا سفر کرنے کے لئے آمادہ ہے۔ خاص طور پر نوجوانوں میں سیر و سفر کا شوق بہت بڑھ رہا ہے۔ قرض لے کر جائدادیں فروخت کر کے لوگ اپنے بچوں کو سمندر پار بھیجتے ہیں اور ایسے مواقع کو "سنہری موقعہ" کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ آجکل کے زمانے میں ایسے لکیر کے فقیر بہت ہی کم ملیں گے جو سمندری سفر کے نام سے گھبرا جائیں۔ اور اگر کوئی لمبے سفر کے لئے چلا جائے تو اس کے جانے کے بعد گھر میں صف ماتم بچھا دیں +

جہاندیدہ بسیار گوید دروغ

پہلے زمانے میں سیاحوں کی باتوں کو اگرچہ بہت دلچسپی سے سُنا جاتا تھا۔ لیکن ساتھ کے ساتھ "جہاندیدہ

بسیار گوید دروغ" بھی کہدیا جاتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ بیرونی ممالک
میں سفر کرنے سے سیّاح کو بڑی صعوبتیں پیش آتی تھیں۔ ہزار
قسم کے حیلوں حوالوں سے کام چلانا پڑتا تھا۔ کچھ عجیب و غریب
واقعات پیش آتے تھے۔ اور کچھ "زیب داستاں" کیلئے مبالغے سے
کام لیا جاتا تھا اس لئے بلا تامل ان پر دروغ گوئی کا شبہ
ہوتا تھا چونکہ پہلے زمانے میں سیّاحوں کا وجود عنقا تھا۔
اس لئے ان کو مبالغہ آمیزی اور دروغ گوئی کے مواقع بھی حاصل
تھے۔ جنگ عظیم کی بدولت لاکھوں آدمیوں کو ممالک غیر میں جانیکا
موقع مل گیا اس لئے ہر مقام پر ایسے لوگ بکثرت ہیں جو ممالک
غیر کا سفر کر چکے ہیں اور اب معمولی سیّاح کے لئے مبالغہ آمیزی
اور دروغ گوئی ذرا مشکل ہوگئی ہے ؛

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک دیہاتی "مولوی صاحب" حج کے
لئے تشریف لے گئے۔ لوگوں نے بڑے شوق اور جوش کے ساتھ
ان کو رخصت کیا۔ بمبئی پہنچے۔ مولوی صاحب تھے ذرا رنگین مزاج۔
بمبئی کی دلچسپیوں نے ان کا دامن پکڑ لیا اور جہاز میں بیٹھنے کی
اجازت نہ دی۔ مولوی صاحب نے بمبئی میں خوب گل چھرّے
اُڑائے۔ یہاں تک کہ حاجیوں کے جہاز واپس آگئے حاجیوں
سے مل کر انہوں نے وہاں کے حالات دریافت کئے۔ اس کے
بعد حاجیوں کا سا حلیہ بنایا۔ حجازی تحفے تحائف ساتھ لئے۔ اور

پُورے حاجی بن کر اپنے گاؤں کو لوٹے۔ دیہات والوں نے انکا نہایت پُر احترام استقبال کیا۔ گھر گھر دعوتیں ہوئیں حاجی صاحب مجلسوں اور محفلوں میں حج کے سُنے سُنائے حالات سُناتے رہے۔ ایک دن کسی نے پُوچھا کہ حاجی صاحب حجر اسود کیسا ہے آپ نے بلا تکلف فرمایا سُبحان اللہ بہت ہی مقدس اور محترم شخص ہے حاضرین میں سے ایک شخص بولا۔ حاجی صاحب ہم نے تو سُنا ہے وہ پتھر ہے۔ کہنے لگے بھائی جب ہم ملے تھے تو اسوقت تک تو وہ آدمی ہی تھا۔ اب اپنے اعمال کی بدولت پتھر ہو گیا ہو تو ہمیں معلوم نہیں"

اگلے زمانے کے نام نہاد سیّاح اسی قسم کی مبالغہ آمیزی اپنا شعار بنا لیتے تھے۔ اسی لئے دروغ گو کہلاتے تھے۔ باخبر لوگ ان کو دروغ گو کہنے میں حق بجانب بھی تھے کیونکہ وہ جب اپنے کارنامے سُناتے تھے تو زمین آسمان کے قلابے ملا دیتے تھے۔ اور ہر چیز سے واقفیت ظاہر کرتے تھے۔ چاہے دیکھی اور سُنی بھی نہ ہو"

سفر تجربہ سکھاتا ہے

جو لوگ اپنے گھروں سے باہر نہیں نکلتے ان کی حالت کوئیں کے مینڈک کی طرح ہے۔ سیر و سفر کرنے والوں کو ہر قدم پر نیا کرشمہ نظر آتا ہے۔ نئے نئے تمدن کے لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ عجیب و غریب اخلاق و اطوار دیکھ کر وسعت نظر بڑھتی ہے۔ ہر جگہ نئی زمین اور نیا آسمان دکھائی دیتا ہے۔ کہیں ضرورت سے کہیں محبت سے اپنے آپ کو ہر رنگ میں ڈھالنا

پڑتا ہے۔ چالبازوں کے ساتھ ہوشیاری۔ حیلہ سازوں کے ساتھ عقلمندی اور دیانتداروں کے ساتھ ایمانداری کا برتاؤ مسافر کی آنکھیں کھول دیتا ہے۔ کہیں اپنے رسم و رواج کو چھوڑنا پڑتا ہے کہیں میل ملاپ کی خاطر دوسروں کی زبان بولتے ہیں۔ کہیں جیسا دیس ویسا بھیس اختیار کرنا پڑتا ہے۔ غرض ہر شخص کی بُری بھلی بات خندہ پیشانی سے برداشت کرنی پڑتی ہے۔ یہی وہ صفات ہیں جو ہر شخص میں ہونی چاہئیں اور سفر کرنے سے یہ خوبیاں بہت آسانی سے پیدا ہو جاتی ہیں "

سفر وسیلۂ ظفر ہے

قناعت ایک نہایت ہی اچھی صفت ہے اور ہندوستانیوں میں یہ صفت بدرجہ اتم موجود ہے۔ لیکن قناعت کا یہ مقصد ہرگز نہیں ہے کہ ہمت کے ہاتھ پاؤں توڑ دیئے جائیں قناعت یہ ہے کہ جو کچھ اپنے پاس ہے اس پر ضرور صبر و شکر کیا جائے مگر ترقی اور بہبودی کا خیال بھی ہمیشہ پیش نظر رہے۔ اکثر لوگ قناعت کا یہ مطلب سمجھتے ہیں۔ کہ جو کچھ مل گیا۔ وہی کافی ہے اور جو کچھ قسمت کا ہوگا وہ آپ ہی مل جائیگا۔ اس کے لئے کوشش کرنے کی ضرورت نہیں۔ اسے قناعت ہرگز نہیں کہا جا سکتا۔ اس کو تو بے ہمتی سے تعبیر کرنا چاہئے۔ انسان کا فرض ہے کہ عمر بھر ترقی اور بہبودی کے لئے ہاتھ پاؤں مارتا رہے۔ اور موافق مواقع سے پورا پورا فائدہ اُٹھائے۔ تاریخ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ

ہمیشہ وہی اقوام ترقی کرتی ہیں جن کے افراد میں قوتِ عمل ہوتی ہے
ہمارے سامنے ایسٹ انڈیا کمپنی کی بہترین مثال موجود ہے۔
یہ ایک معمولی تجارتی جماعت تھی لیکن باہمت تھی۔ وہ اپنی جان پر
کھیل کر ہندوستان جیسے دور افتادہ ملک میں تجارت کے
مقصد سے آئی۔ اور تجارت کو فروغ دیتے دیتے ہندوستان پر
حکومت کرنے لگی "

یہ انگریزوں کے سیاحت پسند مزاج ہی کی برکت ہے کہ ایک
چھوٹے سے ملک کے باشندے ہیں۔ مگر دنیا کے بیشتر حصّہ پر
حکمران ہیں۔ اس کے برعکس ہمارے ہندوستانی بھائیوں کی یہ
حالت ہے کہ اپنے ملک میں بھی ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے
سے کتراتے ہیں۔ اپنے فائدے ترقی اور عروج کو یہ کہہ کر لات مار
دیتے ہیں ؎

گر یاں بہت نہ کھائینگے تھوڑا ہی کھائینگے
ہم اپنی دلی چھوڑ کے دکن نہ جائیں گے

اس بات سے یہ نہ سمجھ لینا چاہیئے کہ فقط غیر تعلیم یافتہ طبقہ ہی
اس صفت سے موصوف ہے اُستاد ذوقؔ جیسے عالم باکمال اور
شاعر بے مثال نے بھی گراں قدر تنخواہ اور بڑے بڑے عہدوں کو یہ کہکر ٹھکرا دیا تھا ؎

ان دنوں گرچہ دکن میں ہے بہت قدرِ سخن
کون جائے ذوقؔ پر دلی کی گلیاں چھوڑ کر

علمی سفر کا شوق

آج سے چند سال پہلے علمی سیر و سیاحت کا شوق ہمارے مُلک میں بالکل مفقود تھا۔ جب سے تعلیم کا چرچا ہُوا ہے اور ملازمتوں کا کال پڑا ہے۔ پیٹ پُوجا کی خاطر سیر و سیاحت نے کسی قدر علمی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ اس میں شک نہیں اس شوق کی ترویج اور مقبولیت میں غیر ملکی حکومت اور ماہرین تعلیم کو بہت دخل ہے ؛

ماہرین تعلیم نے متفقہ طور پر تسلیم کر لیا ہے کہ طلبا کے لئے سیر سیاحت تعلیم کا جُزو ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کالجوں سکولوں اور دیگر درسگاہوں کے طلبا اپنے اساتذہ کی زیر نگرانی اکثر لمبے لمبے سفر تعلیمی نقطۂ نظر سے کرتے ہیں اور ان تاریخی مقامات کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر اپنی واقفیت بڑھاتے ہیں جن کا ذکر تاریخ کی کتابوں میں آتا ہے؛ محکمہ ریل بھی اس قسم کے سیاحوں کو بہت زیادہ مراعات دیتا ہے۔ اگر کم از کم تین چار آدمی مل جائیں تو ایک طرف کا کرایہ دا کر کے تمام ہندوستان کی سیر ہو سکتی ہے۔ اگر سیاحوں کی تعداد زیادہ ہو تو سپیشلیں بھی چلا دیتے ہیں۔ اور کرائے میں مزید رعایت کرتے رہیں۔ اس قسم کی تعلیمی سیر و سیاحت کا انتظام موسم سرما یا گرما کی تعطیلات میں ہوا کرتا ہے۔ مُلک و قوم کو ان رعایات سے تفریحی سفر کرنے میں بہت آسانیاں ہو گئی ہیں سیر و سفر کا شوق ترقی کر رہا ہے ؛

تعلیمی سیر و سیاحت میں اساتذہ کے فرائض

ہماری درسگاہیں تعلیمی سیاحت کا انتظام تو کر لیتی ہیں لیکن اس سے کوئی مخصوص فائدہ نہیں پہنچتا۔ اس کی ذمہ داری زیادہ تر ان اساتذہ پر عائد ہوتی ہے جن کی زیر نگرانی تعلیمی سیاحت کی جاتی ہے۔ معلوم ہونا چاہیئے کہ نگراں اساتذہ کے فرائض محض اس حد تک محدود نہیں ہیں کہ طلبا کوئی جھگڑا فساد نہ کرنے پائیں۔ ان کا فرض ہے کہ وہ ہر مقام کی علمی اور تاریخی اہمیت سے اپنے ساتھیوں کو آگاہ کریں۔ قدم قدم پر جزئیات پر روشنی ڈالیں۔ کہیں سیاسی پہلو پر بحث کریں۔ کہیں تعمیری حیثیت پر لکچر دیں۔ کہیں معاشی رُخ دکھائیں غرض پُرانے لوگوں کی زندگی کو اس طرح پیش کریں کہ جیتی جاگتی تصویریں آنکھوں کے سامنے آجائیں۔ گویا تعلیم گاہوں سے نکلنے کے بعد بھی درس و تدریس کا سلسلہ منقطع نہیں ہونا چاہیئے بلکہ سیاحت سے خشک اور غیر دلچسپ لکچر اور اسباق میں مزید دلچسپی اور اہمیت پیدا کرنی لازم ہے یہ امر مسلّمہ ہے کہ اس قسم کی درس و تدریس ان اسباق سے کہیں زیادہ دلچسپ اور شوق انگیز ہوتی ہے جو طلبا کو درسگاہوں کی چار دیواری میں دیئے جاتے ہیں

اس میں کوئی شک نہیں کہ سفری تعلیم اساتذہ کی تفریح کو کم کر دیتی ہے۔ لیکن جس قدر فائدہ طلبا کو اس سے پہنچتا ہے اس کو مدنظر رکھتے ہوئے اساتذہ کا فرض ہے کہ اپنے آرام اور تفریح کو طلبا کے

استفادہ پر قربان کر دیں۔ اس قسم کے لکچروں کی تیاری کے لئے اساتذہ کو بہت وسیع مطالعہ اور سخت محنت کرنی پڑتی ہے۔ اس لئے آرام طلب اساتذہ کو یہ کام کبھی اپنے ذمہ نہیں لینا چاہیئے اور نہایت دیانتداری کے ساتھ اس عہدے سے مستعفی ہو جانا چاہیئے۔

اساتذہ کو چاہیئے کہ مجوّزہ سفر کا تمام نقشہ پہلے سے تیار کر لیں۔ ہر قابل توجہ چیز کے متعلق زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کریں۔ ممکن ہو تو پہلے خود ان مقامات کو اچھی طرح سے دیکھ آئیں۔ سفر شروع کرنے سے پہلے مجوّزہ سفر کا پروگرام اچھی طرح سے سمجھا دیں تاکہ طلبا کے دل میں یہ خیال پیدا ہو جائے کہ سفر کا مقصد سیر و تفریح کے علاوہ کچھ اور بھی ہے۔ بلکہ طلبا کے لئے مفید مطلب لٹریچر بھی مہیا کرنا چاہیئے تاکہ ان کو خود بھی معلوم ہو جائے کہ ہمیں کس کس چیز کو کس نظر سے دیکھنا ہے۔ تعلیمی سفروں میں رہنما کا اوّلین فرض یہ ہے کہ طلبا کے دل میں جذبۂ شوق کو مشتعل کر دے تاکہ ان کے دل و دماغ غیر ضروری تفریحات پر مرتکز نہ ہونے پائیں۔

ہمارے طلبا اور اساتذہ جب کبھی سیر و سیاحت کے لئے نکلتے ہیں تو اپنے خیالات کو منزل مقصود پر محیط کر دیتے ہیں اگر ان کا رہنما راستے کے خوشگوار اور ناگوار اثرات اور معلومات سے باخبر ہو تو سفر کی دلچسپی میں غیر معمولی اضافہ پیدا ہو سکتا ہے۔ اس کے علاوہ ہر چیز پر ناقدانہ اور مبصرانہ نظر ڈالنے کی صلاحیت بھی پیدا

کی جا سکتی ہے۔

جس وقت سیاح جماعت کسی مخصوص مقام پر پہنچے تو رہنما پوری دلچسپی۔ سچے جوش۔ اور مکمل واقفیت کے ساتھ ہر ضروری چیز پر روشنی ڈالے۔ اور ہر شخص کے سوال کا جواب نہایت مدلل اور پُر وثوق طریقے سے دے تاکہ معلومات میں اضافہ ہو اور تبادلۂ خیالات کے ذریعہ سفر کی دلچسپی قائم رہے۔

سیاح جماعتوں کے رہنماؤں کے فرائض سفر ختم کرنے پر ختم نہیں ہو جاتے۔ بلکہ ان کا اصلی فرض سیر و سفر ختم کرنے کے بعد شروع ہوتا ہے۔ سفر سے واپس آنے کے بعد طلبا سے سفر کے پورے حالات لکھوانے چاہئیں۔ اگر ممکن ہو سکے تو اس میں مختلف مقامات کی تصویریں اور نقشے بھی شامل کئے جائیں۔ یہ سفر نامے جماعتوں میں پڑھوا کر سُنے جائیں۔ بحث طلب امور پر بحث کی جائے۔ اس طرح سے یقیناً ایک باقاعدہ سفر نامہ تیار ہو جائیگا۔ اور سیر و سیاحت کا صحیح شوق بڑھیگا۔

مناظر قدرت کی پائمالی

ہمارے طلبا جب جماعت کی صورت میں سیر و تفریح کے لئے نکلتے ہیں تو ان کا مطلب سوائے تفریح کے اور کچھ نہیں ہوتا۔ وہ خوبصورت باغات کے پھلوں پھولوں کو نہایت بیدردی سے نقصان پہنچاتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کو یہ بات نہیں سمجھائی جاتی کہ قدرتی مناظر کا مطالعہ ہم اُسی وقت کر سکتے

ہیں۔ جب ہر چیز اپنی جگہ پر موجود ہو، دوسرے ہم لوگوں کا سفری شوق محض تفریحی ہوتا ہے۔ بس چار دوست مل گئے۔ سیر و سفر کر رہے ہیں۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے مست کئے دیتے ہیں۔ آپس میں ہنسی مذاق کی باتیں ہو رہی ہیں۔ گویا وقت کے ساتھ کھیلا جا رہا ہے قدرتی حسن کو پائمال کر رہے ہیں۔ باغوں اور کھیتوں کو روندے ڈالتے ہیں۔ پھلوں پھولوں کے درختوں کو بے برگ و بار کر کے خوش ہو رہے ہیں۔ اپنے ملک کے قدرتی مناظر کا ستیا ناس اُڑائے دیتے ہیں۔ سوچنے کی بات ہے جن اساتذہ کی زیر نگرانی ایسے تباہ کُن سفروں اور سیاحتوں کا انتظام ہوتا ہے دیکھنے والے ان کے متعلق کیا خیال قائم کرتے ہونگے! افسوس کا مقام ہے کہ ہمارے مُلک میں لوٹے ہوئے پھولوں۔ روندے ہوئے سبزہ زاروں اور ویران کئے ہوئے پھل دار درختوں کو دیکھ کر دیکھنے والے فوراً اس نتیجے پر پہنچ جاتے ہیں کہ یہاں ضرور کسی طلبا کی جماعت کا گزر ہوا ہے۔ اور یہ ان کے تعلیمی کارنامے ہیں۔ اسی وجہ سے ہمارے مُلک میں یہ خیال عام ہے کہ سیر و سفر میں طلبا کا وقت ضایع ہوتا ہے۔ اگر اس قسم کے سفر قابل اُستادوں کی نگرانی میں کیئے جائیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہمارے مُلک میں حقیقی معنوں میں سیاح پیدا نہ ہوں اور وہ اپنی واقفیت اور سیاحت سے مُلک کو فائدہ نہ پہنچائیں ۔

سیاحت کا شوق نہ ہونے سے مُلک کو نقصان پہنچتا ہے	ہمارے مُلک میں

سیاحت کا شوق نہ ہونے سے ملکی ترقی میں بہت سی رکاوٹیں حائل ہیں اور سچ یہ ہے کہ اس شوق کے فقدان نے ہمارے ملک کو شدید نقصانات پہنچائے ہیں۔ کتنے افسوس کی بات ہے۔ کہ ہمارے ملک کے قدرتی خزانوں کا کھوج غیر ملکی لوگ آ کر لگاتے ہیں۔ اور ہم پڑے سوتے ہیں۔ زر و جواہر سے جہاز کے جہاز بھر کر اپنے ملکوں کو لئے جاتے ہیں اور ہم بیٹھے دیکھتے ہیں۔ یہ سب نقصان محض اس لئے پہنچ رہا ہے کہ ہمیں سیر و سیاحت کا شوق نہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ ترقیٔ تعلیم کے ساتھ ساتھ سیر و سیاحت کا شوق بھی ترقی کر رہا ہے۔ اور نوجوان اپنی ترقی اور ملکی بہبودی کے لئے دُور دراز ملکوں میں جانے سے نہیں ہچکچاتے۔ موجودہ حالات کو دیکھتے ہوئے اندازہ ہوتا ہے کہ بیسویں صدی کے اختتام تک جس قدر رکاوٹیں سیر و سیاحت میں سد راہ ہیں دُور ہو جائینگی۔ اور ہر طالب علم کے دل میں سیر و سیاحت کا غیر فانی شوق پیدا ہو جائیگا ؎

شکار

شکار کی تدریجی ترقیاں

جب حضرت آدم کو جنّت سے نکالا گیا اور وہ اس دُنیا میں تشریف لائے تو شروع شروع میں انہوں نے درختوں کے پتّے اور پھل پھول کھا کر اپنا پیٹ پالا۔ اور انہی کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنایا، اسوقت دُنیا خونخوار درندوں سے بھری پڑی تھی اپنی حفاظت کے لئے ان سے نبرد آزمائیاں کیں جس قدر اولاد آدم بڑھتی گئی یہ لڑائیاں بھی زیادہ ہوتی گئیں۔ اس طرح درندوں سے دشمنی مسلّم اور ان کا گوشت و خون حفاظت خوداختیاری میں جائز ہوگیا، قیاس کہتا ہے جب کسی درندے سے بہت زیادہ آزار پہنچتا ہوگا تو دشمنی کا جذبہ اور بھی زیادہ ترقی کرتا ہوگا، کیا تعجب ہے کہ انسان درندوں کو مار کر غصہ کی آگ ٹھنڈا کرنے کے لئے ان کا خون بھی پی لیتا ہو، یا چیر پھاڑ میں خون خودبخود مُنہ میں چلا جاتا ہو، غرض جب انسان کے مُنہ کو خون لگا تو اس کی توجہ گوشت کی طرف مبذول ہوئی خون ایسی چیز ہے جسے تازہ تازہ ہی پی سکتے ہیں، لیکن گوشت کو کئی کئی دن رکھ کر بھی کھایا جا سکتا ہے اس لئے بالکل ممکن ہے کہ گوشت تازہ بتازہ خون نہ ملنے کی صورت میں کھایا جاتا ہو۔

جب انسان نے ترقی کی تو اس نے درندوں کو مارنے کے لئے
نئے نئے ڈھنگ ایجاد کئے۔ بلا خوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ شکار کے آلات
کو ایجادات میں اولیت کا فخر حاصل ہے۔ جس زمانے میں انسان شکار
پر زندگی بسر کرتا تھا، تاریخی کتابوں میں اس کو شکار کا زمانہ کہا جاتا ہے
اس دور میں شکار ضروریات زندگی میں سے تھا کیونکہ شکار سے
نہ صرف غذائے انسانی مہیا ہوتی تھی بلکہ انسان کی زندگی بھی اسی سے محفوظ
رہ سکتی تھی، زمانۂ دراز کے بعد جب انسان کی عقل نے مزید ترقی
کی تو اس نے دوسرے زمانہ میں قدم رکھا، اب وہ جنگلوں میں سے
نکل کر سیراب علاقوں میں آگیا، اس نے اپنے رہنے کے طور طریقے
بدلے، ضروریات زندگی کو بڑھایا، جانوروں کو پالنے لگا، اس زمانے
کو تاریخی زبان میں گڈریوں کا زمانہ کہتے ہیں، اس دور زندگی میں ہر
خاندان کے ساتھ مویشیوں کے گلّے ہوا کرتے تھے، افراد خاندان
ان کا دودھ پیتے اور گوشت کھا کر پیٹ پالتے تھے، اب بجائے پتوں
کے وہ کھالوں سے تن پوشی کرنے لگے تھے، اسوقت انسان شکار
کے زمانے سے ایک قدم آگے تھا لیکن حقیقت میں شکار کے زمانے
کی تمام خصوصیات اس میں موجود تھیں اب انسان پر صرف اپنی ہی
حفاظت لازم نہ رہی تھی بلکہ ان جانوروں کا تحفظ بھی اس پر فرض تھا
جن کو وہ اپنی ضروریات زندگی پورا کرنے کے لئے پالتا تھا، اس زمانہ
میں انسان نے ترقی کا ایک اور قدم اٹھایا گویا اس نے زمین کی

پیداواری قوّت کا پتہ لگایا، اس نے خانہ بدوشی کی زندگی ترک کر کے زرخیز زمینوں پر قبضہ کیا، اور کاشتکاری کی طرف متوجہ ہُوا غرض ضرورتیں بڑھتی گئیں اور طبیعتیں زراعت، صنعت حرفت اور تجارت کی طرف باقاعدہ مائل ہوئیں، یہی وہ زمانہ ہے جہاں سے انسان کے متمدن اور مہذب کہلانے کا دَور شروع ہوتا ہے۔ لُطف یہ ہے کہ باوجود اس قدر ترقی کرنے کے اس نے شکار کو نہ چھوڑا ہاں اتنا فرق ضرور پیدا کیا کہ پہلے اور دوسرے دَور زندگی میں شکار ضروریات زندگی میں شامل تھا، لیکن تہذیب وتمدّن کی آن بان نے اسے شوق میں تبدیل کر دیا۔

انسان کو اس دُنیا میں زندگی بسر کرتے ہوئے ہزارہا سال گزر چکے ہیں۔ لیکن شکار کی چَٹ اس کے ساتھ اب تک لگی ہوئی ہے۔ ہم ذرا نہ دیکھتے ہیں کہ گلی کوچوں میں چھوٹے چھوٹے بچّے طرح طرح کی غلیلیں لئے پھرتے ہیں، اور جہاں کہیں کسی پرندے کو بیٹھا دیکھتے ہیں اس کا نشانہ اُڑاتے ہیں۔ اگر حسنِ اتفاق سے وہ غُلّہ لگ کر زخمی ہو جائے تو ان کی خوشی کی کوئی انتہا نہیں رہتی، بڑے ہونے کے بعد اگر حالات مساعدت کرتے ہیں تو یہ شوق غلیل سے آگے بڑھتا ہے ورنہ صرف شکار کا شوق ہی شوق باقی رہ جاتا ہے غالباً اسی اُفتادِ طبع کی بدولت اکثر لوگ شکاریوں کے ساتھ ساتھ جنگلوں کی خاک چھانتے پھرتے ہیں، اگرچہ وہ خود شکار نہیں کرتے لیکن دوسروں کو شکار کھیلتے

ہوئے دیکھ کر ہی خوش ہو جاتے ہیں ۔

شکار کے متعلق علمائے نفسیات کی تحقیق و تفتیش کا لُب لباب یہ ہے کہ شکار انسان کی فطری ضروریات زندگی میں سے ایک ضرورت ہے طرز معاشرت اور تمدن میں تبدیلیاں اور ترقیاں ہونے سے اس مخصوص ضرورت کی نوعیت بدل گئی ہے۔ ورنہ درحقیقت یہ فطری ضرورت ہر انسان کے دل میں اب تک موجود ہے۔ موجودہ دور میں چونکہ شکار ہر شخص کے بس کا کھیل نہیں رہا۔ اس لئے یہ ضرورت تحصیل و گرفت کے ذریعہ سے پوری کی جاتی ہے۔ مثلاً چھوٹے چھوٹے بچے کمال شوق سے ہر دل پسند چیز اپنی جیبوں میں بھر لیتے ہیں اور کسی عنوان سے اپنی جیب کو خالی کرنے نہیں دیتے، نوخیز لڑکے اس ضرورت کا اظہار ان کھیلوں میں دلچسپی لے کر کرتے ہیں جن میں پکڑ دھکڑ اور چھینا جھپٹی لازم آتی ہے۔ مرد اس فطری ضرورت کو عشق و محبت کے کارناموں کے ذریعے بہم پہنچاتے ہیں، پس اگر ان معاملات میں فطری ضرورت کارفرما نہ ہوتی تو انسان ان سے بہت کم دلچسپی لیتا ۔

ہم اس مضمون میں شکار کھیلنے کے مختلف طریقے اس طرح بیان کرینگے کہ پڑھنے والوں کو آسانی سے شکار کھیلنا آجائیگا، اور اس ضمن میں بعض ایسے دلچسپ شکار کے طریقوں کا ذکر آئیگا جو بہت کم دیکھنے میں آتے ہیں ۔

غلیل | شکار کا شوق اکثر ربڑ کی غلیل سے شروع ہوتا ہے، چونکہ اس مخصوص قسم کی غلیل سے کوئی پرندہ مشکل سے شکار ہو سکتا ہے، اس لئے غلیل کا شوق بہت جلد ختم ہو جاتا ہے۔ اگر آپ کو کبھی پھلوں کے باغوں میں جانے کا اتفاق ہوا ہے تو وہاں آپ نے اکثر رکھوالوں کو گوپھیا چلاتے ہوئے دیکھا ہو گا، گوپھیا شکار کھیلنے کے کام نہیں آتا۔ اس کے ذریعے غلّے پھینک کر درختوں پر سے پرندوں کو اُڑایا جاتا ہے تاکہ وہ پھلوں کو نقصان نہ پہنچائیں، قدیم زمانے میں دشمن کی فوج پر اس کے ذریعے گولے بھی پھینکا کرتے تھے۔

پھل دار باغوں میں پرندوں کو اُڑانے کے لئے کماندار غلیل بھی استعمال کی جاتی ہے، یہ واقعی کام کی چیز ہے، اس سے پرندوں کو مارا بھی جا سکتا ہے، لیکن اس کا چلانا بہت خطرناک ہے، اس کو چلاتے وقت بائیں انگوٹھے کی سیدھ میں نشانہ لیتے ہیں، اس لئے عموماً انگوٹھا بہت بُری طرح زخمی ہو جاتا ہے، اکثر لوگوں کے متعلق سُننے میں آتا ہے کہ وہ غلیل چلانے میں اس قدر مشاق تھے کہ پہلے ایک غلّہ آسمان کی طرف پھینکتے اور دوسرے غلّے سے پہلے غلّے کو زمین تک آنے سے پہلے توڑ ڈالتے، وہ ہر قسم کا شکار غلیل ہی سے کھیلا کرتے تھے، اور جس جگہ غلّہ مارنے کا ارادہ کرتے وہ ہمیشہ وہیں جا کر لگتا، غرض اس قسم کے بیسیوں ناقابلِ یقین افسانے باکمال غلیل اندازوں کے متعلق سُننے میں آتے ہیں، لیکن "شنیدہ کے بود مانند دیدہ" کے معیار پر

کہا جاسکتا ہے کہ غلیل کے نشانہ میں زیادہ سے زیادہ بیس فیصدی کامیابی ہوتی ہے ۔

نشانہ کی مشق عام بچوں کی طرح مجھے بھی شکار کا شوق تھا، پہلے میں نے ربڑ کی غلیل سے اس شوق کو پورا کیا پھر کماندار غلیل خریدی، جب انگوٹھا زخمی ہوا تو اس سے بھی دل بیزار ہو گیا، پھر میں نے ہوائی بندوق سے نشانہ کی مشق شروع کی، مجھے بتایا گیا کہ پہلے بندوق کے کندے کو کندھے پر جماؤ، اور وہ مکھی جو نال کے سرے پر بنی ہوئی ہوتی ہے اس کو دیدوان میں سے دیکھو، دیدوان اس کھانچے کو کہتے ہیں جو نال کے شروع میں لگا ہوا ہوتا ہے، مکھی اور دیدوان کو شکار پر مرتکز کردو، جب یہ تینوں چیزیں بالکل ایک سیدھ میں آجائیں تو پھر لبلبی کو اس آہستگی سے دباؤ کہ بندوق کی نال کو ہوا برابر جنبش نہ ہو، نشانے میں مہارت پیدا کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ کسی کاغذ پر ایک پانچ انچ قطر کا کالا دائرہ بنا کر اسے دیوار پر چسپاں کردو، پھر آٹھ دس قدم کے فاصلے سے اس کا نشانہ کرو جب نشانہ ٹھیک نشان پر لگنے لگے تو اسے اور چھوٹا کردو، اس طرح سے نشانہ کی مشق بہت آسانی سے ہو جاتی ہے اور انسان چھوٹے چھوٹے پرندے بخوبی مار لیتا ہے ۔

گرانبہا نصیحتیں میرے حقیقی ماموں کے پاس ٹوپی دار بندوق تھی، اور وہ ہر اتوار کو شکار کھیلنے جایا کرتے تھے، ایک دفعہ کمال شفقت

سے انہوں نے مجھے اپنے ساتھ لے جانا منظور کیا، مَیں اس سے پہلے کبھی شکار میں نہ گیا تھا، یہ پہلا موقعہ تھا اس لئے مجھے بہت خوشی ہوئی ہم بہت رات گئے تک شکار کی باتیں کرتے رہے، دَوران گفتگو میں انہوں نے فرمایا کہ جس وقت شکار کو جاتے ہیں تو شکاری لوگ چاقو کا نام نہیں لیا کرتے، کہتے ہیں اگر کسی کے مُنہ سے یہ لفظ نکل جائے تو پھر شکار نہیں ملتا، شکاری زبان میں چاقو کو ملّا کہا جاتا ہے اس لئے مہربانی کر کے کہیں تم چاقُو کا نام نہ لے دینا، میں نے کہا کہ کیا یہ بات درست ہے؟ انہوں نے کہا، مَیں اس پر یقین تو نہیں کرتا لیکن پھر بھی احتیاط ضرور کرتا ہوں، غرض جُوں تُوں کر کے صبح ہوئی، اور ہم شکار کو روانہ ہوئے، ماموں جان کا سلسلہ کلام برابر جاری تھا کہ انہوں نے ایک پرندے کو دیکھ کر کہا لو بھئی شگون تو خوب ہُوا، میں نے کہا ماموجان وہ کیا؟ کہنے لگے اگر پہلا شکار دائیں جانب نظر آئے تو شکار میں کامیابی یقینی جانو، اور اگر معاملہ اس کے برعکس ہو تو پھر شکار مشکل ہی سے ملتا ہے اور بھئی میرا تجربہ بھی یہی ہے کہ عموماً خالی ہاتھ ہی آنا پڑتا ہے۔ غرض اسی طرح وہ اپنی گرانبہا نصیحتوں سے برابر مستفیض فرماتے چلے جاتے تھے۔ اسی دوران میں انہوں نے یہ بھی فرمایا کہ میرے والد مرحوم مجھے نصیحت کیا کرتے تھے کہ ہمیشہ پرندوں کا شکار کھیلا کرو، اس میں حادثہ کبھی نہیں ہوتا، دوسرے جس جنگل میں کوئی انگریز شکار کھیل رہا ہو، اس میں کبھی بندوق نہ

چلاؤ، اور اُلٹے پاؤں واپس آجاؤ، کیونکہ یہ لوگ اکثر رائفل سے شکار کھیلتے ہیں اور بڑی بے پرواہی سے بندوق چلاتے ہیں اس لئے عموماً راہگیروں کو زخمی کر دیتے ہیں۔ حکمران ہونے کی وجہ سے ان کو پکڑنے کی کوئی جرأت نہیں کرتا، اور ان کے بدلے دیسی شکاری پکڑے جاتے ہیں ٭

ماموں جان کی بندوق قدیمی دیسی ساخت کی تھی اور وہ اسکو بہت عزیز رکھتے تھے، کیونکہ ان کے والد کی نشانی تھی، اس میں نال کے ذریعے اوپر سے پہلے بارود بھرتے پھر ایک کپڑے کا ٹکڑا ٹھونس کر لوہے کے گز سے اسے کوٹتے، اس کے بعد اندازے کے مطابق کچھ چھرے ڈال کر پھر کپڑا ٹھونستے تھے کندے کے پاس نال میں سے ایک چھوٹی سی نلکی باہر کو نکلی ہوئی تھی، اس میں پٹاس کی ٹوپی رکھتے تو پھر کہیں جا کر بندوق چلانے کے لئے تیار ہوتی تھی۔ میں نے ہزار چاہا کہ وہ مجھے بھی بندوق چلانے کو دیں لیکن انہوں نے نہ مانا اور خود ہی چلاتے رہے۔ غرض اس تمام گردش میں انہوں نے چار بچے مارے اور واپس آ گئے ٭

میں چند سال بعد علی گڑھ سے ایف۔ اے کا امتحان پاس کر کے دہلی میں آیا۔ یہاں میرے جانکاروں میں کئی ایک شکاری بھی تھے۔ چونکہ میرے دل میں شکار کا شوق تھا اس لئے اکثر ان سے شکار کی باتیں رہا کرتی تھیں، ایک دن میں نے ماموں جان سے

کہا کہ میرے والد مرحوم کی بندوق ان کے ایک دوست کے پاس بطور امانت پڑی ہے، اگر مجھے لائسنس مل جائے تو میں اسے منگوا لوں انہوں نے کہا میں بندوق کا لائسنس دلوا دونگا تم ایک درخواست لکھ دو، میں نے اوّلین فرصت میں درخواست لکھ کر ان کے حوالے کی اور انہوں نے سفارش کر کے مجھے لائسنس دلوا دیا۔ میں نے فوراً بندوق منگوا کر اس پر رنگ و روغن کرایا اور بہت سے نمبروں کے کارتوس خرید لئے، شروع شروع میں متعدد مرتبہ میں ماموں جان کے ساتھ شکار کو گیا اور اکثر چھپے۔ کبوتر اور فاختائیں وغیرہ ماریں، چونکہ وہ بہت محتاط شکاری تھے اور قدم قدم پر نصیحتیں کرتے تھے، اس لئے میں نے ان کے ساتھ جانا چھوڑ کر ہر اتوار کو بہ نفس نفیس دو ایک غیر شکاری مگر شکار کے شوقین دوستوں کی معیت میں جانا شروع کر دیا،

اُڑتے پرندوں کا شکار

میرے بعض دوست مانے ہوئے شکاری تھے، اور وہ اکثر تین تین چار چار ہرن مار مار کر لایا کرتے تھے میں ان کے مقابلے میں بالکل اناڑی تھا۔ اس لئے ان کے ساتھ جانے کی ہمت نہ پڑتی تھی، میرے دل میں شکار کا شوق دن دوگنی اور رات چوگنی ترقی کر رہا تھا اور طبیعت زوروں پر تھی اس لئے کسی اتوار کو خالی نہ جانے دیتا تھا، اُن دنوں میں لوگوں کی کہی سنی باتوں پہ عمل کر کے اُڑتے پرندوں کا شکار کھیلنے کی مشق کر رہا تھا، یہ

مشق بہم پہنچانے کے لئے میں نے بہت کافی کارتوس ضایع کئے۔
آخر کار میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ جب بندوق کندھے پر رکھ کر اُڑتے
پرندے کا نشانہ لیا جائے اور جس وقت وہ نشانہ پر آجائے تو بندوق
فوراً ہی نہیں چلانی چاہئے بلکہ پرندے کی پرواز کے ساتھ ساتھ کندھے
کو بھی آہستہ آہستہ اس جانب موڑنا چاہیئے جدھر وہ پرواز کر رہا ہے
جب وہ مکھی اور دیدوان کے نیچے بالکل مرتکز ہوجائے تو اس کی
چونچ سے ایک ہاتھ بھر آگے نشانہ لے کر بندوق چلادی جائے،
جتنی دیر میں لبلبی دبتی اور بندوق چلتی ہے اتنی دیر میں پرندہ اُڑ کر
عین نشانہ پر آجاتا ہے اور اکثر زد سے باہر نہیں نکل سکتا، جب مشق
پختہ ہوکر ہاتھ میں پھرتی آجاتی ہے تو یہ فاصلہ قدرے کم کر دیتے ہیں۔
اس قسم کے شکار میں یہ بھی خیال رکھنا پڑتا ہے کہ پرندہ کس رفتار
سے اُڑ رہا ہے۔ عموماً شروع میں پرندوں کی پرواز ہلکی ہوتی ہے
اور پھر بڑھتی چلی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ یہ احتیاط بھی ضروری
ہے کہ سانس لینے یا لبلبی دبانے میں بندوق ہلنے نہ پائے کیونکہ نال
کی ذراسی جنبش سے نشانہ خطا ہوجاتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ بعض
شکاریوں کے برابر کے دو فائروں میں سے اکثر دوسرا نشانہ
اسی وجہ سے خالی جاتا ہے۔ اگر پہلے فائر کے بعد اوسان درست اور
اعضاو قویٰ پر قابو رہے تو یہ خرابی واقع نہیں ہوتی، جب نشانہ لینے
کی مشق اور مہارت ہوجاتی ہے تو نال کی مکھی اور دیدوان کو مرتکز

کرنے میں بہت کم وقت صرف ہوتا ہے بس جونہی جانور سامنے آتا ہے بندوق اس طرح اُٹھتی ہے جس طرح پہلے سے تیار تھی اور اسکے ساتھ ہر ضروری فعل نہایت منضبط طریقے سے خود بخود بغیر کسی گھبراہٹ کے عمل میں آتا ہے۔ بندوق کے شکار میں فاصلے کا مسئلہ بھی غور طلب ہے اکثر شروع شروع میں فاصلہ کا اندازہ صحیح نہیں ہوتا اس کے لئے اگر چند مرتبہ قدموں سے فاصلہ ناپ کر نظروں میں جچا لیا جائے تو پھر غلطی کا امکان بہت کم باقی رہ جاتا ہے ۔

بعض شکاری کہا کرتے ہیں کہ نشانہ لینے کا ایک اندازہ ہو جاتا ہے جب شکار سامنے آتا ہے تو ان کو دیدوان اور مکھی کو ملانے کی ضرورت پیش نہیں آتی بس بندوق اُٹھائی اور داغ دی ، یہ اندازہ کثرت مشق اور مہارت کا نتیجہ ہے اور اس میں شک نہیں کہ بہت مفید ہے۔ مثلاً پہاڑوں میں جنگلی مُرغ بہت تیزی سے اُڑتے ہیں اور پلک جھپکتے ہیں درختوں کی آڑ میں آجاتے ہیں، ایسے مواقع پر شکاری باقاعدہ نشانہ نہیں لے سکتا اس لئے اس کو اپنے اندازے سے کام لینا پڑتا ہے۔ اسی طرح جہاں اونچی نیچی جھاڑیاں یا قد آور گھاس ہو وہاں بھی شکاری کو باقاعدہ نشانہ لینے کی مہلت نہیں مل سکتی، لیکن پھر بھی جہاں تک ممکن ہو سکے شکاری کو نشانہ ضرور لینا چاہئے، جن لوگوں کو اندازے پر بندوق چلانے کی عادت پڑ جاتی ہے ان کے نشانے خالی جانے کا اکثر احتمال رہتا ہے کیونکہ عادت ایک خاص

اندازے پر قائم ہو جاتی ہے اور جب یہ اندازہ درست نہیں رہتا تو نشانہ آپ سے آپ ٹھیک جگہ پر نہیں بیٹھتا ۔

شکاری کو پہلی مرتبہ بڑی احتیاط اور صحیح اندازے سے بندوق چلانی چاہئے کیونکہ اکثر بار ایسا دیکھنے میں آیا ہے کہ اگر کسی دن پہلی مرتبہ نشانہ غلط ہو جائے تو پھر تمام دن برابر نشانے خطا ہوتے چلے جاتے ہیں، شکاری کو لازم ہے کہ وہ اپنی طبیعت کو مضبوط رکھنے کی کوشش کرے، حساس شکاری بہت جلد گھبرا جاتے ہیں، اور اکثر جلدی نشانہ نہیں لے سکتے، جتنی دیر میں وہ اپنے اوسان درست کرتے ہیں اتنے عرصے میں شکار زد سے باہر نکل جاتا ہے اور وہ منہ دیکھتے رہ جاتے ہیں ۔

تیتر کا شکار

محض تیتر کے شکار کے لئے ۱۲۸/۳ انچ کی سیلنڈر نال والی بندوقیں مفید ہیں کیونکہ ان میں سے چھرّے خوب پھیل کر نکلتے ہیں جو لوگ ایک ہی بندوق سے ہر قسم کے شکار کا شوق پورا کرنا چاہیں ان کے لئے وہ بندوق کار آمد ہے جس کی ایک نال سیلنڈر دوسری چوک اور چیمبر کم سے کم تین یا پونے تین انچ کا ہوتا ہے ایسی بندوق سے دُور اور نزدیک کا شکار آسانی سے ہو سکتا ہے بعض صاحب حیثیت شکاری ہر قسم کے شکار کے لئے الگ الگ قسم کی بندوقیں رکھا کرتے ہیں مگر اکثر ان کو استعمال نہیں کر سکتے۔ اوّل تو دو سے زیادہ بندوقوں کو اُٹھانا مشکل ہے۔ اگر کوئی بندوق بردار

رکھا جائے تو وہ ہر موقعہ پر ساتھ نہیں رہ سکتا اس لئے ایک بندوق سے سب قسم کا شکار کھیلنے کی مشق کرنی چاہیئے اس میں شک نہیں کہ شروع شروع میں ذرا دقت محسوس ہوتی ہے لیکن مہارت پیدا ہونے کے بعد کوئی دقت پیش نہیں آتی ۔

میں نے خاص طور پر تیتر کا شکار کبھی نہیں کھیلا ہاں ایک مرتبہ پروفیسر شیرانی صاحب کے ساتھ تیتروں کے شکار میں گیا تھا۔ اس شکار میں ہم چھ شکاری تھے سب شکاری ایک قطار میں کھڑے تھے، اور بہت سے دیہاتی تیتر اُڑا رہے تھے جب تیتر اُڑتا تو پہلا شکاری بندوق چلاتا اگر اس سے بچ جاتا تو پھر دوسرا فائر کرتا، اس طرح سے بعض اوقات چھ چھ بندوقیں ایک دم چل جاتیں اور تیتر کسی نہ کسی زد میں ضرور آجاتا، میں سب سے آخر میں تھا۔ اس لئے مجھ تک کوئی تیتر مشکل سے پہنچتا اور پہلے ہی چار پانچ فائروں میں گر پڑتا۔ اتفاق سے ایک تیتر بچتا ہوا مجھ تک آ ہی گیا، میں اپنی جگہ پر مایوس کھڑا تھا، مگر پھر بھی میں نے بغیر نشانہ لیے بندوق داغ دی، اس اندازے کے نشانہ میں تیتر کی ٹانگ ٹوٹ کر نیچے گر پڑی اور وہ بچ کر نکل گیا مگر سدھا ہوا کتا اس کو کہیں سے پکڑ لایا، یہ چاندماری تقریباً چار گھنٹے جاری رہی، اور ہم نے کوئی چالیس کالے تیتر مارے ۔

کالے تیتر عموماً گنّوں کے کھیتوں اور سرکنڈوں کے جھنڈوں

میں رہتے ہیں، یہ صبح کے وقت کھیتوں میں دانہ چگنے کے لئے نکلتے ہیں مگر ہوتے ہیں اس قدر ہوشیار کہ ذرا سی آہٹ سے دبک جاتے ہیں، اور دبکے دبکے کہیں سے کہیں نکل جاتے ہیں، شروع شروع میں انسان تیتر کی پھڑپھڑاہٹ سے گھبرا جاتا ہے۔ لیکن جب جھجک دُور ہو کر اُڑتے پرندوں کو مارنے کی مشق و مہارت پیدا ہو جاتی ہے تو بندوق خود بخود وقت ضرورت نشانہ پر آجاتی ہے اور اکثر وار خالی نہیں جاتا ؏

تیتروں کا مارنا اتنا زیادہ مشکل نہیں جتنا ان کو جھاڑیوں اور کھیتوں میں سے اُڑانا دشوار ہے۔ اس کام کے لئے تقریباً پانچ چھ آدمیوں کی ضرورت پڑتی ہے۔ ایک دیہاتی نے ہمیں یہ ترکیب بتلائی کہ ایک لمبی سی رسّی لے کر اس کے سرے دو آدمی پکڑ لیں اور گنّوں یا سرکنڈوں کے اوپر سے کھینچتے ہوئے آگے بڑھیں شکاری کھیت کے سرے پر کھڑے ہو جائیں۔ رسّی کی سرسراہٹ سے تیتر آگے بڑھیں گے اور ایک ایک دو دو کر کے اُڑتے بھی جائینگے، اس ترکیب پر عمل کرنے سے اگر کوئی جانور کھیت میں چھپا ہوا ہو تو وہ نکل کر بھاگتا ہے ؏

تیتر پکڑنے کا عجیب طریقہ ایک دفعہ شکار میں میری ملاقات ایک سپاہی سے ہو گئی، اس کو تیتر پکڑنے کا بہت شوق تھا، اور وہ عجیب طریقے سے تیتر پکڑتا تھا، اس نے تقریباً ۸ انچ اونچے اور گز گز بھر

لمبے کوئی بارہ فریم بانس کے بنا رکھے تھے، اوران میں چھ چھ سات سات انچ چوڑے خانے بانس کی کھپچیوں سے بنا کر ہر خانے میں گھوڑے کی دُم کے بالوں سے پھندے لگائے تھے، یہ فریم ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح بندھے ہوئے تھے کہ آسانی سے تہ ہو جاتے تھے، اور وہ ان کو ہر جگہ اپنے ساتھ لئے پھرتا تھا، جس جگہ اسے تیتروں کا شبہ ہوتا وہاں اپنے فریموں کو ایک قطار میں کھڑا کر دیتا، اور تیتروں کو گھیر کر ان کی طرف لاتا، تیتروں کو فریموں کی طرف لانے کے لئے وہ بار بار زمین پر لکڑی مارتا تھا، تیتر ڈر کر آگے بھاگنے کی کوشش کرتے، اور ان پھندوں میں گرفتار ہو جاتے، اس نے ایک تیتر بھی پال رکھا تھا، وہ سپاہی کی آواز پر بولتا تھا، تیتروں کا قاعدہ ہے کہ کسی تیتر کی آواز سن کر وہ اس کا جواب دیتے ہیں، اور اس طرح سے اپنا پتہ خود ہی بتا دیتے ہیں۔ غرض جہاں جنگلی تیتر اس کے تیتر کی آواز پر بولتے وہ اپنے تیتر کے پنجرے کو بیچ میں رکھ کر ان کے چاروں طرف فریم لگا دیتا، اور خود دور جا کر چھپ جاتا۔ وہاں سے اپنے تیتر کو بلاتا، وہ حسب عادت اس کی آواز پر بولتا، جنگلی تیتر اس کی آواز سن کر لڑنے کے لئے اس کے قریب آتے اور اس لڑائی کے جوش میں گرفتار ہو جاتے تھے۔

تیتر کے شکار کے لئے کوئی خاص وقت مقرر نہیں، ان کا شکار

ہر وقت ہو سکتا ہے۔ صبح اور شام کے وقت وہ بھاگتے بہت ہیں
اور اکثر شکاری کے ہاتھ نہیں آتے، ان کو بھاگنے سے روکنے کا طریقہ
ایک شکاری نے ہمیں یہ بتلایا کہ جس کھیت میں وہ چھپے ہوئے ہوں
اس کھیت پر ایک ایسی پتنگ اُڑا دی جائے جس کے نیچے کا حصّہ
شکرے یا بہری کے رنگ کا ہو۔ تیتر اس کو دیکھ کر خوف کے مارے
وہیں دبک جائینگے اور اس کھیت میں سے آگے نہ جائینگے، شکار
کے لئے جانا اور اپنے ساتھ گڈی اور ڈورلے جانا بہت مضحکہ خیز
اور معیوب سا معلوم ہوتا ہے۔ اس تضحیک سے بچنے کی ہم نے یہ
ترکیب نکالی کہ ایک بیلون (ربڑ کا غبارہ) شکرے کے رنگ کا خریدا
اور اس کو جیب میں رکھ کر اپنے ساتھ لے گئے، شام کے وقت ہوا
بھر کر ہم نے اس کو ایک لکڑی پر باندھا اور کھیت پر اُڑا دیا، اسکا
اثر وہی ہوا جو شکرے کا ہوتا ہے۔ تیتر بھاگنے سے رُک گئے اور
ہم نے اُڑا اُڑا کر کتنے ہی مارے۔

مُرغابی کا شکار مُرغابی پانی کا جانور ہے، یہ گرمی میں پہاڑوں میں
رہتا ہے اور سردی میں میدانوں میں اُتر آتا ہے۔ مرغابیاں مچھلی
کی طرح پانی چاہتی ہیں، اس لئے جہاں پانی ہوتا ہے وہیں اُترتی
ہیں۔ تالابوں۔ جھیلوں اور دریاؤں کے کنارے بکثرت مل جاتی
ہیں، جہاں پانی دُور دُور تک پھیلا ہُوا ہو وہاں آسانی سے زد پر
نہیں آتیں، بندوق کی آواز سے ڈر کر آگے ہی آگے نکل جاتی ہیں

اس کے شکار میں بہت لطف آتا ہے۔ بہت بڑے بڑے تالابوں اور جوہڑوں پر مرغابی کا شکار ایک شخص کے بس کا کھیل نہیں، اگر دو چار شکاری ہوں اور وہ دو دو سو گز کے فاصلے پر بیٹھ جائیں تو پھر اس کا شکار خوب پرلطف اور کامیاب رہتا ہے۔ مرغابی کا قاعدہ ہے کہ وہ پانی سے زیادہ دُور نہیں جاتی، ہر پرواز میں دو تین سو گز اُڑ کر پھر پانی میں آجاتی ہے ؛

بعض جھیلوں پر مرغابیاں اس کثرت سے جمع ہوتی ہیں کہ ان کے شور سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی، جب ان کے غول اُڑتے ہیں تو آسمان سیاہ ہو جاتا ہے۔ یہ منظر دیکھ کر دل پر عجب کیفیت طاری ہوتی ہے۔ جب پہلی مرتبہ مجھے ایسی جھیل پر جانے کا اتفاق ہوا تو میری عجیب حالت ہوئی، مرغابیاں لاتعداد تھیں، اور شکاری بھی بہت تھے، ہم ایک طرف کو بیٹھ گئے اور شام تک یہی لطف دیکھتے رہے، ایک طرف بندوق چلتی، تو وہاں سے مرغابیاں اُڑتیں اور دوسری طرف جاتیں، ہر جگہ شکاری تاک لگائے بیٹھے تھے۔ جونہی ان کی زد پر آتیں وہ فائر کرتے وہاں سے آگے بڑھتیں تو اور فائر ہوتا غرض ہر طرف سے بندوقیں سر ہو رہی تھیں لیکن وہ ہر پھر کر پھر پانی ہی پر آتی تھیں، اس موقعہ پر اگرچہ ہمیں اچھی جگہ نہ ملی تھی لیکن پھر بھی ہم نے نو دس مرغابیاں آسانی سے ماریں، شکاریوں کی ایک پارٹی جو صبح سے وہاں مقیم تھی انہوں نے شام تک تقریباً ڈیڑھ سو

مُرغابیاں ماریں۔ اور ایسی جگہ پر یہ کوئی بڑی بات نہیں ؛
مُرغابی کی رفتار عام پرندوں سے تیز ہوتی ہے اس لئے ابتدائے مشق میں ان کا نشانہ دو ڈھائی فٹ آگے لینا چاہیئے۔ جب ہاتھ میں پھرتی پیدا ہو جائے تو پھر آدھ گز آگے مارنے میں سَو فیصدی کامیابی ہوتی ہے، ایک فائر میں کئی ایک مُرغابیاں مارنے کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے بندوق کو ان پر مرتکز کر دیا جائے اور پھر دیکھا جائے کہ کس نقطہ پر دیدوان اور مکھّی کی اوٹ میں زیادہ سے زیادہ مُرغابیاں آتی ہیں، جونہی ایسا موقعہ ہاتھ آئے فوراً اپنے اندازے کے مطابق بندوق آگے بڑھا کر لبلبی دبا دی جائے، مُرغابی کے شکار میں ٹھیک جگہ کا تلاش کرنا بھی ضروری ہے، اگر پانی کے کنارے کسی جھاڑی کی اوٹ میں جگہ مل جائے تو سُبحان اللہ، ورنہ بیچ کی وہ جگہ بھی مناسب ہے جہاں سے مُرغابیاں اِدھر اُدھر سے اُڑ کر ہر بار گزرتی ہیں نیز یہ بات ہمیشہ یاد رکھنی چاہیئے کہ بیکار بندوق چلانے سے وہ ڈر جاتی ہیں اور دیر تک زد پر نہیں آتیں ؛

مُرغابی پکڑنے کا عجیب طریقہ

ایک دفعہ ہم ایک بہت بڑی جھیل پر مُرغابیاں مارنے کے لئے گئے، بیٹھنے کے لئے کسی معقول جگہ کی تلاش میں تھے، کہ ہمیں چند دیہاتی ملے، ان کے پاس زندہ مرغابیاں تھیں، انہوں نے ہم سے خریدنے کیلئے کہا، میں نے ان سے دریافت کیا، کیوں بھئی یہ مُرغابیاں تم نے کیونکر پکڑی ہیں، ہم میں سے

ایک نے کہا "ہوں جال سے پکڑی ہیں" دیہاتی نے جواب دیا، بابو جی ہم نے تو ہاتھ سے پکڑی ہیں، میں نے کہا اگر تم ہمارے سامنے ہاتھ سے پکڑو تو ہم ایک مُرغابی خرید لینگے، اس نے کہا اگر دو خرید و تو میں ابھی پکڑ کر دکھا دونگا، میں نے کہا چلو منظور ہے، اس اثنا میں ہم کنارے پر پہنچ چکے تھے۔ ان میں سے دو آدمیوں نے لنگوٹ کسے، اور اپنے سروں پر مٹی کی ہنڈیاں ٹوپی کی طرح پہن کر پانی میں گھُس گئے، ان ہنڈیوں میں دو دو سوراخ تھے جن میں سے یہ لوگ مُرغابیوں کو دیکھتے تھے، جھیل کے بیچ میں پہنچ کر انہوں نے اپنا تمام جسم پانی میں چھُپا دیا، اور اب محض ہنڈیاں تیرتی ہوئی نظر آنے لگیں، اس طرح بڑھتے بڑھتے یہ دونو ہنڈیاں مُرغابیوں کے بالکل قریب پہنچ گئیں۔ ان کو دیکھ کر مُرغابی نے ڈُبکی لگائی اور غائب ہو گئی، ایک دیہاتی جو ہمارے پاس کھڑا تھا بولا "لو اس نے مُرغابی پکڑ لی، ہم نے پوچھا کہ وہ کس طرح کہنے لگا کہ اس نے نیچے سے اسکی ٹانگ پکڑ کر کھینچ لی اور اپنے تھیلے میں رکھ لی، غرض تھوڑی سی دیر میں انہوں نے ہماری آنکھوں کے سامنے چار مُرغابیاں پکڑ لیں اور ہماری حیرانی کی کوئی حد نہ رہی، ان کی زبانی معلوم ہُوا کہ یہ لوگ دو چار ہنڈیاں پانی میں ڈال دیتے ہیں، وہ ہر وقت بیچ تیرتی رہتی ہیں، اور اس جھیل پر آنے والی مُرغابیاں ان سے بے خوف ہو جاتی ہیں، پھر اس طریقے سے یہ لوگ ان کو پکڑ لیتے ہیں ؎

ایک اور جھیل پہ ہم نے مُرغابیاں مارنے کی ایک اور دلچسپ ترکیب دیکھی، دو شکاری ایک جھاڑی کی اوٹ میں بیٹھے تھے اور ان سے چالیس گز کے فاصلے پر دو مُرغابیاں تیر رہی تھیں، اُڑتی ہوئی مُرغابیاں ان کو دیکھ کر بے خوف و خطر ان کے قریب اُتر آتیں یا تیرتے تیرتے ان کے قریب آجاتیں اور یہ شکاری ان پر بندوق چلا دیتے۔ جو مُرغابیاں بچ جاتیں وہ اُڑ جاتیں یہ زخمی مرغابیوں کو پکڑ لاتے، لیکن یہ دو مرغابیاں کسی طرح نہ اُڑیں اور اسی طرح تیرتی رہیں آخر معلوم ہوا کہ یہ مرغابیاں لکڑی کی بنی ہوئی ہیں ؎

ہرن کا شکار

پرندوں کے شکار میں مشق بہم پہنچانے کے بعد مجھے ہرن کے شکار کا شوق ہُوا، میری ہمت نے کسی کا شاگرد بننا گوارا نہ کیا، اس لئے یہ فیصلہ کیا کہ چلو پہلے انجان بن کر کسی شکاری کے ساتھ ہرن کا شکار دیکھنے چلیں، جب کچھ اندازہ ہو جائیگا تو پھر خود جا کر شکار کرینگے۔ ایسا موقعہ مجھے بہت جلد مل گیا، ہماری پارٹی ایک ایسے مقام پر پہنچی جہاں ہرن اکثر مل جاتے تھے، اِدھر اُدھر ہرنوں کی تلاش شروع ہوئی۔ زمین پر ان کے پاؤں کے نشان دیکھ کر اندازہ ہُوا کہ واقعی یہاں ہرن بکثرت ہیں، راگیروں سے کھوج لیتے لیتے ہم ایسی جگہ پہنچ گئے جہاں ایک ہرنوں کی ڈار چرتی پھرتی تھی، ان میں تین چار کالے ہرن بھی تھے، ساتھیوں میں

باہم مشورہ ہو کر بندوق چلانے کے رُخ کا فیصلہ ہُوا، پھر سب شکاری مختلف سمتوں میں پھٹ گئے، شکاریوں نے ہرنوں کے گرد چکّر لگانے شروع کئے، ایک ہرنوں کو گھیرنے کے فن کا ماہر ہمارے ساتھ تھا، وہ کاوا کاٹ کر ہرنوں کی جانب بڑھا، ہرن آدمی کو آتا دیکھ کر اور آگے بڑھے، اس نے وہ رُخ چھوڑ کر ایک اور چکّر لگایا اور آگے بڑھ کر انہیں روکا، غرض اس طرح سے دو گھنٹے کی محنت کے بعد اسنے ہرنوں کو گھیر کر ایک شکاری کے آگے سے گزارا، اس نے بندوق چلائی لیکن اتّفاق یہ کہ کوئی ہرن نہ گرا، اتنے میں ہرن بھاگ گئے اور سب شکاری جمع ہو گئے، آپس میں بحث شروع ہوئی ایک نے کہا لگی ہی نہیں۔ دوسرے نے کہا زخمی ضرور ہُوا ہے۔ آخر جن صاحب نے بندوق چلائی تھی وہ بولے کہ لگتی کیسے وہ رُکے ہی نہیں، اس پر ایک شکاری نے کہا اگر رُکتے نہیں تھے تو ایک ہاتھ آگے بڑھا کر بندوق چلائی ہوتی وہ وہیں اُلٹ جاتا ۔

ہُوں کا لطیفہ | اس شکار میں ہرنوں کو گھیرنے والا بہت ہوشیار آدمی تھا اس نے کہا میاں ایسے موقعہ پر جبکہ ہرن رُکتے نہ ہوں تو شکاری کو چاہئے کہ اپنی جگہ پر کھڑے ہو کر زور سے "ہُوں" کہے، ہُوں کی آواز سُنتے ہی تمام ہرن سہم جاتے ہیں اور کتنی ہی دیر تک اپنی جگہ پر کھڑے ہو کر سوچتے ہیں کہ اب کدھر جائیں، غرض اسی شکار میں مجھے معلوم ہُوا کہ جب ہرن بھاگ رہے ہوں تو ہرن کے منہ سے

ڈیڑھ فٹ آگے کا نشانہ لینا چاہئے اور اگر کھڑے ہوں تو سینے پر بندوق مارنی چاہئے۔ کیونکہ پچھلے حصّے پر چھرّے لگنے سے ہرن زخمی تو ہو جاتا ہے لیکن گرتا نہیں، بر خلاف اس کے اگر ایک چھرّہ بھی سینے میں پیوست ہو جائے تو وہیں لیٹ جاتا ہے۔

ہرن کو جال سے پکڑنے اور گھیرنے کا طریقہ

جرائم پیشہ اقوام میں باوریا قوم کے اکثر افراد جال سے ہرن پکڑنے میں بڑے مشّاق ہیں، یہ لوگ کئی رسوں میں آدھ آدھ گز کے فاصلے پر پھندے ڈال دیتے ہیں، یہ پھندے ہرنوں کی ٹانگوں کے پٹھوں کے ہوتے ہیں جہاں کہیں ہرنوں کی ڈار دیکھتے ہیں، وہاں تھوڑے تھوڑے فصل سے ان رسوں کو مٹّی میں دبا کر یہ پھندے درختوں کی ٹہنیوں یا چھوٹے چھوٹے پودوں کے سہارے کھڑے کر دیتے ہیں، پھر اپنے گھیرنے کے فن کو کام میں لا کر ہرنوں کو ان کے اوپر سے گزارتے ہیں۔

میں نے یہ دلچسپ منظر ایک مرتبہ اپنی آنکھوں سے دیکھا، اور حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی، باوریوں نے سروں پر گھاس اُٹھا رکھی تھی، اور وہ ہرنوں کو گھیرے لئے چلے آتے تھے، یہاں تک کہ ہرن جال کے اوپر پہنچ گئے، اچانک ایک ہرنی کا پاؤں پھندے میں پھنسا اور وہ کشمکش کرنے لگی، باقی ہرن یہ کیفیت دیکھ کر پریشان ہوئے، ایک ہرن غالباً اظہار ہمدردی کے لئے اس کے قریب آیا اور وہ غریب دوسرے پھندے میں گرفتار ہوا سب

ہرن گھبرا گئے، اور ڈر کر آگے بڑھے اب کی دفعہ ایک ہرن کا سینگ پھندے میں اُلجھا، بڑے زور کی کھینچا تانی شروع ہو گئی، اسی کشمکش میں ایک اور بھی پھنس گیا، اتنے میں بادریوں نے لٹھوں سے حملہ کر دیا اور دم کے دم میں سب کو گرا گرا کر ادھموا کر ڈالا "

بادریوں کی زبانی معلوم ہوا کہ ایک ہرنی پوری ڈار کی رہنمائی کرتی ہے، اور جس جگہ سے وہ گزر جائے تمام ہرن وہیں سے گزرنے کی کوشش کرتے ہیں، رہنما ہرنی سب ہرنوں میں الگ پہچانی جاتی ہے وہ سب سے زیادہ چوکنی رہتی ہے، اور آگے آگے چلتی ہے۔ اس لئے گھیرنے والے کو اسے گھیرنا چاہیئے، باقی ہرنوں کا خیال کرنا ضروری نہیں وہ تو سب اس کے پیچھے اندھا دھند بھاگتے ہیں۔ جب وہ کھڑی ہو جائے تو باقی بھی رک جاتے ہیں۔ بادریوں کی یہ نصیحت بھی شکاریوں کے لئے بہت مفید ہے کہ زخمی ہرن کے پیچھے بھاگنا نہیں چاہیئے۔ زخمی ہو کر اس میں غیر معمولی حرارت پیدا ہو جاتی ہے اگر اس کا پیچھا کیا جائے تو وہ میلوں نکل جاتا ہے ورنہ تھوڑی دور جا کر بیٹھ جاتا ہے اور جسم میں خون بہ جانے کے بعد اس میں دوبارہ بھاگنے کی طاقت نہیں رہتی "

چونکہ ہرن بڑا ہوشیار اور چالاک جانور ہے اس لئے آسانی سے زد پر نہیں آتا اُن کو مارنے کے لئے بڑی گھیرا گھاری اور دوڑ دھوپ کرنی پڑتی ہے۔ لیکن انسان کی چالاکی کے سامنے

ان کی کوئی پیش نہیں جاتی، ہرن کے شکار کے لئے عموماً تین پونے تین انچ کا کارتوس استعمال کرنا چاہیئے یہ کارتوس تقریباً ۵۰/۵۵ گز تک اچھی طرح کام آسکتے ہیں ڈھائی انچ کے کارتوس کے چھرے ۳۵/۴۰ گز سے آگے جاکر کمزور ہو جاتے ہیں یہ اور بات ہے کہ کوئی حُسن اتفاق سے کسی ایسی جگہ جا لگے کہ ہرن وہیں کا ہو رہے ☆

رائفل کا شکار فاصلے کی دقتیں رائفل کے استعمال سے بہت آسانی کے ساتھ دُور ہو سکتی ہیں کیونکہ اچھی رائفل کی گولی عموماً ڈیڑھ دو سو گز گز تک نشانہ اُڑا سکتی ہے مگر مصیبت یہ ہے کہ رائفل کے استعمال میں حادثات کے خطرات بڑھ جاتے ہیں، اس لئے رائفل سے شکار کھیلنا بہت محتاط شکاری کا کام ہے۔ دوسرے رائفل کے شکاری کو نشانے کی مشق بہت ہی زیادہ ہونی چاہیئے، بندوق کے کارتوس میں چونکہ بہت سے چھرے ہوتے ہیں اس لئے ان میں سے کوئی نہ کوئی شکار کو جا ہی لگتا ہے لیکن رائفل کے کارتوس میں ایک گولی ہوتی ہے۔ اس لئے اگر نشانہ سو فیصدی درست نہ ہو تو کامیابی کوسوں دُور رہتی ہے۔ رائفل کے نشانے میں اندازہ بھی کوئی مدد نہیں کرتا، جس وقت لبلبی دبائی جاتی ہے اگر اُس وقت سانس لینے سے ہوا بھر رائفل ہل جائے تو نشانہ خطا ہو جاتا ہے۔ ہزاروں شکاریوں میں سے مشکل سے کوئی ایک شکاری ایسا نکلتا ہے جو متحرک جانوروں کو رائفل سے مار سکتا ہے، ہاں سرحدی علاقے کے پٹھان عموماً یہ

مہارت رکھتے ہیں، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ شب و روز رائفل چلانے کی مشق کرتے رہتے ہیں ؂

رائفلیں عموماً دو قسم کی ہوتی ہیں، ایک وہ ہیں جن کی گولی خط مستقیم میں جاتی ہے۔ ایسی رائفلیں بہت خطرناک ہیں کیونکہ ان کی گولی میلوں تک زور میں بھری ہوئی جاتی ہے اور جو چیز سامنے آتی ہے اس کو چیرتی پھاڑتی نکل جاتی ہے۔ یہ رائفلیں عام طور پر گھنے جنگلوں میں استعمال کی جاتی ہیں، دوسری قسم کی رائفلیں جن کی گولی قوس بناتی ہوئی جاتی ہے میدانوں میں شکار کھیلنے کے کام آتی ہیں۔ ان کی گولی نشانے سے چار پانسو گز آگے جاکر زمین میں دھس جاتی ہے اور شکاری بے فکر ہو جاتا ہے کیونکہ نشانے سے چار پانسو گز آگے کا جایزہ لینا کوئی مشکل کام نہیں، یہی وجہ ہے کہ خط مستقیم میں گولی پھینکنے والی رائفلوں کو استعمال کرنے والے دُوربین سے دیکھے بغیر کبھی گولی نہیں چلاتے ؂

بلم سے ہرن کا شکار | ایک دفعہ ہرن کے شکار کا شوق مجھے جمنا کے کنارے لے گیا، مَیں ہرنوں کی تلاش میں سرگردان تھا اوّل تو ہرن ملتے ہی نہ تھے اور اگر ملتے تھے تو نزدیک نہ آتے تھے فصلیں بہت بڑھ چکی تھیں ہرن ادھر اُدھر سے گھوم کر کھیتوں میں آکر چھپ جاتے تھے اور کھیتوں میں آدمی کام کر رہے تھے، ایسے مقامات پر بندوق چلانی بہت مخدوش ہے اس لئے کامیابی کی کوئی صورت

نظر نہ آتی تھی، اس پریشانی کے عالم میں مجھے ایک مہتر ملا، میں نے اس سے ہرنوں کے متعلق دریافت کیا، اس نے بتلایا کہ ہرن تو بہت ہیں لیکن کھیتوں میں ہیں، میں نے کہا ہم صبح سے پھر رہے ہیں اور ایک نہیں مارا۔ وہ بولا بابو جی ہم تو آجکل بلم سے مار لیتے ہیں، یہ دیکھو میرے بلم پر لہو لگا ہُوا ہے، ہم نے آج دو ہرن مارے ہیں، میں نے کہا بھائی بلم سے کیونکر ہرن مارتے ہو یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی، اگر ہمارے سامنے مار کر دکھاؤ تو بہت مہربانی ہوگی، غرض وہ کہنے سُننے سے بلم کا شکار دکھانے پر راضی ہو گیا، کہنے لگا اچھا تم میرے پیچھے دبے پاؤں چلے آؤ اگلے کھیت میں ہرن بیٹھے ہیں میں ابھی تمہیں مار کر دکھاتا ہوں، اگر کوئی اور ہرن ادھر اُدھر سے اُٹھے تو تم اسے بندوق سے مار لینا، میں نے کہا اس سے بہتر اور کیا ہے۔ وہ آگے آگے تھا اور میں اس کے پیچھے پیچھے، یکایک اس نے اشارہ کیا کہ وہ ہے، میں نے دیکھا کہ ایک ہرن بیٹھا اُونگھ رہا ہے اور اس کا سر نیند کے غلبے سے بار بار نیچے جُھکا جاتا ہے۔ اتنے میں مہتر نے اوچک کر اس کو بلم سے زخمی کر دیا۔ وہ تو وہیں رہا اس شور سے دو اور ہرن اسی کھیت میں سے چمک کر اُٹھے اُس نے مجھے بندوق چلانے کو کہا لیکن میں اس قسم کے شکار میں ایسا محو ہو چکا تھا کہ بندوق سیدھی بھی نہ کر سکا اور وہ بھاگ کر دوسرے کھیت میں گھُس گئے ؎

دریافت کرنے پر معلوم ہُوا کہ جب پروا ہوا چلتی ہے تو ہرنوں کو بہت زیادہ نیند آنے لگتی ہے۔ جہاں بیٹھتے ہیں وہیں نیند سے بیہوش ہو جاتے ہیں، اور یہ لوگ دبے پاؤں ان کے قریب پہنچ کر بلم سے مار لیتے ہیں"

ٹورچ سے شکار

میں نے ٹورچ کی مدد سے شکار کھیلتے ہوئے کسی کو نہ دیکھا تھا، ایک مرتبہ اُستاد گرامی پروفیسر شیرانی کی معیت میں مجھے یو۔پی کے جنگلات میں جانے کا اتفاق ہُوا، ہم لوگوں کا قیام ایک گاؤں میں تھا، بیل گاڑیاں ہمارے ساتھ تھیں، دن بھر ہم جنگلات میں شکار کھیلتے رہے، اور قرار یہ پایا کہ رات کو ٹورچ کی مدد سے شکار کھیلا جائے، چنانچہ رات کے نو بجے ہم تین آدمی گاڑی میں سوار ہو کر جنگل میں پہنچ گئے، پروفیسر صاحب کے پاس ایک گیارہ سل کی ٹورچ تھی، جو کلپ کے ذریعہ بندوق کی نالی پر لگا دی گئی، ہم تھوڑے تھوڑے فاصلے پر ٹورچ روشن کر کے شکار کو ڈھونڈھتے تھے جب کسی جانور پر روشنی پڑتی تو وہ مبہوت سا ہو جاتا اور کتنی ہی دیر تک اپنی جگہ سے حرکت نہ کر سکتا، اس شکار میں سوءِ اتفاق سے کوئی ہرن وغیرہ نہ ملا اور محض تین چار خرگوش شکار ہوئے۔

ایک مرتبہ مجھے پھر رات کو شکار میں جانیکا اتفاق ہُوا، اس دفعہ ہم موٹر میں سوار تھے، موٹر میں دونوں طرف

سرچ لائٹ کا انتظام تھا، تاریکی میں ہمیں مختلف قسم کی آنکھیں چمکتی ہوئی نظر آرہی تھیں، میرے ساتھیوں نے بتلایا کہ زرد اور سُرخ رنگ کی آنکھیں گیدڑ اور لومڑی کی ہوتی ہیں۔ تھوڑی دیر بعد، ہمیں سفید رنگ کی آنکھیں چمکتی ہوئی نظر آئیں۔ ایک نے کہا لو بھئی یہ ہرن کی آنکھیں ہیں۔ کار روک لی گئی اور روشنی ڈالکر دیکھا تو واقعی ہرن تھے، ایک آدمی برابر سرچ لائٹ ان پر ڈالتا رہا تاکہ وہ ادھر اُدھر بھاگ نہ جائیں، ہرن بالکل مبہوت کھڑے تھے، اور حیران تھے کہ یہ کیا نئی قسم کی مصیبت آئی ہے۔ اگر وہ ادھر اُدھر ہونے کی کوشش کرتے تھے تو سرچ لائٹ بھی انکے ساتھ ہی گھما دی جاتی تھی، ہم میں سے دو شکاری جن کی بندوقوں پر ٹارچیں لگی ہوئی تھیں، کار میں سے اُترے، ان کو ہدایت کیگئی کہ جب تک ہرن ان کے بیچ میں سے گزر کر آگے نہ چلے جائیں وہ فائر نہ کریں۔ اس احتیاط سے مطلب یہ تھا کہ کہیں ایک دوسرے ہی پر بندوق نہ چل جائے، قصہ مختصر بجلی کی روشنی سے ہرن اندھے ہو کر گھبرا رہے تھے، اور روشنی کے جال میں اس طرح پھنسے تھے کہ اپنی جگہ سے ہل بھی نہ سکتے تھے ادھر دونوں شکاری نہایت اطمینان سے ان کی طرف بڑھ رہے تھے، جب ہرنوں نے ان کے پاؤں کی آہٹ سُنی تو بہت گھبرائے، لیکن کرتے کیا وہ روشنی کی شعاعوں سے بندھے ہوئے تھے، جب ایک شکاری ان کے بالکل قریب

پہنچ گیا تو اس نے اپنی بندوق والی ٹورچ روشن کر کے فوراً نشانہ اُڑا دیا، ہرن وہیں ڈھیر ہو گیا۔ اور بندوق کی آواز سے باقی ہرن ادھر بھاگ گئے۔ ہم نے سرچ لائٹ سے پھر ان کو گھیر لیا اور اسی طرح ایک اور نہایت آسانی سے مارا۔ غرض اس شکار میں تین کالے ہرن تقریباً تین گھنٹے میں مارے گئے۔

چکارے کا شکار چکارا ہرن کی قسم کا جانور ہے، یہ عام طور پر پتھریلے اور ریتلے علاقوں میں کثرت سے ملتا ہے۔ ہرن سے ڈیل ڈول میں چھوٹا اور نازک اندام ہے، اس کی خاص پہچان یہ ہے کہ دُم بہت ہلاتا ہے۔ اس لئے دیہاتی لوگ اسکو "کل پوچھا" کہتے ہیں۔ چکارا شکل و شباہت میں بالکل ہرن سے ملتا ہے لیکن اس کی عادات ہرنوں سے مختلف ہیں، یہ ہرن کی نسبت بہت ہوشیار اور چالاک ہے، عموماً گھیرنے والوں کے قریب میں نہیں آتا، ہرنوں کی ڈار کی ایک ہرنی راہنمائی کرتی ہے اور جس مقام سے وہ گزرتی ہے باقی ہرن بھی وہیں سے گزرنے کی کوشش کرتے ہیں، مگر چکارا بھاگتے وقت رہنما مادہ کی کوئی پروا نہیں کرتا، بلکہ مادہ کو چھوڑ کر مخالف سمت کو بھاگ جاتا ہے چکاروں کی مخصوص عادت یہ ہے کہ وہ جس جنگل میں رہتے ہیں اس کو چھوڑ کر دوسرے علاقے میں نہیں جاتے، اگر بندوق سے ڈر کر بھاگ جائیں تو تھوڑی دیر بعد پھر وہیں آجاتے ہیں۔

چکارے شکار کرنے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ شکاری ان کے پہلوؤں پر چلیں، جس طرف وہ جائیں ادھر بڑھتے چلے جائیں اور آگے سے ان کا راستہ روکنے کی کوشش کریں، باقی شکاری چھپتے چھپاتے ان کے پیچھے پیچھے آئیں جب چکاروں کو پہلو والے شخص کی موجودگی کا احساس ہوگا تو وہ یا آگے بڑھیں گے یا پیچھے ہٹینگے یا دوسرے پہلو کو مڑینگے اگر وہ آگے بڑھیں تو اور آگے بڑھ کر ان کو روکا جائے۔ اگر پیچھے ہٹیں تو پیچھے آنیوالے شکاری ان پر حملہ کریں اور اگر سامنے کے رخ کو جائیں تو ادھر والا آدمی ان پر فائر کرے، اگر اتفاق سے ایک شکاری ہو تو پھر گھیرنے والے انہیں پیچھے لوٹانے کی کوشش کریں ؎

جنگل کا شکار جنگل کا نام تو ہر شخص نے سنا ہے لیکن یہ بات بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ درحقیقت جنگل کہتے کسے ہیں۔ مجھے شکار کا شوق اکثر جنگلوں میں لے گیا اور ریل گاڑی میں سے بھی جنگلات دیکھنے کا اتفاق ہوا لیکن حقیقتاً میں پھر بھی جنگل کے مفہوم سے ناواقف تھا، ایک مرتبہ مجھے یو۔پی میں جانیکا اتفاق ہوا جب میں نے وہاں کے جنگل دیکھے تو میری حیرانی کی کوئی حد نہ رہی۔ اور مجھے یہ ماننا پڑا کہ شمالی ہندوستان کے باشندے جنگل کے مفہوم سے قطعی بیخبر ہیں، عموماً ہم لوگ ان اجاڑ اور غیر آباد علاقوں کو جنگل کہتے ہیں جہاں درخت اور جھاڑیاں کافی ہوتی ہیں۔ لیکن اصل میں یہ جنگل

نہیں، یہ تو معمولی میدان ہیں، جنگل کچھ اور ہی چیز ہے۔ اصلی جنگلوں میں درختوں اور جھاڑیوں کا سلسلہ نہیں ختم ہی ہونے میں نہیں آتا، اکثر مقامات پر صبح اور شام کا بھی پتہ نہیں چلتا، درخت اس طرح گتھم گتھا ہوتے ہیں کہ آسمان بھی دکھائی نہیں دیتا۔ اگر ایک طرف سبزہ کی فراوانی دل کو کھینچتی ہے تو ساتھ ہی جنگل کی دہشت سے دلوں پر خوف و ہراس کا عالم طاری ہوتا ہے۔ بعض جنگل تو میری نظر سے ایسے گزرے ہیں کہ ان میں آدمی کے چلنے کا راستہ بھی نہ تھا، درندوں اور چرندوں کے آنے جانے کے راستوں سے آدمی بھی جھک جھک کر اور بیٹھ بیٹھ کر گزرتے تھے۔"

شیر کا شکار مجھے اگرچہ شیر کے شکار میں جانے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا لیکن میں نے شیر کے شکاریوں کی زبانی شیر کے شکار کے افسانے بہت سُنے ہیں، وہ لوگ تو یہ ظاہر کرتے ہیں کہ شیر کو مارنا بڑے دل گُردے کا کام ہے۔ لیکن میرا خیال یہ ہے کہ جس قدر شیر کے شکار کو اہمیت دی جاتی ہے وہ اس قدر مشکل نہیں۔ تجربہ بتاتا ہے کہ ہرن اور نیل گائے وغیرہ کا شکار اس سے کہیں زیادہ مشکل اور محنت طلب ہے۔ بھلا یہ بھی کوئی شکار ہے کہ ایک بچھڑا کسی ایسی جگہ باندھ دیا جہاں شیر کا گزر ہے۔ شیر نے رات کو کسی وقت آ کر اس کا خون پی لیا، دوسرے دن شکاری صاحب تشریف لے جاتے ہیں کسی درخت پر مچان بنا کر چڑھ بیٹھے، رات کو حسب معمول جب شیر اس

بچھڑے کو کھانے کے لئے آیا تو انہوں نے اسے مچان پر سے بیٹھے بٹھائے مار لیا"

بہرحال یہ بات تسلیم ہے کہ شیر جنگل کا بادشاہ ہے اور اسکی دہشت بہت ہے۔ وہ جس طرف نکل جاتا ہے وہاں کی فضا میں اس کی آمد آمد سے ایک قسم کی خاموشی دہشت اور تھرتھری سی پیدا ہو جاتی ہے ہم ایک دفعہ یو۔ پی کے جنگلوں میں رات کے وقت ٹورچ سے شکار کھیلتے پھرتے تھے، پروفیسر شیرانی صاحب کو ہمارا شکاری (رہبر) بیل گاڑی میں سے اُتار کر جنگل میں لے گیا اس کا خیال تھا کہ ایک جگہ برسات کا پانی کھڑا ہے وہاں چیتل اور ہرن وغیرہ رات کو پانی پینے آتے ہیں، ان لوگوں کو گئے ہوئے کافی دیر ہو چکی تھی، مَیں گاڑی میں بیٹھا گاڑیبان سے اِدھر اُدھر کی باتیں کر رہا تھا، اس اثناء میں شیر کے ڈکارنے کی آواز بہت دُور سے آئی، اس آواز سے جنگل پر ایک عجیب کیفیت طاری ہوئی، مَیں نے شیر کو چڑیا گھر اور سرکس میں ڈکارتے ہوئے اکثر سُنا تھا لیکن آزاد شیر کی آواز سے میرے کان قطعی نا آشنا تھے، ہر طرف خاموشی چھا گئی تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد شیر کی آواز برابر گونج رہی تھی، جس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ ہماری طرف آرہا ہے۔ یہاں تک کہ اس کے سانس لینے کی آواز بھی آنے لگی، گاڑیبان نے کہا بابوجی شیر بالکل قریب آگیا ہے یہ کہہ کر اس نے بیلوں پر سے ٹاٹ کھینچ لیا، اور وہ اوڑھ کر

گاڑی کے نیچے دبک گیا، میں نے فوراً بندوق میں پھٹنے والی گولی بھری، اور چوکنا ہو کر بیٹھا، شیر کی دہشت سے بیل تھر تھر کانپنے لگے، ان کے پیٹ میں سے گڑگڑاہٹ کی آواز آئی۔ یہانتک کہ انہوں نے بھد بھد گوبر کر دیا، میں نے دل ہی دل میں کہا۔ آج پروفیسر صاحب کی خیر نہیں، اور سچ پوچھئے تو میری ہی کب خیر تھی، تھوڑی دیر بعد شیر نے پھر ڈکارا آواز سے اندازہ ہوا کہ وہ کہیں دور نکل گیا ہے۔ اتنے میں گاڑیبان گاڑی کے نیچے سے نکل آیا اور کہنے لگا بابوجی یہاں کئی آدمیوں کو شیر مار چکا ہے، خدا کا شکر ہے کہ جیسا آیا تھا ویسا ہی چلا گیا، تھوڑی دیر بعد پروفیسر صاحب بھی خیریت سے تشریف لے آئے۔ اور ہم مع الخیر واپس ہوئے "

حادثات یہ مضمون ناقص رہیگا اگر ہم حادثات واقعہ ہونے کے اسباب پر روشنی نہ ڈالیں۔ ہر شخص جانتا ہے کہ حادثات عموماً بے احتیاطیوں سے وقوع میں آتے ہیں۔ اور اس قسم کی بے احتیاطیاں اکثر نئے شکاریوں سے سرزد ہوتی ہیں۔ مجھے ایک تجربہ کار پولیس افسر کی زبانی معلوم ہوا کہ بیشتر حادثات ہرن کے شکار میں واقعہ ہوتے ہیں۔ ہرن کو دیکھ کر بعض شکاری سامنے کا خیال نہیں رکھتے، اگر جھاڑیوں کے پیچھے سوء اتفاق سے کوئی آدمی ہو تو وہ زخمی ہو جاتا ہے۔ اس لئے جہاں لمبی لمبی گھاس یا اونچے اونچے پودے ہوں وہاں بندوق چلانے میں بڑی احتیاط کرنی چاہئے۔ یاد رہے شکار

ایک قسم کی تفریح ہے اس تفریح کے ایسے نتائج سے بچنا چاہئیے جن کی بدولت جان جوکھوں میں پڑ جائے یا انسان لاتناہی مصیبتوں میں گرفتار ہو جائے ؛

اکثر دیکھا گیا ہے کہ بعض اناڑی بندوق میں کارتوس ڈال کر بھرتے ہیں۔ اگر کہیں بے خیالی سے گھوڑا دب جائے تو بندوق فوراً چل جاتی ہے۔ شکاری کو لازم ہے کہ ہمیشہ وقت پر کارتوس بھرنے کی عادت ڈالے، اگر وہ کام نہ آئیں تو فوراً ان کو نکال لے، تاکہ حادثات واقعہ ہونے کا خطرہ ہی نہ رہے ؛

گرمی

ہندوستان میں تین قسم کے موسم ہوتے ہیں۔ اوّل گرمی دوسرے برسات اور تیسرے جاڑا۔ گرمی کا موسم عام طور پر مارچ سے شروع ہوجاتا ہے۔ لوگ باگ گرم لباس اُتار کر ہلکی قسم کے کپڑے پہننے شروع کرتے ہیں۔ مئی اور جون کے مہینوں میں گرمی اپنے شباب پر ہوتی ہے عموماً جولائی میں برسات شروع ہوجاتی ہے جس سے گرمی میں تخفیف ہونے لگتی ہے ۔

گرما گرمی جُوں جُوں گرمی بڑھتی ہے لباس ہلکا ہوتا جاتا ہے۔ اور تخفیف ہوتے ہوتے لنگوٹی کی نوبت آجاتی ہے۔ ہر طرف سے ہائے گرمی ہائے گرمی کی صدائیں کانوں میں آتی ہیں۔ پانی کا کٹورا منہ سے نہیں چھوٹتا۔ پیٹ پھٹا جاتا ہے۔ لیکن پیاس نہیں بُجھتی بڑے پانی لاؤ ٹھنڈا پانی پلاؤ پکارتے ہیں۔ بچے مم مم کی رٹ لگاتے ہیں۔ زمین آگ اُگلتی ہے۔ آسمان سے آگ برستی ہے۔ درودیوار سے شعلے نکلتے ہیں۔ مکان بھٹی کی طرح تپتے ہیں۔ لوؤں سے جسم جلا جاتا ہے انسان چنوں کی طرح بُھنتے ہیں۔ دھوپ میں اس قیامت کی تپش ہے کہ ہرن کالے ہوجائینگے کیا عجب ہے پتھر بھی پگھل جائیں۔ جسم

پسینے سے تر ہے۔ مسام مسام سے پسینے کی دھاریں بہ رہی ہیں۔ کپڑا سُوئیوں کی طرح جسم پر چُبھتا ہے۔ گرمی دانوں سے جسم اولمہ بنا ہے۔ کھال اُدھڑ گئی ہے اور تمام بدن میں آگ سی لگی ہے۔ نہ سوتے آرام ہے نہ جاگتے چین ہر وقت پنکھا ہاتھ نہیں ہے۔ بار بار بھگوتے ہیں۔ دماغ بارُود کی طرح اُڑا جاتا ہے۔ کوئی سر پہ پانی ڈالتا ہے۔ کوئی کپڑے بھگو کر پہنتا ہے۔ چہرے کُملا گئے۔ دل جل بُجھے۔ کھانے کو جی نہیں چاہتا۔ پانی کے سوا دوسری چیز حلق سے نیچے نہیں اُترتی۔ جان ہے تو پانی میں یہاں ہے تو پانی میں۔ جی چاہتا ہے قسم بھی کھاؤ تو ٹھنڈے پانی کی اور مرو بھی تو ٹھنڈے پانی میں، بس نہیں چلتا کہ پانی کی مچھلی بن جائیں۔ انسان پر کیا موقوف ہے حیوانات تک پانی کو ترستے ہیں جہاں پانی نظر آیا وہیں کے ہو رہے جہاں ذرا ٹھنڈک معلوم ہوئی وہیں اڑ گئے۔ ہانپ رہے ہیں، کانپ رہے ہیں۔ گرمی کی شدت سے زبانیں باہر لٹک پڑیں۔ نظر آیا جہاں پر سایہ دیوار بیٹھے ہیں درختوں کی چھاؤں میں کھڑے ہیں۔ جھیلوں میں گھُس گئے تو شام تک نہ نکلے۔ پانی پیتے پیتے جان عزیز جاں آفریں کے سپرد کر دی۔ پرندوں کو دیکھو تو درختوں کے پتّوں میں چھپتے پھرتے ہیں۔ چونچیں کھُلی ہوئی ہیں۔ پتلا حال ہے۔ لدو جانوروں نے کندھا ڈال دیا۔ چاہے کوئی مار مار کر کھال ادھیڑ دے مگر کیا مجال جو اپنی جگہ سے ہل جائیں۔ مویشیوں کا دُودھ خشک ہے۔ لوؤں کے جھکڑ ہوش اُڑائے دیتے

ہیں۔ آسمان پر غبار چڑھا ہے۔ کرۂ ارض کرۂ نار بن گیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے قیامت آگئی۔ سوا نیزے پر سورج اُتر آیا۔ سرسبز اور شاداب باغ جل کر خاک ہو گئے۔ گرمی سے بڑے بڑے تناور درخت خشک ہیں۔ چھوٹے چھوٹے پودوں کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ سبزہ کہیں نام کو نظر نہیں آتا۔ پانی ملے تو سبزہ باقی رہے۔ آدمیوں کے پینے کو پانی نہیں ملتا۔ کنوئیں خشک ہیں۔ دریا سانپوں کی طرح پڑے سسکتے ہیں۔ وہ دریا جو کف بلب ٹھاٹھیں مار کر بہتے تھے پایاب ہیں۔ نہریں بند پڑی ہیں۔ ہری بھری کھیتیاں سوکھی جاتی ہیں۔ کسانوں کی جان پر بنی ہے۔ کبھی آسمان کو دیکھتے ہیں۔ کبھی کھیتوں پر نظر ہے۔ دل بدعا ہیں کہ خدایا رحم کر۔ کھیتی جل گئی تو کیا ہوگا۔ قحط کا خوف رُوح قبض کئے لیتا ہے مستقبل کے خیال سے دل سینے میں گھبراتا ہے

بازاروں کی حالت

چھوٹے موٹے شہروں کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ بڑے بڑے شہر جو تجارت کے مرکز کہلاتے ہیں دوپہر کے وقت ان کے پُر رونق بازاروں میں بھی اُلّو بولتا ہے۔ دُکاندار اپنی دُکانوں کے آگے پردے ڈال کر اندر بیٹھ گئے۔ آمد و رفت بالکل بند ہے۔ ہر شخص اپنے گھر میں گھس گیا اور کسی ایسی جگہ پر آرام کر رہا ہے۔ جہاں روشنی اور تپش سے محفوظ ہے۔ جو مصیبت کے مارے دن کو پھرتے ہیں۔ دھوپ سے بیکل نظر آتے ہیں۔ کوئی سر پر کپڑا ڈال کر چلتا ہے۔

کوئی چھتری لگاتا ہے۔ لُو سے بچنے کے لئے کوئی جیب میں پیاز کی گٹھیاں ڈال کر نکلتا ہے۔ کوئی کانوں کو لپیٹ کر چلتا ہے۔ پھر بھی کسی کی نکسیر پھُوٹتی ہے۔ کسی کو سرسام ہوتا ہے۔ کوئی چلتے چلتے بیہوش ہوکر گرتا ہے۔ کسی کو لُو لگ کر بخار چڑھتا ہے۔ خوف کے مارے پران خشک ہیں کہ دیکھئے گرمی کیا آفت لاتی ہے۔ الٰہی خیر کیجیو۔ گرمی کی گرما گرمی ہے۔ بڑے بڑے کاروباری دُکاندار ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں۔ ہاں شربت شیرے کی دُکانوں اور سبیلوں پر ضرور ہجوم ہے۔ پیاؤ پر پانی پانی کی مانگ سے باری نہیں آتی۔ مشکوں پانی صرف ہوئے جاتا ہے۔ سقّوں کے وارے نیارے ہیں۔ قدم قدم پر مشک لئے کھڑے ہیں۔ "ٹھنڈا پانی" کی ٹھنڈی آوازیں لگا رہے ہیں۔ ایک گلاس پلاتے ہیں اور پوری مشک کے دام وصول کرتے ہیں۔

شام کی کیفیت

دوپہر ڈھلے تیسرے پہر ذرا گرمی کم ہوئی تو جان میں جان آئی۔ آمد و رفت کا بازار گرم ہوا۔ اب ذرا بازاروں میں بھی رونق ہے۔ سقّے سڑکوں پر چھڑکاؤ کرتے پھرتے ہیں۔ دُکاندار پیسے دے دے کر اپنی دُکانوں کے آگے چھڑکاؤ کرا لیتے ہیں۔ شام ہوتے ہوتے پُوری طرح چہل پہل ہو گئی۔ لوگ نہا دھو کے ہلکے ہلکے باریک کپڑے پہن گھُومنے نکلے ہیں۔ کسی کے ہاتھ میں پنکھا ہے۔ کوئی اخبار ہی سے پنکھے کا کام لے رہا ہے۔ کوئی بار بار رومال سے

پسینہ پونچھتا ہے۔ کوئی انگشت ہلالی سے پیشانی صاف کرتا ہے۔ قطرات عرق ٹپ ٹپ نیچے گرتے ہیں۔ گرمی سے گھبرا کر ہر شخص یہی کہتا ہے چلو ذرا باغ میں چلیں وہاں ٹھنڈک ہوگی۔ باغ کے دروازے میں قدم رکھتے ہی دوسری دُنیا میں پہنچ گئے۔ پہلے معتدل ہوا کا جھونکا آیا ذرا آگے بڑھے تو ہوا میں بھی خُنکی بڑھی بیچ میں پہنچے تو معلوم ہُوا جنّت میں آگئے۔ ہری ہری گھانس کو دیکھ کر آنکھوں میں تراوت آگئی۔ پھُولوں پر نظر پڑی تو دل باغ باغ ہو گیا۔ بچّوں بڑوں کا ہجوم ہے۔ لڑکے کلیلیں کرتے پھرتے ہیں۔ کوئی گھاس پر لیٹا ہے کوئی ٹہل رہا ہے۔ بنچوں پر تل دھرنے کو جگہ نہیں۔ بہت سے اس انتظار میں اِدھر اُدھر گھوم رہے ہیں کہ بنچ خالی ہو تو لپک کر قبضہ کریں لیکن اس خُنک فضا کو چھوڑ کر کون اُٹھتا ہے۔ قدم قدم پر سقّے پانی پلاتے پھرتے ہیں۔ کٹورے ایسی تال اور سُر سے بجاتے ہیں کہ بغیر پیاس پانی پینے کو جی چاہتا ہے۔ فقیر بڑے بڑے پنکھے لئے گھُوم رہے ہیں۔ دو منٹ پنکھا جھلتے ہیں۔ اور بغیر اصرار کے پیسہ وصول کرتے ہیں۔ ساقی تازے حقّے لئے پھر رہے ہیں۔ سِنے پر پھُولوں کے ہار لپیٹے ہیں۔ جو حقّہ نہیں پیتا اس کا بھی دل چاہتا ہے۔ کہ دو کش لگا لے۔ بانکے چھیلوں کے کچھ اور ہی رنگ ہیں۔ باریک باریک کرتے پہنے ہیں۔ نیچے جالی کا بنیان ہے۔ گورا گورا جسم جھلک رہا ہے۔ دُور سے خس اور ہانڈی کے عطر کی لپٹیں آرہی

ہیں۔ چھڑی ہاتھ میں ہے۔ لٹکتے مٹکتے چلے آرہے ہیں۔ کسی نے دو پلڑی ٹوپی جمائی ہے۔ کوئی ننگے سر ہے اور اپنے بالوں کی شان دکھا رہا ہے۔ کسی نے سلمے کی ٹوپی ترچھی رکھی ہے۔ اور ناپ تول کر برابر کے قدم اُٹھاتا ہے۔ تعلیم یافتہ لوگ نصف آستین کی قمیض پہنے ننگے سر ٹہل رہے ہیں۔ ٹوپی ہاتھ میں ہے۔ اگر زیادہ فیشن زدہ ہیں تو پتلون ڈانٹے ہیں۔ ورنہ تہ بند ہے۔ جرابیں بھی تکلف میں داخل ہیں۔ چپلی نے شوز کی جگہ لی ہے۔ کوئی بنچ بھی خالی مل جائیگی تو بیٹھ جائینگے ورنہ گھومتے رہینگے۔ اور آخر تھک ٹوٹ کر گھاس کے مخملیں فرش پر ہی دراز ہو جائینگے +

باغوں میں رات کے گیارہ بارہ بجے تک ہی گہما گہمی رہیگی۔ چوکیدار آوازوں پر آوازیں لگائیگا کہ وقت ہوگیا ہے باغ خالی کرو دروازے بند ہوتے ہیں لیکن لوگ ہیں کہ ہلنے کا نام نہیں لیتے۔ چوکیدار یہاں سے اُٹھائیگا وہ بھونرے کی طرح ادھر سے اُٹھ کر اُدھر جا بیٹھیں گے بس نہیں چلتا کہ باغ ہی میں سو جائیں۔ یہیں ٹھنڈی ٹھنڈی گھاس پر کروٹیں لیں۔ اور صبح کر دیں +

صبح کا منظر شام کی لطف انگیزیاں دیکھ چکے۔ اب صبح کی رنگ آمیزیاں دیکھو کتنے ہی سویرے اُٹھو لوگ دریا کی طرف امنڈے چلے جاتے ہیں۔ جیسے رات کو گرمی کے مارے نیند نہیں آئی۔ سیر گاہوں میں جُھرمٹ کے جُھرمٹ جمے ہوئے ہیں کوئی ورزش میں مصروف

ہے کوئی دوڑ لگا رہا ہے۔ چہل قدمی کا دلدادہ پھولوں کی کیاریوں پر منڈلا رہا ہے۔ کسی نے ٹہلتے ٹہلتے پھول توڑا ہے۔ اسے کیفیت سے سونگھتا جاتا ہے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی نسیم کے جھونکے اُمنگوں کو بیدار کرتے ہیں۔ چڑیوں کی چوں چوں میں ترانوں کا کیف بھرا ہے شاخیں جھوم رہی ہیں اور جھوم جھوم کر پھولوں کا منہ چوم رہی ہیں۔ غرض ہر طرف ایک کیفیت طاری ہے۔ معلوم ہوتا ہے فطرت نے انگڑائی لی ہے ؛

دریا پر چل کر دیکھو تو کچھ اور ہی سماں ہے۔ بچے، بوڑھے، جوان لڑکے لڑکیاں مچھلیوں کی طرح پانی میں تیرتے پھرتے ہیں۔ باہر نکلنے کا نام نہیں لیتے۔ کوئی رات کی سستی اتار رہا ہے کہیں شباب اور حسن کے سر بجوش شیشے معتدل ہو رہے ہیں۔ پجاری اپنی دکان پر آسن جمائے بیٹھے ہیں۔ صندل اور سیندور کے تلک لگا رہے ہیں۔ کوئی ہری اوم کے ورد میں اپنے آپ کو بھولا ہے۔ کوئی رام رام جپتا چلا جاتا ہے۔ کوئی بھجن گنگناتا چلا آ رہا ہے۔ کسی کے ہاتھ میں گنگا جلی ہے۔ کوئی دونے میں ارادت کے پھول لئے ہے۔ ماتھے پر قشقہ کھچا ہے۔ چل چلاؤ کا نقشہ جما ہے۔ جلدی جلدی قدم اُٹھ رہے ہیں کہ دھوپ نکلنے سے پہلے گھر پہنچ جائیں ؛

دولتمندوں کی گرمی لو وہ سورج نکل آیا۔ آنکھیں چندھیانے لگیں پہاڑ سا دن سامنے ہے۔ گرمی کی مصیبت دانت نکوسے کھڑی

ہے۔ دوپہر کیا ہوئی سورج سوا نیزے پر آ گیا۔ دھوپ کی شدت سے چیل نے چلچلا کر انڈے چھوڑ دیئے۔ لوگ باگ اپنے گھروں میں گھس گئے۔ جن کو خدا نے دولت دی ہے وہ گرمی کی تاب نہ لا کر پہاڑوں کو روانہ ہو چکے ہیں۔ جو نہ جا سکے انہوں نے یہیں گرمی سے بچنے کا انتظام کیا ہے۔ سرد خانوں میں پڑے ہیں پنکھا چل رہا ہے۔ خس کی ٹٹیاں دروازوں پر لگی ہیں برابر پانی چھڑکا جا رہا ہے۔ خس کی لپٹیں چلی آتی ہیں۔ سوندی سوندی خوشبو سے دل و دماغ معطر ہے۔ میدانوں میں پہاڑوں کا مزہ آ رہا ہے۔ لو کے گرم اور جانگداز جھکڑ جانفزا اور ٹھنڈی ہواؤں میں تبدیل ہو گئے۔ برف کی بدولت گرم پانی کی تاثیر بدل گئی۔ غسل خانوں میں فوارے لگے ہوئے ہیں جب گرمی لگی ان کے نیچے جا بیٹھے اور ساون بھادوں کا لطف اٹھایا۔ دن بھر خوب سنائے۔ شام ہوتے نہائے۔ ٹھنڈے شربت پئے۔ قلفیاں کھائیں۔ آئیس کریم جمائی۔ اب بن سنور کر باہر نکلیں گے سیر کو جائینگے۔ قدم قدم پر گرمی کی شکایت زبان پر آئیگی۔ دن بھر کا آرام بھول جائینگے۔ گرمی گرمی کا شور مچائیں گے دم بدم یخ بستہ پانی کا دور چلیگا لیکن پھر بھی چین نہ آئیگا ۔۔

بجلی کے پنکھوں نے گرمی کی تکلیفوں میں بہت کمی کر دی ہے پہلے دستی اور فرشی پنکھے استعمال ہوتے تھے۔ پنکھا قلی

دن بھر پنکھا جھلتے۔ اگر سو جاتے تو بے نقط گالیاں کھاتے۔ اب صرف پنکھے کا بٹن دبانے کی دیر ہے کہ فرانٹے کی ہوا آنے لگتی ہے۔ ہاں اگر بجلی خراب ہو جائے یا پنکھا بگڑ جائے تو ٹھنڈا پانی پی پی کر کوسو۔ اور دل کی بھڑاس نکالو۔ اس میں کیا شک ہے بجلی سے بہت آرام ہیں۔ لیکن جب تمام عالم تپتا ہے تو پنکھوں میں سے بھی گرم ہوا نکلتی ہے۔ تیز ہوا سے دماغ چکراتا ہے۔ جسم پھنکتا ہے۔ جس حصۂ جسم کو ہوا لگتی ہے وہ خشک، جہاں ہوا نہیں پہنچتی وہ پسینے سے تر۔ غرض گرمی سے بچنے کی کتنی ہی کوشش کرو لیکن وہ اپنا اثر دکھائے بغیر نہیں رہتی۔

غریبوں کی گرمی کوئی کہتا ہے گرمی اچھی، کوئی کہتا ہے سردی اچھی۔ اگر انصاف کی نظر سے دیکھا جائے تو نہ سردی اچھی ہے نہ گرمی۔ ہم سے پوچھو تو سب موسموں میں اعتدال کا موسم اچھا ہے۔ چونکہ اللہ میاں کے کاموں پر کوئی اعتراض نہیں کر سکتا اس لئے گرمی اور سردی دونوں اچھی ہیں۔ ہمیں مین میخ نکالنے کا کیا حق ہے۔ پھر بھی اگر غریبوں سے پوچھا جائے تو وہ گرمی ہی کو اچھا بتائیں گے۔ لیکن جس شخص میں ذرا سا بھی ہمدردی کا مادہ ہے اس کا دل ان لوگوں کی حالت دیکھ کر ضرور کڑھتا ہے۔ ہائے مفلسی۔ غریب کا خون پسینہ ہو کر بہتا ہے۔ جسم و جان کو جلا دینے والی لوئیں اس کو بے محابا ستاتی ہیں۔ گرمی کے مارے پرندہ پر نہیں مارتا۔ ہاں

کبھی کبھی چیل کے چلچلانے کی آواز ضرور کانوں میں آتی ہے۔ امیر تہ خانوں، سرد خانوں اور خسخانوں میں استراحت فرما ہیں۔ اوسط درجے کے لوگ گھروں میں محفوظ ہیں۔ جانور درختوں کی چھاؤں میں کندھا ڈالے کھڑے ہیں لیکن غریب جانہار مزدور اس قیامت کی گرمی میں اپنا کام کر رہا ہے۔ ایڑی سے چوٹی تک پسینے کا تار بندھا ہے۔ پیاس سے نڈھال ہے۔ جسم پر کپڑا نہیں۔ پیٹ میں روٹی نہیں۔ بھوک لگتی ہے تو گرم پانی کے دو گھونٹ پی لیتا ہے۔ اگر سستانے کے لئے بیٹھتا ہے تو کسی ظالم کی دلدوز آواز کانوں میں آتی ہے۔ کام کرو۔ کام کرو۔ بیکار مت بیٹھو۔ لو لگے سرسام ہو۔ بخار چڑھ جائے۔ سرمایہ دار کو کوئی پروا نہیں۔ اسے تو اپنے کام سے کام ہے۔ اس نے تانبے کے چند ٹکڑے دے کر اس کی جان خرید لی ہے۔ کھری مزدوری دے کر چوکھا کام لیگا۔ بچارا مزدور بھی کیا کرے۔ کام نہیں کرتا اور گالیاں صبر سے نہیں سنتا تو پیٹ کی دوزخ کیسے بھریگا۔ ان لوگوں کو جاکر کیا منہ دکھائیگا جو اس کی راہ تک رہے ہیں۔ اور شام کی روٹی کی آس لگائے بیٹھے ہیں۔

شام ہوگی ٹھنڈک کا مژدہ لائیگی۔ امیر سیر کو جائینگے۔ ٹھنڈے ٹھنڈے شربت اڑائینگے۔ رات کو مزے سے پلنگ پر پڑ کر سوئینگے۔ اس بچارے کے پاس پلنگ کہاں۔ سر چھپانے کو چھت بھی نہیں۔ رات ہوگی سڑک کے کنارے جلتی ہوئی زمین پر پڑ رہیگا۔

وہیں ایسا بےخبر ہوکر سوئیگا کہ صبح کو حلال خور آکر جگائیگا۔ کہ اُٹھ کھڑا ہو جھاڑو دینی ہے۔ اور ساتھ کے ساتھ دوچار گالیاں بھی جھاڑ دیگا۔ ٹھیک ہے گرمی اور سردی دولت کے دو نام ہیں۔ اس کو نہ سردی کی پروا ہے نہ گرمی کا فکر۔ جب پیسے جیب میں ہونگے تو گرمی اور سردی دونوں کو محسوس کریگا ؎

گرمی کے فائدے کہتے ہیں خدا نے کوئی چیز بیکار اور بغیر کسی مصرف کے پیدا نہیں کی۔ اس کے ہر کام میں کوئی راز ہے جس کو انسان کی ناقص عقل ذرا مشکل سے سمجھتی ہے۔ گرمی کے نقصانات اور مصائب تو اظہر من الشمس ہیں مگر فائدے ذرا غور طلب ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ گرمی بہت مفید ہے۔ دھوپ کی تیزی سے زہریلے جراثیم خود بخود ہلاک ہو جاتے ہیں۔ آندھیوں سے ہوا صاف ہو جاتی ہے۔ وبائی امراض دُور ہوتے ہیں۔ پانی پی پی کر جسم کی مشینری دُھل جاتی ہے پسینوں سے جسم کے مسامات کھُلتے ہیں۔ اور زہریلا مواد پسینے کے ساتھ خارج ہو جاتا ہے۔ انسان کو گرم پانی سے غسل کی ضرورت نہیں رہتی، جن ملکوں میں گرمی نہیں پڑتی وہاں جب کبھی دھوپ نظر آتی ہے تو خوشی کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ لوگ کپڑے اُتار دیتے ہیں ننگے ہو کر دھوپ کھاتے پھرتے ہیں۔ کہتے ہیں۔ وہ اپنے جسموں میں سُورج کی کرنیں جذب کر کے برقی طاقت بھرتے ہیں ورنہ صحت کو درست رکھنے کے لئے برقی غسل کرنا پڑتا ہے تاکہ جلدی امراض

سے محفوظ رہیں۔ ڈاکٹروں کی رائے ہے کہ امیروں اور آرام طلب لوگوں کے لئے گرمی بہت ہی مفید ہے کیونکہ وہ کوئی محنت طلب کام نہیں کرتے اس لئے پسینہ نہ آنے سے ان کے جسمانی مسامات بند ہو جاتے ہیں اور طرح طرح کی بیماریاں ہونے کا خطرہ ہمیشہ درپیش رہتا ہے۔ گرمی کے موسم میں ان کو خود بخود پسینہ آتا ہے اس لئے مسامات کے ذریعہ جسمانی آلائشیں آپ ہی آپ صاف ہو جاتی ہیں بہرحال یہ تسلیم کرنا ہی پڑیگا کہ گرمی باوجود اپنے شدائد کے فوائد سے خالی نہیں۔ اس لئے خداوند کریم کی نعمتوں میں سے ایک نعمت ہے جس کا ہمیں ضرور شکرانہ ادا کرنا چاہیئے ٭

برسات

گرمی کی گرما گرمی اور برسات کی آمد

خدا یاد نہ دلائے گرمی کا موسم بھی قیامت سے کم نہیں۔ آسمان کی آتش ریزی اور زمین کی شعلہ خیزی سے اللہ ہر ایک کو محفوظ رکھے۔ ہر طرف خاک اُڑتی ہے۔ آندھیاں چلتی ہیں، در و دیوار سے العطش العطش کی صدا بلند ہوتی ہے۔ ٹھنڈے پانی کے لئے چھوٹے بڑے جان دیتے ہیں۔ درخت مرجھائے اور پودے خشک ہوئے جاتے ہیں۔ سبزہ کہیں نام کو نظر نہیں آتا۔ بنی نوع انسان ہزاروں کی تعداد میں گرمی کا شکار ہوتے ہیں۔ آدمی تو آدمی جانور بھی زبان نکالے ہانپتے کانپتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ مویشیوں کا دودھ خشک ہو جاتا ہے۔ غرض کیا انسان کیا حیوان گرمی سے سب نڈھال اور بیحال نظر آتے ہیں۔ مایوسی اور امید کی نگاہیں بار بار آسمان کی طرف اُٹھتی ہیں۔ اور ابر کو ڈھونڈھتی ہیں۔ بارش کے لئے دُعائیں مانگی جاتی ہیں۔ جب آسمان پر ابر نمودار ہوتا ہے تو خوشی کی انتہا نہیں رہتی۔ بوڑھے، بچّے، جوان لنگر لنگوٹے کس لیتے ہیں توے کی سیاہی اور کیچڑ ایک دوسرے کے

ط ۱ بارش کا خیر مقدم اس طریقے سے نیچ طبقے کے لوگ کرتے ہیں۔

مُنہ پڑھتے ہیں۔ گلی کوچوں میں گروہ در گروہ شور مچاتے پھرتے ہیں کہ اللہ میاں مینہ برساؤ۔

کالے پیلے بادلوں اور اُودی گھٹاؤں کو دیکھ کر مُردہ جسموں میں جان آتی ہے۔ بارش کے لئے دل سے دُعائیں نکلتی ہیں۔ ٹھنڈی ہوائیں پژمُردہ چہروں پر رونق لاتی ہیں۔ آسمان اور زمین کا رنگ ہی پلٹ جاتا ہے۔ ایک بارش سے رُت بدل جاتی ہے۔ مُرجھائے ہوئے پودے اور خشک درختوں میں زندگی کے آثار پیدا ہو جاتے ہیں۔ گھر گھر خوشیاں ہوتی ہیں۔ شُکرانے ادا کئے جاتے ہیں۔ کہ برسات آئی اور گرمی ختم ہوئی۔ یہی وہ موسم ہے جس کو ہندوستان کا موسم بہار کہتے ہیں۔ یہی وہ وقت ہے جو غیر شاعر کو شاعر بنا دیتا ہے۔ یہی وہ زمانہ ہے جو مُردہ دلوں میں ولولے اور جوش پیدا کرتا ہے۔ یہی وہ دَور ہے جو بچھڑے ہوؤں کی یاد کو تازہ کرتا ہے۔ اور جنوں خیز اور طرب انگیز کہلاتا ہے۔ پرندوں کے چہچہے اور زمزمے، کوئل کی کوکو اور پپیہے کی پی کہاں کچھ ایسے جذبات کی متحمل ہیں جو برسات ہی سے مخصوص ہیں۔

متقدمین اور متاخرین کے ابر کے متعلق خیالات	[۱] دریا سے ابر سیاہ اُٹھا۔ چہرہ اس کا زنگیوں کی طرح کالا اور شب تاریک کی طرح سیاہ ہے۔

[۱] یہ ترجمہ شمس العلماء مولوی ذکاءاللہ مرحوم کا کیا ہوا ہے میں نے اسکو حسب ضرورت تبدیل کر دیا ہے ۱۲

وہ دیدۂ عاشق کی طرح اشک ریز۔ اور زُلف محبوب کی طرح مشک بیز ہے۔ وہ اگرچہ ظاہر میں سیاہ فام ہے لیکن اس کا دل دودھوں بھرا ہے اس کی آنکھیں سُرمگیں ہیں اور دل موتیوں سے بھرا ہُوا ہے اسکا دل ایک شاداب باغ ہے لیکن اس کا جسم قمار خانہ کی طرح تاریک ہے کبھی خنداں کبھی گریاں ہے ہواہیں دھوئیں کی طرح پراگندہ اور دیو کی طرح مست وآشفتہ ہے، اپنی بدمستی سے خارا پر دُرہائے سُفتہ گراتا ہے۔ خورشید انور کو نہاں کرتا ہے۔ کبھی اجرام فلکی کو پنہاں کر کے آسمان پر چاند کو ظُلمات کی سیر کراتا ہے۔ لب غنچہ پر پھپھولے ڈالتا ہے۔ گلشن وصحرا میں ژالۂ تر برساتا ہے۔ اپنے فیض سے پھُولوں کو بڑھاتا ہے اور سُنبل پر طرے لگاتا ہے۔ کبھی گُل کے گالوں کو خراشیدہ کرتا اور خط ریحاں کو تراشیدہ کرتا ہے۔ ژالۂ بیضا سے الماس گراتا ہے۔ اطراف فارستان کو بہارستان بناتا ہے۔ سمن پر سایہ ڈال کر دمن کو سرمایہ دیتا ہے۔ چمن کو شاہد رعنا کا پیرایہ دیتا ہے، تن ہاموں پر سنبل سے کسوت سیاہ اور ژالے سے خلعت دیبا پہناتا ہے۔ اپنے فیض سے بوستان میں گُل وریحاں کھلاتا ہے چمن کو گُلہائے گوناگوں سے انگلیون بناتا ہے۔ لالے کے رنگ سے زمین کو زیبا اور سمن کی بو سے ہوا کو رُوح افزا بناتا ہے۔ گُل کو ہوا کی جنبش سے لرزاں کرتا ہے۔ جس سے بُلبل کے ہوش پراں ہوتے ہیں۔ لولوئے لالا کو بحار میں رواں اور قُلزم میں معلق کر دیتا ہے اژدھے

کی طرح غرّاتا اور درندوں کی طرح ڈھاڑیں مارتا ہے۔ جس کے خوف سے دل دہل جاتے ہیں جب آسمان خروش کرتا ہے تو انسان کا پتّہ پھٹنے لگتا ہے۔ غرض ابر بہار بھی عجب جوہر خیزی اور گوہر ریزی کرتا ہے۔

ابر پر مغربی خیالات

ابر کہتا ہے کہ میں دریا اور سمندر سے پیاسے پھولوں کے پاس ان کی پیاس بجھانے کے لئے آب مقطّر لاتا ہوں۔ دوپہر کے وقت جو پتّے سوتے ہیں اُن پر میں اپنا ہلکا اور نرم سایہ ڈالتا ہوں۔ جب میں اپنے بازوؤں سے اوس کو جنبش دے کر آفتاب کے سامنے نچاتا ہوں تو وہ ہر ایک پیارے پرندے کو جو اپنی ماں کی چھاتی کے نیچے آرام سے سوتا ہے جگاتی ہے۔ میں اولے برسا کر سبز کھیتوں کو سفید رُو بناتا ہوں۔ اور پھر اولوں کو پگھلا کر اُڑا دیتا ہوں۔ اور خود قہقہہ لگا کر گرج کے برج میں چلا جاتا ہوں پہاڑوں پر برف بیزی کر کے ان کے صنوبروں کو پریشان کرتا ہوں اور ان سے آہ و فغاں کی صدا نکلواتا ہوں جب میں ہوا کے جھونکوں کی آغوش میں سوتا ہوں تو اپنے گرد سفید تکیے لگاتا ہوں اپنے قصر آسمانی کے بلند برجوں پر بجلی کو بٹھا کے اپنا رہنما و ہادی بناتا ہوں۔ اور گرج کو ایسا مقید بہ زنجیر کرتا ہوں کہ وہ بیتاب ہو کر شور و غل مچاتی ہے۔ بحر و بر پر ہر اہ ہر اپنی نرم نرم حرکتوں سے میری رہنمائی کرتا ہے یہ رہنما سبز گوں سمندروں کی تہوں میں

ندی نالوں پہاڑوں اور پہاڑوں کی چوٹیوں اور جھیلوں میں جو عالم چھپا رہتا ہے اس کی سیر کرتا ہے۔ اور اس کے عشق کے دھوئیں اور دم بازیوں سے کوہ و دریا میں سو جاتا ہے مگر اس کی روح جو اس کو عزیز ہے باقی رہتی ہے۔ اور میں اس کی اس سیر کے سارے وقت میں آسمان نیلگوں کے تبسم میں دھوپ کھاتا ہوں۔ اور اپنے رہنما کو بارش میں تحلیل کرتا ہوں ؂

جب صبح کو آسمان اپنے آتشیں دیدے دکھاتا ہے اور اپنے جلانے والے پروں کو پھیلاتا ہے تو وہ میرے مرکب وال پر سوار ہو کر بھاگتا ہے۔ جب پہاڑ کی چوٹی پر صبح کا ستارہ جھلملاتا ہے یا زمین کو زلزلہ ہلاتا چلا جاتا ہے یا باز نیچے اُتر کر اپنے زریں پروں کی روشنی میں بیٹھتا ہے یا روشن سمندر کے نیچے آفتاب غروب ہوتے وقت لمبے لمبے سانس لیتا ہے اور گرمجوشی سے آرام کرتا ہے یا آسمان کے اوپر سے شام کی قرمزی پال اس پر پڑتی ہے تو میں اپنے پروں کو سمیٹ کر اپنے ہوائی آشیانے میں اس طرح بیٹھتا ہوں جیسے فاختہ اپنے انڈوں پر بیٹھتی ہے ؂

چندرما کی کنیا اپنا نورانی لباس پہنے ہوئے میرے نرم اُونی فرش پر جو آدھی رات کی نسیموں سے آراستہ ہوتا ہے درخشاں اور خراماں ہوتی ہے۔ جہاں اس کے پاؤں کی آہٹ فرشتوں کے سوا کوئی نہیں سنتا تو وہ میرے باریک خیمے کی چھت میں چھید کرتی ہے جیسے

سے ستارے جھانکتے ہیں۔ اور اپنے آپ کو دکھلاتے ہیں۔ میں ان کو دیکھ کر کہ سُنہری مکھیوں کی طرح پراں ہیں بہت ہنستا ہوں۔ جب میں اپنے خیمے میں جو میں نے ہوا میں لگایا ہے ایسا کُشادہ روزن کرتا ہوں جس کے اندر سے میری وساطت سے خاموش دریا اور جھیلیں اور سمندر پارہ ہائے آسمانی کی طرح اوپر بلندی پر چڑھ جاتے ہیں۔ تو ان میں سے ہر ایک پر چاند ستاروں کا فرش بچھ جاتا ہے۔ میں جب آفتاب کے تخت رواں کو منطقۂ درخشاں سے باندھتا ہوں اور ماہ کی کمر میں موتیوں کا پٹکا لگاتا ہوں۔ جب طوفان ہوا میرے پھریروں کو ایک راس سے دوسری راس تک پل کی شکل بنا کر سمندر کے تلاطم پر پھیلاتی ہے تو میں سُورج کی کرنوں کے حجاب کو چھت کی طرح آویزاں کرتا ہوں جس کے ستون پہاڑ بن سکتے ہیں۔

جب میری کرسی کے ساتھ ہوا کے قوی پا بزنجیر ہوتے ہیں تو لاکھوں رنگوں سے وہ خمیدہ ہوتے ہیں اور اس کے ہلکے رنگوں کے اوپر کرۂ نار تموج اور نیچے نم آلود زمین خندہ کرتی ہے۔ میرے ماں باپ زمین اور پانی ہیں۔ میری دایہ آسمان ہے۔ سمندر اور ساحل سمندر میری گزرگاہ ہیں۔ جب آسمان کا شامیانہ صاف ہوتا ہے اور اس میں کوئی داغ دھبا نہیں ہوتا جب ہوائیں اور سُورج کی کرنیں خوب درخشاں ہوتی ہیں تو میں اپنا نیلا برج ہوائی بناتا ہوں۔

میں اپنی قبر پر چُپ چاپ ہنستا ہوں۔ اور میہ کے خلاؤں میں سے اس طرح نکلتا ہوں جیسے کہ شکمِ مادر سے بچہ۔ یا قبر سے رُوح۔ اور پھر میں اپنی عمارت تعمیر کرتا ہوں ؀

بادل ہمیشہ اپنی چُپ چاپ حرکتوں سے اپنی حالت کو بدلتے رہتے ہیں۔ کبھی ان میں اندھیرا ہوتا ہے کبھی اُجالا۔ وہ پھُولے ہوئے پہاڑ جو اپنے آپ کو اس طرح بدلتے رہتے ہیں کہ کبھی آپس میں مل جاتے ہیں کبھی جُدا ہو جاتے ہیں، پھر جُدا ہو کر مل جاتے ہیں۔ اور اپنے آبی رنگ کا جوبن دکھاتے ہیں اگر ہم بادلوں کو یہی جانیں کہ وہ پانی کے آنے کے راستے ہیں تو ان کی حالت کے سمجھنے میں بڑی غلطی کریں اور یہ ستم کریں کہ آسمان کو بیجان بنا دیں۔ جو شاعر آسمان کی جب وہ بالکل ابر سے معرّا ہو یہ تعریف کرتے ہیں کہ اس حالت میں وہ نہایت خوشنما اور خوش منظر ہوتا ہے وہ غلط بیانی کرتے ہیں۔ آسمان کی بڑی خوبصورتی یہی ہے کہ اُس پر ابر چھایا ہوا ہو۔ آسمان پر بادلوں کا وہی حال ہے جو زمین پر آدمیوں کا۔ جیسے کہ زمین پر آدمی رہتے سہتے چلتے پھرتے ہیں اور عورت مرد اپنا جوبن دکھاتے ہیں ایسے ہی آسمان پر بادل چلتے پھرتے رہتے سہتے اور طرح طرح کی صورتیں بدل کر اپنا حُسن دکھاتے ہیں ؀

بادل ہوا میں اُڑتے ہوئے ایسے معلوم ہوتے ہیں کہ کسی فرشتے نے اپنا لباس اُتار کر ہوا میں چھوڑ دیا ہے ؀

ابر سمندر کی تہ میں کسی قطرے کو نہیں چھوڑتا کہ اس کو آسمان کی سیر نہیں کراتا۔ وہ پھر اس کو دریا بنا کے بہاتا ہے اور دریا کو سمندر میں لیجا کر قطرے کو اپنی جگہ پر پہنچا دیتا ہے"۔

برسات کی بہاریں

ہندوستان میں برسات کا موسم کیا آتا ہے مسرتوں اور امنگوں کا پیغام لاتا ہے۔ پژمردگی دُور ہوتی ہے۔ تازگی آتی ہے۔ ہر طرف سبزہ ہی سبزہ نظر آتا ہے۔ در و دیوار تک سبز ہو جاتے ہیں۔ سُوکھے ہوئے درخت ویران باغ ہرے بھرے دکھائی دیتے ہیں۔ جنگل منگل بن جاتے ہیں۔ جل تھل ایک ہو جاتے ہیں۔ لڑکیاں بالیاں رنگ برنگ کے لباس پہنتی ہیں۔ سرسبز اور شاداب فضا میں رنگ برنگ کے لباس ایسے معلوم ہوتے ہیں جس طرح کہکشاں آسمان سے زمین پر اُتر آئی ہے۔ گھر گھر کڑاہیاں چڑھتی ہیں۔ پکوان اور پُوڑے تلے جاتے ہیں۔ آم کھائے جاتے ہیں۔ آلُو۔ کچالو۔ امرود۔ جامنیں اس موسم میں کچھ عجب لُطف دیتے ہیں۔ گھر گھر گھم گرد وائے جلتے ہیں جہاں درخت ہیں وہاں درختوں میں جھولے ڈلے جاتے ہیں۔ چھوٹے بڑے سب باری سے جھُولتے ہیں۔ مزے مزے کے گیت گاتے ہیں اور اپنا دل خوش کرتے ہیں۔ ایک جھولتی ہے دوسری جھُلاتی ہے۔ امیر خسرو کا یہ گیت عورتوں میں بہت مقبول ہے شائد ہی کوئی ایسی ہو جس کو یاد نہ ہوگا۔

جو پیا آون کہ گئے ۔۔ اجھوں نہ آئے سوامی ہو رے ہو جو پیا آون کہ گئے

آون آون کہ گئے ؎ آئے نہ بارہ ماس ؎ اے ہو جو پیا آون کہ گئے

بڑی بڑی عورتوں کے تو اس قسم کے گیت ہیں جو اپنے سوامی کی یاد یا اپنے عزیزوں کی محبت کی آگ کو بھڑکاتے ہیں۔ بچی بالیوں کے لئے اور گیت ہیں۔ کیونکہ جذبات تو ان میں بھی ہیں۔ آخر وہ اپنے دلوں کی اُمنگوں کا کیونکر اظہار کریں۔ دیکھنا کیا معصومانہ خیالات ہیں معلوم ہوتا ہے لڑکی سسرال میں ہے برسات کا موسم آیا ہے جھولے ڈالے گئے ہیں۔ برسات منائی جارہی ہے۔ وہ اپنی ماں کو یاد کرتی ہے اور کہتی ہے اماں مجھے بلا لو۔ ابا کو بھیجدو کہ وہ مجھے آن کر لے جائیں۔ ماں کہتی ہے بیٹی وہ تو بڈھا ہے وہ کس طرح اتنا لمبا سفر کرسکتا ہے۔ بیٹی کہتی ہے اچھا اگر ابا بڈھے ہیں تو بھائی کو بھیج دو۔ ماں کہتی ہے بیٹی وہ تو بچہ ہے وہ تجھے کس طرح لا سکتا ہے۔ پھر کہتی ہے۔ اچھا تو پھر ماموں ہی کو بھیجدو وہ مجھے اپنے ساتھ لیجائیں ماں جواب دیتی ہے۔ بیٹی وہ تو بانکا چھیلا ہے۔ اسے اپنی رنگ رلیوں سے فرصت کہاں جو تجھے لینے جائے ؎

اماں میرے باوا کو بھیجو جی کہ ساون آیا
بیٹی تیرا باوا تو بڈھا ری 〃 〃 〃
اماں میرے بھیا کو بھیجو جی 〃 〃 〃
بیٹی تیرا بھیا تو بالا ری 〃 〃 〃
اماں میرے ماموں کو بھیجو جی 〃 〃 〃

بیٹی تیرا ماموں تو بانکا ری   کہ ساون آیا

چھوٹی چھوٹی توتلی بچیوں کے گیت کسی اور ہی رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ ہمارے ملک میں گزشتہ صدی تک یہ دستور بہت ہی عام تھا کہ بہت ہی کمسنی میں لڑکیوں کی شادی کر دیتے تھے۔ بچیوں کی ابھی پوری زبان بھی نہ کھلتی تھی کہ ماں کی گود سے علیحدہ ہو جاتی تھیں اور پرایا گھر آباد کرتی تھیں ایسی بچیاں سوائے ان پاکیزہ جذبات کے اور کیا اظہار کرتیں کہ اماں میں سسرال نہیں جاتی۔ آڑو اور جامنیں تو کھلی ہوئی رکھی ہیں۔ میں پہلے انہیں کھاؤں گی۔ اگر گھوڑا اور دولہا دروازے کے باہر کھڑا ہے تو کھڑا رہنے دو۔ برسات کی رنگ رلیاں چھوڑ کر میں ہرگز نہ جاؤنگی ؎

آڑو جامن کھلے پڑے   میں نہیں جاتی میری ماں

گھوڑا دولہا باہر کھڑا   میں نہیں جاتی میری ماں

غرض کوئی گھر مشکل سے ایسا ہوتا ہو گا۔ جس میں برسات کی خوشیاں نہ ہوتی ہونگی۔ جس گھر میں جھولا پڑا ہے وہاں ہجوم ہے۔ کاموں سے فارغ ہوئے اور سب وہاں جمع ہوئے پھر کیا تھا۔ جھول رہے ہیں آپس میں چہلیں اور چخیں ہو رہی ہیں۔ آنکھ مچولی کھیلی جا رہی ہے۔ کوئی گرتی پڑتی بھاگتی ہے۔ کوئی لڑتی جھگڑتی ہے۔ کوئی کھلکھلا کر ہنستی ہے۔ طرح طرح سے دل کی امنگوں کا اظہار ہوتا ہے گھر بار ویران ہیں۔ اور ویرانے آباد ہیں۔ بارش ہو رہی ہے۔

بھیگ رہے ہیں۔ لیکن خوش ہیں غرض کھانا پینا گانا بجانا سیر تماشے برسات کی عام تفریحات ہیں جن سے سبھی لُطف اندوز ہوتے ہیں ؎

بارش کے لُطف آسمان پر بادل کا ایک ٹکڑا نظر آیا وہ پھیلتے پھیلتے سارے آسمان پر محیط ہوگیا۔ اب آسمان پر طرح طرح کے نقشے نظر آرہے ہیں۔ ہوا کے زور میں بادل اِدھر سے اُدھر اُڑے چلے جاتے ہیں معلوم ہوتا ہے قُدرت کا نداف روئی دُھنک دُھنک کر اُڑا رہا ہے۔ بجلی چمک رہی ہے۔ بادل گرج رہے ہیں۔ آسمان پر میدانِ جنگ کا سماں بندھ گیا ہے۔ بادلوں کے رسالے کالی اور اُودی وردیاں پہنے بندوقیں چھوڑتے اور توپیں داغتے۔ تلواریں چلاتے اڑے چلے جاتے ہیں۔ گھٹا کیا ہے کوئی مست ہاتھی ہے۔ جو سُونڈھ میں تلوار پکڑ کر اس کو گردش دے رہا ہے۔ آسمانی توپوں کی گرج اور چمک سے دل دہلتے ہیں۔ بچّے ماؤں کی چھاتی سے چمٹے جاتے ہیں۔ بارش مُوسلا دھار ہے۔ معلوم ہوتا ہے نُوح کا طوفان آیا ہے یا میگھ دیوتا بگڑ گئے ہیں۔ سُورج نے مُنہ پر کالے بادلوں کی نقاب ڈالی ہے۔ گھنگھور گھٹائیں مچل رہی ہیں۔ پانی برس برس کر جل تھل ایک ہُوا ہے۔ کوئی ملہار گا رہا ہے کوئی ولیس الاپتا ہے۔ کہیں ہارمونیم بج رہا ہے۔ کہیں گراموفون کے ریکارڈوں سے لُطف اُٹھایا جا رہا ہے۔ برساتی گیت سُن کر

سُننے والے سر دُھن رہے ہیں ؎

آئی بدریا برسن کو، ترست ہے دل درسن کو
آئی بدریا برسن کو

باغبان خوش اور کسان سرمست ہے۔ کوئل کی کُوک سے دل میں ہوک اُٹھتی ہے۔ پپیہوں کی آواز کچھ اور لُطف پیدا کرتی ہے۔ مور کی جھنکار سے اور ہی سماں بندھا ہے۔ جہاں کوڑی کے ڈھیر تھے اب وہاں سرسبزی اور شادابی نے گُل کھلائے ہیں۔ خشک جھیلیں اور دریا اُبل رہے ہیں۔ ندی نالے چڑھے ہوئے ہیں۔ کالی گھٹا سامنے سے جھُوم کر اُٹھی ہے۔ دُھواں دار ابر آیا ہے۔ بجلی کوندتی ہے تو آنکھوں میں چکا چوند آجاتی ہے، بگلوں کی سفید سفید قطاریں اور گھٹاؤں کا پس منظر کیسی بہار دکھاتا ہے۔ جب بادل کڑکتا ہے۔ تو دل ہل جاتے ہیں۔ پرندے دبک کر شاخوں میں چھپتے پھرتے ہیں۔ جانور درختوں کی اوٹ ڈھونڈھتے ہیں۔ مور جُدا جھنکارتے ہیں۔ پپیہے الگ پکارتے ہیں اور مینڈک مل مل کر ٹراتے ہیں۔ مویشی پانی میں مچھلیوں کی طرح تیرتے پھرتے ہیں اور نکلنے کا نام نہیں لیتے۔ زمین کے مخفی خزانے بارش کے جادو سے آپ ہی آپ برآمد ہو گئے۔ ویرانے اور باغ شہروں سے زیادہ آباد ہیں جھُولے پڑے ہوئے ہیں۔ ہلکی ہلکی بھرن پڑ رہی ہے۔ کچھ جھُولتے ہیں کچھ جُھلاتے ہیں۔ چہلیں ہو رہی ہیں۔ جھینٹوں سے لڑا جا رہا

ہے۔ دیکھنا پینگیں کہیں سے کہیں جا پہنچیں ! اُف اُلٹنے کا خطرہ ہے کتنا دل گردہ ہے۔ نہیں جوانی دیوانی مشہور ہے یہ اس کا جوش اور آب و ہوا کی تاثیر ہے۔ لو وہ زور کی بارش آگئی۔ آہا ہا تل دھار اوپر دھار برسنے لگا۔ سب آم جامنوں کے ٹوکروں پر ٹوٹ پڑے۔ کھاتے جاتے ہیں مزے لیتے جاتے ہیں۔ پہلے گٹھلیوں اور چھلکوں سے چوتھی شروع ہوئی پھر کھٹے آموں سے مُنہ کی آنے لگے۔ جب دل سیر ہو گیا تو جتنے کھائے اتنے کھائے باقی لڑائی میں کام آئے کہیں ناچ گانا ہو رہا ہے۔ خوب چہل پہل ہے۔ قدم قدم پر پھول کھلے ہیں۔ طرح طرح کی خوشبوئیں آ رہی ہیں۔ ٹھنڈی ہواؤں سے ٹہنیاں مستوں کی طرح جھوم رہی ہیں۔ اور مستی کے عالم میں پھول ایک دوسرے کا مُنہ چوم رہے ہیں۔ صبح کے وقت شبنم ان کا مُنہ دُھلاتی ہے۔ کوئل اذان دے کر ان کو جگاتی ہے۔ بادِ نسیم شکرانے کے لئے جھکاتی ہے۔ اور شبنم کے موتی ان چمن کے تاجدار دل پر سے نچھاور کرتی ہے۔ طائران خوش الحان غول غول اُڑتے پھرتے ہیں۔ کوئی زمزمہ پرداز ہے۔ کوئی کلول کر رہا ہے۔ کوئی بول رہا ہے۔ غرض بھیگی بھیگی ہوائیں مُرغان چمن کی نغمہ سرائیاں اور برسات کی چمن آرائیاں وہ لُطف پیدا کرتی ہیں۔ جو کسی اور موسم کو نصیب نہیں اسی لئے ہم لوگ اس بہار کو موسم بہار کہتے ہیں۔

برکھا رُت کی گل ریزی اور گل خیزی آب و ہوا عجب گُل و گلزار دکھائی ہے	میلے ٹھیلے

آجکل کے زمانے میں وہ پہلی سی باتیں نہیں رہیں۔ مگر پھر بھی جو میلے تماشے قدیم سے چلے آتے ہیں اب بھی منائے جاتے ہیں۔ ان میں امیر غریب ہندو مسلمان سبھی شریک ہوتے ہیں۔ افسوس کی بات ہے کہ اگلے زمانے میں ان میلوں سے ہندو مسلمانوں میں یکجہتی اور یگانگت پیدا ہوتی تھی۔ سب ایک جگہ جمع ہوتے تھے۔ اور مل کر خوشیاں مناتے تھے۔ اب یہ میلے جنگ و جدل کا درس دیتے ہیں۔ ذرا سی بات پر جنگ چھڑ جاتی ہے اور دم کے دم میں چھری کٹاری ہو جاتے ہیں اگر کوئی میلہ آیا تو سمجھ لو قہر خدا کا پیش خیمہ آیا۔ پتہ نہیں کتنے زخمی ہونگے کتنے بیگناہ مارے جائینگے۔ کوئی قید ہو گا۔ کسی کو پھانسی ملے گی۔ کئی گھر بے چراغ ہو جائینگے۔ یتیم اور بیوائیں لاوارث ہو کر ماری ماری پھرینگی۔ خدا جانے دُنیا کو کیا ہو گیا ہے۔ آخر پہلے بھی یہی میلے تھے اور یہی ہندو مسلمان تھے۔

دلّی والے برسات کے موسم میں "پھول والوں کی سیر" کا میلا ابھی تک مناتے ہیں لیکن وہ پہلی سی باتیں کہاں۔ پھر جو بھی کچھ باقی ہے۔ وہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ میلا مُغلیہ سلطنت کی یادگار ہے۔ شائد اس کو اکبر شاہ ثانی نے قائم کیا تھا۔ وہ برسات میں ہمیشہ مہرولی (قطب صاحب) میں جا کر رہتے تھے۔ ان کی وجہ سے ساری دلّی وہاں امنڈ پڑتی تھی۔ اتحاد یگانگت یکجہتی اور اتفاق کے وہ سمے دیکھنے میں آتے تھے کہ کوئی ہندو مسلمان اور امیر غریب میں

امتیاز نہیں کرسکتا تھا۔ مدتوں پہلے تیاریاں شروع ہوجاتیں سیر کی نفیری بجتے ہی خوب چہل پہل ہوجاتی تھی۔ قطب صاحب میں مکانات کرایہ پر نہ ملتے تھے دو دو چار روپے کے مکانات چند دن کے لیئے پچاس پچاس اور ساٹھ ساٹھ پر اُٹھتے اور پھر بھی ڈھونڈھے نہ ملتے۔ گھر گھر وہ ہجوم ہوتا کہ تل دھرنے کو جگہ نہ رہتی۔ اور مارے غُل غپاڑے کے کان پڑی آواز سُنائی نہ دیتی۔ بچے الگ کھیل رہے ہیں عورتیں علیحدہ منڈلی جمائے بیٹھی ہیں۔ طرح طرح کے کھیل ہو رہے ہیں۔ کہیں جھولا ہے کہیں شطرنج اور چوسر کی بساطیں بچھی ہیں۔ کنکوے بازی۔ گلی ڈنڈا۔ کبڈی۔ آنکھ مچولی۔ خدا جانے کیا کیا کھیل کھیلے جاتے تھے۔ مینہ آگیا تو سب بارش میں بھیگ رہے ہیں کپڑے شرابور ہیں۔ چھینٹوں سے لڑا جا رہا ہے۔ ایک دوسرے کے پیچھے بھاگ رہے ہیں کوئی پھسلا اور گرا تو قہقہوں کی گونج سے آسمان پھٹ جانے کا گمان ہوا۔ کوئی کسی کا مُنہ کالا کرتا اور نہیں تو کیچڑ ہی مُنہ پر مل دیتا۔ موقعہ پاتے ہی پانی میں دھکا دیتا۔ غرض ایک ہنگامہ رہتا، شام آتی تو نئے لُطف لاتی۔ سب کپڑے بدل کر جمع ہیں۔ ڈھولک بج رہی ہے۔ بچی بوڑھیاں مل مل کر گا رہی ہیں۔ مردوں کی نشستگاہ میں رنڈی کا رقص ہو رہا ہے۔ ہر طرف سے ایسی سُریلی آوازیں کانوں میں آ رہی ہیں کہ دل کھچا جاتا ہے۔ جس مکان کے آگے دیکھو ٹھٹ کے ٹھٹ آدمیوں کے لگے ہیں

راستے پر کھڑے گانا سُن رہے ہیں اور وہیں سے بیساختہ داد دے رہے ہیں۔ بازاروں کی رونق اور چہل پہل کا کیا کہنا۔ طرح طرح کی دُکانیں کھلی ہیں۔ کوئی دیکھ رہا ہے کوئی خرید رہا ہے۔ قدم قدم پر کڑاہیاں چڑھی ہیں کہیں پکوان پک رہے ہیں۔ کہیں پراٹھے اتر رہے ہیں۔ کبابوں والے کی دُکان پر اس قدر بھیڑ ہے کہ گھنٹوں باری نہیں آتی۔ پُھلیرے کنٹھے لئے پھرتے ہیں۔ دو گنی چوگنی قیمت لیتے ہیں۔ مگر پھر بھی لوگ شوق سے لئے جاتے ہیں۔ جسے دیکھو پُھولوں سے لدا پھندا اکڑتا مکڑتا چلا جا رہا ہے۔ پنواڑیوں کی دُکانوں کے آگے بھی خوب ہجوم ہے۔ گلوریوں کے تھال کے تھال بھرے رکھے ہیں جو لگے ہاتھوں بکتے چلے جاتے ہیں۔ چھلے انگوٹھیوں کی دُکانیں اتنی پُر رونق ہیں کہ حیرانی ہوتی ہے۔ کیوں نہ ہو پُھول والوں کی سیر کا یہی خاص تحفہ ہے۔ اس لئے جو شخص آتا ہے انگوٹھیاں چھلے ضرور خریدتا ہے۔ اور خوشی خوشی گھر جا کر ہر ایک کو تقسیم کرتا ہے ؛

جُھوم جُھوم کر بادل آ رہے ہیں۔ کالی گھٹائیں دیکھ کر ہر ایک کا دل مچلتا ہے۔ کوئل کی کوک اور مور کی جھنکار مُوسلا دھار بارش کا پیغام دے رہی ہے۔ لو وہ مینہ آ گیا۔ ہلکی ہلکی پھوار میں سب بھیگ کر لطف اُٹھا رہے ہیں۔ کیاریوں میں پُھول اپنی بہار دکھا رہے ہیں۔ بہار دیکھنے والوں کی بہار الگ ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔

رنگ برنگ کی تیتریاں پھول پھول پر اڑتی پھرتی ہیں۔ اگر سچ مچ
کوئی تیتری آگئی تو اس کے پیچھے بھاگ رہے ہیں۔ کوئی گر پڑا تو
طرح طرح کی پھبتیاں اُڑیں۔ کیا مجال جو کیڑے مکوڑے کا کس کو خیال
آئے بے تکان گھاس کو روندا جا رہا ہے۔ اگر آم کھا رہے ہیں تو کچھ
اور ہی لطف ہے۔ ذرا کسی کی آنکھ بچی دوسرے نے فوراً آم کی
گٹھلی ماری۔ ایک کا آم کھٹا نکلا تو سمجھو دوسروں کی شامت آگئی۔
ان سے فارغ ہوئے تو آلو کچالو کی نوبت آئی۔ رنگترے اور انار
کچھ کھائے کچھ پھینکے۔ کسی کی آنکھوں کے قریب چھلکا لیجا کر دبا دیا۔
اب آنکھوں سے پانی بہہ رہا ہے۔ کوئی رو رہا ہے۔ کوئی ہنس رہا ہے۔ اس
طرح تو دن کٹا اب شام آئی۔ وہ کچھ اور ہی رنگ لائی۔ ہر زبان
پر یہی ہے چلو چل کے پنکھے دیکھیں۔ یہ دھوبیوں کا پنکھا ہے۔ یہ
سقوں کا ہے۔ یہ کھتریوں کا ہے۔ دیکھنا کیسا خوبصورت بنایا ہے
کارچوب سے لپا ہوا ہے۔ معلوم ہوتا ہے سونے کا بنا ہے۔ پھول والوں کا
پنکھا دیکھو دیکھنا کیا صناعی صرف کی ہے۔ غرض ہر قوم کے پنکھے کی
شان نرالی ہے۔ جلوس کو دیکھو تو بہ توبہ سارا شہر اتنی سی جگہ میں آگیا
ہے۔ تل دھرنے کو جگہ نہیں۔ کھوے سے کھوا چھلا جاتا ہے۔ کیسی
دھکا پیل ہے۔ روشنی سے رات کو دن بنا دیا ہے۔ جھجوں اور برآمدوں
پر سے تماشائی لٹکے پڑتے ہیں۔ دو کی جگہ پہ دس کھڑے ہیں اگر
جھجھ نیچے آگیا تو کوئی زخمی ہوا۔ کسی کی ہڈی پسلی ٹوٹی۔ خدا کا

شکر ہے کہ جان بچ گئی۔ کمروں اور برآمدوں پر سے چھناچھن پڑے برس رہے ہیں۔ نفیری والا مست ہو ہو کر اپنی نفیری بجا رہا ہے۔
میرا پیا گیا ہے بدیس، موری چولی کون رنگاوے، بیری ساون آیو ری، موا پیا گیا ہے بدیس
اب آتشبازوں نے آتشبازی چھوڑنی شروع کی۔ جس کو دیکھ کر ہر ایک کے منہ سے بیساختہ واہ نکلی۔ شوقینوں نے استادوں کے گلے میں ہار ڈالے انعام واکرام دیا۔ اور میلا بچھڑنا شروع ہوا۔ مسلمانوں نے اپنے پنکھے درگاہ پر چڑھائے۔ ہندو اپنے پنکھے جوگ مایا لے گئے اب باقی رات ناچ گانے میں گزری صبح ہوئی تو پھر وہی رنگ ڈھنگ ہے۔ لیکن اب آہستہ آہستہ رخصت کے انتظام ہو رہے ہیں دو دن بعد دیکھنا قطب میں سناٹا ہوگا اور دیکھنے کو انسان کی شکل بھی نظر نہ آئیگی ؛

برسات کی صعوبتیں برسات کا موسم باوجود اپنی رنگینیوں کے کلفت سے خالی نہیں ہوتا۔ اکثر بارش ہو چکنے کے بعد جب دھوپ نکلتی ہے تو دھوپ کی گرمی سے پانی کے بخارات بننے شروع ہوتے ہیں۔ اور ہوا چلنی بند ہو جاتی ہے۔ عام زبان میں اس کو بند گرمی یا حبس کہتے ہیں۔ حبس" شدت کی گرمی" سے بھی زیادہ تکلیف دہ ہوتا ہے۔ سانس لینا دشوار ہو جاتا ہے۔ پسینے آ کر کپڑے بری طرح بدن سے چمٹ جاتے ہیں اور طبیعت کو حد درجہ ناگوار معلوم ہوتے ہیں۔ برسات کے پسینوں میں سے ایک خاص قسم کی بو آتی ہے۔ جس سے دل بہت ہی خراب

ہوتا ہے ۔

حبس عام طور پر بارش آنے سے پہلے بھی ہو جاتا ہے۔ لیکن بارش ہونے سے یہ کیفیت دُور ہو جاتی ہے۔ مگر جو حبس بارش ہونے کے بعد ہوتا ہے اس سے بہت زیادہ تکلیف ہوتی ہے پھر برسات کی موٹی موٹی اور بھاری بھاری مکھیاں جو غالباً ہیضے کے جراثیم سے بھاری ہو جاتی ہیں۔ طبیعت پر اور بھی زیادہ ناگوار گزرتی ہیں۔ رات کے وقت روشنی کرنے سے پروانوں بھنگوں اور ٹڈوں کی فوجیں ٹوٹ پڑتی ہیں۔ غرض ان دنوں زمین اور آسمان اپنے اچھے بُرے جوہر سب اُگل دیتے ہیں۔ اگر کہیں جگنو، بیر بہوٹیاں دلکش معلوم ہوتی ہیں۔ تو ساتھ ہی سانپ۔ بچھو۔ کنکھجورے اور کیڑے پتنگے وغیرہ بھی انسان کو محتاط بنا دیتے ہیں ۔

جب برسات پورے زور شور سے آتی ہے۔ اور کئی کئی دن سُورج دکھائی نہیں دیتا۔ تو خلقت اللہ میاں کی نوازشوں سے گھبرا جاتی ہے۔ بجلی کی چمک اور گرج اور مسلسل بارش سے لوگ پناہ مانگنے لگتے ہیں۔ اب اُلٹی دُعائیں مانگی جاتی ہیں کہ یا اللہ اس طوفان نوح سے محفوظ رکھیو۔ کوئی کہتا ہے جل تو جلال تو آئی بلا کو ٹال تو۔ کوئی بارش روکنے کے لئے مُسافر بنا کر کھڑا کرتا ہے۔ کوئی ہر نالا لیپتا ہے۔ غرض بارش روکنے کے لئے طرح طرح کے ٹوٹکے کئے جاتے ہیں۔ بارش کے خوف سے لوگ گھروں سے نہیں نکلتے۔ بار بار آسمان کی طرف دیکھتے

ہیں کہ دیکھئے کب مطلع صاف ہو۔ اور اطمینان کا سانس لیں ❖

ہر طرف سے بارش کی تباہ کاریوں کی اطلاعیں آتی ہیں۔ سُننے میں آتا ہے۔ فلاں مکان گر گیا۔ اس کے نیچے گھر والے دب کر مر گئے۔ کہیں سے خبر آتی ہے۔ دریا میں سیلاب آگیا۔ اور فلاں گاؤں غرق ہو گیا ہے۔ جانور بہ گئے جو بچ گئے تھے وہ چارہ نہ ملنے سے مر گئے مکانات گر گئے۔ لوگوں نے درختوں پر چڑھ کر اپنی جان بچائی۔ اور جو کشتیاں ان کی امداد کے لئے پہنچی تھیں وہ آدمیوں سمیت غرق ہو گئیں۔ اچھے اچھے پُختہ مکانات کو بارش سے نقصان پہنچتا ہے، شاید ہی کوئی ایسا مکان بچتا ہو جو ٹپکتا نہیں۔ یا اس کو کسی نہ کسی طرح بارش سے نقصان نہیں پہنچتا ❖

کسی نے ایک نہایت سن رسیدہ بُڑھیا سے پُوچھا کہ بُڑھیا بُڑھیا تو کس چیز سے ڈرتی ہے۔ بُڑھیا نے جواب دیا۔ بیٹا مَیں کسی چیز سے نہیں ڈرتی۔ فقط ٹپکے سے ڈرتی ہوں۔ اس نے کہا بُڑھیا۔ تو شیر سے ڈر۔ چور سے ڈر۔ سانپ سے ڈر۔ موت سے ڈر۔ یہ ٹپکے سے ڈرنا کیسا۔ اس نے نہایت متانت سے جواب دیا۔ بیٹا ہر چیز سے انسان بچ سکتا ہے۔ لیکن ٹپکے سے انسان نہیں بچ سکتا ❖

بُڑھیا کا جواب بالکل ٹھیک تھا۔ جن لوگوں کو ایسے مکانات میں رہنے کا اتفاق نہیں ہوا جو برسات میں اکثر ٹپکا کرتے ہیں۔ وہ اس کا لُطف نہیں اُٹھا سکتے۔ لیکن جن کو ٹپکے کا تلخ تجربہ ہے۔

اِس مصیبت کا کچھ وہی اندازہ کر سکتے ہیں جب کوئی مکان ٹپکتا ہے۔ تو اس میں رہنے والوں کی عجب حالت ہوتی ہے۔ چپے چپے پر برتن رکھتے پھرتے ہیں۔ دن کا چین اور رات کی نیند حرام ہو جاتی ہے۔ گھر کا سامان الگ خراب ہو جاتا ہے۔ جس کو دھوپ دینے کے لئے خاصی تکلیف اُٹھانی پڑتی ہے اور اگر سوءِ اتفاق سے دھوپ کئی دن نہ نکلے۔ تو اکثر چیزیں خراب ہو کر ضایع ہو جاتی ہیں۔ اگر بچ جائیں تو برسات کی نشانیاں ان کو ہمیشہ کے لئے داغدار بنا دیتی ہیں۔ شدت کی بارشیں مکانات گرا دیتی ہیں۔ بعض کا تو لاکھ کا گھر خاک ہو جاتا ہے۔ جو لوگ رات کو آرام سے اپنے گھر میں نرم اور گرم بستروں پر استراحت کر رہے تھے مکان کے منہدم ہو جانے سے کتنے ہی دب کر مر گئے۔ جو بچ رہے دوسرے دن نہ ان کے پاس کھانے کو روٹی نہ بیٹھنے کو جگہ اور نہ پہننے کو کپڑا تھا۔ ایسی بارشوں سے خدا بچائے اب تو پہلے جیسی بارشیں ہی نہیں ہوتیں۔ کہتے ہیں جنگل کم ہو جانے سے بارشیں بھی کم ہو گئی ہیں۔ پہلے ایسی بارشوں کو ڈھائی ڈھوئی کی بارشیں کہتے تھے۔ اور ان کے تصور سے پناہ مانگتے تھے۔

برسات کی تباہ کاریاں یہیں ختم نہیں ہو جاتیں موسم خراب ہو کر طرح طرح کی بیماریاں پھیلتی ہیں۔ اکثر ملیریا اور ہیضہ سے ہزاروں جانیں تلف ہوتی ہیں۔ گھر کے گھر ہسپتال بن جاتے ہیں۔

جاڑا

گلابی جاڑا

قدرت کی ستم ظریفی کے کیا کہنے ہیں۔ ہمارے ملک کی آب و ہوا میں بھی افراط و تفریط موجود ہے۔ کبھی سخت گرمی ہے۔ کبھی شدت کی برسات۔ اس کے بعد سردی اور پھر قیامت کی سردی۔ خدا خدا کر کے گرمی کی مصیبتوں اور برسات کی صعوبتوں سے نجات ملتی ہے تو جاڑے کا موسم آتا ہے۔ شروع شروع میں جاڑا بہت ہی بھلا معلوم ہوتا ہے۔ لوگ باگ باریک کپڑے اتار کر ذرا بھاری کپڑے پہنتے ہیں۔ جن میں جوانی کی حرارت ہوتی ہے۔ وہ سرد کپڑوں میں اکڑے اکڑے پھرتے ہیں۔ جسموں میں جان اور چہروں پر رونق آتی ہے۔ چلنے پھرنے کا مزا آتا ہے۔ ٹھنڈی ہوائیں کمہلائی ہوئی طبیعتوں میں زندگی کے آثار پیدا کرتی ہیں۔ یہی زمانہ جاڑے کی آمد آمد کا وقت ہے اور ٹکسالی اردو میں گلابی جاڑا کہلاتا ہے ایسا موسم عام طور پر اکتوبر سے نومبر کے وسط تک رہتا ہے۔

چلّے کی سردیاں

گلابی جاڑے کے بعد اصلی جاڑا آتا ہے۔ اب ذرا لوگوں کی طبیعتیں سردی کی طرف رجوع ہوتی ہیں۔ جسے دیکھو گرم کپڑے پہنے بیٹھا ہے۔ جوں جوں سردی بڑھتی ہے۔ لباس بھی گرم تر

ہوتے جاتے ہیں۔ جب جاڑا بہت ہی شدت کا پڑتا ہے تو کہتے ہیں بابا "چلے کا جاڑا" ہے۔ ہر شخص سردی سردی۔ جاڑا جاڑا پکارتا ہے۔ ذرا باہر نکلو دانت سے دانت بجنے لگتے ہیں۔ بادِ خنک کے جھونکوں سے دل تھرّاتا ہے۔ جسم کانپتا ہے۔ جی چاہتا ہے۔ لحاف ہی میں دبکے رہو۔ کمروں کے دروازے بند رکھو۔ آگ روشن رہے۔ غرض جس طرح بھی ہو گرم رہیں۔ گرم گرم غذائیں کھائیں۔ گرم گرم چائے پئیں۔ بس نہیں چلتا کہ آگ کو سینے میں رکھ لیں۔ منہ سے انجن کی طرح دھواں نکل رہا ہے۔ لیکن سردی سردی کی فریاد ہے۔ کوئی سیٹی بجاتا چلا جاتا ہے۔ کوئی سوں سوں کر رہا ہے۔ بچّے ماؤں کے سینے سے چمٹے جاتے ہیں۔ کوئی لحاف سے منہ نکالے پڑا ہے۔ کسی نے انگیٹھی کاچھے سے لگائی ہے۔ کسی نے لحاف ہی میں رکھ لی ہے۔ انگیٹھی بیچ میں رکھی ہے چاروں طرف سارا گھر ہاتھ پھیلائے بیٹھا ہے۔ باتیں ہو رہی ہیں حکایتیں بیان کی جا رہی ہیں، ذرا آگ دھیمی ہوئی اور سردی کا لفظ ہر ایک کی زبان پر بیساختہ آیا۔ غرض سردی کے لُطف کچھ سردی ہی میں آتے ہیں۔

منچلے نوجوانوں کی حالت بھی ان دنوں عجیب ہوتی ہے۔ کمزور اور بُوڑھے تو مارے سردی کے بات نہیں کر سکتے۔ اگر کہتے ہیں تو یہی کہ اے بابا بڑی سخت سردی ہے۔ اپنی جوانی پر رحم کرو۔ سردی سے بچو۔ گرم کپڑے پہنو۔ ہمارے حال پر کرم کرو۔ لیکن وہ بھلا کب سنتے ہیں۔ کہتے ہیں سردی کہاں ہے ہمیں تو کوئی نہیں لگتی۔ یہ کہا اور یہ جا وہ جا۔

خون کی حرارت واقعی سردی کو محسوس نہیں ہونے دیتی۔ بڑے بوڑھے منع کرتے رہے اور وہ کہتے کہتے ٹھنڈے پانی سے نہا لئے۔ صبح کا وقت ہے۔ سردی کے مارے منہ سے بات نہیں نکلتی بقول شخصے الفاظ منہ میں جمے جاتے ہیں لیکن یہ لحاف میں سے نکلے۔ اور بغیر کپڑے پہنے صحن میں نکل آئے۔ سردی کھا رہے ہیں اور خوش ہو رہے ہیں +

دو دلچسپ حادثے مجھے ایک واقعہ یاد آ گیا۔ ستمبر کا مہینہ تھا۔ ہم کشمیر میں گاندربل کے مقام پر اپنے ہاؤس بوٹ میں مقیم تھے۔ ہمیں ٹھنڈے پانی سے نہانے کی عادت تھی۔ وہاں دریا میں نیلا نیلا پانی عجب لطف دیتا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ قریب کے پہاڑوں سے برف پگھل پگھل کر آ رہی ہے۔ شاید کہیں برف پڑ چکی ہو گی۔ پانی اس قدر ٹھنڈا تھا کہ ہاتھ پاؤں سن ہوتے تھے۔ ایک دن سردی زیادہ تھی۔ ہم اپنے کمرے میں بیٹھے دریا کی سیر دیکھ رہے تھے وہاں قریب ہی چند ایک نوجوان نہا رہے تھے۔ ان میں سے ایک تیرتے تیرتے دریا کے منجھ میں چلا گیا۔ وہاں پہنچ کر وہ ایکدم چلّایا۔ ارے پکڑنا۔ لینا۔ میں مرا۔ فوراً دو ایک آدمیوں نے چھلانگ ماری۔ اور اس کو پکڑ کر کنارے پر لائے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ ٹھنڈے پانی نے ان کے تمام جسم کو سن کر دیا تھا۔ اور اگر وقت پر مدد نہ پہنچتی تو یہ حضرت وہیں جم گئے ہوتے۔ اس واقعہ کے دوسرے دن ہمارے ساتھی کو ایک اور دلچسپ حادثہ پیش آیا۔ میں اُن دنوں تیرنا نہیں جانتا تھا اس لئے غسل خانہ ہی میں

ٹھنڈے پانی سے نہا لیتا تھا۔ ان کو سُوءِ اتفاق سے تیرنا آتا تھا۔ مَیں تو غُسل خانے میں نہا لیا۔ اور وہ حضرت حسبِ دستور لنگوٹہ کس کر دریا میں کُود گئے۔ لیکن خلافِ معمول تھوڑی دیر میں نکل آئے۔ کہنے لگے سردی بہت لگ رہی ہے۔ میں نے کہا بہت عقلمندی کی آپ فوراً تشریف لے آئے ورنہ ملّاحوں کو چھلانگ مارنی پڑتی۔ شام ہوتے ہوتے ان کے سینے میں درد ہونے لگا اور تکلیف زیادہ بڑھ گئی۔ رات ڈاکٹر کو بُلایا۔ اس نے تشخیص کیا کہ نمونیا ہو گیا ہے۔ سخت پریشانی ہوئی۔ خیر علاج ہو گیا۔ اور جان بچ گئی "

اکثر پُرانے لوگوں کی زبانی سردیوں کا یہ لطیفہ بھی سُننے میں آیا ہے آپ بھی اس سے کیوں محروم رہیں کہتے ہیں بہت مدّت کا ذکر ہے۔ سردی کا موسم تھا اور کڑاکے کے جاڑے پڑ رہے تھے۔ لکھنؤ کے رنگیلے بادشاہ اپنے محل میں جھروکوں کے پاس کھڑے سیر کر رہے تھے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ دو نوجوان باریک تن زیب کا انگرکھا پہنے چھڑی ہلاتے۔ اس طرح سیر کرتے ہوئے جا رہے ہیں۔ جیسے گرمیوں کا موسم ہوتا ہے۔ بادشاہ سلامت کو ان کی یہ ادا بہت پسند آئی۔ اپنے مصاحب سے فرمایا ماشاء اللہ خوب نوجوان ہیں۔ لوگ ہمارے لکھنؤ کو خواہ مخواہ بدنام کرتے ہیں کہ یہاں کے لوگ کمزور ہوتے ہیں۔ ہمارا جی چاہتا ہے ہم ان سے ملاقات کریں۔ فوراً پیش خدمت دوڑے اور ان نوجوانوں کو ملاقات کے لئے ایک کمرے میں لا کر بٹھا دیا۔

سرکار یہ بات کہہ کر اپنی رنگ رلیوں میں لگ گئے اور بالکل خیال نہ رہا کہ کس کو بُلایا تھا اور کیا کہا تھا۔ بہت رات گئے جب گانے کی محفل برخاست ہوئی اور حضور خوابگاہ میں تشریف لیجانے لگے تو سردی لگی۔ اسوقت پھر وہ نوجوان یاد آئے۔ اپنے مصاحب سے ان کا ذکر کیا۔ اس نے عرض کیا حضور وہ آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ اللہ رے آپکے اخلاق آپ فوراً ان سے مُلاقات کے لئے تشریف لے گئے۔ کمرے میں داخل ہوئے۔ وہ نوجوان اسی طرح بیٹھے رہے۔ آداب و کورنش کا بھی خیال نہ کیا۔ بات کی تو اس کا بھی جواب نہ دیا۔ بار بار سوالات ہوئے آخر مصاحب نے ہو کر ان کے قریب گئے۔ شانہ ہلایا۔ تو معلوم ہُوا کہ سردی کی شدت سے رُوح اور قوت گویائی دونو جم گئے تھے۔ کہتے ہیں کسی مسخرے نے اسی موقعہ پر یہ شعر کہا تھا ؎

عاشق کا بانکپن نہ گیا بعد مرگ بھی تختے پہ جو لٹایا وہاں بھی اکڑ گئے

ان واقعات کے بیان کرنے سے ہمارا مقصد فقط اتنا ہے۔ کہ ہر بات اپنے موقع محل پر اچھی لگتی ہے۔ اگر خدا نے آپ کو اتنی جرأت دی ہے کہ آپ سردی کا مقابلہ کر سکتے ہیں تو واقعی سردی کی کوئی پرواہ نہ کریں۔ دریا میں چھلانگ ماریں تو اور ٹھنڈے کپڑے پہنے تو اپنی قوت کو دیکھ لیں کہ آپ کے جسم میں مدافعت کی قوت ہے یا نہیں۔ اگر آپ میں برداشت کی طاقت موجود ہے تو آپ کو کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ اگر محض شیخی ہی شیخی ہے تو آپ کو ایسا مزہ ملیگا کہ عمر بھر یاد رہیگا اور

کیا عجب ہے کہ دوسروں کے لئے کسی دلچسپ افسانے کا سامان مہیّا کردے۔ اور آپ کا نام ہی نام باقی رہ جائیے +

سردیوں کی خزاں اور بہار جُوں جُوں سردی بڑھتی ہے۔ آب و ہوا کی تاثیر بدلتی جاتی ہے۔ سرد ہواؤں کے جھکڑوں سے جس طرح سینوں میں دل تھراتے ہیں اسی طرح نونہالان چمن مارے سردی کے پتوں میں مُنہ چھپائے لیتے ہیں۔ بادِ صرصر کے جھونکے سبز سبز پتوں کو زرد کر دیتے ہیں۔ پت جھڑ سے گُل و گلزار کی رونق کم ہونی شروع ہوتی ہے۔ نغمہ سنجان چمن ہرنوں کی طرح چوکڑیاں بھول جاتے ہیں پر پُھلائے اور منقار زیر پر کئے ٹنڈ مُنڈ درختوں پر بیٹھے نظر آتے ہیں۔ گُل و غُنچہ کی مُرجھائی ہوئی پتّیاں ٹھٹھری ہوئی گھانس پھونس پر اُڑتی پھرتی ہیں۔ یہی وہ موسم ہے جس کو موسم خزاں سے تعبیر کیا جا سکتا ہے،،

بہر حال جہاں سردی سے باغوں کی رونق کم ہوتی ہے وہاں اس سے فائدے بھی پہنچتے ہیں۔ ہواؤں کی کثافتیں دُور ہوتی ہیں زہریلے حشرات الارض یا تو سردی کی شدت سے ہلاک ہو جاتے ہیں یا اپنے بلوں میں گُھس جاتے ہیں اور وہیں منجمد ہو کر رہ جاتے ہیں۔ برسات کے وبائی جراثیم سردی کی تاب نہ لا کر کالعدم ہوتے ہیں۔ مریض شفا پاتے ہیں۔ مزاجوں کی رطوبت خشک ہو جاتی ہے۔ میووں میں شیرینی اور غذائیت پیدا ہوتی ہے۔ تر اور خشک میوے مزہ دینے لگتے ہیں۔ کھانے

پینے کا مزا آتا ہے گنبد گردوں شیشے کی طرح صاف ہو جاتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے۔ عالم خاک کی انگوٹھی میں قدرت کے صانع نے ایک نہایت خوشرنگ فیروزہ بڑی کاریگری سے جڑ دیا ہے۔

عین سردی میں بسنت آتی ہے۔ نباتات کا رنگ بدل جاتا ہے۔ سرسوں پھولتی ہے۔ نونہالان چمن بسنتی جوڑے پہنتے ہیں اور آنکھوں میں کھبے جاتے ہیں۔ بسنتی اور زعفرانی رنگ اس بہار میں کچھ عجب لطف دیتے ہیں۔ بسنت کے ترانے جب فضا میں گونجتے ہیں۔ ہر طرف سے شور اُٹھتا ہے بسنت آگئی بسنت آگئی۔ بسنتی جوڑے رنگے جاتے ہیں۔ خوشیاں ہوتی ہیں۔ رقص وسرود کی محفلیں برپا کی جاتی ہیں۔ آج اس محلے میں کل دوسرے میں۔ مسرتوں کا ایک دریا امنڈ آتا ہے۔ بسنت کی خوشیوں میں ہندو مسلمان بغیر تعصب کے شریک ہوتے ہیں۔ اور اس تہوار کو باہم مل کر مناتے ہیں۔

غریبوں کی سردی

ہندوستان کے مفلس باسیوں کی بیشتر جانیں اسی جاڑے میں ضائع ہوتی ہیں۔ اسی لئے کہتے ہیں کہ امیر سردی کو پسند کرتے ہیں اور غریبوں کو گرمی بھاتی ہے۔ غریبوں کے لئے کیا گرمیاں اور کیا سردیاں۔ جس طرح بھی ہوا اپنی زندگی کے دن پورے کرتے ہیں۔ گرمیاں ستائیں تو کیا اور سردیاں تنگ کریں تو کیا۔ سردی تو انہیں لگتی ہے جو سردی سے بچ سکتے

ہیں۔ غریبوں کی تو وہ مثال ہے۔ کیا ننگی نہائیگی اور کیا ننگی نچوڑیگی۔ کوئی اپنے مال میں مست ہے کوئی اپنے حال میں مست ہے صبح اُٹھے سوں سوں کرتے اپنے کام میں لگ گئے۔ پھر سردی کہاں۔ زیادہ سردی نے تنگ کیا۔ تو اِدھر سے اُدھر کوڑا کرکٹ جمع کیا اور آگ جلا کر تاپ لی۔ دھوپ نکل آئی تو پھر نہ کپڑے کی ضرورت ہے اور نہ آگ کی۔ شام کو تھکے ہارے آئے۔ چولہے کے آگے بیٹھ کر روٹی کھالی۔ جب تک جاگے چولہے کے قریب بیٹھے رہے، باہر نکلے تو چار آدمی جمع ہوئے اِدھر اُدھر سے درختوں کی شاخیں۔ پتے۔ کچھ کوڑا کرکٹ اور اگر کہیں سے مل گئیں تو چند ایک لکڑیاں جمع کیں اور راستے میں آگ سلگادی۔ چار اِدھر سے آگئے چار اُدھر سے آنکلے۔ کوئی آتا جاتا بھی آبیٹھا۔ اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے اور آگ سینکتے رہے۔ جب نیند آئی تو کچھ وہیں چادر تان کر سو رہے۔ جن کو خدا نے گھر دیا ہے۔ وہ اپنی تنگ و تاریک کوٹھری میں جا پڑے۔ مفلس کسان سردی سے بچنے کے لئے اکثر اپنی کوٹھریوں میں گائے بھینس باندھ لیتے ہیں۔ اور اس کے سانس کی گرمی سے اپنے تئیں سردی سے بچاتے ہیں جن کو یہ بھی میسر نہیں۔ وہ سڑکوں کے کنارے لوگوں کے دروازوں اور دکانوں کے چبوتروں پر لمبی تانتے ہیں۔ موت ان کی جانوں کی حفاظت کرتی ہے جس کا وقت آلگتا ہے مفلسی اور بیکسی اُس کے سرہانے آنسو بہاتی ہے۔ جو لوگ اخبارات دیکھتے

ہیں۔ ان کی نظر سے اکثر اس قسم کی دل ہلانے والی خبریں گزرتی رہتی ہیں۔

سردیوں کے عذاب و ثواب سردی کے موسم میں اکثر امیر لوگ کمبل اور لحاف غریبوں کو مفت تقسیم کر کے دارین کا ثواب حاصل کرتے ہیں اور وہ دولتمند جو خود تو گرم رہتے ہیں اور بنی نوع انسان کے اس گروہ کو بھول جاتے ہیں جو ان کی ہمدردی کا اس موسم میں مستحق ہے۔ یقیناً عذاب کماتے ہیں۔ ہندوستان کی اکثر میونسپل کمیٹیاں بھی سردی میں کمبل وغیرہ تقسیم کرتی ہیں۔ لیکن ان کی مثال وہی ہوتی ہے کہ اندھا بانٹے ریوڑیاں اپنے اپنوں کو دے۔ پھر بھی اس حقیقت سے انکار نہیں ہو سکتا کہ اکثر مستحق لوگوں کو بھی کچھ نہ کچھ فائدہ پہنچ ہی جاتا ہے۔ بہت نہ سہی تھوڑا ہی تھوڑا۔ جن لوگوں کو بلا ضرورت یہ خیراتی کمبل اور لحاف مل جاتے ہیں وہ ان کو اکثر بیچ ڈالتے ہیں۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے کمیٹی کے خیراتی کمبل بکتے ہوئے دیکھے ہیں۔ اس کا عذاب یا ثواب ان لوگوں پر ہے جو کسی لحاظ کے ماتحت یا بغیر تحقیقات کئے غیر مستحقین کو مستفید فرماتے ہیں نیکی بجائے خود نیکی ہے۔ لیکن اگر اس سے اس شخص کو فائدہ نہ پہنچے جو حقیقت میں اس کا مستحق ہے تو سبحان اللہ۔

سردیوں کے دن سردیوں میں دن چھوٹے ہوتے جاتے ہیں۔ اور راتیں لمبی۔ صبح آٹھ بجے کے قریب سورج کی شکل نظر آتی ہے۔ صبح

کے وقت دھوپ میں گرمی نام کو نہیں ہوتی۔ معلوم ہوتا ہے سورج کی کرنیں برف ہی سے ٹھنڈی ہو ہو کر آرہی ہیں۔ سرد ہوا جسم کو اس طرح لگتی ہے جس طرح کسی نے برف کا نیزہ مار دیا۔ سردی کے مارے ہاتھ باہر نہیں نکال سکتے۔ کوئی بغلوں میں دبائے لیتا ہے کوئی اپنے سانس سے گرم کرتا ہے کوئی دستانے پہنے ہوئے ہے۔ کسی نے کمبل لپیٹا ہے۔ کوئی لحاف ہی اوڑھ کر نکل آیا ہے۔ کسی نے چسٹر اور کوٹ ڈانٹا ہے۔ گلے میں مفلر لپیٹا ہے۔ سر پر گرم ٹوپی ہے۔ گرم پاجامہ ہے۔ گرم قمیض ہے۔ پہلے زمانہ میں اُونی کپڑے بہت مہنگے بکتے تھے اس لئے عام طور پر روئی کے کوٹ بھروا کر پہنتے تھے۔ اُف دُنیا ہی بدل گئی ہے۔ وہ پہلی سی باتیں نہیں رہیں، اگر کوئی آجکل رُوئی کا کوٹ، رُوئی کا پاجامہ اور روئی کا کنٹوپ پہن لے تو اُسے دیکھ کر ہنسی آتی ہے اور مُنہ سے بیساختہ نکلتا ہے کہ یہ اُذبک کہاں سے آگیا۔ ابھی صدریاں عام طور پر استعمال کی جاتی ہیں لیکن ان کی جگہ بھی سویٹر اُونی بنیان اور گرم واسکٹیں لیتی جاتی ہیں۔ اب چسٹر اور اور کوٹ سے جسم کو زینت دی جاتی ہے پہلے زمانہ میں شالیں۔ دُھسے۔ رضائیاں اور لبادے کام آتے تھے۔ کیا عجب ہے کہ عنقریب ہمارے سائنسدان کوئی ایسی دوا ایجاد کردیں جو سردی نہ لگنے دے۔ اور اس مصیبت کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہو جائے۔

سردیوں کی راتیں	سردیوں کی راتیں بہت طولانی ہوتی ہیں۔ پانچ

بجنے نہیں پاتے کہ سُورج غُروب ہو جاتا ہے۔ اور رات کا سیاہ جھنڈا لہرانے لگتا ہے سردی بلا کی طرح امنڈتی آتی ہے۔ نو بجتے تک بڑے بڑے شہروں میں اُلّو بولنے لگتا ہے۔ لوگ اپنے اپنے گھروں کے دروازے بند کر کے بیٹھ جاتے ہیں! اور جلدی جلدی سب ضروریات سے فارغ ہو کر بستروں پر دراز ہو جاتے ہیں۔ بُڈھوں کو خشکی کی وجہ سے ذرا نیند کم آتی ہے۔ اور سردی کی رات بھی کچھ غیر معمولی طور پر لمبی ہوتی ہیں۔ اس لئے بڑی بوڑھیاں اپنے پوتے پوتیوں۔ نواسے نواسیوں کو انگیٹھی کے گرد لے کر بیٹھ جاتی ہیں۔ کبھی پُرانے زمانے کے خاندانی قصّے سُناتی ہیں۔ کبھی لمبی لمبی کہانیاں کہتی ہیں۔ کبھی گھر بار کی گفتگو رہتی ہے۔ شادی بیاہ مرنے جینے اور نسبت ناطوں کے تمام افسانے انہی راتوں میں لُطف دیتے ہیں۔ پہلے زمانے میں امیر گھرانوں میں مُغلانیاں ملازم رکھی جاتی تھیں۔ امور خانہ داری سکھانے کے علاوہ ان کا ایک مقصد یہ بھی ہوتا تھا کہ سردیوں کی طولانی راتوں میں لڑکیوں بالیوں کو کام کی باتیں کہانیوں اور افسانوں کے ذریعہ سے سکھائیں۔ اگر کچھ نہ ہو تو سینا پرونا لے بیٹھیں۔ اب وہ زمانہ گیا۔ مُغلانیاں نہ ملتی ہیں اور نہ کوئی رکھتا ہے۔ گھر گھر تعلیم کا چرچا ہے۔ مُغلانیوں کی جگہ قصّے کہانیوں کی کتابوں، ناولوں اور مدرسوں کے نصابوں نے لے لی ہے ۔

مجلسوں اور صحبتوں کے مزے بھی سردیوں کی راتوں سے خاص تعلق رکھتے ہیں۔ گرمیوں میں تو کسی کے قریب بیٹھا نہیں جاتا جاتا۔ طرح طرح کے پسینے کی بھبک آتی ہے۔ دل الٹا جاتا ہے۔ لیکن سردیوں میں ایک دوسرے میں گھس کر بیٹھتے ہیں اور گھنٹوں چہلیں لڑاتے ہیں۔ جوان اپنی جوانی کا اور بچے کہانی کا مزا اٹھاتے ہیں۔ رضائیوں اور کمبلوں میں لپٹے ہوئے ہیں۔ بیچ میں انگیٹھی رکھی ہے۔ رقص و سرود کی محفلیں برپا ہیں۔ حقے کے دور چل رہے ہیں۔ پان کی گلوری پر گلوری کھائی جا رہی ہے۔ تھوڑی دیر بعد چائے کے سبز بخوش پیمانے گردش میں آتے ہیں۔ اور پینے والے بے نشہ مست ہوئے جاتے ہیں ۔

شب سرما کے لطف کیا بیان کئے جائیں۔ کہیں شاعر صاحب فانوس خیال کو روشن کئے بیٹھے ہیں۔ کوئی عالم ارواح کی سیر کر رہا ہے۔ کسی نے کتابیں کھول رکھی ہیں۔ کہیں کہانیاں ہو رہی ہیں۔ کوئی چوروں کے خوف سے دبکا ہے۔ کوئی گھوڑے بیچ کر بیخبر سویا ہے۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد چوکیداروں کی دل ہلا دینے والی آواز جو آجاتی ہے۔ تو خوف سے جسم لرز جاتا ہے۔ ذرا سی کھٹ کھٹ سے سارا گھر جاگ اٹھتا ہے۔ چوہے اور بلی کی کھٹا پٹی پر چور کا گمان گزرتا ہے۔ اور کوہل لگنے کا یقین ہو جاتا ہے۔ جس کی آنکھ پہلے کھلتی ہے۔ دوسرے کو آواز دیتا ہے۔ کیوں بھئی جاگ رہے ہو؟ ابھی سے سو گئے۔

اگر سوءِ اتفاق سے گھر میں کوئی مرد موجود نہیں تو کریم النساء کو بڑی بی پکارتی ہیں۔ ارے کریم بیگ کمبخت کیا مصیبت آگئی اتنی جلدی پڑ کر سو گیا۔ ذرا دیکھ تو چھینکے پر دہی رکھا ہے۔ بلی آئی ہے۔ کسی نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ بلی کے پاؤں آیا ہے۔ کتے کے پاؤں جائیو۔ کسی نے جلدی جلدی آیت الکرسی پڑھی۔ جل تو جلال تو کا ورد کیا۔ لیجئے جناب چور صاحب کو معلوم ہو گیا کہ ان کی آمد کی اطلاع ہو گئی۔ بھلا چور کے پاؤں کہاں۔ چراغ لے کر ڈھونڈو تو کوسوں پتہ نہیں۔ رات تو جوں توں کر کے گزاری صبح کو نقش قدم تلاش کرنے کی کوشش کی گئی۔ کہیں کوئی پاؤں کا نشان مل گیا تو یقین ہو گیا کہ چور تھا۔ بار بار شکر اپنے زبان پر آنے لگے۔ کوئی سجدۂ شکر بجالایا۔ کسی نے شکرانے کے نفل ادا کئے۔ کہ اللہ نے بچالیا۔ ورنہ کیا دھرا تھا۔ غرض جذبات، توہمات اور خیالات جس سرعت اور آزادی سے سردی کی طولانی راتوں میں اُبھرتے ہیں اس کا اندازہ سردی ہی میں ہو سکتا ہے ٭

سردیوں کی چاندنی ہمارے ہاں ایک مثل مشہور ہے، کہ غریب کی جوانی اور سردیوں کی چاندنی یونہی ضائع ہو جاتی ہے۔ پرانے لوگوں کی جو بات ہے کیسی باون تولے پاؤ رتی ہوتی ہے۔ بھلا آپ ہی بتائیے آپ نے سردیوں میں چاندنی کا لطف کب اُٹھایا ہے۔ اگر چاندنی کھیت دیکھنا ہو تو سردیوں میں دیکھو۔ ماہتاب کے چشمہ سے کس طرح نور اُبلتا ہے۔ تمام عالم بقعۂ نور بن جاتا ہے۔ لیکن سردی کب

کسی کو باہر نکلنے دیتی ہے۔ جو اس کا لُطف اُٹھائیں۔ ہاں کہیں آتے جاتے ذرا چاندنی سے لُطف اُٹھا لیا تو سُبحان اللہ اور یہ کہتے کہتے کہ آہا چاندنی کیسے جوبن پر ہے۔ مزا آگیا۔ اپنے کمرے میں گھس گئے۔ اور لحاف میں جا دبکے۔

مہاوٹ

سردیوں کی بارش بھی عجب لُطف دیتی ہے۔ پہلے کئی دن تک مطلع ابر آلود رہتا ہے۔ کبھی کبھی چھوٹی چھوٹی بوندیاں پڑ جاتی ہیں۔ پھر ایسی ٹھنڈی ہوائیں چلتی ہیں کہ معلوم ہوتا ہے۔ برف سے ٹکرا کر آرہی ہیں۔ جس حصّۂ جسم سے آکر ٹکراتی ہیں اسے سُن کرتی چلی جاتی ہیں۔ سرد ہوا کا ہر ایک جھونکا تیر و تبر کی طرح بدن کو کاٹتا ہے۔ اگر اولے پڑ گئے تو سمجھو قیامت آگئی۔ کرۂ خاک و نار طبقۂ زمہریر بن گیا۔ مسلسل کئی کئی دن تک سُورج کا مُنہ دکھائی نہیں دیتا۔ آنکھیں سُورج دیکھنے کو ترس جاتی ہیں۔ جب بارش شروع ہوتی ہے تو پھوئیوں پھوئیوں کئی دن تک برسے چلی جاتی ہے۔ یہ نہیں کہ ایک دم آجائے اور برس کر کھُل جائے۔ لوگ گھروں میں بند ہیں۔ دن کو یہ عالم ہے کہ لحافوں میں گھُسے ہوئے ہیں۔ کمروں کوٹھڑیوں کے دروازے بند ہیں۔ انگیٹھیاں روشن ہیں۔ چراغ جل رہے ہیں۔ ذرا آگ سے دور ہوئے سردی سے کانپ اُٹھے۔ دانت بجنے لگے۔ کام کیا اور سردی سردی پکارتے پھر انگیٹھی کے سامنے آبیٹھے۔

ان دنوں میں لکھنے پڑھنے والوں کی بھی عجب حالت ہوتی ہے۔ سردی سے ہاتھ ٹھٹھرے جاتے ہیں۔ اُنگلیاں سیدھی نہیں ہوتیں۔ ہاتھ سینک لیتے ہیں دو حرف لکھ لیتے ہیں۔ دفتروں میں انگیٹھیاں روشن رہتی ہیں۔ جس کے قریب آگ ہے وہ مزے میں ہے جو دُور ہیں وہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد آگ کے پاس دوڑ دوڑ کر آتے ہیں، کہیں ہاتھ سینکتے ہیں۔ کبھی پاؤں گرم کرتے جسم کو حرارت پہنچاتے ہیں۔ غرض چاروں طرف کے دروازے بند ہیں۔ اور اگر کھُلے ہیں تو گرم پردے پڑے ہوئے ہیں۔ کمرہ کیا ہے حمام بنا ہُوا ہے۔ پھر بھی سردی چڑھے چلی جاتی ہے۔ اور بےحال کئے دیتی ہے۔

ہمارے مُلک میں چونکہ سڑکیں بہت خراب ہیں۔ اس لئے ہلکی ہلکی بارش سے راستوں پر کیچڑ ہو جاتی ہے۔ اور کیچڑ بھی ایسی کہ چلنا محال ہو جاتا ہے۔ پاؤں کہیں رکھو پڑتا کہیں ہے۔ ذرا انسان چُوکا کہیں کا کہیں پہنچا۔ اور چاروں شانے چت بیچ سڑک کے گرا۔ دیکھنے والے دیکھ کر ہنستے ہیں۔ اور وہ بچارا ہے کہ شرم کے مارے آنکھیں اونچی نہیں کر سکتا۔ کوئی میونسپل کمیٹی کو بُرا بھلا کہتا جاتا ہے۔ کوئی اپنے آپکو سنبھالتا ہُوا چلا جاتا ہے۔ جس کے کپڑے دیکھو کیچڑ سے لتھ پتھ۔ جس کے جُوتے دیکھو گارے سے دو دو من کے قدم اُٹھائے نہیں اُٹھتا۔ ایک دن بارش ہو تو کئی دن تک راستے چلنے کے قابل نہیں ہوتے۔ جن سڑکوں کی اچھی طرح دیکھ بھال کی جاتی ہے۔ وہاں

کیچڑ اوّل تو ہوتی ہی نہیں۔ اور اگر ہوتی ہے تو بہت ہی کم۔ ایسی سڑکیں مشکل سے کسی بڑے شہر میں ایک دو ہی ہونگی۔ لوگوں کی چیخ پکار سے اکثر میونسپل کمیٹیاں سڑکوں کی مرمت وغیرہ پر کافی روپیہ خرچ کرنے لگی ہیں لیکن جن راستوں پر سے انگریز افسروں کا گذر زیادہ ہوتا ہے۔ ان کی خاص طور پر دیکھ بھال کی جاتی ہے ورنہ اور سڑکیں اسی طرح کس مپرسی کی حالت میں پڑی رہتی ہیں ॥

اگر سردیوں میں بارش ہو تو یہ مصیبتیں ہیں اور اگر نہ ہوں تو کہتے ہیں خشک سردیاں اور بھی زیادہ قیامت برپا کرتی ہیں۔ خشک سردی میں نمونیا بہت پھیلتا ہے۔ ذرا ہوا لگی کھانسی ہوئی۔ زکام آیا۔ اور نمونیا نے آن دبایا۔ سینے میں درد ہے۔ گرم گرم دوائیں پی جا رہی ہیں۔ ہر ایک اپنے آپ کو پھپھولے کی طرح لئے پھرتا ہے۔ کہ کہیں ہوا نہ لگ جائے۔ ہمارے ملک میں گرمی کی نسبت سردی سے زیادہ اموات واقع ہوتی ہیں۔ بڑے تو اپنے آپ کو سردی سے بچائے رکھتے ہیں لیکن بچارے معصوم بچوں کا اللہ ہی حافظ و ناصر ہوتا ہے ॥

سردی کا موسم تقریباً فروری کے وسط میں ختم ہو جاتا ہے۔ اور پھر وہی گلابی موسم آتا ہے۔ جس میں لوگ اپنی اپنی کینچلی بدلنے لگتے ہیں ॥

دیہاتی زندگی

شہر کے ہنگاموں سے دُور، تصنع اور آرائش سے پاک فضائیں جہاں فطرت اپنے اصلی رنگ میں جلوہ گر ہوتی ہے دیہات آباد ہیں۔ جو لوگ ان دیہاتوں میں فطرت کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر زندگی بسر کرتے ہیں دیہاتی کہلاتے ہیں۔ ہم کیا جانیں دیہات کیا ہیں۔ دیہاتی زندگی کے لُطف کچھ دیہاتی ہی جانتے ہیں اور وہی ان کی قدر کر سکتے ہیں۔ ہم تو دیہاتوں کو ویرانوں اور گنواروں کے مسکنوں سے تعبیر کرتے ہیں۔ ہمارے لئے شہروں کی پُرشور فضا ہزارہا دلچسپیوں کا موجب ہے لیکن جو لوگ فطری ماحول میں زندگی بسر کرنے کے عادی ہیں۔ وہ شہروں سے کوسوں دُور بھاگتے ہیں۔ فطرت کے پُرکیف اور خاموش نغمے، بہتی ہوئی ندیوں کی دلکش آوازیں۔ درختوں کی سائیں سائیں، رہٹ کے چلنے کی متوازن روں روں۔ کھیتوں میں کام کرنے والوں اور چرواہوں کے جذبات سے بھرے ہوئے گیت ان کے لئے وہ لُطف اور کیفیت رکھتے ہیں جو ہمارے اعلیٰ قسم کے ساز اور سازندے بھی پیدا نہیں کر سکتے۔

سادگی دیہاتی زندگی کی امتیازی خصوصیت سادگی ہے دیہاتوں کے

باشندے نہایت ہی سادہ زندگی بسر کرتے ہیں۔ وہ شہریوں کے تکلفات سے بالکل ناواقف ہیں۔ نہ فیشن کو جانتے ہیں اور نہ اس کو پسند کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ ان کے جانور بھی شہریوں کے لباس ان کی وضع قطع اور چال ڈھال سے ڈرتے ہیں۔ جس طرح ان کا طرز معاشرت سادہ اور بے تکلف ہے۔ اس طرح ان کا ماحول بھی تکلفات اور تصنع سے مبرا ہے۔ لباس۔ عادات۔ رہنے سہنے کا طریقہ۔ بات چیت کا ڈھنگ۔ کھانا پینا۔ اُٹھنا بیٹھنا غرض ان کی ہر چیز سے سادگی ٹپکتی ہے۔ اور ان کی فطری سادگی کی گواہی دیتی ہے ؛

لباس۔ دیہاتیوں کے لباس میں بھی غضب کی سادگی ہوتی ہے۔ گاڑھے کا کُرتہ یا فتوحی وہ بھی اگر موسم نے اجازت دی ورنہ اس کی بھی کوئی ضرورت نہیں۔ پاؤں میں پُرانی وضع کا آدھ آدھ سیر کا جوتا۔ اگر شہر کے قریب پہنچے تو پہن لیا ورنہ لٹھ کے سرے پر اَڑا کر کندھے پر رکھے چلے جا رہے ہیں۔ سر پر خدا جھوٹ نہ بلوائے تو پانچ سیر کا پگڑ۔ سمجھ لو کہ موٹی ململ کا پُورا تھان لپٹا ہُوا ہے۔ اگر سردی بہت زیادہ ہے تو گاڑھے کی ایک بڑی سی چادر جس میں تمام جسم لپٹ جائے۔ کندھے پر پٹکا۔ ٹانگوں کو چھپانے کے لئے تہ بند۔ وہ بھی گاڑھے کا۔ اور تکلفات ہیں شامل۔ ورنہ ایک چار اُنگل کی لنگوٹی کافی ہے۔ گرمی ہے تو چھتری کی ضرورت نہیں۔۔

سردی ہے تو اور کوٹ اور کمبل کے محتاج نہیں۔ کڑکتی ہوئی سردیاں اسی چادر میں گزر جاتی ہیں مگر کیا مجال جو کھانسی زکام ستائے۔ یا لسی کو چھوڑ کر چائے کا نام آئے۔ غرض گرمی جائے سردی آئے ان کے لباس میں کوئی خاص تبدیلی پیدا نہیں ہوتی۔ نہ ان کو گرمی ستاتی ہے نہ جاڑا تنگ کرتا ہے۔ انتہا درجے کی گرمی میں بھی ننگے پنڈے اپنے کھیتوں میں نہایت محنت طلب کام کرتے پھرتے ہیں۔ موسمی تبدیلیوں سے ان کے کاروبار میں ذرّہ بھر فرق نہیں آتا۔ اور فطرت کی ستم ظریفی کا شکوہ ان کی زبان تک نہیں آنے پاتا۔

خوراک۔ دیہاتیوں کے لباس کی طرح ان کی خوراک بھی سادہ ہوتی ہے ہماری طرح ان کو مرغن اور لذیذ کھانے مرغوب نہیں۔ دن بھر محنت کرنے کے بعد لہسن کی چٹنی اور خشک موٹی روٹی میں جو لُطف اور لذّت ان کو حاصل ہوتی ہے وہ ہم کو رنگ برنگ کے کھانوں اور پلاؤ زردے میں نہیں آسکتی۔ ان کا من بھاتا کھاجا دودھ۔ لسّی۔ مکھن اور سادی اُبلی ہوئی ترکاریاں اور دال روٹی ہے۔ بلکہ ان کا دودھ اور مکھن بھی ہمارے کام آتا ہے۔ گندم کی فصلیں شہریوں کو مبارک رہیں وہ تو جوار اور بھجڑ کی روٹی کھا کر الحمد اللہ کہتے ہیں اور بہت ہی خوش ہوتے ہیں۔ اس سے ان کے معدوں کی قوّت اور جسمانی طاقت کا اندازہ بخوبی ہو سکتا ہے

ذرا شہری تو ایک دن جو یا بھجڑ کی سوکھی روٹی کھا کر دیکھیں۔ واللہ پیٹ کے درد کے مارے بل کھاتے پھریں یا قلابازیاں لگائیں۔ خشکی کی کثرت سے رات بھر نیند نہ آئے۔ ڈاکٹروں اور حکیموں کی خوشامدیں کریں۔ ان کی فیسیں الگ بھریں۔ لیکن واہ رے دیہاتی اس قدر سادہ اور سخت غذا۔ اچھی صحت۔ طاقتور جسم۔ بلند ہمت اس پر اپنی کھال میں مست۔ سو سو برس کی عمریں۔ عینک کا کبھی نام نہیں سُنا۔ اگر کسی نے لگائی تو دلچسپی کا نمونہ بن گیا۔ دُور دُور سے لوگ پُوچھنے کو آ رہے ہیں کہ خیر ہے کیا ہوا۔ عینک لگائی ہے۔ باپ کی سو سال کی عمر تھی دادا سوا سو برس کے ہو کر مرے تھے۔ خدا بخشے اندھیرے میں سُوئی پروتے تھے اور آخر دم تک عینک کی نوبت نہ آئی تھی۔ اگر تمہارا ستر اسّی برس کی عمر میں یہ حال ہے تو تمہارے پوتوں پڑپوتوں کا کیا حشر ہوگا۔ ایک ہم لوگ ہیں پوتے تو دُور رہے بیٹے بیٹیوں کی شادی بھی دیکھنی نصیب نہیں ہوتی۔ پیدا ہوتے ہی حکیموں ڈاکٹروں کا تانتا بندھ جاتا ہے۔ اور ادنیٰ جماعت میں عینک کی ضرورت لاحق ہو جاتی ہے۔ بچپن ہی میں چُورن اور ہاضمہ کی دواؤں سے الماریاں بھری ہوئی نظر آتی ہیں۔ وقت پر کھانا ملتا ہے لیکن وہ بھی ہضم نہیں ہوتا۔ گہری نیند تو برسوں نہیں آتی۔ واہ رے دیہاتی آفرین ہے تری زندگی پر۔ جس وقت بھوک لگی، جو ملا کھا لیا۔ ہل جوت رہے ہیں۔ کنواں چلا رہے ہیں۔ سُوکھی روٹی نکالی اور

پانی پی کر ڈکار لی۔ یہ بھی میسّر نہیں تو کھیت میں سے کوئی کچی ترکاری توڑی اور بکر بکر چبا لی۔ دوپہر کو جب گھر والی کھانا لائیگی تو کھالینگے۔ کام چھوڑ کر گھر جانے یا بھوک کے مارے بیکار بیٹھ رہنے کی عادت نہیں۔ کھانا کھا کر نرم اور گرم بستروں کی ضرورت نہیں۔ درخت کے سائے میں زمین پر لیٹ رہینگے اور آرام کر کے پھر اپنے کام میں جُت جائینگے۔ شام کو محبّت بھرے گیت گاتے اور موٹر تانیں اُڑاتے اپنے مویشیوں کو ہانکتے ہوئے گھر آئینگے۔ نہا دھو کر روٹی کھائینگے۔ اسکے بعد تھوڑی دیر چوپال میں بیٹھ کر ادھر اُدھر کی باتیں کرینگے اور پھر ایسے بیہوش ہو کر سوئینگے کہ تاروں کی چھاؤں میں اُٹھینگے۔ ضروریات سے فارغ ہو کر پھر اُسی تن دہی سے اپنے کام میں لگ جائینگے ۔"

آب و ہوا حقیقت میں سب تعریف دیہاتوں کی پاک اور پاکیزہ، صحت بخش اور رُوح افزا آب و ہوا کو ہے۔ اور یہ اُسی اچھی آب و ہوا ہی کا ثمرہ ہے کہ دیہاتوں میں رہنے والوں کی صحت شہریوں کی نسبت سَو فیصدی اچھی ہوتی ہے اور وہ کاشتکاری اور زراعت کے سخت ترین فرائض نہایت آسانی سے بجا لاتے ہیں۔ موسمی تبدیلیوں کا ان کی صحت پر قطعی کوئی اثر نہیں ہوتا۔ ثقیل سے ثقیل غذا کو ہضم کر لینا ان کے لئے روزانہ کا معمول ہے۔ اور دیر ہضم غذائیں کھانا ان کا عام دستور ہے۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اس کی ذمہ وار سخت

کوشش ہا اور محنت طلب طرز زندگی ہے لیکن پھر بھی ماننا پڑیگا کہ کھُلی ہوا اور کنوؤں کے پانی کو بھی اس میں بہت زیادہ دخل ہے ؛

اگر ہم شہری لوگ چند دن کے لئے کیا چند گھنٹوں کے لئے دیہات میں چلے جائیں تو تازہ ہوا۔ ہرے بھرے کھیت چہروں پر تازگی پیدا کر دیتے ہیں۔ اور اگر حُسن اتفاق سے چند دن ٹھہرنے کا اتفاق پیش آئے تو صحت میں نمایاں فرق نظر آتا ہے ؛

ایک مرتبہ ہمیں سیر و شکار کے لئے اپنے شہر کے مضافات میں جانے کا اتّفاق ہوا۔ پندرہ سولہ میل کے فاصلے پر ایک ہرا بھرا کھیت نظر آیا۔ ایک دیہاتی نے بتایا کہ یہاں سے ایک میل کے فاصلے پر ہرن ڈول رہے ہیں۔ ہم وہیں اُتر گئے۔ جو شکاری تھے وہ بندوقیں لے کر شکار کے تعاقب میں نکل گئے۔ اور ہم تین چار آدمی کھیتوں کے بیچ میں ایک کنوئیں کے قریب پیپل کے درخت کے گھنے سائے میں جا بیٹھے۔ کنواں چلا کر پانی پیا۔ اور ٹھنڈی ہوائیں اِدھر اُدھر گھومنے لگے۔ سرسبز کھیت۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا۔ چرواہوں کے ترنم ریز اور کیفیّت انگیز گیت عجب لُطف پیدا کر رہے تھے۔ کوئی دو گھنٹے گزر گئے۔ ہمارے ساتھیوں کا کہیں پتہ نہ چلا۔ اور نہ بندوق چلنے کی کہیں سے آواز آئی۔ حالانکہ ہم گھر سے خوب کھاپی کر چلے تھے۔ اور خیال یہ تھا کہ اب کوئی چیز ساتھ لے جانے کی ضرورت نہیں رہی۔ اِس لئے ایسے ہی چلے آئے تھے۔

لیکن اتنی بھوک لگی۔ کہ اس نے ناقابل برداشت صورت اختیار کر لی۔ رہٹ چلا کر پانی پیا کہ کچھ سہارا ہو جائے لیکن پانی نے سوڈے کا کام دیا۔ اور بھوک زیادہ بھڑک اُٹھی، ہم وہاں سے واپس بھی نہ آ سکتے تھے چونکہ ہمارے شکاری ابھی واپس نہ آئے تھے۔ جہانتک نظر کام کرتی تھی ان کا سایہ بھی نظر نہ آتا تھا۔ خیر جب بھوک کی شدت برداشت سے گزر گئی تو اِدھر اُدھر کسی چیز کی تلاش میں گھومنا شروع کیا۔ بھلا سنسان جنگل میں کیا رکھا تھا۔ آس پاس کے کھیتوں میں مرچوں کے پودے لدے پھندے کھڑے تھے۔ جب بھوک نے بالکل بیحال کر دیا تو چند مرچیں توڑ کر بے تکلف چبالیں۔ بھوک تو یقیناً رُک گئی لیکن مُنہ اور آنکھوں سے بلا مبالغہ پانی کے فوارے چھوٹ گئے۔ اور ساتھ ہی دماغ بم کی طرح اُڑ گیا۔ بہر حال مرچوں نے اعضا میں غیر معمولی ہمت پیدا کر دی۔ آگے بڑھ کر ایک جگہ باجرے کی چھوٹی چھوٹی بالیں نظر آئیں۔ ان کو توڑ کر دانے نکالنے کی کوشش کئے بغیر، ہم ایسے ہی چبا گئے۔ جب اس کوشش میں ناکام رہے تو آگ جلا کر بالوں کو بھونا اُسوقت ان کچے پکے دانوں نے وہ مزہ دیا کہ ابھی تک یاد ہے۔ لیکن کیا مجال جو پیٹ میں درد یا طبیعت میں گرانی ہوئی ہو۔ ذرا آپ شہر میں رہ کر تو ایسی بدبوجی حرکت کا ارتکاب کریں۔ اگر پاگل اور سڑی نہ کہلائیں تو ہمارا ذمہ اور اس کے ساتھ اگر کئی ہفتے صاحب فراش نہ رہیں تو جو مُنہ میں

آئے سو کہیں۔ اوّل تو ہمیں یقین ہے کہ کوئی بھلا آدمی آپ کو اپنی جان خطرے میں ڈالنے ہی نہ دیگا۔ اور آپ کو زبردستی روک لیگا۔ سُبحان اللہ دیہات کی آب وہوا جس میں پتھر بھی کھاؤ تو ہضم ہو جائیں اور مٹّی بھی پھانکو تو پیٹ میں پہنچ کر سونا بن جائے ۔

یہی وجہ ہے کہ دیہاتوں کی عمدہ آب وہوا کو شہری بھی پسند کرتے ہیں اور جب کبھی موقعہ ملتا ہے چند دن دیہاتوں میں رہ کر اپنی صحت کو درست کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بلکہ اب تو عوام کا رجحان شہروں سے قریب کے دیہاتوں میں منتقل ہونے کی طرف بڑھ رہا ہے۔ گویا شہری بھی دیہاتوں کی عمدہ آب وہوا سے مستفیض ہونا چاہتے ہیں۔ اس تحریک کی مقبولیت سے دیہاتوں کے شہر بن جانے کا خطرہ ضرور ہے لیکن فطرت کی فیاضیوں کا فائدہ اُٹھانے کا ہر ایک کو حق حاصل ہے۔ اور ہمارے دیہاتی بھائی کُھلی آب وہوا کے بلاشرکت غیرے اجارہ دار نہیں ہیں ۔

صفائی | عام طور پر کہا جاتا ہے۔ صفائی خدا کو پیاری ہے۔ مگر فطرت پرست کہتے ہیں دیہات خدا کو پیارے ہیں کہ وہاں فطرت خلقت سے ہر وقت ہم آغوش رہتی ہے۔ اگر ان دونوں اقوال کو یکجا کیا جائے تو ممکن ہے صفائی کے نام نہاد دلدادگان کو کچھ تضاد نظر آئے اور وہ دیہاتوں کو گندگی اور امراض کا سرچشمہ بتائیں۔ لیکن اگر انصاف کی عینک لگا کر دیکھا جائے تو جو صفائی دیہاتوں میں ہے وہ شہروں

میں نہیں اور جو شہروں میں ہے وہ دیہاتوں میں نہیں ذرا دیہاتیوں کے گھر ملاحظہ فرمائیے۔ لپے پتے، صاف ستھرے، معلوم ہوتا ہے ابھی بن کر تیار ہوئے ہیں۔ یہ اور بات ہے قدرت نے باوجود سخت کوشش زندگی کے ان کو اتنی دولت نہیں دی کہ وہ پکے گھر اور پکی سڑکیں بنائیں۔ اور نئے دور کے صفائی کے اصولوں کی پابندی کریں اور اُن اعتراضات کو دُور کرنے کی کوشش کریں جن کی بدولت وہ ملامت کا نشانہ بنے ہوئے ہیں۔ بہرحال حکومت نے ہر صُوبے میں دیہات سُدھار کے دارے کھول دیئے ہیں جو دیہاتیوں کو صفائی کی ترغیب اور ضروری تعلیم دے رہے ہیں۔ دیہاتی بھی اس موقعہ سے خاطر خواہ فائدہ اُٹھا رہے ہیں۔ اس لئے امید ہے کہ چند سال کے عرصے میں دیہاتی زندگی ایک نعمت غیر مترقبہ بن جائیگی اور دیہات ان تباہ کن وبائی امراض سے محفوظ ہو جائینگے جو نئی روشنی کی صفائی نہ ہونے کی وجہ سے گاؤں کے گاؤں خالی کر دیتے ہیں۔

ہمدردی اور اشتراک عمل ہمدردی اور محبت کی جو مثالیں دیہاتوں میں دیکھنے میں آتی ہیں وہ شہروں میں سُننے میں بھی نہیں آتیں، کسی کو ذرا سی تکلیف ہو سارا گاؤں خدمت کے لئے موجود ہے۔ ایک کو خطرہ ہو پُوری بستی جانوں کو سپر کئے حاضر ہے۔ ایک گھر کا مہمان پورے گاؤں کا مہمان ہے۔ اگر ایک دیہاتی کے پاس کوئی چیز موجود ہے تو باقی دیہاتی اس کو استعمال کرنے کے برابر کے حق دار ہیں۔

ہمارے شہروں کی یہ حالت ہے کہ برابر کے گھر میں کوئی مر جائے کوئی کسی مصیبت میں مبتلا ہو جائے ہمسایوں کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی۔ جھگڑا ہو فساد ہو، خون خرابے ہو جائیں کسی کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی۔ اور کس نمی پُرسد کہ بھیا کون ہے۔ اس کے برعکس دیہاتوں کی حالت ہی کچھ اور ہے۔ ہر شخص ہمدردی۔ محبت۔ استقلال اور اشتراک عمل کی زندہ یادگار ہے۔ امیر غریب۔ زمیندار۔ کاشتکار سب ایک حال میں ہیں۔ جو زمیندار ہیں ان کے وارے نیارے ہیں جو غریب اور مفلوک الحال ہیں وہ بیفکر ہیں جس کے گھر سے چاہینگے چھاچھ لے آئینگے جس زمین میں سے چاہینگے سبزی ترکاری توڑ لائینگے۔ اور مزے سے کھائینگے۔ جب فصل کٹے گی خوشی خوشی سب کے سب جمع ہو کر ایک دوسرے کی سچی ہمدردی سے امداد کرینگے اور اپنی محنت کے صلے میں سال بھر کے لئے اناج پائینگے۔ کسی کے آگے ہاتھ پھیلانے کی ضرورت نہ رہیگی۔ تمام سال بغیر ایک پیسہ لئے خدمات بجالائینگے اگر کسی کھاتے پیتے گھر میں شادی بیاہ رچیگا تو کمینوں کے پاس اتنا روپیہ آجائیگا کہ اپنے لڑکے لڑکی کی شادی باآسانی کر لینگے۔ اس کی بھی کیا ضرورت ہے وہ شادی کا نام منہ سے نکالیں تمام گاؤں والوں کے بٹووں کے منہ کھل جائینگے۔ ہر شخص حسب مقدور مدد کرے گا۔ کمینوں پہ کیا منحصر ہے جس گھر میں شادی بیاہ ہو نیوتنے کی رسم میں روپوؤں کے ڈھیر لگ جاتے ہیں، شادی موت کے موقعہ پر باہر سے

ایک بھی چیز لانے کی ضرورت نہیں جس گھر میں دریاں موجود ہیں دریاں آ جائینگی۔ جس کے ہاں حُقّے ہیں وہ حُقّے لے آئیگا۔ جس کے پاس فالتو چارپائیاں ہیں وہ چارپائیاں پہنچا دیگا۔ غرض جس چیز کی ضرورت ہے۔ اوّل تو بغیر مانگے مِل جائیگی نہیں تو حسبِ ضرورت بغیر کھٹکے مانگ لیگا۔ بلکہ اگر ایسے موقعہ پر کسی کی چیز سے فائدہ نہ اُٹھایا جائے تو آپس میں شکائتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ رنجشیں بڑھ جاتی ہیں کہ ہمیں اس قابل نہیں سمجھا گیا کہ ہماری چیز کو استعمال میں لایا جائے۔ سُبحان اللہ بھلا یہ باتیں شہروں میں کہاں۔ وہاں تو ہر چیز پر "بلا شرکت غیرے ملکیت" کا لیبل لگا ہُوا ہے۔ اگر شادی بیاہ اور مرنے جینے کے موقعہ پر کسی سے کوئی چیز مانگو تو کورا جواب ہے۔ اور بازار کا رستہ بنایا جاتا ہے ؂

دیہات تہذیب و تمدّن کا مرکز نہیں

مغربیت کی رَو نے شہروں کی زندگی کو بالکل بدل دیا ہے۔ پُرانی تہذیب کی جگہ نئی تہذیب لے رہی ہے۔ اور ایسا انقلاب نشو ونما ہو رہا ہے جس کی روک تھام نہایت مشکل نظر آتی ہے۔ برخلاف اسکے دیہاتوں میں ابھی پُرانی تہذیب کے اثرات باقی ہیں۔ اگرچہ دیہاتی قدامت پرستی کے باعث مطعون کئے جاتے ہیں لیکن اس حیثیت سے وہ یقیناً قابلِ تعریف ہیں کہ اپنی پُرانی تہذیب کے دلدادہ ہیں اور اس کو باوجود شدید مخالفت کے نباہ رہے ہیں ؂

موجودہ ترقی کے دَور سے انکی تہذیب کو ضرور خطرہ درپیش ہے۔ کیونکہ نئی تہذیب کی ترقی کا انحصار زیادہ تر دیہاتی ماحول پر ہے صنعت و حرفت کے

کارخانے عام طور پر دیہاتوں ہی میں بنائے جاتے ہیں تاکہ کم اجرت پہ مزدور مہیا ہوسکیں۔ اسکے علاوہ نقل وحمل کی آسانیوں سے قدیمی دیہاتی صنعتوں کو بہت سخت نقصان پہنچ رہا ہے۔ بلکہ عام طور پر دیہاتیوں کی ضروریات بھی شہروں کی منڈیوں سے پوری ہونے لگی ہیں۔ اور انکی گھریلو صنعتیں دن بدن ختم ہوتی جاتی ہیں۔ اکثر اشیاء جو روساء اور امرا کے لئے مخصوص تھیں اب دیہاتوں میں عام لوگوں کے استعمال میں آتی ہیں۔ اس طرح سے دیہاتیوں کے عادات اور خیالات میں ایک انقلاب پیدا ہو رہا ہے ؛

اگر اس انقلاب کو دیہاتوں کی ترقی قرار دیا جائے تو واقعی دیہات شہروں کے قریب ہوتے جاتے ہیں۔ عمدہ آب و ہوا کی وجہ سے شہروں پر انہیں ضرور فوقیت حاصل ہے۔ پھر بھی ضرورت اس بات کی ہے کہ ان میں اور شہروں میں جو خصوصیت مابہ الامتیاز ہے اسے قائم رکھنے کی کوشش کی جائے تاکہ شہری زندگی کی جھک جھک سے محفوظ رہنے کا ذریعہ باقی رہے اور دیہات والوں کے لئے شہروں کی کشش بدستور قائم رہے ؛

دیہاتی شہر میں

جب کسی آدمی کو اسکے ماحول سے نکال کر نئی فضا میں لایا جائے تو اسکی حالت دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ بجنسہٖ ایسی ہی کیفیت اس دیہاتی پر گزرتی ہے جو اپنے دیہات سے شہر میں آتا ہے۔ شہر کی ہر چیز اسے عجوبہ نظر آتی ہے۔ جس چیز پر نظر پڑتی ہے حیرت کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جاتی ہیں۔ بچارہ دیہاتی جب شہر میں آتا ہے تو اپنی حرکات وسکنات سے صاف پہچانا جاتا ہے۔ اسکی

سادگی سے شہر والے فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ اور بچارے کو بات بات پر بیوقوف بناتے ہیں۔ وہ بھی عدم واقفیت کی بدولت انکے جال میں آسانی سے پھنس جاتا ہے۔ ہر چیز کی دوگنی تگنی بلکہ اس سے بھی زیادہ قیمت ادا کرتا ہے اور اُلٹی سیدھی باتیں الگ سُنتا ہے۔ کہیں اس سے شہری زندگی کے تکلفات شرمندہ کرتے ہیں اور کہیں اسکے دل میں استعجاب اور نفرت کا جذبہ برانگیختہ کرتے ہیں۔ وہ اپنے گاؤنکی سادہ اور بے تکلف زندگی کو دل ہی دل میں سراہتا ہے۔ اور شہر والوں کو کوستا ہے ؞

شہری دیہات میں

شہر ونکی گہما گہمی اور مصروفیتوں سے نکل کر جب کوئی شہری دیہات میں جاتا ہے تو وہاں کی پُرسکون زندگی کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھتا ہے۔ اور دیہاتی زندگی سے دلچسپی کا اظہار کرتا ہے۔ لیکن تھوڑی مدّت میں وہ دلچسپی ختم ہو جاتی ہے۔ اور شہر ونکی پُر تکلف زندگی اپنی طرف کھینچتی ہے۔ دیہاتوں میں شام ہوئی اور لوگ باگ فطرت کے ساتھ ہم آہنگ ہوئے۔ ہر طرف خاموشی چھاگئی۔ اور سناٹے کا عالم طاری ہو گیا۔ دن بھر کے تھکے ہارے دیہاتی لمبی تانے بے غل وغش پڑے سوتے ہیں۔ علی الصبح اُٹھیں گے اور اپنے کام میں مصروف ہو جائینگے۔ شہر ونکی حالت ہی کچھ اور ہے۔ رات کے بارہ ایک بجے تک جاگنا معمولی سی بات ہے۔ بازار کھلے ہوئے ہیں۔ سیلانی جوڑے اِدھر اُدھر الّھڑ کُھلے پھرتے ہیں سینما ہالوں میں رونق ہے معلوم ہوتا ہے سارا شہر امنڈ آیا۔ گلی کوچے بجلی کی روشنی سے دن کا سماں پیش کر رہے ہیں۔

حقیقت یہ ہے شہروں میں شام کو دن کی نسبت زیادہ رونق ہوتی ہے جو دیہاتوں کی زندگی کے بالکل برعکس ہے۔ وہاں تھیٹر اور سینما کا کوئی نام بھی نہیں جانتا۔ ان کی دلچسپیاں کچھ اور ہیں۔ جن کا لطف کچھ وہی جانتے ہیں۔

دیہاتی خصوصیات

دیہات اپنی گوناگوں دلچسپیوں اور دلفریبیوں کے باعث ہمارے ملک کی جان ہیں۔ سارے ملک کا رزق دیہاتوں کی بدولت پیدا ہوتا ہے۔ وہ سیدھے سادے اور فطرت پسند انسان محنت کر کے اپنا خون پسینہ ایک کر دیتے ہیں لیکن افسوس کہ انکو اپنی سخت کوشش زندگی اور محنت شاقہ کا پھل خود کھانا نصیب نہیں ہوتا۔ وہ جب تک جیتے ہیں انکی محنت میں کمی واقع نہیں ہوتی۔ کیسی نیک اور پرلطف زندگی ہے کہ دوسروں کے لئے جیتے ہیں۔ اور ہمت نہیں ہارتے۔ سچ ہے اگر وہ کندھا ڈالدیں تو ہم لوگوں کے لئے اناج کہاں سے آئے۔

غرض دیہات کیا ہیں ہمارے لئے رزق پیدا ہونے کی جگہ صحتوں کو درست کرنے کے مقامات۔ اور وہ ارض مقدس جہاں فطرت اور انسانیت ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہیں۔ نمائش کا نام نہیں۔ تکلف کوسوں دور ہے۔ جہاں تک نگاہ کام کرتی ہے قدرت کے ہرے بھرے شاداب مرغزار نظر آتے ہیں نہ چمن کو مالی کی ضرورت ہے نہ میونسپل کمیٹی کی نگرانی اور امداد کی حاجت، شب و روز ایسی جاں بخش اور روح افزا ہوا چلتی ہے۔ کہ نئی زندگی بخشتی اور قوت عمل کو تحریک میں لاتی ہے۔